SHEIK-AHMED-DEEDAD

اسلامی نظامِ زندگی

قرآن عصری سائنس کی روشنی میں

شیخ احمد دیدات

SHEIK-AHMED-DEEDAD

اسلامی نظامِ زندگی

قرآن عصری سائنس کی روشنی میں

شیخ احمد دیدات

اسلامی نظامِ زندگی

قرآن اور عصری سائنس کی روشنی میں

مشہور و معروف محقق، عظیم اسلامی سکالر، عالم تقابل ادیان
شیخ احمد دیدات رحمۃ اللہ علیہ کی عالمی شہرت یافتہ کتاب
کا بامحاورہ اردو ترجمہ

مصنف

شیخ احمد دیدات رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

مصباح اکرم

ترتیب و تحقیق

مفتی محمد وسیم اکرم القادری

عبداللہ اکیڈمی

الکریم مارکیٹ ۔ اردو بازار، لاہور

فہرست

☆☆☆

انتساب

اللہ تعالیٰ کے ان عظیم بندوں

کے نام

جو دین اسلام کی تبلیغ میں

تاحیات کوشاں رہے۔

باب نمبر 1:

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سیدنا حضرت محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم مکہ کے مشہور قبیلہ قریش میں 9یا12 ربیع الاول کے دن پیدا ہوئے ۔ یہ عام الفیل تھا۔ آپ کی پیدائش 20اپریل 571ء میں بوقت صبح ہوئی۔

آپ کی پیدائش سے چند ماہ قبل آپ کے والد عبداللہ بن عبدالمطلب وفات پا چکے تھے۔ ابھی آپ چھ برس کے بھی نہ تھے کہ آپ کی والدہ ماجدہ آمنہ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

اس کے بعد آپ کے دادا جناب عبدالمطلب نے نہایت پیار و محبت کے ساتھ آپ کی پرورش کی اور اپنی وفات سے قبل انہوں نے آپ کی تربیت و نگرانی آپ کے چچا جناب ابوطالب کے ذمہ کردی۔

جناب ابوطالب نے تنگ دستی اور کثرت عیال کے باوجود آپ کی پرورش اپنے ذمہ لے لی۔ اگر طبعی حالات کے مطابق آپ پرورش پاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یتیمانہ اخلاق اور جاہلانہ عادات اپنا کر جوان ہوتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی تہذیب و تربیت کا انتظام فرمایا اور عقل رسا، حسن اخلاق، نازک طبع، پروقار، شرم وحیا، متانت و بردباری، صبر واستقلال، اعتماد، ذمہ داری، قوی دل، صدق وسچائی اور جمعیت خاطر بخش کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی تکمیل فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بت پرستی کی نجاستوں سے پاک رکھا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کبھی شراب پی، نہ بتوں پر چڑھائے ہوئے جانوروں کا گوشت کھایا اور نہ اس دور کے میلوں اور جلسوں میں شرکت کی۔

بچپن میں ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبع بلند کو کسب معاش کے لئے حیلہ وتدبیر کا شوق پیدا ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قومی رواج کے مطابق نہایت ہوشیاری اور مستعدی سے تجارت میں حصہ لینا شروع کیا۔ لوگوں میں آپ کی ہوشیاری، راست بازی اور دیانت داری کا چرچہ عام ہونے لگا۔

اس وقت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا نے جو قریش کی مالدار اور باعزت خاتون تھیں، آپ کو اپنے مال کی تجارت کے لئے دعوت دی۔ آپ نے ان کے خادم "میسرہ" کے ساتھ شام کا سفر کیا۔ یہ سفر بہت کامیاب رہا اور اس تجارت میں بڑا نفع ہوا۔ جب آپ مکہ واپس ہوئے تو یہ نیک بی بی اس گرانقدر منافع اور کامیاب تاجر کی امانت داری دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور آپ سے شادی کرنا چاہی۔ اس وقت وہ چالیس سال کی تھیں اور آپ پچیس برس کے۔ آپ نے بھی اس رشتہ کو پسند فرمایا۔ حضرت خدیجہ کی گرانقدر خدمات کے باعث اسلام کی ترقی میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔

پھر آنحضرت اپنے اہل وعیال کے لئے روزی کمانے کے لئے متفرق منڈیوں میں تجارت کرنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کے سازوسامان اور زندگی کے آرام و آرائش سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے آپ کو نہ تو دولت جمع کرنے کی ہوس ہوئی اور نہ کسی بلند منصب پر پہنچنے کی تمنا۔ آپ دنیا کے مشاغل سے فارغ ہو کر تخلیہ میں لمبی لمبی راتیں غار حرا میں بیٹھ کر عبادت اور غور وفکر میں گزار دیتے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پاکیزہ اور لطیف روح کو عالم بالا کی طرف متوجہ کرتے حتیٰ کہ اسی غار حراء میں چالیس برس کی عمر ہونے پر آپ کو بذریعہ وحی رسالت و معجزہ بخشا گیا۔ آپ پر پہلی وحی میں سورۃ الاقراء کی پانچ آیات نازل کی گئیں۔

قرآن مجید تقریباً تیس سال کے عرصے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ قرآن کا نام خود اس وحی الٰہی میں تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

"شھر رمضان الذی انزل فیہ القران"

"رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا۔"

(سورۃ البقرہ، آیت نمبر: ۱۵۸)

یہ اولین اور آخرین کے علوم کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"نزلنا علیك الکتب تبیانا لکل شیء"

"ہم نے تجھ پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جو تمام چیزوں کو واضح کرنے والی ہے۔"
(سورۃ النحل: آیت نمبر ۹۸)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"فیها کتب قیمة"

"قرآن مجید میں تمام کتب کے علوم جمع ہیں۔"

(سورۃ البینہ، آیت نمبر: ۳)

یہ کتاب حق اور ہدایت اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ نیز اس کی سورتیں اور آیات اس طرح آپس میں مربوط ہیں کہ ان میں نہ کوئی تعارض ہے اور نہ تخالف۔ قرآن مجید کے مضامین باہم دیگرے ایسے ملے ہوئے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سب ایک ہی مسلک میں منسلک ہیں۔

دعویٰ نبوت سے قبل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غار حراء میں ریاضت اور عبادت کیا کرتے تھے۔ جب آپ کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو دفعتاً وہ منزل مل گئی جس کے لئے جویاں تھے، وہ گوہر مل گیا جس کے لئے مضطرب تھے اور وہ ہدایت مل گئی جس کے لئے گریاں تھے۔ جبریل وحی نبوت لے کر آئے اور کہا:

"اقرء"

"پڑھیے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ماانابقاری"

"میں پڑھنے والا نہیں ہوں۔"

فرشتے نے زور سے دبایا پھر چھوڑ دیا اور کہا:

"اقرء"

"پڑھیے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی جواب دیا۔ فرشتے نے پھر زور سے دبایا اور چھوڑ دیا۔ تیسری مرتبہ کے بعد فرشتے نے یہ آیات پڑھیں:

'اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ O خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ O اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ O الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ O عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ O"

(العلق: آیت نمبر 1 تا 5)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس پیغام ربانی کو لے کر کانپتے ہوئے آئے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

"مجھ پر کوئی کپڑا اوڑھا دو۔"

جب ذرا سکون آیا تو آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تمام ماجرا سنا دیا اور کہا:

"خشیت علی نفسی"

"مجھے اصلاح دنیا کی ذمہ داری کے بوجھ سے ڈر لگتا ہے۔"

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا:

"واللہ ما یخزیك اللہ ابدا انك لتصل الرحم وتحمل الكل وتكسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی فرائب الحق"

"اللہ تعالیٰ یقیناً آپ کو رسواء نہیں کرے گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، کمزوروں کے بوجھ اٹھاتے ہیں، ناداروں کی خبر گیری کرتے ہیں، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ بن نوفل حضرت خدیجہ کے عم زاد تھے۔ ورقہ کو تمام ماجرا سنایا تو ورقہ نے کہا:

"یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا۔ کاش! میں جوان ہوتا کہ جب آپ کی قوم آپ کو گھر سے باہر نکالنا چاہتی تو میں آپ کی دل و جان سے مدد کرتا۔"

پہلی وحی کے نازل ہونے کے بعد کچھ عرصہ وحی رک گئی۔ وہ زمانہ ''فترت الوحی'' کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ دوسری وحی میں سورۃ المدثر کی آیات نازل ہوئیں۔

اس کے بعد سلسلہ وحی جاری ہو گیا اور کم و بیش تیس سال تک جاری رہا۔ قرآن مجید کا نزول ضرورت اور حالات کے مطابق ہوتا تھا۔ کچھ لوگ خود مسائل چھیڑ دیتے تھے پھر قرآن نازل ہوتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات پوچھے جاتے تو آپ وحی کے ذریعے جواب دیتے۔ کبھی معاشرے میں ایسے مسائل ابھر آتے جن کا جواب دینا ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح قرآن مجید ضرورت کے مطابق آہستہ آہستہ ''نجماً نجماً'' نازل ہوتا رہا۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

''وقال الذین کفروا لولا نزل علیه القران جملة واحدة وتلك لنثبت به فوادل ورتلنه ترتیلا''

(الفرقان: آیت نمبر ۳۲)

سورۃ اقراء کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد ایک مدت تک وحی کا سلسلہ بند ہو گیا۔ پھر روح الامین اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ آیات لے کر نازل ہوئے:

'' يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ [۱] قُمْ فَاَنْذِرْ [۲] وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ [۳] وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ [۴] وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ [۵] وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ [۶] وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ [۷] فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ [۸] فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ [۹] عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ [۱۰] ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا [۱۱] وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا [۱۲] وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا [۱۳] وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا [۱۴] ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ [۱۵] كَلَّا اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا [۱۶] سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا [۱۷] اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ [۱۸] فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ [۱۹] ''

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رسالت و تبلیغ کے بار گراں کو اٹھا کر تین برس تک خفیہ طریقے سے تبلیغ دین فرماتے رہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو برملا دعوت حق دینے کا حکم

ملا۔ چنانچہ آپ نے علی الا اعلان قریش کو دعوت دین پہنچائی، ان کے افکار و خیالات پر تنقید کی اور ان کے بتوں پر نکتہ چینی کی، جس کا جواب کفار نے کھلی دشمنی سے دیا۔ کفار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مکر و فریب اور سازشوں کے جال بچھائے اور اس تاک میں رہے کہ زمانہ کی گردشیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ختم کر ڈالیں، مگر آپ ان کی تمام سازشوں کا مقابلہ صبر، استقلال، حوصلہ مندی اور ایمان سے کرتے رہے۔

آپ کی پشت پناہی میں آپ کے چچا ابو طالب تھے جو آپ کی مدافعت وحمایت کرتے رہے اور آپ کی نیک بیوی حضرت خدیجہ تھیں جو آپ کو تسلی دیتیں۔ حتیٰ کہ ان سخت پریشان حالیوں کا مقابلہ کرتے کرتے دس سال گزر گئے۔

نبوت کے دسویں سال آپ کے مشفق چچا اور آپ کی غم گسار بیوی یکے بعد دیگرے دو روز کے وقفے سے داغ مفارقت دے گئے، جس کا آپ کو بڑا دکھ ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال کو عام الحزن (غم کا سال) کا نام دیا۔ ان دونوں ہمدردوں کی وفات کے بعد مکہ میں آپ کا رہنا دوبھر ہو گیا۔

بالآخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ چھوڑ کر مسلمانوں کے ساتھ مدینہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ مدینہ منورہ میں قبیلہ اوس و خزرج کے کچھ لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ جب مشرکوں کو آپ کے اس ارادہ کا علم ہوا تو انہوں نے مل کر آپ کو قتل کرنے کی سازش کی، لیکن اسی رات جب وہ آپ کو قتل کرنے کی نیت سے اکٹھے ہوئے آپ اپنے دوست حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مدینہ کی جانب ہجرت کر گئے۔ ان کی حفاظت و نگہبانی خدا کر رہا تھا۔

ربیع الاول جمعہ کے دن اپنی عمر کے ترپن سال گزرنے پر ۲۴ ستمبر ۶۲۲ء کو وہ دونوں مدینہ پہنچے۔ یہ مبارک ہجرت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بول بالا ہونے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے پھیلنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کی تکمیل کا آغاز بن گئی۔

آپ لگاتار مشرکین سے جہاد کرتے رہے اور قرآن مجید کے احکامات کے مطابق مقابلہ و مباحثہ اور تلوار سے جنگ کرتے رہے، حتیٰ کہ جہالت کا دور ختم ہو گیا۔ شرک کی بدلیاں چھٹ گئیں اور دنیا میں توحید کا بول بالا ہو گیا۔

حتیٰ کہ وہ آیت نازل ہوئی جس کے ذریعہ دین کی تکمیل ہو گئی۔ اس آیت کریمہ کے

نزول کو ابھی تین ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ آپ بخار میں مبتلا ہوئے اور پیر کے دن ۱۲ ربیع الاول ۱۱ ہجری مطابق ۸ جون ۶۳۲ء کو رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

داعی اسلام حضرت محمد رسول اللہ نے اپنی زندگی کے چالیسویں سال، سن ہجری سے تیرہ سال قبل ۶۱۰ء کے قریب انقلاب اسلام کا پہلا درس دنیا کو دیا تھا اور اس کے بعد سے آپ کی زندگی کے پورے ۲۳ سال اسی پیغام کی تبلیغ و اشاعت میں صرف ہوئے۔ ۲۳ برس کی مدت میں روئے زمین کا وہ دس لاکھ مربع میل رقبہ جو جزیرہ نمائے عرب کے نام سے موسوم ہے، اسلام کے بتائے ہوئے نظام زندگی پر عامل ہو چکا تھا۔ فلسطین سے لے کر یمن و حضر موت تک اور حجاز سے لے کر عمان و کویت تک جو انسانوں کا جم غفیر بستا تھا وہ سب آپ کی حیات میں ہی زندگی کا پرانا چولا بدل چکا تھا۔ چنانچہ مشہور روسی دانشور ٹالسٹائی رقم طراز ہے:

> ''اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان مصلحین میں سے ہیں جنہوں نے ہیئت اجتماعیہ کی شاندار خدمات سر انجام دی ہیں۔ وہ سب سے بڑے اور عظیم ترین مصلح تھے۔ ان کا یہ کارنامہ انتہائی فخر کے قابل ہے کہ انہوں نے دنیا کی جاہل ترین قوم کو نور ہدایت سے منور کر کے صلح و آشتی کا ملجا و ماویٰ بنا دیا۔''

غیر معمولی مقبولیت:

اسلام جس تیز رفتاری سے پھیلا دنیا کا کوئی مذہب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ملکی اور مقامی مذاہب کا ذکر ہی کیا، تمام عالمی مذاہب (یہودیت، عیسائیت اور بدھ مت وغیرہ) صدیوں تک نہایت گمنامی کی حالت میں رہے۔ یہی معاملہ یہودیت کے ساتھ پیش آیا۔ بدھ مت بھی اپنے بانی کے زمانے میں آس پاس کی چند چھوٹی ریاستوں سے باہر قدم نہ رکھ سکا تھا۔ البتہ صدیوں بعد راجاؤں اور فرمانرواؤں کی سرپرستی میں پروان چڑھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صدیوں بعد عیسائیت بھی تاج و تخت کے سایہ میں اشاعت پذیر ہوئی، لیکن اسلام اپنے آغاز سے تیس سال کے اندر اندر جزیرہ نما عرب کے گوشہ گوشہ میں پھیل گیا۔ یہی نہیں بلکہ اگلے پچیس سال میں کسریٰ کے مقبوضات اور قیصر کا بہت بڑا علاقہ

مسلمانوں کے زیر نگیں آ گیا۔ اسی دوران اسلام ایشیا اور افریقہ میں بھی بہت مقبول ہوا۔

یہاں ہمیں دیکھنا ہے کہ اس غیر معمولی مقبولیت کے اسباب کیا ہیں۔ عیسائی مبلغین اس کی تمام تر وجہ قوت کا استعمال بتاتے ہیں لیکن تاریخ سے گہری دلچسپی رکھنے والوں پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ کوئی تحریک آج تک قوت کے بل بوتے پر کامیاب نہیں ہو سکی۔ تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ عمدہ سے عمدہ تحریکیں صرف تشدد کے باعث ناکام ہو گئیں۔ پھر اسلام کی اشاعت کا سبب تلوار کو قرار دینا حقائق سے دیدہ ودانستہ چشم پوشی کرنے کے مترادف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی مقبولیت کا سب سے اہم سبب اس کی تعلیمات کی گہرائی ہے۔ جس میں انسانی زندگی کے ہر ہر شعبہ کی اصلاح پر زور دیا گیا ہے۔ جس کی ہدایات نہ صرف اگلی دنیا میں چین و آرام کی راہیں کھولتیں ہیں بلکہ اس دنیاوی زندگی میں بھی امن و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لئے مشعل راہ بھی ہیں۔ اسلام کی اس ہمہ گیر اور قابل عمل تعلیمات کا نتیجہ ہے کہ ہر خطہ اور ہر ملک کے باشندوں نے اسے قبول کیا اور اس کے ذریعہ وہ ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج پر فائز ہو گئے۔

اسلامی تعلیمات میں جس چیز نے سب سے زیادہ لوگوں کو لبھایا وہ اس کی مساوات کی تعلیم ہے جس کے ذریعہ صدیوں کے درماندہ لوگوں کو نئی زندگی مل گئی۔ وہ مظلوم طبقہ جو نامعلوم زمانے سے مٹھی بھر لوگوں کے پنجہ جور میں بری طرح جکڑا ہوا تھا اس نے اسلام کے دامن میں آ کر پناہ لی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عہد میں اکثریت اور بہت بڑی اکثریت ایسے لوگوں کی رہی ہے جو غریب طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر اسلام نے جہانبانی کے جو اصول سکھلائے ہیں اور جس طرز حکومت سے بنی نوع انسان کو روشناس کرایا ہے، لوگ اس کے گرویدہ ہو کر بہ کثرت حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔

اسلام کی مقبولیت کا ایک اور اہم سبب یہ بھی ہے کہ اسلام نے وحدت ادیان کا اصول پیش کیا ہے۔ اس کی رو سے تمام مذاہب جن کی بنیاد توحید پر ہے سب کے سب سچے ہیں اور ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں جو وقت اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق اللہ کی طرف سے انسان کی اصلاح کی خاطر وقتاً فوقتاً آتے رہے۔

اس وحدت ادیان کے ساتھ اسلام نے سچائی اور نجات کی اجارہ داری کا بھی بالکل

خاتمہ کر کے رکھ دیا ہے۔ مذاہب عالم میں اکثریت ایسے مذاہب کی ہے جنہوں نے نجات کو کسی خاص فرقہ یا گروہ کے لوگوں تک محدود کر دیا ہے، لیکن اسلام میں نجات کا دروازہ ہر ایک شخص کے لئے کھلا ہوا ہے جو خود کو خالق کائنات کے سپرد کر دے اور نیک عملی کو اپنا شعار بنا لے۔ اس طرح انسان پہلی بار اس حقیقت سے روشناس ہوا کہ کسی خاص نسل یا قوم میں پیدا ہونا نجات کی ضمانت نہیں ہے، بلکہ رنگ و نسل سے ہٹ کر تقویٰ، تزکیۂ نفس اور حسن سیرت ہی دنیا میں فلاح اور آخرت میں نجات کا باعث ہے۔

اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم:

تاریخ انسانی میں ایسے لاکھوں ممتاز افراد گزرے ہیں جنہوں نے بنی نوع انسان کے لئے اپنی زندگیاں نمونے اور ماڈل کے طور پر پیش کیں۔ ان میں سے شاہان عالم ہیں، جنگی سپہ سالار ہیں، علماء، حکماء اور فاتحین عالم ہیں اور شہرۂ آفاق شاعر ہیں۔ اسی طرح اسٹیج عالم پر ہزاروں قسم کی زندگیوں کے نمونے ہیں اور ہر زندگی ایک کشش رکھتی ہے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ ان مختلف گروہوں میں سے کس کی زندگی بنی آدم کی سعادت، نجات اور ہدایات کی ضامن ہے اور اس کے لئے قابل تقلید اسوۂ حسنہ ہے؟ اس معیار پر پرکھیں تو انبیاء علیہم السلام کا گروہ ہی ایسا قابل تقلید نمونہ ہے جو اس معیار پر پورا اترتا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ بنی نوع انسان کے حقیقی مسلمان، اعمال کی بہتری، اخلاق کی نیکی، قلوب کو صفائی اور انسانی قویٰ میں اعتدال اور توازن پیدا کرنے کی کامیاب سعی اگر کسی گروہ انسانی نے کی ہے تو وہ نفوس قدسیہ انبیاء کرام کا گروہ ہی ہے۔ وہ انسانی ہدایت کے لئے اس دنیا میں تشریف لائے اور رشد و ہدایت کی مشعل روشن کر کے چلے گئے۔ جن کی تعلیم و عمل کی ضیاء پاشیوں سے آج بھی تمام انسانی گروہ یکساں فیض یاب ہو رہے ہیں۔ انبیاء کا پیام باہمی انس و محبت اور عالمگیر اخوت کا پیغام تھا۔ بقول مولانا روم:

"انبیاء توڑنے نہیں جوڑنے آتے ہیں۔"

یہ نفوس قدسیہ (انبیاء کرام) اپنے اپنے وقت پر آئے اور گزر گئے۔ ہر ایک نے اپنے وقت میں اپنی اپنی قوموں کے مناسب حال اخلاق حسنہ کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا اور تاریکی و ضلالت کے مقابلے میں ایسا رشد و ہدایت کا چراغ روشن کیا جس سے صراط مستقیم تک

رسائی آسان ہو گئی۔ مگر اب ضرورت ایسے رہنما اور پیشوا کی تھی جو پورے عالم کو بقعہ نور بنا دے اور ہمارے ہاتھ اپنی اعلیٰ ترین عملی زندگی کا وہ مکمل ہدایت نامہ دے دے جس کو لے کر اس کی حکیمانہ ہدایت کے مطابق ہر مسافر بے خطر منزل مقصود کا پتہ پا لے۔ یہ رہبر کامل سلسلہ انبیاء کی آخری کڑی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ آپ کی تعلیم دائمی اور ابدی ہیں یعنی قیامت تک اس کو زندہ رہنا ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو علم و عمل کا مجموعہ کمال بنایا گیا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ قیامت تک کے لئے پوری انسانیت کے لئے اسوۂ حسنہ ہے، کیونکہ آپ کی پوری زندگی ایک روشن کتاب کی طرح ہمارے لئے کھلی ہے، کوئی واقعہ راز اور جہالت کی تاریکی میں گم نہیں۔ اس طرح آپ کی سیرت پاک جامعیت کی حامل ہے یعنی مختلف طبقات انسانی کو اپنی رشد و ہدایت کے لئے جن نمونوں کی ضرورت ہے یا ہر فرد کو اپنے مختلف تعلقات اور فرائض کو ادا کرنے کے لئے جن ماڈلوں اور نمونوں کی ضرورت ہے وہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں موجود ہیں اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قول و فعل اور تعلیم و عمل کا حسین مرقع ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس تعلیم کو پیش کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس کی ترجمان اور ذاتی عمل اس کے مطابق ہے۔ ورنہ اچھے سے اچھا فلسفہ اور عمدہ سے عمدہ نظریہ ہر شخص پیش کر سکتا ہے۔ البتہ جو چیز پیش نہیں کی جا سکتی وہ اس نظریئے اور فلسفے کے مطابق عمل ہے۔ اس لحاظ سے بھی سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کے لئے ازلی نمونہ اور ابدی اسوۂ حسنہ ہے۔

قرآن کریم کی نظر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہر ایک مسلمان کے لئے بہترین نمونہ ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

"لقد كان لكم فى رسول الله اسوة حسنة"

"تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔"

(سورۃ الاحزاب: آیت نمبر ۲۱)

ایک مسلمان کی حیثیت سے انفرادی اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لئے ہمیں ہر قدم پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ حضور ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم

نے حیات انسانی کے ہر شعبے، ہر گوشے میں مکمل ہدایات اور مثالی اعمال کے ذریعے ہمیں سیدھا، سچا، روشن اور بہترین راستہ بتایا ہے۔

انسانوں کے ہر طبقہ اور گروہ کے لئے اس سیرت پاک میں نصیحت پذیری اور عمل کی رہنمائی موجود ہے۔ جو لوگ بچپن میں ناساز ماحول میں گھر جاتے ہیں ان کے لئے آمنہ کے لال اور در یتیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن میں تسلی و اطمینان کا سامان ہے۔ نوجوانوں کے لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاء داری اور عفت میں نمونہ عمل ہے، جو کنواری لڑکیوں سے بھی زیادہ حیادار تھے۔ تاجروں کے لئے مکہ معظمہ کے اس تاجر کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے جس کے تجارتی لین دین کی سچائی اور معاملے کی صفائی کا شہرہ ملک شام تک تھا۔ اس طرح اگر تم حکمران ہو تو سلطان عرب صلی اللہ علیہ وسلم کا حال پڑھو۔ اگر رعایا ہو تو قریش کے مجاہد کو ایک نظر دیکھو۔ اگر تم استاد ہو تو صفہ کی درسگاہ کے معلم مقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو۔ اگر طالب علم اور شاگرد ہو تو رحمن عزوجل کے شاگرد پر نظر جماؤ۔ اگر واعظ اور ناصح ہو تو مسجد نبوی کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو۔ اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو حضرت خدیجہ الکبریٰ اور حضرت عائشہ صدیقہ کے مقدس شوہر کی حیات پاک کا مطالعہ کرو۔ اگر بے اولاد ہو تو فاطمہ کے باپ اور حسن و حسین کے نانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حال پوچھو۔ اگر مزدور اور محنت کش طبقہ کے افراد ہو تو مسجد نبوی کے معمار اول کو دیکھو کہ جنہوں نے "محنت میں عظمت ہے" کا عملی پیغام دیا۔

غرض تم جو کوئی بھی ہو اور کسی حال میں بھی ہو تو تمہاری زندگی کے لئے نمونہ، تمہاری سیرت کی اصلاح کے لئے سامان اور تمہارے ظلمت خانہ کے لئے ہدایات کا چراغ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کامل میں ہر وقت مل سکتا ہے۔ اس لئے طبقہ انسانی کے ہر طالب اور حق کے ہر متلاشی کے لئے صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح مبارکہ ہدایت اور نجات کا ذریعہ ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق"

"میں جملہ اخلاق عالیہ کی تکمیل کے لئے آیا ہوں۔"

اخلاقِ فاضلہ انسان کی عملی سیرت کا نام ہے۔ قرآن پاک نے اس بات کی عملی

شہادت دی ہے کہ آپ اپنے عمل واخلاق کے لحاظ سے بھی بلند ترین انسان تھے۔ قرآن مجید نے دوست ودشمن کے مجمع میں علی الاعلان کہا:

"وانك لعلى خلق عظيم"

"بے شک آپ خلق عظیم کے حامل ہیں۔"

(سورۃ القلم: آیت نمبر:۴)

چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا روشن ترین پہلو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نصیحت فرمائی اس پر سب سے پہلے خود عمل کر کے دکھایا۔ آپ نے لوگوں کو خدا کی یاد اور محبت کی نصیحت کی تو شب وروز میں کوئی لمحہ ایسا نہ تھا کہ جب خدا کی یاد سے آپ کا دل اور ذکر سے زبان غافل ہو۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"آپ ہر وقت خدا کی یاد میں مصروف رہتے تھے۔"

صبر، توکل اور خدا پر اعتماد کی شان دیکھیں تو صرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ملتی ہے۔ حکم الٰہی تھا:

"واصبر کما صبر اولو العزم من الرسل"

(القرآن المجید)

"جس طرح صاحب عزیمت رسولوں نے صبر واستقلال دکھایا تو بھی دکھا۔"

آپ نے وہی کر کے دکھایا۔ قریش مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسی کیسی تکلیفیں دیں۔ مگر صبر واستقلال کا دامن آپ کے ہاتھ سے کبھی نہ چھوٹا۔ ہجرت کے وقت غار ثور میں پناہ لیتے ہیں۔ کفار آپ کا پیچھا کرتے ہیں اور غار ثور کے دھانے تک پہنچ جاتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ گھبرا کر کہتے ہیں:

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم دو ہیں اور دشمن کثیر۔؟"

ایک تسکین بھری آواز آتی ہے:

"ابوبکر ہم دو نہیں۔

"لاتحزن ان اللہ معنا" "گھبراؤ نہیں اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔"

(سورۃ التوبہ، آیت نمبر:۴۰)

اسی طرح عفو ودرگزر سے کام لینا اور دشمنوں سے پیار کرنا صرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی حصہ تھا۔ چنانچہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ جو اسلام قبول کرنے سے قبل برابر سات برس تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف فوجیں لاتے رہے۔ وہ اسلام کے سخت ترین دشمن تھے۔ اسی طرح ان کی بیوی "ہندہ" جس نے احد کے معرکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کی بے حرمتی کی اور ان کے سینے کو چاک کر کے کلیجہ نکال کر چبایا، فتح مکہ کے موقع پر رحمۃ للعالمین نے نہ صرف میاں بیوی کو معاف کر دیا بلکہ یہ بھی فرمایا:

"جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا اس کو بھی امن ہے۔"

غرض تاریخ عالم میں یہ فخر صرف اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ وہ تعلیم اور اصول کے ساتھ ساتھ اپنے عمل اور اپنی مثال کو پیش کرتے ہیں۔ آخری حج کے موقعہ پر جب کہ شمع رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد ایک لاکھ چالیس ہزار پروانوں کا ہجوم تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نوع انسان کو خدا تعالیٰ کا آخری پیغام سنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کے ساتھ اپنی ذاتی مثال بھی پیش فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آج عرب کے تمام انتقامی خون باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں اپنے بھتیجے ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون معاف کرتا ہوں۔ جاہلیت کے سودی لین دین آج باطل کیئے جاتے ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سودی کاروبار ختم کرتا ہوں۔" (مسند امام احمد)

الغرض چھوٹے بڑے، حاکم ومحکوم، فاتح ومفتوح، دوست ودشمن، اپنے بیگانے، معلم ومتعلم، مقنس ومصلح، غرض سب کے لئے سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ یکساں مفید اور قابل تقلید نمونہ ہے۔

دین اسلام بعد از پیغمبر اسلام:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت راشدہ کا دور آیا۔ ان خلفاء کا عہد حقیقی جمہوریت کا عہد تھا۔ ہر طرف بغاوت کے آثار تھے۔ ایک طرف جھوٹے مدعیان نبوت اٹھ کھڑے ہوئے تو دوسری طرف وہ لوگ جنہوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا تھا، لیکن

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بصیرت وفراست نے ان سب پر غلبہ پالیا۔ قرآن مجید کی تدوین کا خیال بھی اسی دور میں پیدا ہوا۔ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا عہد اسلامی فتوحات کا دور تھا۔ ان کے دور میں اسلام عرب سے نکل کر عراق، ایران، شام، مصر اور شمالی افریقہ تک پھیل گیا۔ خلیفہ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ پرفتن زمانہ تھا۔ ان دونوں خلفاء کے زمانے میں اسلام دشمن عناصر پھر میدان عمل میں آگئے اور انہوں نے اسلامی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

خلفائے راشدین کے بعد مسلمانوں میں شہنشاہیت کا آغاز ہوا اور اس کے سب سے پہلے علم بردار حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے اموی خاندان کی حکومت کی بنیادوں کو استوار کیا۔ اموی عہد میں اسلامی فتوحات کا دائرہ اور وسیع ہوا۔ اسلامی مملکت کی حدود ہندوستان اور سپین تک وسیع ہوگئیں، لیکن اسلام کی وہ انقلابی روح جس کا پیغام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے بہت حد تک مردہ ہوگئی۔ یہ زمانہ تقریباً اسی ۸۰ سال پر محیط ہے۔

امویوں کے بعد عباسی آئے جنہوں نے فتوحات پر دنیاوی ثقافت کو ترجیح دی۔ ان کا عہد علوم وفنون کا عہد تھا، جس سے مسلمانوں میں فرقہ بندی کا ظہور ہوا۔ عباسی حکومت پانچ سو برس تک قائم رہی لیکن اس کا انحطاط دو سو برس بعد ہی شروع ہوگیا تھا۔ آخری تین سو برس میں متعدد چھوٹی چھوٹی اسلامی حکومتیں وجود میں آگئیں، جن میں سلاجقہ، غزنوی اور ایوبی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

عباسیوں کے بعد سب سے بڑی اسلامی حکومت جو تقریباً سات صدیوں تک قائم رہی عثمانیوں کی تھی جن کی فتوحات یورپ کے اکثر ممالک پر محیط تھیں۔ عثمانی حکمران بھی اپنے آپ کو خلفاء کہلواتے تھے۔ انقلاب ترکی کے بعد اس خلافت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی مسلمانوں کی غلامی اور نکبت وادبار کا دور ہے جس پر یورپی طاقتوں نے مسلمانوں کو اپنا محکوم بنالیا۔ اگرچہ ان کی حکومتیں بتدریج ان کی غلامی سے نکلتی جارہی ہیں، لیکن بین الاقوامی سیاست کے زیر اثر اب بھی وہ کسی نہ کسی یورپی طاقت کے زیر اثر ضرور ہیں۔

☆☆☆

باب نمبر 2:

القرآنُ المجید

قرآن کا لفظ "قرات" سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں:
"پڑھنا اور تلاوت کرنا"
قرآن مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں:
"بکثرت پڑھی جانے والی کتاب۔"
اس کتاب الٰہی کا یہ نام "قرآن" کسی انسان کا رکھا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ نام خود خداوند تعالیٰ نے رکھا ہے۔

1: سورۃ الاسراء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:
"وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا o"
(سورۃ الاسراء (بنی اسرائیل)، آیت نمبر 106)

2: سورۃ النساء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:
"اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا o"
(سورۃ النساء، آیت نمبر 82)

3: سورۃ یوسف میں ہے:
نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ o"
(سورۃ الیوسف، آیت نمبر 3)

4: سورۃ الحجر میں ارشاد ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ○"

(سورۃ الحجر، آیت نمبر 87)

5: سورۃ الحجر میں ہی ہے:

" اَلَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ○"

(سورۃ الحجر، آیت نمبر 91)

6: سورۃ النحل میں ارشاد ہے:

" فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○"

(سورۃ النحل، آیت نمبر 98)

7: سورۃ الاسراء میں ارشاد ہے:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ○"

(سورۃ الاسراء، آیت نمبر 9)

8: سورۃ الاسراء میں ہی ارشاد ہے:

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ○"

(سورۃ الاسراء، آیت نمبر 45)

9: سورۃ طٰہٰ میں ارشاد ہے:

" مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى ○"

(سورۃ طٰہٰ، آیت نمبر 2)

10: سورۃ الفرقان میں ارشاد ہے:

"وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا○"

(سورۃ الفرقان، آیت نمبر 30)

اس کے علاوہ بھی قرآن مجید کی بیسوں آیات میں قرآن مجید کا نام "القرآن" موجود ہے۔ اس کتاب کو قرآن کریم کا نام دینے میں دراصل ایک زبردست پیش گوئی مضمر ہے۔

وہ یہ کہ یہ کتاب اس کثرت سے دنیا میں پڑھی جائے گی کہ کوئی دوسری کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔

چودہ سو سال سے زائد کا طویل عرصہ اس امر کا شاہد ہے کہ یہ پیشگوئی نہایت تسلسل اور تواتر سے پوری ہو کر قرآن مجید کی صداقت پر ایک زبردست شہادت ثابت ہوئی ہے اور قیامت تک ثابت ہوتی رہے گی۔ چنانچہ دشمنوں اور مخالفوں کو بھی مجبور ہو کر تسلیم کرنا پڑا:

''حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر میں صرف قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جو سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے۔''

(انسائیکلو پیڈیا برٹینکا، نولڈ یکے کا مقالہ قرآن)

یہی وہ کتاب ہے جسے کروڑوں افراد دن میں کم سے کم پانچ مرتبہ پڑھتے ہیں۔ جو بڑی عمر کے لوگوں کے علاوہ نوعمر بچوں کے سینوں میں محفوظ ہے جو رمضان المبارک میں پوری کتاب صحت لفظی اور حسن قرأت کے ساتھ سناتے ہیں۔

نزول قرآن مجید:

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جسے اس نے اپنے پیارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تھوڑا تھوڑا کر کے تئیس سال کی مدت میں نازل فرمایا۔ جب اس کا نزول شروع ہوا تو اس وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک کا اکتالیسواں سال تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے وحی غار حراء میں نازل ہوئی۔ وہ سورۃ العلق کی یہ آیات ہیں:

"اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ o اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ o الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ o"

(سورۃ العلق: آیت نمبر 1 تا 5)

''(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے رب کریم کا نام لے کر پڑھو۔ جس نے (کائنات) کو پیدا کیا، جس نے انسان کو علق سے بنایا۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے سکھلایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا علم اس کو نہ تھا۔''

آخری وحی کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آنحضور صلی

اللہ علیہ وسلم نے جو آخری حج ادا فرمایا تو آیت کلالہ نازل ہوئی:

" يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَّلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِثُهَا إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ وَإِنْ كَانُوا إِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ أَنْ تَضِلُّوا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ○"

(سورۃ النساء، آیت نمبر: ۱۷۶)

" (اے پیغمبر!) لوگ تم سے کلالہ کے بارے میں (اللہ کا) حکم دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ خدا کلالہ کے بارے میں حکم دیتا ہے......"

پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات میں وقوف فرمایا تو یہ آیت نال ہوئی:

" اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا"

(سورۃ المائدہ: آیت نمبر ۳)

" آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین کے پسند کر لیا۔"

اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی:

" وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللّٰهِ ق ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ○"

(سورۃ البقرہ: آیت نمبر ۲۸۱)

" اور اس دن سے ڈرو جب کہ تم اللہ کے حضور لوٹ کر جاؤ گے، پھر ہر شخص اپنے اعمال کا پورا بدلہ پائے گا اور کسی پر زیادتی نہ ہوگی۔"

اس آیت کے نزول کے بعد حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا:

" اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کو سورۃ البقرہ کی 280 نمبر آیت کے سرے پر رکھو"

اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکیاسی دن زندہ رہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ قرآن مجید کی موجودہ ترتیب نزولی ترتیب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لگائی ہوئی ہے۔ جس روز قرآن مجید کا نزول مکمل ہوا اس روز اس کی ترتیب بھی مکمل ہو گئی گویا جو اس کا نازل کرنے والا تھا وہی اس کو مرتب کرنے والا بھی تھا۔

حفاظت قرآن مجید...... معجزۂ قرآن مجید:

تمام آسمانی و غیر آسمانی کتابوں کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن اپنی اصل زبان (عربی) میں آج تک اسی صورت سے محفوظ ہے جیسے وہ اترا تھا۔ قرآن مجید دراصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی زمانے میں مرتب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد صحابہ کرام نے اس کے مختلف نسخے کرا کر مختلف جگہوں پر بھیجے۔ چنانچہ اس کے قدیم ترین اور جدید ترین نسخوں میں ایک شوشے کا فرق بھی نہیں ملتا۔ اسلام کے کٹر مخالف بھی اس بات کے معترف ہیں کہ قرآن مجید ہر قسم کی تحریف سے پاک اور منزہ ہے۔

جمع کے معنی ہیں:

"قرآن کو حفظ کرنا اور سینہ میں محفوظ کرنا۔"

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"انا علينا جمعه و قرانه"

"بیشک اس کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمے ہے۔"

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اترنا شروع ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو یاد کرنے کی غرض سے جلدی جلدی پڑھتے تو یہ آیت حضور پر اتری:

"ہم اسے آپ کے دل میں جمع کر دیں گے اور اسے آپ کی زبان سے پڑھائیں گے۔"

اس طرح دوسری آیت میں ایسی ہی تاکید کی کہ آپ زبان تیز نہ کریں، ہم اس کو حفظ کرائیں گے۔ ارشاد ہے:

"لا تحرك به لسانك لتعجل به"

دوسری جگہ ہے آپ جلدی نہ کریں۔ ارشاد ہے:

"ولا تعجل بالقران انما نعدهم عدا"

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ آپ امی تھے مگر آپ فصیح ترین کلام دنیا کو سنا رہے تھے۔ اسی وجہ سے حفاظ قرآن کو جماع قرآن بھی کہتے ہیں۔

قرآن مجید اتنا جامع اور مختصر کلام الٰہی ہے کہ اسے سینوں میں محفوظ رکھنا آسان ہے۔ یہ بھی اس کا اعجاز ہے کہ بے شمار علوم کا مخزن ایک مختصر سے مجموعہ میں سمویا ہوا ہے۔ قرآن مجید یاد کرنے میں آسان ہے اور سمجھنے میں مشکل نہیں۔ ان دونوں باتوں کی طرف قرآن مجید کا ارشاد ہے:

"وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ"

(سورۃ القمر، آیت نمبر 17)

قرآن مجید کے علاوہ دنیا کی کوئی ایسی مذہبی کتاب نہیں جسے حفظ کیا جاتا ہو۔ عیسائیوں نے جب قرآن مجید کو ضائع کرنے کا منصوبہ بنایا تو انہوں نے اس کے لئے خطیر رقم لگانا شروع کی مگر انہیں بتایا گیا کہ پہلے تو یہ بہت مشکل ہے، اگر معاذ اللہ یہ تم کر بھی لو تو قرآن مجید ان لاکھوں حفاظ کے دلوں سے کیسے نکالو گے جو اس کو محفوظ رکھے ہیں؟ اس پر انہوں نے منصوبہ ہی ترک کر دیا۔

خدا تعالیٰ نے خود قرآن مجید کی حفاظت کا اعلان کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

"انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون"

"ہم ہی اس قرآن کو نازل کرنے والے ہیں اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔"

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ شامل ہونے آئے تو انہوں نے حفظ قرآن کی شرط بیان کی۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ رمضان شریف میں اکسٹھ قرآن مجید ختم کر لیتے تھے۔ دن اور رات میں دو اور پورے ماہ میں اس کے برعکس ہمیں کسی مقدس کتاب کے متعلق ایسا لگاؤ تا حال دریافت نہیں ہو سکا۔

جب سے قرآن کریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں تک پہنچایا ہے، اس دن سے آج تک کوئی دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ قرآن مجید اس میں نہ پڑھا گیا ہو۔ لاکھوں مسلمان روزانہ اس کی تلاوت کرتے ہیں اور یہ شان صرف قرآن مجید کی ہے۔ ارشاد باری ہے:

"فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ"

"پس پڑھو (نماز میں) جو قرآن کا حصہ آسانی سے پڑھ سکو۔"

(سورۃ المزمل، آیت نمبر 20)

یہ بات مسلمہ ہے کہ قرآن مجید سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف برٹینیکا میں ہے:

"The Holy Quran is the most read book in the World"

قرآن مجید دنیا کی واحد کتاب ہے کہ جو زمانہ کے ساتھ متواتر ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی۔ قرآن مجید وہ کتاب ہے جس نے ہر پہلو سے بے مثل ہونے کا دعویٰ کیا ہے ارشاد الٰہی ہے:

"قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل هذا القرآن لا یاتون بمثله ولو کان بعضهم لبعض ظهیراo"

(بنی اسرائیل، آیت نمبر:۸۸)

"کہہ دیجئے کہ اگر انس و جن جمع ہو جائیں اور کوشش کریں کہ اس قرآن کی مثل بنا لائیں تو وہ ہرگز اس کی مثل نہ بنا سکیں خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔o"

سورۂ بقرہ میں منکرین کو صرف ایک سورت کی مانند کلام پیش کرنے کا چیلنج دیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

"وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورة من مثله وادعوا شهداء کم من دون الله ان کنتم صدقین oفان لم تفعلوا ولن تفعلوا"

(سورۃ البقرۃ، آیت نمبر۲۳)

"اگر تمہیں اس امر میں شک ہو کہ جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے تو تم اس کی مانند کوئی سورت بنا لاؤ اور اپنے گواہوں کو بلاؤ اگر تم سچے ہو۔ پس اگر تم نے اس کی مثل پیش نہ کی اور یاد رکھو کبھی نہ کر سکو گے۔"

یہ دونوں آیات قرآن مجید کا بے مثل ہونا ثابت کرتی ہیں۔

دلائلِ اعجاز:

قرآن مجید کن کن پہلوؤں کے لحاظ سے معجزہ ہے ان تمام کا احاطہ کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے، صرف چند ایک اعجازی پہلوؤں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید علوم کا خزانہ ہے جس کو بوجہ خارق عادت ہونے کے علمی اعجاز کہنا چاہئے۔

قرآنی علوم کو چار عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے:

1: جن میں خدا کی توحید اور اس کی صفات کا علم، تعلق باللہ کا علم، ملائکہ کا علم، مبداء و معاد کا علم، اخلاق فاضلہ کا علم اور عبادات کا علم شامل ہے۔

2: جن میں عمرانیات، علم سیاسیات، علم اقتصاد، علم قانون، علم تمدن، علم ہندسہ اور علم مناظرہ شامل ہیں۔

3: جن میں علم کیمیا، علم طبیعات، علم نباتات، علم طبقات الارض، علم الجبال، علم الحیوان، علم ہیت اور علم طبابت شامل ہیں۔

4: جس میں صرف ونحو اور معانی و بیان کے علم شامل ہیں۔

چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین"

"کوئی خشک اور تر چیز ایسی نہیں جو اس روشن کتاب میں نہ ہو۔"

اس آیت میں "رطب" سے مراد روحانی علوم اور "یابس" سے مراد بقیہ تمام علوم ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"مافرطنا فی الکتاب من شیء"

"ہم نے کتاب میں بیان کرنے سے کوئی چیز نہیں چھوڑی۔"

(سورۃ الانعام، آیت نمبر: ۳۸)

قرآن مجید میں یہ سب علوم خدمت دین کے لئے بطور خارق عادت بیان ہوئے ہیں، جن سے بڑے بڑے دقیق مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر ہستی باری تعالیٰ ثابت کرنے کے لئے یہ علوم دست بستہ کھڑے نظر آتے ہیں۔

قرآن مجید کے نزول سے قبل اہل عرب ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے۔ اس گمراہی

اور ظلمت کے زمانے میں قرآن مجید نے عربوں کو ہر قسم کی بدی سے نجات دلا کر با اخلاق اور با خدا انسان بنا دیا۔ موسیو سیڈیو فرانسیسی لکھتا ہے:

"اسلام کو جو لوگ وحشیانہ مذہب کہتے ہیں انہوں نے قرآن کی تعلیم کو نہیں دیکھا جس کے اثر سے عربوں کی تمام بری اور معیوب عادتوں کی کایا پلٹ گئی۔"

مسٹر ٹامس کارلائل انگلستان کے فاضل اپنی کتاب "لیکچرز آن ہیروز" میں لکھتے ہیں:

"اسلام قوم عرب کے حق میں گویا تاریکی میں روشنی کا آنا تھا۔ عرب کا ملک پہلے پہل اس کے ذریعے سے زندہ ہوا۔"

قرآن مجید اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے۔ اس کا اعتراف نہ صرف مسلمانوں کو ہے بلکہ مخالفین کو بھی ہے۔ نزول قرآن کے وقت عرب میں بے شمار فصیح اللسان خطیب اور شاعر تھے۔ جن کی زبان آوری مسلمہ تھی، سب فصحاء و بلغاء قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کے سامنے اپنے آپ کو ضعیف اور پست سمجھنے لگ پڑے۔ لبید معلقہ کا شاعر تھا۔ جب وہ مسلمان ہوا تو اس نے شعر کہنے ترک کر دیئے اور کہا کرتا تھا:

"جب خدا نے مجھے سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران سکھائی ہے تو اب مجھے شعر کہنا موزوں نہیں۔"

"Popular Enecyclopedia" میں لکھا ہے:

"قرآن کی زبان بلحاظ لفظ عرب نہایت فصیح ہے۔ اس کی انتہائی خوبیوں نے اسے اب تک بے مثل اور بے نظیر ثابت کیا ہے۔"

قرآن مجید اثر ڈالنے، یقین دلانے کی طاقت، فصاحت و بلاغت اور تراکیب و بندش الفاظ میں بے نظیر ہے اور دنیائے سائنس کے تمام شعبوں کی حیرت انگیز ترقی کا باعث ہے۔

چنانچہ سر جارج لکھتا ہے:

"انسان کا قلم ایسی معجزانہ کتاب نہیں لکھ سکتا اور یہ مردوں کو زندہ کرنے سے بڑھا ہوا معجزہ ہے۔"

قرآن مجید کے الفاظ میں خارق عادت تاثیر ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

"ولقدجاء هم من الانبياء مافيه مزدجر حكمة بالغه فماتغن النذر"

(سورۃ نمبر ۵۴، آیت نمبر ۴ اور ۵)

"اور یقیناً ان کو (قرآن کے ذریعے) وہ باتیں پہنچ چکی ہیں جن میں تنبیہ ہے۔ یہ قرآن دل تک پہنچ جانے والی دانائی ہے، مگر ڈرانا کسی کام نہ آیا۔"

اس وقت تاثیر سے ڈر کر مخالفین لوگوں کو قرآن مجید کے سننے سے روکتے تھے اور کہتے تھے:

"جب کوئی مسلمان قرآن پڑھ کر سنائے تو شور کرو۔"

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"قال الذین کفروا لاتسمعوا لھذا القرآن والغوا فیہ لعلکم تغلبون ○"

(حم السجدہ: آیت نمبر ۲۶)

"کفار نے کہا کہ اس قرآن کو نہ سنا کرو اور اس کے پڑھنے کے وقت شور وغل کیا کرو، شاید تم غالب آجاؤ۔ ○"

جان ویک جرمن فلاسفر کہتا ہے:

"جب قرآن پیغمبر کی زبان سے منکر سنتے تھے تو بے تاب ہو کر سجدے میں گر جاتے تھے اور مسلمان ہو جاتے تھے۔"

قرآن مجید تیس برس دکھ اور سکھ کے مختلف اوقات میں نازل ہوتا رہا ہے، کیا کوئی انسان یہ بات ذہن میں لا سکتا ہے کہ اس قسم کے حالات میں انسان ایک ہی حالت پر قائم رہے اور جو وہ کلام پیش کرے اس میں اختلاف نہ ہو۔؟ قرآن مجید منافقوں اور مخالفوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

"افلا یتدبرون القران لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا ○"

(سورۃ النساء: آیت نمبر ۸۲)

"پھر کیا وہ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے کہ اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں ضرور اختلاف پاتے۔ ○"

قرآن مجید غیب کی خبروں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ کتاب ایک

ایسی ہستی کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو علیم وخبیر ہے۔ بعض وہ خبریں ہیں جو ماضی سے تعلق رکھتی ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان خبروں کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور بعض وہ خبریں ہیں جو مستقبل سے تعلق رکھتی ہیں۔

1: قرآن مجید نے بائبل میں تحریف وتغیر کا دعویٰ اس وقت کیا جب دنیا اس علمی حقیقت سے ناآشنا تھی۔ آج دنیا کے تمام محققین نے اس امر کا اعتراف کرلیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"افتطمعون ان یومنوا لکم وقد کان فریق منھم یسمعون کلم اللہ ثم یحرفونہ من بعد ما عقلوہ وھم یعلمون ○"

"پس کیا تم امید رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے اور ان میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اللہ کے کلام کو سنتا ہے، پھر سمجھ لینے کے بعد اس کو بدل دیتا ہے، حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ ○"

(سورۃ البقرہ، آیت نمبر: ۷۵)

رومن تاریخ کلیسا، مطبوعہ مرزا پور ۱۸۵۶ء کے صفحہ ۱۰ پر لکھا ہے:

"بہت سے مسیحی کتابیں خود لکھ کر کسی حواری مسیح یا حواری مسیح کے کسی خادم یا کسی بڑے اسقف کے نام سے مشہور کر دیتے تھے، ایسی جعلی کارروائیاں تیسری صدی عیسوی سے شروع ہوئیں اور کئی سو برس تک جاری رہیں۔ یہ نہایت ہی خلاف حق اور قابل شرم حرکت تھی۔"

2: قرآن مجید نے فرعون کی لاش کے متعلق یہ خبر دی تھی کہ وہ موجود ہے۔ یہ اس زمانہ کی خبر ہے جب کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ فرعون کی لاش محفوظ ہوگی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"فالیوم ننجیک ببدنک لتکون لمن خلفک ایۃ وان کثیرا من الناس عن ایتنا لغافلون"

"ہم تیری لاش کو باہر نکال دیں گے تاکہ تو ان کے لئے جو تیرے پیچھے ہیں نشان رہے اور بہت سے لوگ ہمارے نشانوں سے بے خبر ہیں۔"

(سورۃ یونس، آیت نمبر: ۹۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابل جو فرعون تھا اس کا نام رعمیس ثانی تھا۔ انسائیکلو پیڈیا آف برٹینیکا میں مضمون "ممی" کے تحت لکھا ہے کہ رعمیس ثانی کی لاش آج بھی محفوظ ہے۔

قوتِ دلائل کے لحاظ سے معجزہ:

قرآن مجید کا نام "بینۃ" ہے جس کے معنی ہی واضح اور کھلی دلیل ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

"فقد جاء کم بینۃ من ربکم"

(سورۃ الانعام: آیت نمبر ۱۵۷)

قرآن کا قاری آسانی سے یہ جان سکتا ہے کہ قرآن مجید ہر دعویٰ کو دلائل و براہین قاطعہ کے ساتھ منواتا ہے۔ قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جو نسل انسانی کی وحدت کا پیغام دیتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"کان الناس امۃ واحدۃ فاختلفوا"

"سب لوگ ایک ہی امت تھے پس انہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔"

(سورۃ ایونس، آیت نمبر: ۵۲)

سماوی کتب میں سے قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جس نے مکمل ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا"

"آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور تمہارا دین اسلام ٹھہرا کر راضی ہوا۔"

(سورۃ المائدہ، آیت نمبر: ۳)

جو بلند مقام قرآن مجید نے انسان کو دیا ہے کسی دوسری کتاب نے نہیں دیا۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

"ولقد کرمنا بنی ادم"

"اور ہم نے نوع انسان کو" "بلی تکریم بنایا۔"

قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جو پہلی آسمانی کتب کی تصدیق کرتی ہے۔ ارشاد

باری تعالیٰ ہے:

"وآمنو ابما انزلت مصدقا لما معکم"

"ایمان لاؤ جو میں نے اتارا ہے۔ اس کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے۔"

(سورۃ البقرہ: آیت نمبر ۶۱)

اس آیت کریمہ میں بنی اسرائیل کی کتب کی تصدیق کا ذکر ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

"مصدقا لما بین یدیه من الکتاب"

(سورۃ المائدہ، آیت نمبر ۴۸)

قرآن مجید میں ہے:

"ماننسخ من ایة او ننسها نات بخیر منها او مثلها"

"جو پیغام ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسا لے آتے ہیں۔"

(سورۃ البقرہ، آیت نمبر: ۱۰۶)

اس آیت کے سیاق وسباق سے ظاہر ہے کہ یہاں یہود یا شرائع سابقہ کے متبعین مخاطب ہیں۔ اس وجہ سے آیت سے مراد شرائع سابقہ ہیں۔ آیت کا لفظ رسالت اور پیغام کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

متعدد مقامات پر قرآن مجید لوگوں کو "یاایها الناس" سے مخاطب کرتا ہے۔ قرآن مجید کسی خاص قوم یا نسل کو مخاطب نہیں کرتا۔ اس کے برعکس کسی آسمانی کتاب نے عالمگیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ایک تو وجہ یہ ہے کہ تمام سابقہ کتب کسی ایک قوم کی رہنمائی کے لئے آئی تھیں، جس زمانہ میں وہ کتب نازل ہوئیں تھیں وہ عالمگیر دعویٰ کا متقاضی نہیں تھا۔ جب قرآن نازل ہوا تو اس نے عالمگیر ہونے کا دعویٰ کیا۔ ارشاد باری ہے:

"ان هو الا ذکر للعالمین" "یہ کتاب تمام جہانوں کے لئے نصیحت ہے۔"

(سورۃ الیوسف، آیت نمبر: ۱۰۴)

قرآن مجید اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں راہِ اعتدال پر چلنے کی دعا سکھائی ہے:

"اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم"

"اے اللہ! ہمیں سیدا راستہ چلا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرے انعام ہوئے۔"
(سورۃ الفاتحہ، آیت نمبر ۶ اور ۷)

اس وجہ سے امت مسلمہ کو امت وسطیٰ کہا جاتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

"و كذلك جعلنكم امة وسطا"

"اور اس طرح ہم نے تم کو امت وسط بنایا۔"

(سورۃ البقرہ، آیت نمبر: ۱۴۳)

امت وسط سے مراد ایسی جماعت ہے جو افراط و تفریط سے پاک ہونے کی وجہ سے ارفع سے ارفع مقام پر پہنچتی ہو۔ پہلی کتب سماوی میں جو اجمال اور ابہام رہ گیا تھا قرآن مجید اس کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

"وما كان هذا القران ان يفترى من دون الله ولكن تصديق الذى بين يديه وتفصيل الكتب لاريب فيه من رب العالمين"

"اور یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اللہ کے سوا اوروں کا افترا ہو، بلکہ اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے اور کتاب کی تفصیل ہے جس میں کوئی شک نہیں، یہ تمام جہانوں کے رب کی طرف سے ہے۔"

(سورۃ الیونس، آیت نمبر: ۳۷)

اس آیت میں قرآن مجید کی دو شانیں بیان ہوتی ہیں:

1: تصدیق بین یدیہ ۔2: تفصیل کتاب۔

ارشاد باری ہے:

"ما انزلنا عليك الكتب الا لتبين لهم الذى اختلفوا فيه وهدى ورحمة لقوم يومنون"

"ہم نے اس کتاب کو تجھ پر اس لئے نازل کیا ہے کہ تا کہ جو عقائد باطلہ عقول ناقصہ کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں ان سب کا رد کیا جائے۔ یہ قرآن ایمان داروں کے لئے ہدایت اور رحمت کا موجب ہے۔"

(سورۃ النحل، آیت نمبر: ۶۴)

☆☆☆

باب نمبر 3:

اسلام، جدت اور حالات حاضرہ

جدت پسندی اور اسلام:

جدت پسندی بذات خود ایک مستحسن جذبہ اور انسان کی فطری خواہش ہے۔ اگر یہ جذبہ نہ ہوتا تو انسان پتھر کے زمانے سے ایٹم کے دور تک نہ پہنچتا اور قدیم ذرائع آمدورفت سے جدید وسائل مواصلات تک اس کی رسائی نہ ہو سکتی۔ انسان کی تمام تر مادی ترقی اور سائنسی ایجادات ایک جذبے کے رہینِ منت ہیں کہ وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کا متلاشی رہا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے۔ یہ کسی نئی بات یا جدت پر بحیثیتِ جدت کوئی پابندی عائد نہیں کرتا، بلکہ اس کی نوعیت اور افادیت کے مطابق اس کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صنعت و حرفت اور فنون جنگ کے بارے میں نئے طریقوں اور آلات کار کا استعمال متعارف ہوا۔ دفاع کے سلسلے میں عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ گہری خندق کھودی گئی۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے طائف کے محاصرے میں دو نئے آلاتِ حرب استعمال کیے گئے، جن میں سے ایک منجنیق کی مانند تھا اور دوسرا دبابہ جسے موجودہ دور کے ٹینک کی قدیم صورت قرار دیا جا سکتا ہے۔

روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ ان آلات کو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے خود بنایا تھا۔ اس کے علاوہ حافظ ابن کثیر کی روایات کے مطابق حضرت عروہ بن مسعود اور حضرت غسلان بن سلمہ رضی اللہ عنہما کو شام کے مشہور صنعتی شہر جرش بھیجا گیا تا کہ دبابے اور منجنیق کی صنعت سیکھ کر آئیں۔ دبابے کی طرح کا ہی ایک آلہ تھا جسے اہل روم جنگوں میں استعمال کرتے تھے۔

زراعت کی ترقی کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ سے زیادہ کاشت کا حکم دیا اور

زمین کی پوشیدہ نعمتوں میں سے رزق تلاش کرنے کی تاکید فرمائی۔

عرب لوگ بحری بیڑے کے تصور نا آشنا تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور یہ پیش گوئی فرمائی کہ میری امت کے کچھ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے سمندر کی موجوں پر اس طرح سفر کریں گے جیسے تخت نشین بادشاہ اور پھر آپ نے ان کے فضائل بھی بیان فرمائے۔

عہد رسالت کے حوالے سے یہ چند مثالیں تھیں جن کا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ اسلام نے کسی جدید ایجاد اور شے پر نئے ہونے کی حیثیت سے کوئی قدغن نہیں لگائی، بلکہ صحیح مقاصد میں جائز حدود کے ماتحت اس کی ہمت افزائی کی ہے۔

عصر حاضر نے جو صنعتی ایجادات اور سائنسی انکشافات پر مبنی ہے، انسان کی مادی ترقی کو بام عروج تک پہنچایا ہے۔ نئی ایجادات نے راحت و آسائش کے بہتر طریقے مہیا کئے ہیں۔ اس کی ان تمام تر خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کے تباہ کن نقصانات بھی ظاہر ہوئے ہیں۔ اس مادی ترقی اور جدت پسندی نے مختلف عنوانات سے ہوس، ملک گیری اور عریانی وفحاشی کے طوفان کھڑے کئے ہیں، گویا جدت پسندی ایک دودھاری تلوار ہے جو بنی نوع انسان کو فائدہ بھی پہنچا سکتی ہے اور اس کا کام تمام بھی کر سکتی ہے۔ اگر اسلامی تعلیمات کے مطابق تجزیہ کیا جائے تو عصر حاضر میں نہ تو کوئی نئی چیز نئی ہونے کی بنا پر قابل قبول ہے اور نہ قابل تردید۔

اہم سوال یہ ہے کہ وہ کیا معیار ہے جس پر یہ فیصلہ کیا جائے کہ جدت پسندی کی کونسی راہ قابل قبول ہے اور کونسی نقصان دہ اور نا قابل قبول۔

اس معیار کے تعین کے لئے ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ کام خالص عقل کے حوالے سے کیا جائے، چنانچہ لادینی معاشروں میں عقل کو قول فیصل کی حیثیت حاصل ہے، لیکن عقل ودانش کے دعویداروں نے ہی جدت پسندی کے نام پر انسانیت کے لئے اخلاق وشرافت کے سارے اوصاف لوٹنے اور مقدس معاشرتی اداروں کی حرمت کو بھی پامال کیا ہے۔ بڑے سے بڑے نظریے کی شاندار اور خوبصورت توجیہات پیش کیں۔ اگر جدت پسندی کی رو میں اچھے اور برے کا فیصلہ خالص عقل پر چھوڑ دیا جائے تو زندگی کی اقدار صحیح سالم باقی

نہیں رہتی اور یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ ہر شخص کی عقل کا پیمانہ دوسرے سے مختلف ہے۔ چنانچہ انسان متضاد آراء اور نظریات کی ایسی بھول بھلیوں میں پھنس جاتا ہے کہ جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ بنیادی وجہ یہ ہے کہ جو عقل وحی الٰہی کی راہنمائی سے آزاد ہو وہ حقیقتاً انسان کی بہیمی خواہشات اور نفسانی اغراض کی غلام بن جاتی ہیں اور یہ عقل کی غلامی کی بدترین شکل ہے۔ ایسی عقل کو قرآن حکیم میں "ھویٰ" یعنی خواہش نفس قرار دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اگر حق ان لوگوں کی خواہشات نفس کا تابع ہو جائے تو آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں مخلوقات ہیں ان میں سخت بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔"

یہ حقیقت ہے کہ اگر اچھے اور برے تمام کا فیصلہ عقل کے حوالے کر دیا جائے تو انسان کے پاس کسی نئے رواج کو روکنے اور جدت پسندی کے ہاتھوں قیمتی سے قیمتی اخلاقی اقدار کو بچانے کا معیار باقی نہیں رہتا۔ خود اہل مغرب کو مہلک نتائج سامنے آنے پر سخت تشویش ہے کہ اس جدت پسندی کی عام روش میں کیا طریق کار اختیار کیا جائے جس کی بناء پر اعلیٰ انسانی اوصاف اور ادارے محفوظ رہ سکیں۔ ایک امریکی جج کردوزو (Carduzo) اپنی کتاب "The Growth of Law" میں لکھتے ہیں:

"قانون کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ایک ایسا فلسفہ مرتب کیا جائے جو ثبات اور تغیر کے متضاد اور متحارب تقاضوں کے درمیان موافقت پیدا کر سکے۔"

ظاہر ہے کہ یہ کام کسی عقلی فلسفے کے بس کا نہیں، عقل کے سر پر وہ بوجھ لادا گیا جس کی وہ متحمل نہیں ہے، کسی قانون کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ وہ دائمی اور ناقابل تغیر ہے کسی دلیل کی بناء پر ہوتا ہے۔ انسانی عقل کی بناء پر کچھ لوگ عقل کو ناقابل تغیر قرار دیں گے لیکن کل کو دوسرے لوگ یہ اندازہ نہ لگائیں گے کہ وہ دائمی قانون بننے کے لائق نہ تھا۔ چنانچہ اس تجدد پسندی کے مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ عصر حاضر میں بھی اسلام کی قوت کو تسلیم کیا جائے اور انسان عقل کا غلام بننے کی بجائے عقل کو اس ذات کا غلام بنائے جس نے اسے اور پوری کائنات کو تخلیق کیا ہے۔

خالق کائنات تمام وقوع پذیر ہونے والے تغیرات سے پوری طرح باخبر ہے اور ذات عالی کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا کہ کونسے اصول قانونی لحاظ سے ناقابل تغیر اور ثبات کے حامل ہیں۔ صرف مذہب میں ہمیں ایسی بنیاد ملتی ہے اور وہ بھی مذہب کے حقائق کو منطقی استدلال کے نتیجے کے طور پر نہیں بلکہ عقیدے کے ذریعے قبول کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے قانون سے راہنمائی کے بغیر انسانیت کی نجات کے لئے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

چنانچہ سورہ محمد کی آیت نمبر ۱۴ میں ارشاد ہے:

”جو شخص اپنے پروردگار کے واضح راستے پر ہو کیا وہ اس طرح ہو سکتا ہے جن کی بداعمالی ان کو بھلی لگتی ہے اور جو نفسانی خواہشات کی پیروی کرتا ہے۔؟“

گویا تمام جدت پسندیوں، نئے طور طریقوں اور رسوم و رواج کو ان کی ظاہری چمک دمک کی بناء پر نہیں بلکہ اس بنیاد پر جانچا جائے کہ وہ پروردگار کے راستے کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اگر شریعت کا حکم موجود ہو تو اس کو بلا حجت تسلیم کیا جائے کیونکہ سورۂ احزاب کی آیت نمبر 36 کے مطابق:

”کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی معاملے میں فیصلہ کر دیں تو پھر اس معاملے میں اس کا اختیار باقی رہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ بڑی واضح قسم کی گمراہی میں جا پڑا۔“

سورۂ نساء کی آیت نمبر 65 کے مطابق اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کی قسم ارشاد فرماتے ہوئے فرمایا:

”آپ کے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک آپ ﷺ کو اپنے باہمی تنازعات میں فیصل نہ بنائیں۔ پھر جو کچھ آپ فیصلہ کریں اس کے بارے میں اپنے دلوں میں تنگی محسوس نہ کریں اور اسے پوری طرح تسلیم کر لیں۔“

(سورۃ النساء، آیت نمبر: ۶۵)

کتاب و سنت کے ذریعے جو احکامات امت مسلمہ کو دیئے گئے وہ اکثر ان ہی مسائل

سے متعلق ہیں کہ اگر انہیں خالص عقل کے حوالے کیا جاتا تو وہ انسان کو گمراہی کی طرف لے جاسکتی تھی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ ماضی، حال اور مستقبل کے تمام احوال سے باخبر ہے اس لئے صرف اسی کے احکام ہر دور میں واجب العمل ہو سکتے ہیں۔

سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۷۶ میں بیان ہے:

"یبین اللہ لکم ان تضلو واللہ بکل شی ء علیم"

"اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کھول کھول کر باتیں بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ۔"

یہاں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تجدد پسندی اور عصر حاضر کے تقاضوں کے سلسلے میں وحی اور شریعت کی ضرورت اس لئے بھی بہت زیادہ ہے کہ خالص عقل کے ذریعے ہدایت تک پہنچنا بہت مشکل ہے، لیکن یہ طرز عمل بھی درست قرار نہیں دیا جاسکتا کہ کسی طور طریقے، چلن یا جدت کو پہلے اپنی عقل کے مطابق صحیح یا بہتر قرار دے دیا جائے پھر اس کے بعد قرآن وسنت کو اپنے عقلی فیصلے پر پورا اتارنے کے لئے تاویلات کو اختیار کیا جائے۔ ایسا طرز عمل احکام الٰہیہ کے اتباع کے منافی ہے، بلکہ یہ تو اتباع کی بجائے ترمیم اور تغیر کہلائے گا جس کا اختیار کسی انسان کو نہیں۔

اتباع کا تقاضا تو یہ ہے کہ انسان ہر حال میں احکام الٰہی پر کامل یقین کر کے کسی ترمیم کے بغیر اسے قبول کرے اور مادی قوتیں اسے کسی صورت میں بھی احکام الٰہی کے اعراض پر آمادہ نہ کر سکیں۔ چنانچہ سورۃ الانعام کی آیت نمبر ۱۱۵ سے ۱۱۷ میں اس مضمون کو اس طرح واضح کیا ہے:

"اور آپ کے رب کی بات سچائی کے لحاظ سے پوری ہو چکی، اس کی باتوں کو تبدیل کرنے والا کوئی نہیں اور اس کی ذات سمیع اور علیم ہے اور اگر آپ زمین پر رہنے والوں کی اکثریت کی پیروی کریں گے تو وہ آپ کو راہِ خداوندی سے گمراہ کر دیں گے، کیونکہ وہ تو ظن وگمان کی پیروی کرتے ہیں اور یہ کہ وہ تو اٹکل کی بات کرتے ہیں، بے شک آپ کا رب زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے گمراہ ہے اور وہ ہدایت کار کو بھی جانتا ہے۔"

یہ بھی وضاحت کر دی گئی:

"کہتے ہیں وہ لوگ جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے کہ آپ قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لے آؤ، یا اس کو بدل دو۔ تو اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ میں اسے خود اپنی طرف سے تبدیل کر دوں۔ میں پیروی کرتا ہوں صرف اس چیز کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔"

اس اتباع خالص میں مخالفت اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن جو لوگ آزمائشوں کا مقابلہ کرتے ہیں انہیں اللہ کی طرف سے دنیا اور آخرت دونوں میں ہدایت نصیب ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور وہ لوگ جو ہماری خاطر کوشش کرتے ہیں تو ہم ضرور انہیں اپنے راستے کی طرف ہدایت دیں گے اور بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

(سورۃ العنکبوت، آیت نمبر ۶۹)

عصر حاضر کی مادی چکا چوند اور تجدد پسندی کے مقابلے میں یہ عمل درست نہیں کہ اگر کسی حکم الٰہی میں ظاہری فائدہ نظر آئے تو اسے قبول کر لیا جائے اور جہاں آزمائش یا تنقید کا خدشہ ہو وہاں اعراض یا تاویل سازی کی جائے۔ قرآن حکیم کے مطابق اس میں دنیا و آخرت دونوں کا خسارہ ہے۔ چنانچہ سورۃ الحج کی آیت نمبر ۱۱ میں اس بارے میں ہدایت دی گئی ہے:

"اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو اللہ کی بندگی کنارے پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں۔ پس اگر ان کو کوئی دنیاوی فائدہ پہنچ گیا تو اس کی وجہ سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور اگر آزمائش آ گئی تو منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ ایسے لوگ دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ اٹھاتے ہیں اور یہ کھلا نقصان ہے۔"

(سورۃ الحج، آیت نمبر: ۱۱)

تجدد پسندی کے تمام تر لوازمات کے مقابلے میں شریعت کے مطابق طرز عمل اختیار کرنا عین اتباع ہے، چاہے استہزاء اور طعن کے مرحلوں سے گزرنا پڑے۔ مخالفانہ اعتراضات کا مسلمان کے پاس صرف یہی جواب ہے:

"اللہ یستھزیء بھم ویمدھم فی طغیانھم یعمھون"

(سورۃ البقرہ)

"اللہ ان (کفار) کے مذاق کا جواب دیتا ہے اور انہیں ڈھیل دیئے ہوئے ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹک رہے ہیں۔"

عصر حاضر میں عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ تجدد پسندی خواہ وہ کسی بھی شعبے میں ہو اس کی حدود کو پہچانے اور ان معاملات میں دخل اندازی نہ کرے جن کو شریعت نے مکمل کر دیا۔

عالم اسلام کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ مادی ترقی اور تجدد پسندی کی جن خوبیوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے ان کی طرف ہماری رسائی بہت سست روی کا شکار ہے اور جن خامیوں سے ہمیں احتراز کرنا چاہئے تھا وہ بہت تیز رفتاری سے مسلم معاشرے میں سرایت کر رہی ہیں۔

عصر حاضر کی ذمہ داریوں سے اسلامی فکر ونظر کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی صورت میں یہ ثابت ہے کہ دین اسلام جس طرح قوت وطاقت رکھتا ہے، اسی طرح بہترین نتائج پیدا کر سکتا ہے اور عالمی قوت کی حیثیت سے اعلیٰ ترین کردار ادا کر سکتا ہے۔ جس طرح عہد رسالت اور عہد خلفائے راشدین کی مثالیں ہماری تاریخ کے اوراق میں جگمگا رہی ہیں۔

جدید علوم اور اسلام

اہم ترین عصری علوم دو اقسام کے ہیں:

1: علم فلسفہ۔ 2: علم سائنس۔

زمانۂ قدیم کی سادہ زندگی سے لے کر دور جدید کی پیچیدہ زندگی تک بنی نوع انسان کی دو اہم بنیادی ضروریات رہی ہیں:

1: اسے کھانے پینے، رہنے سہنے کی آسائش اور محفوظ زندگی حاصل ہو۔ یہ ایک حیاتیاتی ضرورت ہے جو زندگی کی بقاء اور نسل انسانی کے تسلسل کے لئے ضروری ہے۔

2: اس حیاتیاتی ضرورت کے علاوہ انسان کی کچھ ذہنی احتیاجات بھی ہوتی ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی دنیا ایک بامقصد نظر آئے، وہ اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کے حل کا متلاشی ہوتا ہے، زندگی، کائنات اور زمان ومکان کے حقائق سے

چشم پوشی کرنا اور اس کے مسائل حل نہ کرنا دنیا کو بے مقصد اور بے معنی بنا دینے کے مترادف ہے جس کے نتائج انسان کے حق میں مفید نہیں ہو سکتے۔

محفوظ زندگی گزارنے کے لئے اور دیگر آسائشوں کی تلاش میں انسانی ذہن نے نئے نئے علوم کو جنم دیا۔ مثلاً: زراعت، طب اور انجینئرنگ۔ یہ سب ہی علوم دراصل قدرتی وسائل اور زمین کے ذرائع انسانی فائدے کے طور پر استعمال کرنے سے متعلق ہیں جو ٹیکنالوجی کہلائے۔

علم فلسفہ اور اسلام:

انسان بالطبع صاحب فکر و عقل ہے۔ انسانی شعور جب بیدار ہوتا ہے تو وہ اپنے مدمقابل ایک وسیع و عریض کائنات دیکھتا ہے جس کی حقیقت کو وہ سمجھنا چاہتا ہے۔ انسان مختلف آرزوؤں، جستجو اور اشتیاق کے ساتھ کائنات کی طرف متوجہ ہوتا ہے، یہی غور و فکر کا نظام فلسفہ کہلایا۔

فلسفہ ایک یونانی اصطلاح ہے جو ان دو الفاظ کا مرکب ہے:

1: فلو۔

2: سفیہ۔

فلو (Philo) کے معنی حب کے ہیں اور سفیہ (Sphia) کے معنی دانش و حکمت کے ہیں۔ گویا اس کا مفہوم حب دانش ہے۔ فلسفی کو فلسفی اس لیے کہتے ہیں کیونکہ وہ عقل واستدلال کے ذریعے کسی شے کی آخری اور انتہائی حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش کا نام ہے۔

1: ڈی بوئر (De Boer) کہتا ہے:

> ''فطرت کے ایک جامع نقطہ نظر کی تلاش اور اشیاء کی ہمہ گیر توجیح کی کوشش فلسفہ کہلاتی ہے۔''

2: فلسفہ کی تعریف یوں بھی کی گئی ہے:

> "Philosophy is an inquiry into the nature of life and of existence."

فلسفے کا خاص مسئلہ یہ ہے کہ حکیمانہ طور پر علم و وجود کی اساس کی تحقیق کی جائے اور تمام

موجود حقیقتوں کا ربط ان کے ساتھ واضح کیا جائے۔دنیا کو بحیثیت مجموعی ایک کلی واقعہ اور مظہر سمجھ کر اس کی علت العلل تلاش کی جائے۔

فلسفے کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے:

''جزو اور کل کے درمیان کیا تعلق ہے۔؟ اگر کائنات کو کل اور انسان کو جزو قرار دیا جائے تو انسان کا اصل مقصد کیا ہے۔؟ اس کے مطابق انسان کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے؟ کائنات کل ہونے کی حیثیت سے ابتداء، انتہا، ماہیت اور مقصد کے اعتبار سے کیسی ہے۔؟ اس کا کوئی آغاز یا انجام ہے یا نہیں۔؟ انسانی آرزوؤں کے ساتھ یہ کائنات سازگار ہے یا نہیں۔؟''

فلسفے کا تیسرا اہم ترین مسئلہ یہ ہے:

''خیر وشر کی اصل حقیقت کیا ہے۔؟ انسان جس کی فطرت طلب خیر کا تقاضا کرتی ہے وہ خیر کے حصول میں ارادہ اور اختیار رکھتا ہے یا نہیں۔؟ کائنات کا کوئی مقصد بھی ہے یا نہیں؟ اس کائنات کا کوئی خالق ہے یا نہیں؟ اور اس کے ہونے یا نہ ہونے کا ہماری زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔؟''

یہ تمام فلسفے کے مسائل ہیں اور اگر ایک خاص ترتیب سے ان میں نظم پیدا کر لیا جائے تو یہی سوالات مذہب کے دائرہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔

علماء کہتے ہیں:

''یہ عالم (جہاں) جس میں ہم رہتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے اور اس کی ترکیب کیا ہے۔؟ کیا اس کی ساخت میں کوئی دوامی عنصر موجود ہے۔؟ ہمیں اس سے کیا تعلق ہے؟ اور ہمارا اس میں کیا مقام ہے۔؟ باعتبار اس مقام کے ہی طرز عمل کیا ہونا چاہئے۔؟ یہ سوالات ہیں جو مذہب، فلسفہ اور اعلیٰ شاعری میں مشترک ہیں۔''

جہاں تک فلسفے اور مذہب کے بنیادی مسائل کا تعلق ہے تو اس میں یہ قدر مشترک پائی جاتی ہے۔ اگر فلسفہ حکمت کا نام ہے تو یہ عین قرآنی چیز ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب کے جو چار تقاضے قرآن حکیم میں بیان کئے گئے، انہیں سے ایک تعلیم حکمت بھی

ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

"اے نبی! آپ کو حکمت اور خیر کثیر عطا کی گئی ہے۔"

دین اسلام کو سمجھنے کے لئے جو منہاج یا طریق کار اختیار کیا جائے اس کے دو اجزاء ہیں:

1: مذہب کو صاحب کے حوالے سے سمجھا جائے۔

2: موضوع زیر بحث کی اصل ماہیت، مقصد اور غایت کو سمجھا جائے۔

اسلام کا سرچشمہ اور ماخذ پیغمبرانہ ہدایت ہے جو وحی متلو اور وحی غیر متلو پر مشتمل ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جو نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو، اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی افراد پر مشتمل ہو۔ جن کی کوشش کا رخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف اور غم سے محفوظ رہے۔ اس معاشرے میں نمونہ تقلید اور استحکام کی بنیاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خالص وفاداری ہو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم کی استعداد عطا کی ہے۔ انسان اپنے حواس کے ذریعے خام مواد جمع کرتا ہے اور عقل کی خصوصیت کے ذریعے جب اسے منظم کیا جاتا ہے تو اس علم کو کہتے ہیں "فلسفہ"۔ فلسفہ بھی علم کی ایک شاخ ہے جو انہی مسائل کو زیر بحث لاتا ہے جن سے مذہب بھی بحث کرتا ہے، لیکن علم اور عقل اپنی یہ انتہائی معراج کے باوجود حقائق کے ادراک کے لئے کافی نہیں ہو سکتے اور یہ کمی وحی پورا کرتی ہے۔ انسانی عقل کے ناقص ہونے کی تلافی کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو ہدایات نازل فرمائیں وہ سلسلہ وحی کہلاتا ہے۔

فلسفے کو مذہب پر فوقیت حاصل نہیں۔ فلسفہ کو مذہب کی جانچ کا حق ضرور حاصل ہے، لیکن مذہب ایسا معاملہ نہیں ہے جسے مختلف شعبوں میں تقسیم کیا جا سکے۔ لہٰذا مذہب کی قدر و قیمت کے پیش نظر فلسفے کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ مذہب کی تعمیر فکر میں مرکزی حیثیت کو تسلیم کرے۔

"عام خیال ہے کہ مسلمانوں میں جو حکماء اور فلاسفہ پیدا ہوئے ان میں سے کچھ تو ملحد و بے دین اور اکثر ضعیف العقیدہ تھے، یا کم از کم ان کی مذہبی حالت بہتر نہ تھی۔ یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے، کیونکہ حکمائے اسلام نے بڑی خدمات سرانجام دیں کہ فلسفے کو مذہب اور اسلام سے قریب تر کر دیا، نبوت کا

اثبات کیا اور روح واحساسات کو فلسفیانہ دلائل کے ذریعے ثابت کیا گیا۔ ابن عربی ، الکندی، الفارابی، ابن سینا، امام الغزالی اور ابن رشد مشہور فلاسفہ اور حکیم تھے جن کے افکار سے تاریخ اسلام جگمگاتی رہے گی۔"

مسلمانوں میں فلسفیانہ فکر کی نشوونما کے سلسلے میں یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ یہ یونانیوں سے مستعار شدہ تھا۔ درحقیقت مستشرقین کی رائے مسلمانوں کے خلاف اس عناد کا نتیجہ ہے جو عیسائیوں اور یہودیوں کے دلوں میں پیدا ہوتا رہا۔ ان کا انداز فکر یہ ہے کہ جب تک اسلام کے خلاف منافرت پیدا نہ کی جائے مسیحیت مقبول نہیں ہو سکتی ، وہ اسلام کے ثقافتی فضائل کے خلاف رائے قائم کرانا چاہتے ہیں۔

غیر مسلموں کے نظریئے کے مطابق اسلام نے اخلاق اور تصوف مسیحیت سے مستعار لیا ہے...... قانون یہودیت اور رومن لاء سے...... اور فلسفہ یونانی فکر سے۔

فلسفے کے ضمن میں غیر مسلموں کی دلیل یہ ہے کہ اس کا آغاز مسلمانوں میں اس وقت ہوا جب عباسی خلافت کے زمانے میں مامون الرشید کے دور حکومت کے دوران بیت الحکمت قائم ہوا اور فلسفے کی یونانی کتابوں کے عربی میں ترجمے کیے گئے۔

حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان تراجم کی ابتدا سے تقریباً ۱۰۰ سال پیشتر معتزلہ نے فلسفیانہ بحثوں کا آغاز کیا تھا اور دیکھا جائے تو استعداد، عقل، فہم اور دانش کسی دوسری قوم سے مستعار لینے والی چیز نہیں۔ تبلیغ اسلام کے لئے اسلامی عقائد کو عقل ودانش کے ذریعے منوانے کی خاطر فلسفیانہ افکار کو نمو ملی، اس نے ترقی کے مدارج طے کیے اور اس کی تردید کے لئے یہ دلیل بھی بہت وزنی ہے کہ یونانی مفکرین کی نسبت اسلامی مفکرین کی تصانیف بہت زیادہ ہیں اور زیر غور مسائل کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔

اس سلسلے میں قوی ترین دلیل یہ ہے کہ فلسفیانہ فکر کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ پہلے سے قائم شدہ مفروضوں کو رد کیا جائے تا کہ بحث وتمحیص اور دلائل کے ذریعے نیا تجزیہ منظر عام پر آئے۔ اس بناء پر فکر اسلامی کا یونانی افکار سے ماخوذ ہونا ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ ہر قوم میں فلسفیانہ غور وفکر کے محرکات الگ الگ ہوتے ہیں۔

یونانیوں کا بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ محسوس اور معقول کے درمیان کیا تعلق ہے؟ مجوسیوں

میں خیر وشر کے متضاد اصولوں کی بنا پر ایک ہم آہنگ نظریہ جو حقیقت پر مبنی ہو غور و فکر کا محرک تھا۔ مسیحیوں میں علم اور ایمان کے درمیان ہم آہنگی کا مسئلہ تفکر و تدبر کا باعث بنا۔ مسلمانوں میں فلسفیانہ غور وفکر کے آغاز کا باعث یہ بات تھی کہ وہ دین کی تلقین کرنے سے پہلے مخالفین کے ساتھ علمی اشتراک پیدا کرنا چاہتے تھے اور ان کی نہج پر ان سے بات کرتے تھے۔ گویا دینی اشتراک سے پہلے علمی اشتراک پیدا کرنا بنیادی مقصد تھا۔

چنانچہ ثابت ہوا کہ یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ مسلمانوں نے دوسرے فلسفیانہ نظاموں کو جن کے محرکات کچھ اور تھے مستعار لے لیا۔

علم سائنس اور اسلام:

دنیا کو سمجھنے، اس کو با معنی اور با مقصد بنانے کی ذہنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جو علوم وجود میں آئے سائنس ان میں سے ایک ہے۔ سائنس کی نوعیت اور ماہیت کے بارے میں کئی تعریفیں کی گئیں:

"سائنس ایک لاطینی لفظ ہے جس کے معنی جاننا کے ہیں، لیکن اصطلاحاً اس کے معنی نظام فطرت کے اس علم کے ہیں جو مشاہدے، تجربے اور عقل سے حاصل ہوتا ہے۔"

مارٹن نے سائنس کی تعریف یہ کی ہے:

"Science is a systematized posipive knowledge.

کانٹ (Kant) کہتا ہے:

"سائنس تصورات اور تصوراتی منصوبوں کا ایک مربوط سلسلہ ہے۔ جس نے تجربات اور مشاہدات کے نتائج میں نشو ونما وارتقاء حاصل کیا اور اس سے مزید تجربات اور مشاہدات بار آور آئے۔"

رضی الدین کہتا ہے:

"سائنس مشتمل ہے تجربات کے نظریات کے مشاہدات اور ضبط اشیاء پر، یعنی

سائنس کی بنیاد صرف تجربے پر ہی مشتمل نہیں اور نہ ہی یہ محض عقل اور غور وفکر کا نتیجہ ہے، بلکہ ان سب اشیاء کی آمیزش ہے۔"

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سائنس ہماری مادی دنیا پر تصرف حاصل کرنے اور ان قوتوں کی توضیح وتشریح کا ایک منظم اور مرتب نظام ہے۔ یہ حقائق کا ان کی اصل شکل میں مطالعہ ہے۔ یہ ایک متحرک علم ہے اور اگر یہ علم ترقی اور ارتقاء کو ترک کردیتا ہے تو وہ جلد ہی اپنی سائنسی حیثیت کھو دیتا ہے۔

علوم میں سے یہ ایک ایسی قسم ہے جو گردو نواح کو سمجھنے اور مخصوص حقائق سے آگہی کی باشعور کوشش کا نام ہے۔ یہ مظاہرِ فطرت کا مشاہدہ ہے جو ہمارے حواسِ خمسہ کے ذریعے عمل میں آتا ہے۔ سائنس دان کائنات کے مشاہدے سے کچھ نتائج اخذ کرتا ہے، پھر ان نتائج کو ایک قابلِ فہم تنظیم اور ترتیب کے ساتھ جمع کرتا ہے، تجربات کے بعد درست سائنسی نتیجے کو ایک مستقل علمی حیثیت یا قانون سمجھا جاتا ہے، یعنی علمی حقائق یا مشاہدے سے دریافت ہونے والے نتائج کو جب مرتب اور منظم کرلیا جائے تو اسے ہم "علم سائنس" کہتے ہیں۔

سائنس کے بارے میں اسلام کا طرزِ عمل کیا ہے؟ اس کے متعلق دو مختلف آراء موجود ہیں۔

ایک گروہ کی رائے کے مطابق سائنس کا حصول دائرۂ اسلام سے اخراج کی قوی دلیل ہے، جبکہ دوسرے گروہ کے خیال میں ان میں باہم کوئی تناقض نہیں پایا جاتا۔

ان دونوں آراء سے قطع نظر دینِ اسلام کا اگر ہم مطالعہ کریں تو یہ ایک صحت مند معاشرہ پیدا کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ ایک صحت مند معاشرے کے قیام اور اس کی بقاء وترقی کے لئے تین شرائط بنیادی ہیں۔ وہ شرائط درج ذیل ہیں:

1: انسانی شخصیت کی نشوونما۔

2: ہیئت عمرانی کی تشکیل۔

3: ماحول کی تسخیر۔

پہلی دونوں شرائط کی تکمیل کے لئے وحی کی راہنمائی سے کامل ہدایت میسر آتی ہے اور ماحول کی تسخیر کے لئے سائنس کی گنجائش موجود ہے۔

قرآن حکیم نے علم کی اہمیت اور فضیلت سے روشناس کراتے ہوئے اس کے حصول پر زور دیا۔ حقائق میں تقویت اور استحکام پیدا کرنے کے لئے جو دلائل دیئے جاسکتے ہیں، اس میں مطالعہ کائنات کے حق میں سب سے پہلی آواز دین اسلام کی تھی۔ قرآن حکیم میں یہ واضح بیان کیا گیا ہے کہ توحید کی نشانیاں اور علامات مظاہر قدرت میں نظر آئیں گی۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنهار والفلك التی تجری فی البحر بماینفع الناس ومانزل الله من السماء من ماء فاحیابه الارض بعد موتها وبث فیها من کل دابة وتصریف الریح والسحاب المسخرین بین السماء والارض لایت لقوم یعقلون٥"

(سورۃ البقرہ)

گویا مظاہر قدرت کے مشاہدے اور مطالعے کی دعوت دی گئی تا کہ حقیقت اور اصلیت کو پوری طرح سمجھ لیں۔ جب تمام اسرار ورموز سے آگاہ ہو گئے تو گویا تمام طبیعاتی علوم وجود میں آگئے۔ اسی طرح حیاتیاتی دلیل کے طور پر مظاہر قدرت کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ زمین سے روئیدگی، لہلہاتے کھیتوں، پیداوار، غلہ اور اناج سب کے مشاہدے اور مطالعے سے گویا نباتاتی علوم معرض وجود میں آگئے۔

اسی طرح قرآن مجید نے دنیا اور انسان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں اور قوانین کا ذکر بھی کیا۔ یہ قرآن حکیم کا ہی فیض تھا کہ انسان کو علمی میدان میں قدم رکھنے کی تلقین کی، اس میں علمی روح بیدار کی، بحیثیت مجموعی علم سے بحث کی اور سائنس اس علم ہی کا ایک حصہ یا جزو ہے۔ اسلام نے وہ خطوط مہیا کیے جن کی راہنمائی میں صحیح نتائج تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ آئن سٹائن کا ایک مشہور مقولہ ہے:

"Science without religion is lame and Religion without science is Blind."

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اسلامی دنیا نے اس وقت سائنسی علوم کو نکھارا جب پورا یورپ

جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بڑے بڑے سائنس دان علماء پیدا ہوئے۔ احمد بن یعقوب علم جغرافیہ کے بانی تھے اور ان کی تحریر کردہ کتابیں اٹھارویں صدی عیسوی تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں جغرافیے کے نصاب میں شامل رہیں۔

ابن مسکویہ نے حیات انسانی سے بحث کی اور یورپ کے چارلس ڈاروِن کے نظریات زیادہ تر انہی کی مرہون منت ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ابن مسکویہ نے صرف قرآنی تعلیمات کی روشنی میں بات کی تھی۔

ابن الہیثم علم المناظرہ کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے انعطاف نور پر تجربات کیے۔ جابر بن حیان بابائے کیمیا کہلوائے اور انہوں نے بے شمار کیمیائی مرکبات ایجاد کیے۔ محمد بن زکریا رازی پہلے طبی انسائیکلوپیڈیا ''الحاوی'' کے مصنف تھے۔ ابوالقاسم الزہراوی وہ پہلے سرجن تھے جنھوں نے پوسٹ مارٹم کو انسانی اعضاء کی تحقیق کے لئے ضروری خیال کیا۔

اسی طرح محمد بن موسیٰ خوارزمی، یعقوب بن اسحاق کندی، ابوموسیٰ علی الطبری، ابوعباس، احمد الفرقان البیرونی، بوعلی سینا اور ابن بیطار بہت ہی نامور مسلمان سائنس دان گزرے ہیں۔

مسلمانوں نے انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر دور میں علم اور سائنس کی بڑی خدمت کی اور یہی اسلامی اثرات اور یورپ پر اس کے نتائج اندلس کے ذریعے مختلف ممالک پر وارد ہوئے۔ اگر قرون وسطیٰ کے زمانے میں یورپ میں اسلامی خدمات ان کی تاریخ کے اوراق کو رنگین بنانے کے لئے دوبدو نہ ہوتیں تو آج برلن، واشنگٹن، لندن، ماسکو اور پیرس کی حالت کچھ اور ہوتی۔ یہ صرف مسلمانوں کی محنت کا نتیجہ تھا کہ یورپ نے اس سے آگے قدم رکھ کر گزشتہ خدمات کا سہرا بھی اپنے سر سجا لیا اور سائنسی علوم وفنون میں پیش رو قرار پائے۔

وجود خداوندی کے منکرین مادیت پرست سائنس دان جس غلطی کا شکار ہوئے، اس کی وجہ یہ تھی انہوں نے خود سائنس کی حدود کو نہ سمجھا اور اس وہم میں مبتلا ہو گئے کہ سائنس زندگی کے اس عقدہ کو حل کر سکتی ہے۔ جس طرح بحری جہاز ہوا میں نہیں اڑ سکتا اسی طرح طبعی دنیا کا مطالعہ کرنے والی سائنس مابعد الطبیعاتی حقائق کا ادراک نہیں کر سکتی۔

سائنس اپنے مخصوص دائرہ کار میں مفید خدمت سر انجام دے سکتی ہے، لیکن اس کے نام پر کسی ایسے معاملے کو موضوع بحث بنانا جو اس کی حدود سے متعلق نہ ہو، اس کے دائرہ کار

سے باہر ہو، بذات خود ایک غیر سائنٹفک بات ہے۔ اسی وجہ سے یہ کہنا کہ سائنس خدا کے وجود کی نفی کرتی ہے، ایک بے سروپا بات اور غیر عقلی دعویٰ ہے۔ درحقیقت یہ سوال ہی سائنس کے دائرہ عمل سے خارج ہے۔

چنانچہ فرانسیسی پروفیسر لیز نے لکھا ہے:

''کائنات کے آغاز و انجام تک مشاہدے کی رسائی نہیں، اس لئے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی ازلی یا ابدی وجود کا انکار کریں، جس طرح ہمارا کام یہ بھی نہیں کہ ہم اس کو ثابت کریں۔ ہمارا کام نفی اور اثبات دونوں سے الگ ہے۔''

سائنس اور اسلام کی مخالفت کی ایک بڑی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ مغرب کے سائنس دانوں کے ایک گروہ نے خدا کے وجود سے انکار کیا اور مذہب سے فرار کی کوشش کی، لیکن اقلیتی گروہ کی اس کارروائی میں سائنس کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ یہ ایک ایسی لہر ہے جو زیادہ دیر بلند نہیں رہ سکتی۔

چنانچہ مورس (Maurice) نے اپنی کتاب "Man in not alone" میں لکھا ہے:

''ہم ابھی سائنس کی ترقی کے دور میں سے گزر رہے ہیں لیکن جیسے جیسے ہمارے علم میں اضافہ ہوتا جارہا ہے یہ بھی واضح ہوتا جاتا ہے کہ کائنات کا کوئی خالق ایسا ضرور ہے جس کی دانائی اور حکمت کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوسکتا۔ علم نے ہمارے سینوں میں یہ انکسار اور یقین پیدا کردیا ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہم خدا سے دور جانے کی بجائے خدا کے وجود کو تسلیم کرنے اور اس پر ایمان لانے کے قریب آرہے ہیں۔''

"Francis Beacon" نے بجا طور کہا تھا:

''سائنس کا نامکمل علم آپ کو ملحد بنادیتا ہے لیکن سائنس کا وسیع اور عمیق مطالعہ آپ کو خدا پر ایمان رکھنے والا بنادیتا ہے۔''

ڈاکٹر ڈوزلے نے اپنی کتاب ''The Human Destiny'' اس دعوے کے ساتھ پیش کی تھی:

”اگر ہم سائنس کے جمع شدہ سرمائے کا تنقیدی مطالعہ کریں اور اس سے منطقی اور عقلی نتائج مستنبط کریں تو یہ لازمی طور پر ہمیں خدا تک لے آتے ہیں۔“

پروفیسر "Jude" نے "God and Evil" میں یہاں تک کہہ دیا:

”آج سائنس اور مذہب کائنات کی حقیقت کے بارے میں ایک ہی طرح کی بات کہہ رہے ہیں، گو اپنے نتائج فکر تک پہنچنے کے لئے دونوں کے طریقہ ہائے تحقیق و مطالعہ جدا جدا ہیں، بہر حال ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج سائنس نے خدا کے تصور کا اثبات کر دیا ہے۔“

مغربی علماء کی یہ آراء مذہب اور سائنس کے تعلق کی وضاحت کے سلسلے میں کافی وزنی ہے۔ اگر عقیدۂ توحید کو اساس بنا کر تحقیق و جستجو کی رغبت دلائی جائے تو حقیقت یہ ہے کہ مذہب اور سائنس میں کسی تضاد کے واقع ہونے کا امکان نہیں۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اگر ہم اپنی دنیا یا ماحول کا جائزہ لیں تو زیادہ بہتر اور مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ جہاں سائنس تہی دامن ہو وہاں مذہب کے اٹل حقائق سے مدد لے کر تمام عقدوں کو سلجھایا جا سکتا ہے۔ اس طرح زیادہ صحیح، زیادہ بہتر اور زیادہ مثبت نتائج تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

اس کا نتیجہ یہی نکالا جا سکتا ہے کہ فلسفہ اور سائنس اپنی حدود اور مخصوص دائرہ کار کے مطابق دینِ اسلام سے کوئی تضاد نہیں رکھتے۔ ان دونوں کا تعلق مذہب کے ساتھ بہت گہرا ہے اور مذہب ان دونوں کو وہ بنیاد مہیا کرتا ہے جس کی وجہ سے یہ اپنی اس کمی اور خامی کو دور کر سکتے ہیں جو محض حسی دائرہ کار کی وجہ سے اصولی طور پر ان میں موجود ہے۔

تفکر و تدبیر اور عقل و دانش کے ساتھ ساتھ تجربے اور مشاہدے کو دین کے حقائق سمجھنے میں رکاوٹ خیال نہیں کرنا چاہئے، بلکہ یہ مدد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ تضاد صرف اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب ان دونوں کو ان کے محدود دائرہ کار سے نکال کر مسائل حل کرنے کی کوشش کی جائے یا ان دونوں سے غلط توقعات وابستہ کر لی جائیں۔ بصورت دیگر سائنس اور فلسفہ دونوں علوم سے مفید کام لیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

باب نمبر 4:

اسلام کی اساسی تعلیمات

ایمانیات:

قرآن مجید اگرچہ عقل سے کام لینے کی بار بار تلقین کرتا ہے اور اپنے دعوؤں پر عقلی استدلال بھی کرتا ہے، کیونکہ انسانوں کے پاس تلاشِ حقیقت کے لئے فانوسِ عقل کے سوا اور کوئی روشنی نہیں ہے۔ الہامی صلاحیت جو عقل کی کمی کو پورا کرتی ہے، اسے وہ عقل کے ذریعے ہی پہچان سکتا ہے، مگر وہ اپنے ماننے والوں کو جس حالت تک پہنچانا چاہتا ہے وہ محض ایک فلسفیانہ شعور نہیں ہے، جس میں ظن و تخمین اور تامل و تذبذب اور بار بار کا ادل بدل کارفرما رہتا ہے۔ وہ اندھی جذباتیت اور اوہام پرستی سے بھی انسان کو بچانا چاہتا ہے۔ اس کا مطلوب ''حالت ایمان'' ہے۔ محض تعقل، غیر عملی تفلسف، اوہام پرستی اور یکسر جذباتیت انسانی زندگی کو ہرگز نہیں سنوار سکتی۔

انسانی زندگی ہر حال میں حالت ایمان کی محتاج ہے۔ ایمان وہ اعلیٰ کیفیت ہے جو عقلیت، یقین محکم، اعلیٰ تر جذبات اور بھرپور ذوق عمل کے ایک نقطے پر مجتمع ہو جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ ایمان وہ قوت ہے جو انسان کی شخصیت کے تمام شعبوں کو ایک مقصد کے لئے متحرک کر دیتی ہے۔ ایمان سے بہرہ مند آدمی راستی، عدل، محبت اور احسان کی قدروں سے سرشار ہو کر اپنے مسلّمی حقائق و مقاصد کے لئے شہادت علی الناس کے منصب پر فائز ہوتا ہے۔ پھر اپنے فرائض بے لوث ایثار کے ساتھ ادا کرتا ہے اور خواہشات اور مفاد کی قربانی دیتا ہے، مخالفتوں کا مقابلہ کرتا ہے اور ہنسی خوشی سے دکھ جھیلتا ہے۔ یہاں تک کہ پوری متاع زندگی کو قربان کر دیا جائے۔

قرآن مجید جن حقیقتوں کی طرف بلاتا ہے اور ان پر مبنی جس نظام زندگی کی دعوت دیتا ہے ان کے لئے اس قسم کے زندہ و فعال ایمان کا مطالبہ کرتا ہے:

1: توحید پر ایمان۔ 2: رسالت پر ایمان۔
3: الہامی کتب پر ایمان۔ 4: فرشتوں پر ایمان۔
5: تقدیر پر ایمان۔ 6: آخرت پر ایمان۔

عقیدۂ توحید:

اسلام کی تعلیم کا اولین محور ہے کہ اس کائنات کا نظم، اس کے ضابطے، اس کا سلسلہ علت و معلول، اس کے اجزا کا توافق، اس کا حسن و جمال اور اس کے اندر ہونے والے ہر واقعہ کا کسی نہ کسی نتیجے پر منتہی ہونا ایسی کھلی شہادتیں ہیں کہ یہ کھربوں سالہائے نور کی وسعتیں رکھنے والی مادی دنیا ایک خالق کے خلق کرنے سے پیدا ہوئی ہے اور ایک منتظم کے حسن تدبیر سے چل رہی ہے۔

پھر قرآن مجید بتاتا ہے کہ تم بھی خدا کی اس سلطنت کائنات کے اندر خدا کی پیدا کردہ مخلوق ہو، اس لیے تم خدا کے رزق پر پلنے والی راعیت میں اس کی عطا کردہ قوتوں سے زندگی کے تقاضے پورے کرنے پر قادر ہوئے ہو، لہٰذا تمہارے لئے واحد راستہ یہ ہے کہ تم اس کی عبادت واطاعت میں زندگی گزارو۔

قرآن مجید بتاتا ہے کہ ایسی منظم و حسین کائنات کئی مختلف خداؤں کی موجودگی میں ایک لحظہ کے لئے نہیں چل سکتی، ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو اس کے ہر گوشے میں تصادم رونما ہو جاتا۔ پس تمہارا خدا ایک ہی ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ عبادت بھی کرو تو اسی ایک خدا کی اور مدد بھی مانگو تو اسی ایک خدا سے۔ وہی ایک خدا تمہارا خالق ہے، رازق ہے، مالک ہے، حاکم ہے، جزا اور سزا دینے والا ہے۔ پس اسی ایک کو اپنا رب اور اپنا اِلٰہ مانو۔ اس کے ساتھ کسی دوسری قوت کو اِلٰہیت کا پیوند نہ لگاؤ۔ یہ شرک ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی صفات اور اپنے حقوق میں کسی دوسرے کی شرکت کو تسلیم نہیں کرتا اور نہ بطور امر واقعہ کے ایسی کوئی شراکت موجود ہے۔

خدا کی توحید کا یہ تصور ہی وہ واحد نقطہ ہے جس پر دنیا کی تمام قومیں، تمام نسلیں، اپنی بولیوں اور رنگوں کے اختلافات کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں۔ یہی وحدت انسانیت کا واحد راستہ ہے۔ یہ خدائے واحد جو انسانوں سے محبت کرتا ہے اور محبت کرنے کی وجہ ہی سے

ان کے سامنے ہدایت کی راہیں اسلامی تعلیم کے ذریعے واضح کرتا ہے، ان کی دعائیں سنتا ہے اور ان کی مصیبتوں میں سہارا بنتا ہے، اس پر ایمان لانا ایسی قوت کا سرچشمہ ہے کہ جس کے بل پر انسان زندگی کی کشاکش کے پر صعوبت مراحل کو جرأت وہمت سے طے کرتا چلا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات، صفات اور عبادات میں وحدہٗ لاشریک سمجھا جائے۔ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی بیوی ہے نہ اولاد، ماں ہے نہ باپ اور نہ تو وہ کسی کی ذات کا حصہ ہے نہ کوئی اس کی ذات کا جزء۔ جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے واضح ہوتا ہے:

"قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝"

(القرآن المجید، پارہ 30، سورۃ نمبر 112 (الاخلاص)

"تم فرمادو وہ اللہ ایک ہے۔ ۝ اللہ بے نیاز ہے۔ ۝ نہ اسکی کوئی اولاد اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ۝ اور نہ اس کے جوڑ کا کوئی۔ ۝"

اس کے برعکس کسی کو اللہ کا بیٹا، بیٹی، بیوی وغیرہ ماننا یا مخلوق میں سے کسی کو اللہ کی ذات کا حصہ اور جزء اعتقاد کرنا وغیرہ "شرک فی الذات" ہے۔

اللہ تعالیٰ کو صفات میں واحد تسلیم کرنے سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان تمام صفات میں جو قرآن وحدیث سے ثابت ہیں یکتا، بے مثل ومثال اور لاشریک مانا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت "رَزَّاقٌ" (ہمیشہ رزق دینے والا) اور "سَمِیْعٌ" (ہمیشہ سننے والا) ہے۔ یہ حقیقت میں صرف اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں کسی دوسرے میں ان کا پایا جانا محال ہے۔

مخلوق اور اللہ تعالیٰ کی صفات میں یہ فرق ہے کہ ہم مخلوق اللہ تعالیٰ کی عطا سے سنتے ہیں نہ کہ حقیقی طور پر، لیکن اس کے برعکس اللہ تعالیٰ حقیقی طور پر سننے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور مخلوق کی صفات میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام صفات کے ساتھ ازلی وابدی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ دنوں، مہینوں، سالوں اور صدیوں سے نہیں بلکہ ازل سے سننے والا ہے اور ہمیشہ سنتا رہے گا، لیکن ہم نہ تو ہمیشہ سے سنتے ہیں اور نہ ہی ہمیشہ سنتے رہیں گے۔ اس

طرح اللہ تعالیٰ اپنی تمام صفات میں بے مثل، مثال اور یکتا ہے۔ کوئی بھی اس کی صفات میں شریک نہیں۔ اس کی صفات میں کسی کو شریک ٹھہرانا "شرک فی الصفات" کہلاتا ہے۔

اسلام کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اچھی صفات کا مالک ہے۔ وہ تمام صفات رذیلہ یعنی بری صفات سے پاک ہے۔

وحدتِ عبادت سے یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک سمجھا جائے، ہر قسم کی عبادت کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص تسلیم کیا جائے اور کسی دوسرے کو اس میں شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ مثلاً: نماز، روزہ، حج، زکوۃ، سجدہ، رکوع، صدقہ، قربانی، خیرات، طواف، اعتکاف اور دعا صرف اللہ تعالیٰ کی ہی عبادات ہیں۔ اگر کوئی غیر اللہ کی عبادت کی نیت سے نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، حج کرتا ہے، صدقہ دیتا ہے، قربانی کرتا ہے، طواف کرتا ہے، اعتکاف کرتا ہے تو یہ عبادات میں اللہ کے غیر کو اللہ کا شریک بناتا ہے۔ اسے "شرک فی العبادت" کہا جاتا ہے۔

عقیدۂ رسالت:

انسان الہامی ہدایت کا اسی طرح محتاج ہے جس طرح سورج کی روشنی، ہوا، پانی اور روٹی کا محتاج ہے۔ اس کے رب والہ نے اس ضرورت کو پورا کرنے کا انتظام بھی اسی طرح کر دیا ہے جس طرح اس کی جسمانی ضرورتوں کا انتظام فرمایا۔ اسی انتظام کا عنوان نظام رسالت ہے۔

خدائے واحد نے اولین انسان کو اپنی ہدایت سے نوازا اور پھر جوں جوں نسل انسانی پھیلتی گئی، ہر دور میں ہر قوم کے لئے وقت کے بہترین کردار کے انسانوں کو منتخب فرما کر انہیں فریضہ رسالت تفویض کیا۔

خدا کے مبعوث کردہ انبیاء و رسل علیہم السلام نہ صرف اس کی ہدایت اور صحیفے انسانوں کو پہنچاتے رہے بلکہ ان کے مطابق نمونے کی زندگیاں بسر کر کے بھی دکھاتے رہے کہ خدا کو بندوں سے کیسی زندگی مطلوب ہے اور اسے کیا چیز پسند ہے۔

انبیاء کے ذریعے جو "ہدایت نامے" انسان تک پہنچے ہیں ان میں صحف ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام کے علاوہ چار بڑی کتابیں معروف ہیں۔ ان کتب کے نام یہ ہیں:

1: تورات۔ 2: زبور۔

3: انجیل۔ 4: قرآن مجید۔

تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو، زبور حضرت داؤد علیہ السلام کو، انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور قرآن مجید آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا گیا۔

اول الذکر تینوں کتب کی حفاظت ان کے علمبردار نہ کر سکے، بلکہ ان میں تحریف کی گئی۔ آخر کار قرآن مجید کے ذریعے ان کی تعلیمات کو صحیح ترین اور مکمل ترین شکل میں انسانیت کے سامنے رکھ دیا گیا، جسے سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم لائے اور صرف لائے ہی نہیں بلکہ اپنی ذات سے نئے کر دیکھ کر مکمل ضابطہ حیات کے دائرے کے ایک ایک گوشے کو عملی طور پر کر کے دکھایا کہ ایسے ہیں حق الی اور ہدایت یافتہ معاشرے کی ساخت کیا ہونی چاہیے۔

نبیوں اور رسولوں پر ایمان یہ ہے کہ اس بات کو تسلیم کیا جائے کہ تمام انبیاء و رسل علیہم الصلوۃ والسلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور چنے ہوئے بندے ہیں۔ وہ تمام مخلوق سے معزز و مکرم اور ساری مخلوقوں سے اعلیٰ و اشرف ہیں۔

ان سب انبیاء و رسل علیہم الصلوۃ والسلام نے اپنے اپنے وقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام رسانی کا حق ادا کیا ہے۔ اس پیغام رسانی میں کوئی کمی کی نہ کوئی زیادتی۔ اس ہدایت کی تبلیغ کی اور وہی کچھ سکھایا اور بتایا جو اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء و رسل کو ارسال فرمایا۔ انہوں نے جو دعوت اپنی اپنی قوم کو دی وہ حق تھی، پہلے انبیاء و رسل سارے کے سارے سچے تھے۔ ان کی تبلیغ اور دعوت حق تھی۔ کوئی بھی انسان چاہے جتنا بھی عبادت گزار ہو کسی بھی نبی و رسول سے بڑھ نہیں سکتا بلکہ ان کے برابر بھی نہیں ہو سکتا۔ ان سب کا ادب و احترام کرنا فرض اور عین دین حق ہے۔ ان کے ذکرِ خیر کے وقت "علیہ الصلوۃ والسلام" کہنا ضروری ہے۔ سارے انبیاء و رسل "معصوم عن الخطاء" ہیں، یعنی ان سے کوئی بھی غلط کام صادر نہیں ہوتا۔ یہ صرف نیک کام کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔ یہ سب دین اسلام کی تبلیغ کرتے رہے ہیں۔ ان انبیاء و رسل کی کل تعداد کے متعلق حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، البتہ حدیث میں ہے کہ ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار کم و

بیش) ہے۔ جن میں سے تین سو تیرہ (اور ایک روایت کے مطابق تین سو پندرہ) رسول ہیں۔

(مسند امام احمد، جلد نمبر 5، باب مسند ابی ذر، عربی صفحہ نمبر 265)

انبیاء و رسل میں بھی مراتب ہیں کہ نبی سے افضل رسول، رسول سے افضل اولوالعزم رسول، اولوالعزم رسول سے افضل کلیم، کلیم سے افضل خلیل اور خلیل سے افضل حبیب (علیہم الصلوۃ والسلام) ہیں۔

سرورِ کون ومکاں، احمدِ مجتبیٰ، ہادیٔ کل جہاں، دانائے سبل، خاتم الرسل، آمنہ کے لال، پیکرِ حسن وجمال، منبعِ شرف وکمال، شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین، سید الاولین والاخرین، خیر الوریٰ، شمس الضحیٰ، بدر الدجیٰ، والیٔ بطحاء، صاحب المعراج والاسرا، خاتم الرسل والانبیاء، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان یہ ہے کہ اس بات کو دل وجان سے مانا اور تسلیم کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم کو نبی و رسول بنا کر بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم تمام انبیاء و رسل کے سردار ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم کی بعثتِ سعید سے لے کر قیامت تک آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم کا ہی دورِ نبوت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم نے تبلیغ کا حق ادا فرما دیا۔ کوئی ایک چھوٹی سے چھوٹی بات کی بھی تبلیغ کرنے سے دریغ نہیں فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم سے بغض رکھنے والا کافر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم کی شان تمام مخلوق سے اعلیٰ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم کی شان میں ذرا سی بھی گستاخی ایمان سے خارج کر دیتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم سے خطا کبھی بھی سرزد نہیں ہوئی، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم "معصوم عن الخطاء" ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم سید البشر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام علوم آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم کو عطا فرما دیئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم اللہ تعالیٰ کی عطاء سے بطور معجزہ غیب بھی جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم آخری نبی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

"مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ

وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 22، سورۃ نمبر 33 (الاحزاب)، آیت نمبر 40)

"محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں۔ ہاں اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں میں پچھلے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تمام کائنات سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم سے محبت کی جائے اور اس محبت اور پیار کو دل کی دھڑکن بنایا جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ"

(الصحیح البخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول من الایمان، جلد نمبر 4، عربی صفحہ نمبر 7)

"اس وقت تک تم میں سے کوئی بھی ایماندار نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کی اولاد، والدین اور سارے لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔"

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت انسانیت کے بلوغ کے موقع پر اور بین الاقوامی دور کے سرے پر ہوئی ہے اور آپ کی لائی ہوئی کتاب جامع اور مکمل ہونے کے ساتھ ساتھ تحریف کے تمام خطرات سے محفوظ کر دی گئی ہے۔ پس یہ کتاب آخری کتاب ہے اور اس کے لانے والے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

فرشتوں پر ایمان:

فرشتوں پر ایمان یہ ہے کہ انسان یہ عقیدہ رکھے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی فرماں بردار مخلوق ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی مختلف کاموں پر ڈیوٹیاں لگا رکھی ہیں۔ مثلاً حضرت جبرئیل علیہ السلام انبیاء ورسل تک وحی پہنچانے پر مامور تھے۔ حضرت میکائیل علیہ السلام بارش برسانے، بادل کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے پر مامور ہیں۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام روح کو قبض کرنے پر مامو ہیں اور حضرت اسرافیل علیہ السلام قیامت کے دن

صور پھونکنے پر مامور ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ فرشتے جن کو کراماً کاتبین کہا جاتا ہے۔ وہ ہر انسان کے ساتھ ہوتے ہیں، وہ انسانوں کے اعمال کا ریکارڈ تیار کرتے ہیں۔ کچھ فرشتے منکر نکیر کے نام سے جانے جاتے ہیں اور یہ قبر میں سوال و جواب کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ تمام فرشتے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور حکم کی بجا آوری کے لیے تیار رہتے ہیں۔

کتابوں اور صحیفوں پر ایمان:

کتابوں پر ایمان لانا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی کتب یا صحائف انبیاء و رسل پر نازل فرمائے وہ حق ہیں، ان کے احکام صحیح تھے۔ ان میں کوئی بھی جھوٹی بات نہ تھی۔ اب جو کتب و صحائف موجود ہیں قرآن مجید کے سوا ان میں تغیر و تبدیلی کی جا چکی ہے، لیکن اس تغیر و تبدیلی کے باوجود آج بھی جزوی طور پر ان میں جو کلامِ الہیٰ موجود ہے اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ مشہور کتب یہ ہیں:

1: توراۃ۔ 2: انجیل۔
3: زبور۔ 4: قرآنِ مجید۔

توراۃ: حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔
انجیل: حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔
زبور: حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔
قرآنِ مجید: خاتم الانبیاء والرسل احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔

قرآن کریم پر ایمان یہ ہے کہ تسلیم کیا جائے کہ قرآن مجید تمام کتب سے اعلیٰ کتاب ہے۔ اس کے تمام احکام پر عمل کرنا فرض ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم پر نازل فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم نے حرف بحرف اسی طرح امتِ مسلمہ تک پہنچایا۔ اس میں کوئی تبدیلی و تغیر نہیں ہوا اور نہ ہی کبھی ہو سکتا ہے، کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود لی ہے۔

جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم خاتم المرسلین ہیں، اسی طرح قرآن بھی "خَاتَمُ الْکُتُبِ" ہے۔ قرآنِ مجید ایک کامل دین اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ قرآن مجید کے نزول سے دینِ مکمل ہو چکا۔ اسی لیے اب کسی نبی و رسول یا کتاب کی

ضرورت باقی نہیں۔ قرآن مجید پر ایمان اور عمل ہی جنت کی ضمانت ہے۔

عقیدۂ قضاء وقدر:

تقدیر کا مسئلہ بڑا نازک اور اہم ہے۔ تقدیر پر ایمان ہونے سے یہ مراد ہے کہ مخلوق کے ہر فرد کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اپنے ازلی وابدی علم سے لکھا ہے اسے حق وسچ مانا جائے۔

جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ازلی وابدی سے لکھا ہے وہ حق ہے اور وہ کام جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے لکھے ہیں وہی ہم سے صادر ہوتے ہیں۔

اعتراض: اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم مجبور محض ہیں کہ جو کچھ لکھ دیا گیا ہم اسی کو کر سکتے ہیں اس کے خلاف نہیں۔ اگر معاملہ ایسا ہے تو پھر سزا وجزا کیوں۔؟

جواب: یہ مت سمجھیے کہ انسان مجبور محض ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو انسان کو بھی اختیار عطا فرمایا ہے۔ بات کو سمجھنے کے لیے یہ جملہ یاد رکھیے کہ......

> ''جو کچھ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے ہم وہ نہیں کرتے بلکہ جو ہم کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی وابدی علم سے پہلے ہی وہ لکھ دیا ہے۔''

عقیدہ قضاوقدر ایسا اہم اور نازک مسئلہ ہے کہ اس پر بحث کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

عقیدۂ آخرت:

آخرت پر ایمان لانا یہ ہے کہ انسان اس بات کا اعتقاد رکھے کہ ہر شخص کو مرنا ہے اور موت کے بعد قبر کی پرخار وادی سے گزرنا ہے۔ قبر کے بعد حشر کے روز دوبارہ زندہ کیا جاتا ہے اور اللہ کے حضور پیش ہوتا ہے۔ جہاں ایمان کے بعد نیک کام کرنے والوں کو ان کے اعمالِ صالحہ کی جزا (جنت) دی جائے گی اور ایمان لانے کے بعد برے کام کرنے والوں کو سزا دیکر بالآخر جنت عطا کی جائے گی، لیکن بے ایمانوں، کافروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔ نہ تو انہیں نکالا جائے گا، نہ انہیں موت آئے گی اور نہ ہی جہنم سے آزادی ملے گی۔ سارے مسلمان بالآخر جنت میں جمع ہو جائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے اور سارے کافر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل کر دیے جائیں گے۔

کسی عقیدہ کی صحت کی ایک عقلی جانچ یہ بھی ہے کہ اس سے زندگی بہتر شکل اختیار کرتی ہے یا اس میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔؟ اس معیار کو سامنے رکھ کر سوچیں تو انسانی زندگی کا محض اس کرۂ ارضی کے جسمانی دور تک محدود ہونا ایسے نتائج تک پہنچاتا ہے جو فساد اور بگاڑ کے سوا کوئی نتیجہ نہیں دے سکتا۔ اگر زندگی بس یہیں تک ہے اور محض جسمانی ہے تو پھر انسان کے لئے اس سے بڑا کوئی نصب العین نہیں ہوسکتا کہ وہ اس مختصر دور میں اپنی ساری قوتیں زیادہ سے زیادہ فوائد اور لذات حاصل کرنے میں کھپا دے۔ کہیں وہ شرافت کا بہروپ بھرے، کہیں غنڈہ گردی سے کام لے اور کہیں ظلم و جبر کی قوتیں استعمال کرے۔ عقلاً اس کا موقف صرف یہی ہوسکتا ہے کہ وہ جسم و دماغ، دولت و کاروبار، تقریر و تحریر، قیادت و تنظیم، ادب و شعر اور سائنس کی جو بھی قوتیں رکھتا ہو ان کو زیادہ سے زیادہ مفاد حاصل کرنے کے لئے استعمال کرے۔ وہ میکاوٗلی کا پرنس بن کر سحر آفرین نفسیاتی حربوں سے کام لے کر انسانوں کا شکار کرے۔ افراد سے آگے نکل کر یہ تصور تقاضا کرتا ہے کہ ہر طبقہ دوسرے طبقے کے خلاف اور ہر قوم دوسری قوم کے خلاف اور ہر عالمی بلاک دوسرے عالمی بلاک کے خلاف جبر و قوت اور ساز باز کی مختلف ترکیبیں آزما کر اپنے مفاد کی بنیاد دوسروں کے دکھ پر رکھے۔

اسی تصور نے سرمایہ داری سوشلزم کی مصیبتیں پیدا کیں اور اسی نے فلسفہ ارتقاء کے "اصول تنازع" اور "بقائے اصلح" کو اٹل صداقتیں بنادیا۔ جنہیں اختیار کرکے افراد، اقوام اور طبقوں نے لاکھوں انسانوں پر ایسے ایسے عذاب ڈھائے ہیں کہ درندے شرما جائیں۔

جس تصور کے نتیجے میں انسانیت صدیوں سے مصائب کے چکر میں مبتلا ہو اور جس نے امن اور انصاف کھو دی ہو، تاریخ خود عقل انسانی کے سامنے شہادت دیتی ہے کہ وہ قطعی طور پر باطل ہے اور جو نظریات اس سے ہم آہنگ ہوں وہ بھی قابل استرداد ہیں۔

یہی وہ تصور تھا جس نے نمرود اور شداد پیدا کیے، جس نے طاقتور قوموں کو شکاری بنایا، جس نے سیاسی، اقتصادی اور فکری و ثقافتی غلامی کے قلاوے مزدور ملتوں کی گردنوں میں ڈلوائے، جس نے سرمایہ داری اور مزدور سے ناجائز نفع اندوزی کرنا سکھایا اور جس نے اشتراکیت کو اس منزل تک پہنچایا کہ وہ محنت کش انسانوں کو جانوروں کے گلے میں بدل

دے۔ قرآن مجید نے اس تصور کو توڑ کر رکھ دیا اور اس کے بخلاف آخرت کا شعور دلایا۔

قرآن مجید کا تصور آخرت یہ ہے کہ خدا کی طرف سے "اجل مسمّٰی" پوری ہونے پر انسانی دنیا ایک دن ختم کر دی جائے گی اور تمام کے تمام مردہ انسان زندگی کے اس دور میں داخل ہوں گے جس کا آغاز حشر یا بعث بعد الموت سے ہوتا ہے۔ پھر خدا کی عدالت لگے گی اور اس عدالت کے سامنے ہر آدمی کی زندگی کا پورا ریکارڈ پیش ہوگا۔ اس کے مظالم، اس کے ماحول کے تمام عناصر گواہی دیں گے اور پھر فیصلہ صادر ہوگا کہ اس شخص نے زندگی نیکی کی راہ پر گزاری یا بدی اور ظلم کے راستے پر۔ پہلی صورت میں اسے رحمت خداوندی سے نوازا جائے گا اور دوسری صورت میں طویل عذاب ہے۔

یہ عقیدۂ آخرت جس کے تمام پہلوؤں کو قرآن مجید نے تفصیل سے بیان کیا ہے، اس زندگی کو ایک امتحانی زندگی قرار دیتا ہے۔ یہاں ہم ایک امتحان گاہ میں اتارے گئے ہیں اور ہماری جانچ ہو رہی ہے کہ خدا کی عطاء کردہ حیات، علم، قوت واختیار اور اس کی نعمتوں سے ہم کس طرح کے مقاصد کے لئے کیا کام لیتے ہیں۔؟ یہ تصور امتحان ایمان وتقویٰ کی راہ اختیار کرنے کا محرک بھی بنتا ہے اور بدی کی قوتوں کے خلاف کشمکش کرنے اور راستی اور نیکی کے خدائی نظام کو برپا کرنے کی جدوجہد کا درس بھی دیتا ہے۔ اس عقیدے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دوسروں سے محبت کرو اور اس کی خدمت انجام دو۔ نہ یہ کہ ان پر ظلم کرو اور ان سے ناجائز فائدے اٹھاؤ۔ یہ عقیدہ آدمی کے سینے میں ایک پولیس چوکی، ادارۂ احتساب اور ایک نظام عدالت قائم کر دیتا ہے جو اسے تنہائیوں میں بھی نیکی پر قائم رہنے کے رضا کارانہ جذبے سے آراستہ کرتا ہے۔

اسلامی تصور آخرت اگر ہمارے سامنے نہ ہو تو ایسے مسائل پیدا ہوتے ہیں کہ جن کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔

وہ شخص جس نے ساری عمر ظلم ومعصیت میں گزار کر ہزار ہا انسانوں کو مصائب کا شکار بنایا ہے اس کو آخر کون پوچھنے والا ہے؟ کسی استعمار یا آمریت کے علمبردار جو قوموں کی قوموں کو خونریزی اور جبر وتشدد کے تلخ تجربوں سے گزارتے ہیں آخر کونسا دنیوی اقتدار، قانون اور عدالتی نظام ان کے ایک ایک فعل اور اس کے اثرات کا احاطہ کر کے انہیں کما حقہ

پوری سزا دے سکتا ہے۔؟

اسی طرح وہ شخص یا گروہ جو نوع انسانی کو سچائی اور نیکی سے بہرہ مند کرنے اور ان کی بہترین خدمات انجام دینے کے لئے عمروں قربانیاں دیتا ہے، کونسی حکومت اور اس کے ذرائع و وسائل اسے پوری پوری جزا دے سکتے ہیں۔؟

قرآنی تصور حیات کو چھوڑ دینے سے ایسا خلا پیدا ہوتا ہے کہ زندگی عقل کی نگاہ میں لایعنیت بن جاتی ہے اور زندگی کو لایعنی ماننے کے بعد انسان کا اچھا انسان بننا ناممکن ہے۔

بہت سے لوگ اس بات پر حیران ہوتے ہیں کہ ایک ایسا شخص جو سائنسی اور عقلی مزاج رکھتا ہو، کس طرح موت کے بعد زندگی پر یقین کو قبولیت کا درجہ دے سکتا ہے۔؟ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ آخرت پر کسی شخص کا یقین، اس کے اندھے عقیدے کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔

تاہم آخرت پر مسلمانوں کا یقین عقلی دلائل کی بنیاد پر ہے۔ قرآن مجید کی ایک ہزار سے زائد آیات ایسی ہیں جن میں سائنسی حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ گزشتہ چند صدیوں کے دوران قرآن مجید میں بیان کردہ بہت سے حقائق دریافت ہو چکے ہیں، لیکن سائنس ابھی اتنی ترقی یافتہ نہیں ہوسکی ہے کہ قرآن مجید میں بیان کردہ تمام حقائق کی تصدیق کر سکے۔

اب ذرا فرض کیجئے کہ اگر قرآن پاک میں بیان کیے گئے اسی فیصد حقائق سو فیصد درست ثابت ہو گئے ہیں، باقی کے بیس فیصد حقائق کے بارے میں سائنس نے کوئی واضح نتیجہ اخذ نہیں کیا ہے کیونکہ سائنس ابھی تک اتنی ترقی یافتہ نہیں ہو سکی کہ قرآن میں بیان کردہ باقی حقائق کو صحیح یا غلط ثابت کر سکے۔ اس محدود علم کے ساتھ، جو ہمارے پاس ہے، ہم پورے وثوق سے یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ اس بیس فیصد حصے کا بھی صرف ایک فیصد حصہ یا کوئی ایک آیت ہی غلط ہے۔ لہٰذا جب قرآن مجید کا اسی فیصد حصہ (عقلی بنیادوں پر) سو فیصد درست ثابت ہو چکا ہے اور باقی کا بیس فیصد حصہ غلط ثابت نہیں کیا جا سکا تو منطق یہی کہتی ہے کہ وہ بیس فیصد حصہ بھی درست ہے۔

آخرت کا وجود جسے قرآن مجید نے بیان کیا ہے، اسی بیس فیصد مبہم حصے میں شامل ہے

جو منطق کی رو سے صحیح ہے۔

ڈکیتی اچھا عمل ہے یا برا؟ اس سوال کے جواب میں کوئی بھی نارمل اور متوازن شخص بھی کہے گا کہ یہ برا عمل ہے، لیکن اس سے بھی اہم سوال یہ کہ کوئی ایسا شخص جو آخرت پر یقین نہ رکھتا ہو، وہ کسی انتہائی طاقتور اور اثر ورسوخ والے مجرم کو کیسے قائل کرے گا کہ ڈاکے ڈالنا ایک برائی، ایک گناہ ہے۔؟

فرض کیجئے کہ میں دنیا کا سب سے طاقتور اور اثر ورسوخ والا مجرم ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ میں نہایت ذہین اور منطقی شخص بھی ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ڈاکے ڈالنا بہت اچھا ہے کیونکہ اس سے مجھے اپنی پر تعیش زندگی گزارنے میں مدد ملتی ہے۔ لہٰذا میرے لیے تو ڈاکہ زنی بہت اچھا عمل ہے۔

اگر کوئی میرے سامنے اس بات کے حق میں ایک منطقی دلیل بھی پیش کر دے (جو میرے لیے بھی یکساں طور پر قابل قبول ہو) کہ ڈاکہ ڈالنا برا ہے۔ تو میں فوراً یہ کام چھوڑ دوں گا۔ اس کے جواب میں لوگ عموماً درج ذیل دلائل دیتے ہیں:

بعض لوگ یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ لٹنے والے شخص کو مشکلات کا سامنا ہوگا۔

یقیناً میں اس بات سے اتفاق کروں گا کہ لٹنے والے فرد کے حق میں ڈاکہ زنی کا عمل بہت برا ہے، لیکن میرے لیے تو بہر حال یہ اچھا ہے۔ اگر میں ہزار ڈالر کی ڈکیتی ماروں تو میں کئی مہینے فائیو سٹار ہوٹل میں مزے سے کھانا کھا سکتا ہوں۔

کچھ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی دن کوئی دوسرا ڈاکو آپ کو بھی لوٹ سکتا ہے، لیکن میں تو خود بہت اثر ورسوخ والا مجرم ہوں اور میرے سینکڑوں باڈی گارڈ ہیں تو پھر بھلا کوئی دوسرا مجھے کیسے لوٹ سکتا ہے؟ یعنی میں تو دوسروں کو لوٹ سکتا ہوں مگر مجھے کوئی نہیں لوٹ سکتا۔ ڈاکہ زنی ایک عام آدمی کے لئے تو پر خطر پیشہ ہو سکتا ہے مگر مجھ جیسے طاقتور اور بااثر شخص کے لیے نہیں۔

ایک دلیل یہ بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ کسی نہ کسی دن آپ کو پولیس گرفتار کر لے گی۔

ارے بھئی! پولیس تو مجھے گرفتار ہی نہیں کر سکتی! پولیس کے چھوٹے بڑے افسران سے لے کر حکومتی وزراء تک میرے پے رول پر ہیں۔ میرے نمک خوار ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ

اگر کوئی عام آدمی ڈاکہ ڈالے تو وہ گرفتار کر لیا جائے گا اور ڈاکہ زنی اس کیلئے بری ثابت ہوگی لیکن میں تو غیر معمولی طور پر بااثر اور طاقتور مجرم ہوں۔ مجھے کوئی ایک منطقی دلیل دیجئے کہ یہ عمل برا ہے تو میں ڈاکہ زنی چھوڑ دوں گا۔

ایک اور دلیل یہ بھی آسکتی ہے کہ یہ بغیر محنت کے یا کم محنت سے کمائی گئی آمدنی ہے جس کے حصول کیلئے بہت مشقت نہیں کی گئی ہے۔

میں مانتا ہوں کہ ڈاکہ زنی کی کمائی میں کچھ خاص محنت کیے بغیر اچھی خاصی رقم ہاتھ لگتی ہے اور یہی تو میرے ڈاکے ڈالنے کی بڑی وجہ بھی ہے۔ اگر کسی شخص کے سامنے زیادہ پیسہ کمانے کا آسان اور باسہولت راستہ ہو اور وہ راہ بھی ہو کہ جس سے پیسہ کمانے میں اسے بہت زیادہ محنت کرنا پڑے، تو منطقی ذہن رکھنے والا کوئی بھی شخص آسان راستے ہی کا انتخاب کرے گا۔

بعض لوگ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکہ زنی انسانیت کے خلاف ہے اور یہ کہ ایک شخص کو دوسرے انسانوں کا خیال کرنا چاہیے۔ اس کا رد کرتے ہوئے میں یہ سوال کروں گا کہ "انسانیت" کہلانے والا یہ قانون کس نے لکھا ہے اور میں اس کی پاسداری کس خوشی میں کروں۔؟

یہ قانون کسی جذباتی اور حساس قسم کے انسان کیلئے تو اچھا ہو سکتا ہے لیکن میں منطقی انسان ہوں اور مجھے دوسرے انسانوں کی پروا کرنے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔

کچھ لوگ ڈاکہ زنی کو خود غرضانہ عمل بھی قرار دے سکتے ہیں۔ یہ بالکل سچ ہے کہ ڈاکہ زنی ایک خود غرضانہ عمل ہے لیکن میں خود غرض کیوں نہ بنوں۔؟ اسی سے تو مجھے زندگی کے مزے اڑانے میں مدد ملتی ہے۔

لہٰذا، ڈاکہ زنی کو برا عمل ثابت کرنے کی غرض سے دیئے گئے تمام عقلی دلائل بے سود رہتے ہیں۔ ان دلائل سے ایک عام اور کمزور انسان کو تو قائل کیا جا سکتا ہے مگر مجھ جیسے طاقتور اور بااثر شخص کو نہیں۔ ان میں سے کسی ایک دلیل کا دفاع بھی عقل اور منطق کی طاقت پر نہیں کیا جا سکتا۔

لہٰذا اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ دنیا میں بہت جرائم پیشہ افراد پائے جاتے

ہیں۔ اسی طرح دھوکہ دہی اور زنا جیسے جرائم، مجھ سے کسی شخص کیلئے اچھے ہونے کا جواز پا سکتے ہیں اور کوئی منطقی دلیل مجھے اس کے برا ہونے پر قائل نہیں کر سکتی۔

چلیے! اب ہم جگہیں بدل لیتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ آپ دنیا کے طاقتور ترین اور بااثر مجرم ہیں، جس کے پے رول پر پولیس کے سپاہی سے لے کر وزراء تک سب موجود ہیں۔ آپ کے پاس اپنی حفاظت کیلئے ٹھگوں کی ایک پوری فوج ظفر موج ہے۔ میں ایک مسلمان ہوں جو آپ کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ عصمت دری، ڈاکہ زنی اور دھوکہ دہی وغیرہ برے اعمال ہیں۔

اگر میں وہی تمام دلائل (جو پہلے دیئے جا چکے ہیں) ڈاکہ زنی کو برا ثابت کرنے کے لیے پیش کروں تو مجرم بھی اسی انداز سے جواب دے گا جیسے میں نے پہلے کیا تھا۔

میں مانتا ہوں کہ مجرم ذہین ہے اور منطقی سوچ رکھتا ہے اور اس کے تمام دلائل صرف اسی وقت صحیح ہوں گے جب وہ دنیا کا سب سے طاقتور اور بااثر مجرم ہو۔

ہر ایک انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے انصاف ملے۔ حتیٰ کہ وہ دوسروں کے لئے انصاف کا خواہش مند نہ بھی ہو تب بھی وہ اپنے لیے انصاف چاہتا ہے۔ بعض لوگ طاقت اور اثر و رسوخ کے نشے میں اس قدر بدمست ہوتے ہیں کہ دوسروں پر صعوبتیں اور تکالیف مسلط کرتے رہتے ہیں، لیکن یہی لوگ اس وقت شدید اعتراض کرتے ہیں کہ جب خود ان کے ساتھ کوئی ناانصافی کی جائے۔ ان کے دوسرے لوگوں کی تکالیف اور صعوبتوں کی طرف سے بے حس ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ طاقت اور اثر و رسوخ کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ طاقت اور اثر و رسوخ ہی ہے جو نہ صرف انہیں دوسروں سے ناانصافی کرنے کے قابل بناتا ہے بلکہ دوسروں کو ان کے ساتھ ویسا ہی کرنے سے باز بھی رکھتا ہے۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے میں اس مجرم کو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے وجود پر قائل کروں گا۔ (اس بارے میں دلائل علیحدہ ہیں) اللہ تعالیٰ آپ سے بھی کہیں زیادہ طاقتور ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ منصف ترین بھی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

"ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ وان تک حسنۃ یضعفھا و یوت من لدنہ اجرا عظیما○

(القرآن المجید، پارہ نمبر 5، سورۃ نمبر 4 (النساء)، آیت نمبر 40)

الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور o"

(القرآن المجید، سورۃ نمبر 3 (آل عمران)، آیت نمبر 185)

"آخر کار ہر شخص کو مرنا ہے اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو، کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے، رہی یہ دنیا تو یہ محض ایک ظاہر فریب ہے۔"

حتمی انصاف قیامت کے روز کیا جائے گا۔ مرنے کے بعد ہر شخص کو یوم حساب (روز قیامت) ایک بار پھر دوسرے تمام انسانوں کے ساتھ زندہ کیا جائے گا۔ یہ ممکن ہے کہ ایک شخص اپنی سزا کا کچھ حصہ اس دنیا ہی میں بھگت لے، لیکن سزا اور جزا کا آخری اور حتمی معاملہ تو آخرت ہی میں کیا جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی لٹیرے یا بدکار کو اس دنیا میں سزا نہ دے لیکن اسے روز محشر اپنے ایک ایک عمل کا اور ایک ایک گناہ کا حساب چکانا ہوگا اور وہ آخرت (موت کے بعد کی زندگی) میں اپنے ایک ایک جرم کی سزا پائے گا۔

جنگ عظیم کے دوران ہٹلر نے لگ بھگ ساٹھ لاکھ یہودیوں کو زندہ جلوایا تھا۔ بالفرض اگر پولیس اسے گرفتار بھی کر لیتی تو قانون کی پاسداری کرتے ہوئے (انسانی قانون کے مطابق) عدالت اسے زیادہ سے زیادہ کیا سزا دے سکتی تھی؟ بہت سے بہت یہی ہوتا کہ اسے بھی کسی گیس چیمبر میں بند کر کے ہلاک کر دیا جاتا، لیکن یہ تو صرف ایک بے گناہ یہودی کو قتل کرنے کی سزا ہوتی، باقی کے 5999999 یہودیوں کے قتل کی سزا اسے کس طرح دی جاسکتی تھی۔؟ اسے صرف ایک بار ہی سزائے موت دی جاسکتی تھی۔

اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے کہ وہ ہٹلر کو جہنم کی آگ میں ساٹھ لاکھ سے بھی زیادہ مرتبہ جلا دے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

"ان الذین کفروا بایتنا سوف نصلیھم نارا کلما نضجت جلودھم بدلنھم جلودا غیرھا لیذوقوا العذاب ان اللہ کان عزیزا حکیماo"

(القرآن الکریم، پارہ نمبر 5، سورۃ نمبر 4 (النسآء)، آیت نمبر 56)

"جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو ماننے سے انکار کر دیا انہیں بالیقین ہم آگ

لئے یکسو ہو جائیں اور اس پر خود جم جائیں اور اسے معاشرے میں بھی غالب کرنے کی جدوجہد کریں۔

تصورِ عبادت:

اسلام کا تصور عبادت دوسرے محدود مذاہب سے مختلف ہے۔ اسلامی تصور عبادت صرف اتنا نہیں ہے کہ خاص انفرادی دائرے میں پوجا پاٹ کے چند مقررہ طریقوں کو پورا کر دیا جائے گا بلکہ یہاں کا تصور عبادت پوری زندگی کو محیط ہے۔

اسلام کے نزدیک زندگی کا ہر فعل خواہ وہ فرد سے تعلق رکھتا ہو یا خاندان سے، معاشرے سے یا ریاست سے، مسجد کے اندر کی ذمہ داریوں سے یا کھیت سے، کارخانے وبازار سے تعلق رکھتا ہو یا دفتر کے مشاغل سے، بال بچوں کے معاملات سے یا تھانے، کچہری اور اسمبلی کی سرگرمیوں سے، اگر اسے خدا کے احکام وحدود کے تحت انجام دیا جائے تو وہ عبادت کے دائرے میں ہے۔ بصورت دیگر معصیت کے دائرے میں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہ کر بال بچوں کے نفقہ کا انتظام کرنا، ازدواجی تعلقات استوار کرنا، امارت وقیادت کے منصب پر فائز ہونا، میدان جنگ میں حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا، عدالت کی کرسی سے حق کے مطابق فیصلے دینا اور صدق ودیانت کے ساتھ تجارت کرنا بھی عبادت کی وسیع تعریف میں داخل ہے۔

عبادت ہی کے تصور کے مطابق قرآن مجید نیکی کا جامع تصور دلاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ رسوم کا بیرونی خول اصل نیکی نہیں بلکہ اصل نیکی اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اور پھر اس ایمان کے تقاضے پورے کرنا ہے۔ چاہے نماز سے لے کر میدان جہاد تک۔!

نصب العین:

اسلام انسانی زندگی کو ایک بے مقصد کھیل تماشے کی حیثیت نہیں دیتا، بلکہ بامقصد کائنات میں رہنے والی مخلوق کو بھی وہ ایک اعلیٰ نصب العین سے بہرہ مند کرتا ہے۔ وہ نصب العین امت وسط، شہداء علی الناس اور حزب اللہ ہونے کے منصب جلیلہ پر ساری دنیا کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینا ہے، وہ بھی کسی ذاتی غرض اور کسی گروہی مفاد سے بالاتر ہو کر۔!

ہمارے لئے قرآن مجید کا عطا کردہ مقصد حیات یہ ہے کہ ہم جس مقام پر بھی ہوں، جس حیثیت کے مالک بھی ہوں، جیسی صلاحیتیں بھی رکھتے ہوں اور جس پیشے میں بھی مصروف ہوں ہماری تمام سرگرمیوں کا مقصود ساری دنیا تک اصلاح کا وہ پیغام بذریعہ قول و عمل پہنچانا ہے جس پر قرآن مجید مشتمل ہے۔

تمام قومی منافرتیں، تمام نسلی عصبیتیں، تمام لسانی اور لونی دیواریں ہٹادی گئی ہیں اور تمام دوسرے مفاد و مقاصد کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا گیا ہے۔ قرآن مجید پر ایمان لانے والے کا ایک ہی مقصد ہے کہ وہ ہر شخص، ہر گروہ، ہر قوم اور ساری انسانیت کو قرآنی نظام عدل و احسان کے قریب لائے۔

اس قسم کے بلند، پاکیزہ اور اخلاقی نصب العین سے جو لوگ محروم رہ گئے ہیں ان کے سامنے دولت پرستی، نفس پرستی، جاہ پرستی اور جنس پرستی کے علاوہ دلچسپی کا کوئی اور عنوان ہی باقی نہیں رہا اور اس بیماری میں مبتلا اقوام اور تحریکوں کا حال یہ ہے کہ وہ جارحیت، بے علمی و عملی اور بداخلاقی کو تیزی سے فروغ دے رہی ہیں۔

باب نمبر 5:

اسلام کی عدالتی وسیاسی تعلیمات

عدالت وسیاست:

کائنات عالم کا محکم نظام عجیب ترتیب کے ساتھ قائم ہے۔ قرآن مجید میں بنظر غائر دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں سات سو بیس کے قریب آیتیں نظام کون اور ترتیب کائنات میں مشاہدہ ونظر کرنے کے باب میں وارد ہوئی ہیں اور دو پچاس آیتیں احکام شرعیہ کے بارے میں آئی ہیں۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ انسان نظم عالم اور اس کے حسن سلیقہ کو دیکھ کر قوانین الٰہیہ کو جو اس عالم میں جاری وساری ہیں اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں نافذ کرے۔ اپنے تمام حالات واعمال کو ایک نظام کے ساتھ چلائے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک ایسے خلیفہ وامیر کو پیدا کرتا ہے جو مخلوق خداوندی میں حکومت الٰہیہ کو نافذ کرتا ہے اور قدرتی قوانین کو جاری کرے۔ اسی لئے کہا گیا ہے:

"بادشاہ پر تو خداوندی ہے۔"

اعتدال اور نظام ہی کے ساتھ آسمان وزمین اپنی جگہ قائم ہیں۔ قرآن مجید نے اجتماعی نظام کے معاملات کو عدل قائم کرنے اور مخلوق کے سیاسی امور کو خوش اسلوبی سے انجام دینے پر منحصر قرار دیا ہے۔ مادی وادبی ضروریات کے مطابق سیاسی امور کو انجام دینا اور مختلف مصلحتوں کی نگہداشت کرنا رعایا اور بادشاہ کا فریضہ ہے۔ اجتماعی نظم قائم کرنا، امن عامہ کو پھیلانا، سوسائٹی میں دولت وثروت کے راستوں کو ہموار کرنا، قانونی وشرعی نقطۂ نظر سے عادلانہ قضاء کی میزان کو برقرار رکھنا، مملکت کی طرف سے مدافعانہ تیاریاں، علم وعلماء کی حوصلہ افزائی، علوم ومعارف کی نشر واشاعت میں اسباب سہولت کی فراوانی اور رعایا کے درمیان امر بالمعروف ونہی عن المنکر یہ تمام وہ حقوق وواجبات ہیں جو اسلام کی نظر میں

حکومت کے لیے ضروری اجزاء وعناصر ہیں۔ جن پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے آمادہ کیا اور انہی کے لیے قرآن مجید نازل ہوا۔ اس لحاظ سے امن کو پھیلانے اور انسانیت کے مفاد کو پیش نظر رکھنے کو شریعت اسلامیہ نے حکومت کے آدابِ وضروریات میں سے قرار دیا ہے۔

نظامِ عدالت کے قیام ہی سے رعایا کے احوال منظم ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں مختلف حالات وامور میں اور تمام معاملات وحقوق میں میزانِ عدل کو قائم وبرقرار رکھنے پر زور دیا ہے۔

اسی لیے اسلامی سوسائٹی کے نظام اور اس کے آداب وقوانین میں قاضیوں، والیوں اور دیگر کارندوں کو اہل علم وتقویٰ سے انتخاب کرنا واجب ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے:

''ان اللہ یحب البصر الناقد عند ورود الشبہات ویحب العقل الکامل عند حلول الشہوات''

''اللہ تعالیٰ اس مبصر اور ناقد کو پسند کرتا ہے جو شکوک وشبہات کے پیدا ہونے کے وقت اپنی نقد وبصیرت سے ان کو جانچتا اور پرکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پختہ کار دانش مند کو دوست رکھتا ہے جو خواہشات نفسانی کے پیدا ہونے کے وقت عقل وتجربہ سے کام لیتا ہے۔''

رشوت کا لین دین، سود اور ناجائز طریقہ سے لوگوں کا مال کھانا اسلام کی نظر میں حرام ہے۔ اگر باطل کی طرف داری میں کسی کا مال کھایا جائے تو وہ ایسا بدترین ظلم وستم ہوگا جس کا مرتکب اللہ کے عذاب سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ اسی طرح وہ مال بھی حرام ہے جس کو ایک محکوم حاکم کے لیے بطور ہدیہ پیش کرتا ہے۔ یہ کھلم کھلا رشوت ہے۔

صحیح بخاری ومسلم میں ابوحمید ساعدی سے ایک روایت آئی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ ازد کے ایک شخص ابن اللتبیہ کو صدقہ وصول کرنے پر مقرر کیا۔ جب وہ آیا تو کہنے لگا:

''یہ صدقہ ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے۔''

آنحضرت نے فرمایا:

"اس شخص کو کیا ہو گیا ہے؟ جس کو ہم ایسے کام پر جس کا اللہ نے ہمیں والی بنایا ہے۔ کارندہ بنا کر بھیجتے ہیں تو کہتا ہے: "یہ تمہارا مال ہے اور یہ مجھے ہدیہ میں دیا گیا ہے؟ کیوں نہیں وہ اپنے باپ یا اپنی ماں کے گھر بیٹھ رہے اور پھر دیکھے کہ اس کی طرف ہدیہ بھیجا جاتا ہے یا نہیں؟ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! اس مال میں سے وہ جو کچھ لے گا تو قیامت کے دن اس کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے آئے گا۔ اگر وہ اونٹ ہو گا تو آواز کرے گا۔ اگر وہ گائے ہو گی تو آواز کرے گی اور اگر وہ بکری ہو گی تو چلائے گی۔"

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے یہاں تک کہ ہم کو آپ کی بغل نظر آنے لگی اور عرض کیا:

"خداوندا! کیا میں نے اپنا پیغام پہنچا دیا۔؟"

بدباطن کارندوں کا رشوت لینا اور امور حکومت میں خیانت کرنا حکومت کے ادارہ کو فاسد اور رعایا کی مصلحتوں کو بگاڑنے کا بڑا سبب ہے۔ اس لئے عاملوں اور کارندوں کو دیکھ بھال کر انتخاب کرنا ضروری ہے اور ان کو ایک ضابطہ اور نظام میں منسلک کرنا لازمی ہے۔

قیام مملکت کے اصول میں سے ملک کی حفاظت اور مملکت اور قوم کی داخلی و خارجی مدافعت کے لیے لشکر کی تنظیم بھی ہے۔ قرآن مجید کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

"وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ"

"اور تیار کرو تم ان کے لیے جو کچھ تم کر سکو قوت سے اور گھوڑے باندھنے سے۔ ڈراؤ گے تم اس کے ذریعہ اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ دوسروں کو جن کو تم نہیں جانتے، اللہ ان کو جانتا ہے۔"

(سورۃ الانفال، آیت نمبر 60)

اس بنا پر امت اسلامیہ کے شایان شان یہ ہے کہ فنون عسکریہ میں مہارت حاصل کرے اور بہترین عملی تدابیر کرنے میں احتیاط اور دوراندیشی کے دامن کو کبھی ہاتھ سے

"اللہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا اگر کوئی ایک نیکی کرے تو اللہ اسے دوگنا کرتا ہے اور پھر اپنی طرف سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔o"

منطقی اور سائنسی شخص ہونے کے ناطے جب اس کے سامنے قرآن مجید سے دلائل پیش کیے جاتے ہیں تو وہ انہیں تسلیم کر کے اللہ تعالیٰ کے وجود کا اقرار کر لیتا ہے۔ وہ سوال کر سکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ سب سے طاقتور اور سب سے زیادہ انصاف کرنے والا ہے تو پھر وہ مجھے سزا کیوں نہیں دیتا۔؟

ہر وہ شخص، جس کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہو، یقیناً یہ چاہے گا کہ ناانصافی کے مرتکب کو اس کے مال و دولت اور معاشرتی مرتبے کا لحاظ کیے بغیر سزا ملنی چاہیے۔ ہر نارمل انسان یہ چاہے گا کہ ڈاکو اور بدکار کو سبق سکھایا جائے۔ اگرچہ بہت سارے مجرموں کو سزا مل جاتی ہے لیکن پھر بھی ان کی ایک بڑی تعداد قانون سے بچنے میں کامیاب رہتی ہے۔ یہ لوگ بڑی پر لطف اور پر تعیش زندگی گزارتے ہیں اور بسا اوقات بڑے اطمینان سے رہتے ہیں۔ اگر کسی طاقتور اور بااثر شخص کے ساتھ اس سے بھی زیادہ بااثر اور طاقتور شخص ناانصافی کرے تو وہ بھی یہی چاہے گا کہ اس زیادہ طاقتور اور زیادہ بااثر شخص کو (جس نے ناانصافی کا ارتکاب کیا ہے) سزا دی جائے۔

دنیا کی یہ زندگی، آخرت کے لئے امتحان ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

"الذی خلق الموت والحیاۃ لیبلو کم ایکم احسن عملا وھو العزیز الغفورo"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 29، سورۃ نمبر 67 (الملک)، آیت نمبر 2)

"اللہ وہ ہے جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی۔o"

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

"کل نفس ذائقۃ الموت وانما توفون اجورکم یوم القیمۃ فمن زحزح عن النار وادخل الجنۃ فقد فاز وما

میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ
دوسری کھال پیدا کر دیں گے تا کہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں، بیشک اللہ
قدرت والا حکمت والا ہے۔o"
یعنی اللہ تعالیٰ چاہے تو ہٹلر کو جہنم کی آگ میں محض ساٹھ لاکھ مرتبہ نہیں بلکہ لاتعداد بار جلا سکتا ہے۔

یہ واضح رہے کہ کسی شخص کو تصورِ آخرت یا موت کے بعد زندگی کے یقین پر قائل کیے بغیر اسے انسانی اقدار یا نیک و بد اعمال کے تصور پر قائل کرنا بھی ممکن نہیں۔ خصوصاً جب ان طاقتور اور بااختیار لوگوں کا معاملہ درپیش ہو جو نا انصافی میں پڑے ہوں۔

دین:

اسلام کی اساسی تعلیمات میں سے ایک یہ ہے کہ چونکہ دین نام ہے پوری زندگی بسر کرنے کے انداز و اطوار کا اور اس کے مفہوم میں مسلکِ حیات اور نظامِ حیات کے تصورات شامل ہیں۔ اس لئے انسان بیک وقت کسی ایک ہی دین کا پیرو ہو سکتا ہے۔ وہ دینِ حق پر چلے گا یا دینِ باطل پر، وہ خدا پرستی کی راہ اختیار کرے گا یا خدا فراموشی کی اور وہ ایماندار ہو گا یا کفر کیش۔

ہر نظریہ اور فلسفہ ایک خاص قسم کے دین کی بنیاد ہوتا ہے اور ہر قوم اور ہر فرد کی زندگی جس نقشے پر بسر ہو رہی ہے وہی اس کا دین ہے۔

ہماری کتابِ ہدایت (قرآن مجید) میں خدا نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ تمہارے لئے قرآنی تصورِ آخرت کو چھوڑ دینے سے ایسا خلا پیدا ہوتا ہے کہ زندگی عقل کی نگاہ میں لایعنیت بن جاتی ہے اور زندگی کو لایعنی ماننے کے بعد انسان کا اچھا بننا ناممکن ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"میں نے تمہارا خالق، مالک، حاکم اور ہادی ہونے کی حیثیت سے اسلام کو تمہارا دین مقرر کر دیا ہے اور اس کے خلاف جس بھی نظامِ زندگی کو اختیار کیا جائے گا وہ خدا کی بارگاہ (اور عدالتِ آخرت) میں جائز (Valid) تسلیم نہیں کیا جائے گا۔"

پس قرآن کا مطالبہ خدا پرستوں سے یہ ہے کہ وہ ہر طرف سے منہ موڑ کر دینِ حق کے

جانے نہ دے۔ قرآن مجید نے اس کے لیے بہترین اصول یہ ارشاد فرمایا ہے:

"اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ"

"اللہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کے راستہ میں صف باندھے ہوئے لڑتے ہیں گویا کہ وہ مضبوط دیوار ہیں۔"

(سورۃ الصف، آیت نمبر 4)

فوج کی تنظیم کا مظاہرہ اور مجاہدین کی مادی تیاریاں اس امر کی متقضی ہیں کہ لشکر کے لیے غذائی رسد فراہم کی جائے، عسکری زیب وزینت اور شان وشوکت کو بڑھانے کے لیے بہترین اسلحہ وآلات اور پوشاک سے آراستہ کیا جائے۔

امام طرطوسی اپنی کتاب سراج الملوک میں لشکری فضیلت اور اس کی اصلاح کی طرف توجہ کرنے کی ترغیب میں فرماتے ہیں:

"لشکر ملک کا قلعہ، فصیل اور ساز وسامان ہے۔ یہی لوگ بسیط محافظ ہیں اور بیرونی واندرونی خرابیوں کی روک تھام کرنے والے اور مدافعانہ تدبیر کرنے والے ہیں۔ یہی لوگ حوادث کا مقابلہ کرتے اور فصیلوں کی نگرانی کرتے ہیں۔"

حکومت الٰہیہ کی تشکیل:

قبل اس کے کہ ہم حکومت الٰہی کے مفہوم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس جدوجہد پر روشنی ڈالیں جو آپ نے حکومت الٰہیہ کی تشکیل میں صرف کی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وحدت ریاست اسلامیہ کو چند مختصر الفاظ میں بیان کر دیں۔

وحدت ریاست اسلامیہ سے مراد تمام عالم اسلامی کا ایک ہی اسلامی رئیس کے جھنڈے کے نیچے زبان اور دل کے ساتھ جمع ہونا ہے۔ اس نیت اور عہد وپیمان کے ساتھ کہ احکام واوامر الٰہی کے دائرہ میں حسب طاقت بشری اس کی اطاعت ومحبت کو لازمی گردانا جائے گا تاکہ اس کے ذریعے دنیا میں قوانین اسلامیہ اور نوامیس الٰہیہ کو نافذ کیا جا سکے، طاغوتی حکومتوں کو زیر اور ایمانی قوتوں کو اجاگر کیا جائے۔ بمصداق اس آیت خداوندی کے

اعتصام واطاعت ضروری ہے:

"وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا"

"اللہ کی رسی کو سب کے سب مضبوطی سے تھام لو اور پراگندہ نہ ہو جاؤ۔"

(سورۃ آل عمران، آیت نمبر 102)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا:

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ"

(سورۃ النساء، آیت نمبر 59)

"خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے امیروں کی۔"

اس کا مفہوم یہ ہے کہ دین اسلامی محض عبادت کا دین نہیں ہے بلکہ اس کے ایک بازو میں دنیوی نظام اور دوسرے بازو میں اخروی نظام رکھا ہوا ہے۔ ان دونوں نظاموں کو کتاب وسنت کی روشنی میں چلانے کے لیے پیشوائے عظام کی ضرورت ہے، تا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چل کر اُمت کے افراد کو بھی چلنے کی دعوت دیں۔ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادات اسلامی مثلاً جمعہ، عیدین، زکوٰۃ، حج اور جہاد وغیرہا میں ہر زمانہ اور ہر حال میں امت پر یکجہتی اور وحدت دینی کا فریضہ عائد کیا ہے۔ دوسری طرف دنیوی امور میں مثلاً لشکر کی تیاری، دین کی مدافعت، دشمنوں سے جنگ، حکومت الٰہیہ کے قیام، اعلاء کلمۃ اللہ، مسلمانوں کے درمیان اختلافات ومناقشات کے ازالہ کے لیے متحدہ اقدام اور مرکزی ارادہ کی ضرورت ہے۔ ان تمام مقاصد کو انجام دینے کے لیے ایک ایسے امیر کی ضرورت ہے جو قوت ارادی کا مالک، اسلامی تعلیمات سے متصف اور قرآنی افکار ونظریات پر حاوی ہو۔

حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے آنحضرت ﷺ کی جدوجہد:

آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت الٰہیہ کے قیام اور اس کی تشکیل کے لیے جو جدوجہد اور سعی فرمائی وہ سیاست دانوں، حکمرانوں اور قائدین کے لیے ہر اصلاحی واخلاقی نظام کے لیے نمونہ اور مثال ہے اور جن میں انسانوں کی فلاح وبہبود کے راز مضمر ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس قسم کے سیاست دان دور اندیش اور مال کار واقع ہوئے تھے اور جو کامرانی وفتح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیب ہوئی وہ نہ کسی شخص کو حاصل ہوئی اور نہ آئندہ ہوگی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی یہی وہ اعلیٰ ترین خصوصیت ہے۔ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکومت الٰہیہ کو دنیا میں رائج کرنے کے لیے ایک بے نظیر ہستی تصور کیے جاتے ہیں۔ اس پہلو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء ومرسلین میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مدینہ میں زیادہ نمایاں حیثیت رکھتی ہے، جہاں کے احوال کا اقتضایہ ہے کہ وہاں کا زعیم وقائد امت کا نبی ہو۔ سیاسی اور اجتماعی زندگی کے متعلق اسلامی شریعت کے اصول واحکام جس قدر تفصیل ووسعت کے ساتھ مدینہ میں وقوع پذیر ہوئے اس قدر مکہ میں نہیں تھے بلکہ یہاں تبلیغ ودعوت کی ابتداء تھی۔ لوگوں کو اللہ کی حقیقت سے روشناس کرانے اور ان کو قیامت' حشر ونشر اور حساب ومیزان سے خبردار کرنے پر پوری قوت صرف کی گئی۔ اس طرح دو مختلف مقامات میں دعوت وتبلیغ کا کام انجام دینے کی وجہ سے بعض غیر اقوام کے مصنفین ومورخین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی ومدنی دو شخصیتیں تصور کرنی پڑیں۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ مکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں اور مدینہ میں حکمراں اور بادشاہ۔

اگر یہ لوگ اس وہم وگمان کو چھوڑ کر انصاف کی نظر سے دیکھتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں وعظ وتبلیغ فرماتے ہیں' وہی مدینہ میں اس قدر عبادت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک طویل وقفہ تک دربار الٰہی میں مصروف ہونے کی وجہ سے متورم ہو جاتے ہیں۔ یہ وہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس حالت میں ہوتی ہے کہ دولت کے ڈھیر کے مالک ہیں لیکن آپ کا بکتر ایک یہودی کے پاس رہن ہے۔

بلکہ یہ لوگ مشاہدہ کریں گے کہ طائف کے ان اوباشوں' آوارہ منش لوگوں اور غلاموں کے حق میں جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیچھا کیا' مذاق اڑایا اور پتھروں سے زخمی کیا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مقام پر بیٹھنے بھی نہ دیا۔ پھر بھی آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے ہدایت کی دعا فرماتے ہیں۔

یہ وہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو فتح مکہ کے دن عثمان بن طلحہ کو کعبہ کی کنجیاں عطا کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"آج کا دن بھلائی احسان اور وفاداری کا دن ہے۔"

اگر یہ لوگ جنھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں نبی اور مدینہ میں سلطان اور صاحب دولت قرار دیا ہے غور سے مطالعہ کریں کہ کس جانفشانی اور کدوکاوش سے مصیبت وابتلاء کے زمانے میں مکہ میں حکومت ودولت کا خاکہ تیار کیا گیا تو ان کو مدینہ ہی میں اس کی داغ بیل ڈالنے کا گمان نہ ہوتا۔ بلکہ وہ جان لیتے کہ یہ تیرہ سال کی مسلسل کوششوں اور جانفشانیوں کا نتیجہ اور خدائے تعالیٰ کے اس قول "فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشركين" (جو تجھے حکم دیا جاتا ہے اس کی پیروی کر اور مشرکین سے اعراض کر) کی دعوت کا ثمرہ ہے۔

مدینہ میں حکومت ودولت کا قیام واستحکام تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان تلامذہ اور پیروؤں کے ہاتھوں ہوا جنھوں نے پہلی اور دوسری مرتبہ اللہ کے حکم سے اللہ کے راستہ میں حبشہ کی طرف ہجرت کی اور اس کے بعد مدینہ کی جانب رجوع کیا۔ نیز اس میں ان انصار کا بھی حصہ تھا جنھوں نے مکہ کی گھاٹی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلی اور دوسری مرتبہ بیعت کی۔

یہی وہ امت کے مقدس بیج ہیں جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھوں سے سرزمین مدینہ میں بویا تھا۔ انہی کے ہاتھوں دولت اسلامیہ قائم و مستحکم ہوئی، پھر اس کے بعد اسلامی شہنشاہیت کے دور کا ظہور رہا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ اور مدینہ میں اپنے شعور سنی سے لے کر اپنی وفات تک دوراندیش، مدبر و مفکر، عقل خداداد کے مالک اور پختہ کار سیاست دان تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی مشہور و معروف ہستیوں سے فائدہ اٹھایا۔ عبدالمطلب کے زیر سایہ پرورش پائی۔ طائف سے واپسی کے بعد مطعم بن عدی کی حمایت میں (جو مشرک تھا) مکہ میں داخل ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بت پرستوں کی ربط و تعلق کو اس لئے قبول فرمایا تا کہ مکہ

سے بتوں کو منہدم کرنے میں سہولت پیدا ہو اور مدینہ میں یہاں کے لوگوں کی تنظیم واتحاد' معاہدہ اور نصرت و مدد کو اس لئے قبول فرمایا تا کہ اس کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جان اور اپنے اصحاب کو محفوظ رکھ سکیں اور بتوں کی بھی بیخ کنی ہو جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد و مدعا ایک' غرض و غایت ایک اور نقطہ نظر ایک تھا، لیکن اس کی صورتیں مختلف' احوال جداگانہ اور مظاہر گوناگوں تھے۔ صور و اشکال کی تبدیلی سے کیفیت و ہیولی میں کسی قسم کا تغیر و تبدل وقوع پذیر نہیں ہو سکتا' لیکن غیر منصف مزاج ناقدین و مورخین نے ان تصویروں کو سمجھنے میں فاش غلطی کی اور ان کو ان مختلف مظاہر سے غلط فہمی پیدا ہو گئی۔

اگر چہ مدینہ میں زندگی کے مختلف ادوار و مراحل کے مدنظر بے شمار تشریعی احکام اور تنظیم و تصرف امور کے اصول پیش کیے گئے لیکن یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے تبدیل ہونے پر برہان و دلیل نہیں ہو سکتے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت شان' حسن رائے اور عقلی برتری پر دلالت کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس شخصیت کے ساتھ مکہ میں مشرکین کا بے خوف و ہراس مقابلہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں بھی اسی شان سے دنیا کے مختلف کام انجام دیتے ہیں۔ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی ان قوتوں اور روحانی طاقتوں کا پتہ چلتا ہے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام دشوار گزار مراحل میں حسب اقتضائے حال اور مناسب مواقع پر کامیابی و تسلط عطا کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں یہی وہ عظیم الشان صفات اور اولوالعزم قوتیں جمع تھیں جن کی بدولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اخلاق کا مجسمہ پیش کیا اور ہر حیثیت سے امتیاز پیدا کیا۔ انہی صفات و قویٰ کے مجموعہ سے تبلیغ و دعوت کے زمانے میں خواہ وہ مکہ میں طاقت و قوت سے محرومی کا دور ہو یا مدینہ میں سیاست و دولت کی فراوانی کا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مستقل اور کامیاب حکمران و فاتح نظر آتے ہیں جو پوری توجہ کے ساتھ اللہ کی یاد میں مصروف تھے اور یہی توجہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی منزل مقصود تھی۔ اس کے سوائے تمام اشیائے کو دوسرے درجہ میں شمار کیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں مقامات (مکہ و مدینہ) میں عبادت گزار پرہیز گار اور زہد خالص کا نمونہ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ آپ

صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک عمدہ بستر تیار کرنا چاہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"مجھے دنیا سے کیا سروکار؟ میری اور دنیا کی مثال اس سوار کی طرح سے ہے جس نے درخت کے سایہ تلے آرام کیا پھر وہاں سے چل دیا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی جاہ وحشمت اور سلطنت ودولت کے زور نے مغلوب نہ کیا۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تواضع اور بردباری سے باہر ایک قدم بھی نہیں بڑھایا۔

لیکن اب سوال یہ ہے کہ ناقدین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زندگی میں وہ کون سا تضاد اور اختلاف پاتے ہیں جس کی بنا پر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو شخصوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔؟ کیا اس لئے کہ آپ مکہ میں کسمپرسی اور بے چارگی کی حالت میں دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور مدینہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں جہاد کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دولت وقوت کا سرمایہ موجود رہتا ہے۔؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک دونوں مقامات میں صرف ایک ہی مقصد ومدعا دین کی نشر واشاعت اور اعلاء کلمۃ الحق تھا اور شرک وبت پرستی پر قلع وقمع کرنا۔

ناقدین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی مدنی زندگی میں کون سا تناقض اور تضاد نظر آتا ہے؟ حالانکہ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو باسانی اس کا پتہ چل سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں اذیتوں اور تکلیفوں پر صبر کرتے ہیں۔ جاہلیت کے سربرآوردہ اشخاص کی آڑ میں اپنے نفس کو بچاتے ہوئے ان کے دین کو منہدم کرنے کی کوشش میں مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم کرتے۔ اپنے دین کے معاملہ میں بحث ومباحثہ کرتے اور سبھوں کو دین اسلام کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ہر دشوار اور مشکل ترین کام کو اپنی حسن رائے اور فکر وتدبر سے انجام دیتے ہیں۔ مدینہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں کے لوگوں سے نصرت وامداد طلب کرتے، یہود ومشرکین سے معاہدہ کرتے، اپنی حفاظت اس حکومتی قوت کے ذریعہ کرتے ہیں جس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنظیم کی تھی' مختلف پیچیدہ مراحل پر اور مختلف جنگوں میں اپنی دوبینی' اولوالعزمانہ قوتوں اور بہترین عقل وتدبر سے غلبہ وتسلط پاتے ہیں۔

مکہ میں تیرہ سال تک ضیغم اسلام اپنی قوتیں اور اپنی فوج صرف کیے بغیر خاموشی کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے اور یہی ضیغم دس سال تک مدینہ میں اپنے شکار کو تھمائے ہوئے رکھتا ہے۔ ان دونوں زندگیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جس رائے، صبر و استقامت کا جوہر، ملکۂ سیاست اور وسعت تدبیر و عزیمت کا نمایاں اظہار ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب حیرت انگیز کامیابی اور عظیم الشان فتح و نصرت نصیب ہوتی ہے تو کفار انگشت بدنداں ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں:

"اگر آپ سلطنت نہ قائم کرتے اور لشکر کی قیادت نہ فرماتے تو خالص نبی متصور ہوتے۔"

اگر یہ لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سمجھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی محض وعظ و نصیحت تک محدود نہ رکھی بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت و تبلیغ کو پہنچانے میں اپنی جان کی بھی پروانہ کی، ٹھنڈے دل سے یہ بھی سوچتے اور غور کرتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پیغام حق کے پہنچانے اور کلمۃ اللہ کو سربلند کرنے کے لیے کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک پیشوا اور رہبر اور مصلح و فاتح سمجھنے میں ہمارا ساتھ دیتے۔

بت پرست و عصبیت پرور، سنگ دل و خوں ریز اور غارت گر قوم کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تمسخر آمیز اور مضحکہ خیز انداز میں استقبال کیا' کیونکہ قریش نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا رد کرنے کے لیے یہی ایک طریقہ موثر جانا۔ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور بنو ہاشم کو ایک ایسے درجہ پر پہنچا دیا تھا کہ زبان ہلانے کا یارا تک نہ تھا۔

اگر یہ ناقدین عربوں کی زندگی کو چشم بصیرت وا کر کے دیکھتے تو ان کو بہ آسانی صورت حال کا اندازہ ہو گیا ہوتا۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حکومت الٰہیہ کے قیام کی جدوجہد نہ فرماتے اور اپنی تمام زندگی میں ایک ہی مقام پر توقف فرماتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی چند واعظانہ یادگاریں باقی رہ جاتیں جو تاریخی حکایات و واقعات کے ضمن میں دہرائی جاتیں یا آپ ﷺ کا پیغام دیگر انبیاء کے ادیان کی طرح برائے نام باقی رہ جاتا۔

اس وقت اعداء اسلام اور مخالفین دین میں سے کوئی اس دعوت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتا اور دین اسلام کا نام ونشان صفحہ ہستی سے مٹا دیتا۔ علاوہ اس کے ناقدین کی ایک ایسی ہستی کے بارے میں کیا رائے ہے جو عقل وتدبیر میں پختہ کار اور جواں مرد ہیں۔؟ ادھر اس کی قوم نے اس کو قتل کرنے کا ارادہ کرلیا ہے اور وہ ان سے روپوش ہو جاتا ہے۔ پھر قوم کے افراد اس کا تعاقب کر کے اس کا خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں۔ ہر چند کہ محمد ﷺ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے درمیان محض عقیدہ کا نزاع تھا، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگانی کی اساس اور حیات جاودانی کا سرمایہ تھا۔ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی حالت میں مدینہ میں اپنی قوم کا انتظار کرتے ہوئے بیٹھ جاتے کہ وہ آ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں؟ اگر نکتہ چیں حضرات کو اس امر سے اختلاف ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد دنیا کی دولت سے فائدہ کمانا تھا تو ہم ان کی نکتہ چینیوں کے اصل مدعا میں غور کر سکتے، لیکن واقعہ اس کے خلاف شہادت دے رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض وغایت کبھی دنیا کمانے اور مال وزر جمع کرنے کی نہ تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کمال عقل ودانائی اور دور اندیشی کے مالک تھے۔ مدینہ میں پہنچتے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کی حفاظت اور اپنی قوم کی مدافعت کے لیے (جنہوں نے تیرہ سال کی مسلسل مشقتوں کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کو قبول نہ کیا) ساز وسامان کی تیاری شروع کر دی۔

اپنی بالغ نظر اور روشن فکر سے اپنے اور اپنے اصحاب کی مدافعت کے وسائل میں غور کیا۔ اس کو بہترین طریقہ سے استعمال کرنے کا وسیلہ سوچا' آخر کار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ عظیم الشان کامیابی اور حیرت انگیز فتح نصیب ہوئی جس کے بارے میں دائرۃ المعارف برطانیہ رقم طراز ہے:

> ''یہ وہ کامیابی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل کسی دور میں بھی کسی دینی مصلح کو نصیب نہ ہوئی۔''

یہ بے مثال فوز وفلاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ صرف زہد وعبادت' تواضع وانکسار' رحمت ورافت' ظاہر وباطن اور مقصد ومدعا کی تصویر کو بلا کم وکاست پیش کرتی ہے بلکہ

مدینہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کے اس تکمیلی خاکہ کو ظاہر کرتی ہے جو مکہ میں حاصل نہ ہوسکا تھا۔ حکومت کے نقطۂ نظر سے جو عظمت و فوقیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے وہی نبوت میں بھی جھلکتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ حکومت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی شان پر بھی روشن دلیل قائم کی جاسکتی ہے' کیونکہ فاتحین کی تاریخ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ایک ایسی ہستی ہیں جو حکومت و دولت کے حاصل ہونے کے باوصف ایک فقیرانہ اور زاہدانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ پھر جب اس دنیائے فانی سے رحلت فرماتے ہیں تو اپنی خلافت کا جانشین کسی کو نہیں بناتے بلکہ اپنے وارثین کے لیے بھی کسی قسم کی تصریح نہیں فرمائی۔ اس کے برعکس فرماتے تھے:

"ہم انبیاء کی جماعت ہیں۔ ہم کسی کو وارث نہیں بناتے۔ جو کچھ ہمارا ترکہ ہے وہ صدقہ ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں یاد آ گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کچھ سونا باقی رہ گیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں جلدی فرماتے اور گھر آکر بقیہ سونا تقسیم کردیتے ہیں۔ محض اس خیال سے کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں انتقال نہ فرماجائیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دنیا کی کوئی چیز باقی رہ جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی پر سوار ہوکر مکہ میں فاتحانہ شان سے داخل ہوتے ہیں اور اپنا سر جھکائے ہوئے ہیں۔ ادھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دشمن عاجز و ذلیل ہوکر کھڑے ہوئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدشہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں خود پسندی اور کبر کا شائبہ پیدا ہوجائے۔

بلاشک وشبہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مدنی زندگی میں امت کی قیادت فرماتے ہوئے اپنے دور حکومت میں رسالت کے ان فرائض کو جو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ گردانے تھے' نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام تک پہنچایا۔ ہماری آنکھوں کے روبرو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے واجبات و فرائض کو مناسب اوقات اور موزوں مواقع پر عملی جامہ پہنا کر دکھایا۔

اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت فرماجاتے اور اپنا یہ حیرت انگیز عملی کارنامہ

دنیا کے روبرو پیش نہ کرتے تو بطل اعظم اور بے مثال ہستی نہ بن سکتے۔ اگر محض وعظ و نصیحت کی باتیں اصلاح وانقلاب کی ذمہ دار ہو سکتیں تو لوگوں کو مصلحین اور قائدین کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ کتابوں کے ذریعے سے لوگ بہت کچھ سیکھ سکتے تھے۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں ایسے کردار جلوہ گر نظر آتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے ہم آہنگ ہیں، جنہیں آنکھیں مشاہدہ کرتی ہیں، کان سنتے ہیں اور حس مشترک غور کرتی ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو لوگوں کو بے نظیر ہستی بناتی اور انسانوں کو بلند مرتبے تک پہنچاتی ہیں۔ چنانچہ بقول بوزرز اسمتھ:

"محمد علی الاطلاق دنیا کے مصلح اعظم ہیں۔"

ہم نے اپنے گزشتہ بیان میں دیگر ادیان کے بعض مصنفین وناقدین کے شکوک وشبہات کا ازالہ کیا ہے، جنہوں نے آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکی اور مدنی دو شخصیتوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب میں یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اہم خصوصیت پر روشنی ڈالوں گا جو اس باب کا اصلی مدعا ہے اور جو ہمارے اخلاق کی روح کو زندہ کرنے کے لیے سامان حیات فراہم کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیق ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ سفر کی مشقتیں برداشت کرتے ہوئے مدینہ میں تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور اپنے اصحاب کے لیے یہاں کے لوگوں کی حمایت کا عہد لینا چاہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں کامیابی نہ ہوئی' بالآخر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ضمیر کی روشنی میں صلح و آشتی، تنظیم داخلی اور امن خارجی کی ضرورت محسوس کی۔

مدینہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تشریف لائے جب کہ اوس اور خزرج کی باہمی جنگ و جدل کو ہوئے تھوڑا عرصہ گزرا تھا۔ ان دونوں کی عداوت اور باہمی فتنہ پردازیاں قیامت کا سامان فراہم کر چکی تھیں۔ ادھر یہود فتنہ وفساد کا بازار گرم کرنے اور عداوت وعناد کی چنگاریاں بھڑکانے کی کوشش میں مصروف تھے، کیونکہ ان کو اندیشہ ہوا تھا کہ اوس وخزرج کہیں متحد و منظم ہو کر ان کی مصیبت کا موجب نہ بن جائیں۔

مدینہ کی جانب جن اصحاب نے ہجرت کی تھی ابھی ان میں اتنی طاقت فراہم نہ ہوئی

تھی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دے سکیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی قوم میں پناہ گزیں ہوئے جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل وعیال اور خاندان سے سخت نفرت تھی۔ مسلمانوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شجاعت اور دلیری سے شاندار استقبال کیا۔ ادھر یہود مشرکین نے بھی خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا۔ مسلمانوں کی یہ آرزو تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ان لوگوں کی اصلاح کرے اور نفاق وشقاق کو دور کر دے۔ اس طرف یہود ومشرکین اس امر کے متمنی تھے کہ ایک عرب کا رہنے والا جس کو اہل کتاب سے الفت ومودت ہے بتوں کی حمایت کرے گا تاکہ وہ ایک طرف عرب پر غلبہ پا سکے اور دوسری جانب شمال میں نصرانیت کا مقابلہ کر سکے۔ اس لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نت نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں بھی یہود ومشرکین کی نگاہوں کا شکار ہونے کا اندیشہ ہو گیا۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے نازک مواقع پر کس حکمت عملی اور دور اندیشی سے کام لیا اور اس دشوار گزار اور خطرناک منزل کو کیوں کر طے کیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر ہر اہم کام کو انجام دینے کی صلاحیت واستعداد موجود تھی۔ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف وحی سے سرفراز فرمایا تھا بلکہ انسانیت کا بلند مرتبہ عطا کر کے تدبیر اور کمال دانائی سے آراستہ کیا تھا۔

سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسجد تعمیر کرنی شروع کی۔ یہی وہ مسجد تھی جس کے اندر دین ودنیا کی فلاح وبہبودی کا سرمایہ پوشیدہ تھا۔ اسی میں اسلامی پارلیمنٹ قائم ہوتی' یہی اسلامی سلطنت کا پایہ تخت اور قیادت کا اعلیٰ مرکز سمجھی جاتی تھی۔ جہاں سے تبلیغ احکام اور اسلامی قوانین تمام جگہ نافذ کرائے جاتے تھے۔ اسی مقام پر سیاسی تدابیر اور فوجی احکام کو روبہ عمل لایا جاتا تھا۔ اسی میں وفد آیا کرتے تھے اور اسی جگہ لوگوں کو کتاب و حکمت کی تعلیم سے نوازا جاتا تھا۔

مسجد کی تعمیر بہت ہی سادہ تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی تواضع پسند طبیعت کے بہت موزوں تھی۔ ہر وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے سامنے اسی حقیقت کو بیان فرماتے تھے کہ حوادث زمانہ پر قابو پانے اور انقلاب روزگار

میں فلاح و کامیابی کا دارومدار محض روحانی قوت اور اخلاقی اصولوں پر ہے۔ یہ چیز شاندار عمارتوں اور شان و شوکت کے مظاہرہ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

اسی چھوٹی سی مسجد کے ذریعہ رفتہ رفتہ ایک ایسے اسلامی ادارہ کی تشکیل عمل میں آتی ہے جو تمام جزیرۂ عرب پر مستولی ہو جاتا ہے۔ روم اور ایران کی بڑی بڑی سلطنتیں اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہیں۔ اسی مسجد میں مناسب اوقات و احوال میں مختلف تدبیریں اور منصوبے سوچے جاتے ہیں، لیکن جو انقلابی طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا اور جس شاہ وار اصول کو پیش نظر رکھا گیا تھا' وہی آگے چل کر حکومت الٰہیہ کی وسعت و تشکیل کا پیش خیمہ اور انسان کے عظیم الشان اصلاحی قوانین کی تمہید ثابت ہوا۔ ان تدابیر کی وجہ سے مدینہ مسلمانوں' یہود و مشرکین الغرض عرب و عجم کے مختلف و متضاد قبائل و طبقات کا وطن قرار پا گیا۔

پہلے ہی مرحلہ میں وطنیت کا مفہوم ذہن نشین کرا دیا گیا کہ لوگ بلا تفریق حسب و نسب اور بلا امتیاز عصبیت و نسل و قوم ایک ہی نظام میں مربوط ہیں اور جملہ حقوق اور احکام و قوانین میں مساوی درجہ رکھتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اقوام و ادیان کے لوگوں کے لیے ایک جدید وطنی دستور بنایا جس میں تمام وطنی قرار دے کر ان پر یہ امور عائد کر دیئے کہ ملک کی ہر قسم کی مدافعت ان پر لازمی ہے، وہ صلح و جنگ کے ذمہ دار ہیں، اپنے غیر کی مدد نہیں کر سکتے اور اہل وطن کے خلاف خواہ ان کے رشتہ دار' باپ اور اولاد ہی کیوں نہ ہوں امداد بہم نہیں پہنچا سکتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل وطن کے مالوں' جانوں اور ان کی آبروؤں کی حفاظت کا ذمہ لیا اور ان کو عقیدہ و مذہب کے معاملات میں آزادی دے دی۔

اس دستوری صحیفہ کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' یہ خط پیغمبر محمد کی جانب سے قریش و یثرب کے مومنوں' ان کے پیروکاروں' رشتہ داروں اور مجاہدوں کے لیے لکھا جاتا ہے اور ان کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ سب ایک ہی پارٹی اور جماعت ہیں۔ جو یہود ہماری اتباع کریں ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ان کی مدد کی جائے گی اور ان کے خلاف کوئی سازش نہ کی جائے۔ بنو عوف کے یہود مسلمانوں کے ساتھ

ہیں۔ مسلمان اپنے دین پر قائم رہیں اور ان کے جو غلام ہیں وہ انہی کے ہیں۔ یہودیوں کے لیے ان کا دین ہے۔ باقی رہے وہ یہودی جنہوں نے معاہدہ کیا ہے۔ ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ اور سلوک کیا جائے گا جو بنوعوف کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہودیوں اور مسلمانوں کو آپ اپنے نفقات و مصارف برداشت کرنے ہوں گے۔ جو لوگ اہل صحیفہ کے ساتھ جنگ کرنے پر آمادہ ہوں تو یہودیوں کا فرض ہے کہ ان کے خلاف ہر قسم کی امداد بہم پہنچائیں۔ ان کے ساتھ ہر قسم کی بھلائی' احسان اور حسن سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ مدینہ کے حدود اہل صحیفہ کے لیے حرام ہیں۔ اپنے ہمسایہ کو اپنی طرح سے سمجھنا چاہیے' اس پر کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے' نیز اسے کسی طرح کا نقصان بھی نہ پہنچایا جائے۔ اہل صحیفہ کے درمیان ایسے اختلافات اور مناقشات برپا ہو جائیں جن سے فتنہ و فساد کے پھیلنے کا اندیشہ ہو تو ان کو فیصلے کے لیے اللہ عزوجل اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دینا چاہیے۔"

اس جدید دستوری صحیفہ کی وجہ سے مدینہ کی حکومت کی زمام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں بلاقصد و مطالبہ چلی آئی۔ عہد و پیمان شکنی کی صورت میں ایک حکم کی ضرورت لاحق ہوا کرتی' لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی حکم مقرر ہوتے۔ چنانچہ اسی وقت سے اسلامی حکومت کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ بلاد عربیہ میں امت کے حق کو قبیلہ کے حق پر ترجیح دی اور تمام حدود و احکام کا دارومدار اللہ کی شریعت اور اس کے پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم پر رکھا۔ اس وقت عصبیت جاہلیہ کا طوفان بہت زور و شور پر تھا۔ جس کی رو میں مجرم و غیر مجرم' گنہگار و نیکوکار تمام بہ رہے تھے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جابر و متکبر قوموں میں تمدن کا تخم بویا اور اسلامی جمہوریت کی تشکیل کی جو صدیوں تک دنیا پر حکمراں رہی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بصیرت افروز عقل اور ذہن رسا سے معلوم کر لیا کہ اولاً مدینہ کے لیے اور ثانیاً تمام عالم کے لیے جو نظام آپ صلی اللہ علیہ وسلم قائم کرنا چاہتے ہیں وہ اس سرکش و باغی قوم میں جو فتنہ و فساد میں مبتلا اور عصبیت کے پنجوں میں گرفتار

ہے محض دستوری صحیفہ سے جاری نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس دعوت کی حمایت اور اپنے نظام کی حفاظت کے لیے جس کے قوانین واصول صحیفہ میں مقرر کیے گئے ہیں اور اس تمام عہد و پیمان کی نگرانی و پابندی کے لیے جن سے وطن کا ایک نیا دستور تشکیل پذیر ہوا ہے، قوت و طاقت اور عسکری تنظیم کی ضرورت ہے۔ یہ قوت صرف ان مہاجرین کے ذریعہ نشوونما پاتی ہے جنہوں نے اپنے پرانے نظام سے بھاگ کر مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ یہی لوگ سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائحہ عمل کی حفاظت اور نظام حریت کی حمایت کے علمبردار ہوئے۔ جیش محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت و تنظیم مہاجرین و انصار کے افراد سے ہوئی۔ انہوں نے دعوت اسلامی کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر اشارہ پر جان نثاری کا ثبوت دیا۔ قریش اور دیگر قبائل میں سے سوائے مہاجرین اور انصار کے کوئی اور قوم اس جدید نظام کی حمایت میں بطور سند کے نہیں پیش کی جا سکتی' انصار تو قریش کے دشمن اور حریف تھے۔

اہل مدینہ کے درمیان کینہ وعداوت اور بغض ومنافرت کی جو چنگاریاں بھڑک اٹھی تھیں' قریب تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور قدسی سے پیشتر قبیلہ اوس کے وجود کا خاتمہ کر دیں۔

مہاجرین اور انصار کے اس لشکر کی باہمی ترتیب و تنظیم' ان کی تعلیم و تربیت سے ان کو ایک رشتہ میں منسلک کرنا' ان کو دعوت وتحریک اسلامی کی تائید اور اطاعت و ایمان کے لیے تیار کرنا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا حصہ تھا۔ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عسکری شان نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ سب سے زیادہ تعجب اور حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ پہنچے ہوئے ابھی چھ ماہ کا عرصہ نہیں گزرتا کہ آپ اس درمیان میں ایک ایسے لشکر کی تنظیم کرتے ہیں کہ وہ سال ہی کی مدت میں بدر کے میدان میں باوجود دشمن کی قوت وطاقت سامان واسلحہ کی زیادتی اور بڑے بڑے سورماؤں کی شہرت کے ان تین گنی فوج پر غلبہ وتسلط پا لیتے ہیں۔ دنیا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نظام کے معجزہ کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا اور بدر کی شکست کے بعد یہ روشن ہو گیا کہ بت پرستوں کے قدم ڈگمگا گئے۔ نہ صرف یہی بلکہ کچھ عرصہ کے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اسلامی لشکر

فرانس اور ہندوستان تک فاتحانہ شان سے داخل ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ قبیلہ اوس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وتبلیغ کی راہ میں حائل اور مدینہ میں عصبیت کی آماجگاہ ہے تو پہلے اس کو اخوت کی طرف بلایا۔ قریش اور اوس وخزرج کے مابین بھائی چارہ اور برادرانہ تعلقات پیدا کرا دیے۔ حتیٰ کہ اس کا اثر تیزی کے ساتھ مختلف قبیلوں اور خاندانوں میں سرایت کر گیا جس نے تمام کو انسانیت واخوت کے اعلیٰ مقام پر فائز کر دیا۔

یہ مواخات اور بھائی چارگی جس کی اکثر حکایات اور بیشتر واقعات تاریخ وسیر میں تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں' جن میں ناموں اور نسبوں کی طول طویل فہرست ہے' امت اسلامیہ کی تنظیم وجمعیت اور اسلامی فتح ونصرت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

ابوسفیان فتح مکہ کے دن اسلامی فوج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ جب ایک فوج پرے سے گزرتا تو کہتا:

"یہ کون لوگ ہیں۔؟"

جواب دیا جاتا:

"یہ سلیم کی فوج ہے' یہ مزینہ کی' یہ فلاں کی۔"

مگر کوئی اس کی نظروں میں نہ جچتا' یہاں تک کہ ان کے ہی بھائیوں کا ایک لشکر نمودار ہوا۔ اس نے حضرت عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا:

"یہ لوگ کون ہیں۔؟"

آپ نے کہا:

"یہ مہاجرین اور انصار کی فوج ہے۔"

ابوسفیان نے کہا:

"کل تک تو ان کی کوئی قوت اور طاقت نہ تھی۔ اے ابوالفضل! خدا کی قسم! تمہارا بھتیجا آج ایک بڑے لشکر کا مالک بن گیا ہے۔"

یہی وہ اخوت ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قوموں اور قبیلوں کے درمیان عصبیت جاہلیت کو دور کر کے برادرانہ تعلقات کی اسپرٹ پیدا کر دی تھی۔ جس نے امت

عربیہ کو نفاق و شقاق سے نکال کر شاہراہ اتحاد پر گامزن کر دیا اور نظام جمہوریت کی ایسی تشکیل کی جو تاریخ کے صفحات پر ثبت ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلاشک وشبہ مفکر اعظم تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بصیرت کی روشنی میں مشاہدہ کر لیا کہ مدینہ میں امن قائم کرنے کے لیے یہاں کے مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین حریت کی ضمانت کے لیے محض ایک دستوری صحیفہ اور مدینہ کے داخلی نظام کی حفاظت کی ذمہ داری کے لیے مسلمانوں کے درمیان محض مواخات و برادرانہ تعلقات کافی نہیں، تاوقتیکہ مدینہ جزیرۂ عرب کے مشابہ نہ ہو جائے جس میں مشرکین کی اجازت کے بغیر داخلہ ناممکن ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پیچیدہ معمہ کو کس طرح حل کیا اور اس مہلک مرض سے کس طرح نجات حاصل کی۔ پھر کیونکر مدینہ پر جزیرۂ عرب کے قواعد نافذ کر دیے اور کس طرح چند ہی سال کے اندر یہاں اسلامی جمہوریت وریاست کی تشکیل ہوئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدنی زندگی میں دو طریقے اختیار کیے۔ ایک وہ جس کو دیگر ادیان کے بعض مصنفوں اور بعض تنگ نظر وسطح بین اشخاص نے سمجھا ہے۔ سچ ہے جب ان کو زندگی کی دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے تو وہ درماندہ و عاجز ہو جاتے ہیں۔ دوسرا طریقہ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل کے ذریعے ظاہر کر دیا۔ پہلا طریقہ خاموشی اور پراسرار تھا۔ دوسرا عملی میدان میں مظاہرہ کرنے کا تھا۔ پہلے طریقہ میں جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں وعظ ونصیحت کی، مدینہ میں بھی تبلیغ و دعوت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مدینہ میں ان لوگوں پر اعتماد کیا جنھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کا معاہدہ کیا تھا۔ قریش اور مدینہ کے اطراف کے اعراب کی کارروائیوں اور عملی اقدامات پر نگرانی فرماتے رہے۔ انہیں اس بات سے آگاہ کر دیا کہ اگر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسن سلوک سے پیش آئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی قسم کا تعرض نہ کریں تو ان کا یہ رویہ سراسر بھلائی پر محمول ہوگا۔ اگر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت اور راہِ حق میں مارے جائیں تو ان کو شہادت کا ثواب اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد کا فخر حاصل ہوگا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی کارروائی یہ تھی کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اندیشہ کو پالیا تو اس کی مدافعت اور اپنی دعوت میں ہمت و استقلال کے ساتھ قائم رہے اور اس راہ کی تمام مشکلات کا مقابلہ کیا، یہاں تک کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پناہ لینے کی خاطر آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو امداد پہنچائی اور جن لوگوں نے ہجرت کی ان کے فضل و شرف اور مرتبہ کو بڑھا دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان واعظین وقائدین میں سے نہ تھے جو اپنی زندگی لوگوں کو بھلائی کا حکم کرنے اور خود اس پر عمل پیرا نہ ہونے میں گزارتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رسالت و نبوت اور بے نظیر بہادری کے مطابق ایمان اور عمل صالح کی زندہ تصویر تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں آنے کی غرض وغایت یہ نہ تھی کہ کوئی گرجا تعمیر کر دیں اور یہودیوں اور مشرکین سے اپنی حمایت طلب کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کا تقاضا یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حق بات کہنے میں خاموشی کے طریقہ کو چھوڑ کر انقلابی روش اختیار کریں۔

بعض اہل مدینہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد کی اور مشرکین نے بھی مکہ پر غلبہ حاصل کرنے کی حرص وتمنا میں اور مدینہ کے بازاروں میں اپنی تجارت کو فروغ دینے کی ہوس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔ مدینہ میں یہود اس غم میں مبتلا تھے کہ وہ اللہ کے خاص چہیتے اور لاڈلے ہیں۔ ان کے سوائے کسی اور کو اللہ تعالیٰ نبوت سے نہیں سرفراز کر سکتا۔ ان کی بھی یہ تمنا اور آرزو تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے عرب پر غلبہ حاصل کریں اور اپنی دعوت دین کو پھیلائیں۔

مدینہ میں مہاجرین پہلی ہی مرتبہ بخار یثرب میں مبتلا ہو گئے۔ اس سے انہوں نے اپنی عورتوں کے بانجھ ہو جانے کا شگون لیا۔ زبیر رضی اللہ عنہ کی بیوی کے جب بچہ پیدا ہوا تو اس وقت جشن منایا گیا۔ ان لوگوں نے مکہ میں اپنی جائیدادیں اور اموال چھوڑ دیئے تھے۔ مدینہ آ کر فقر و فاقہ میں مبتلا ہو گئے۔ یہ وہ مشقت آگیں زمانہ تھا جس میں ایمان اور عمل صالح کے بغیر لغزش کھا جانے کا اندیشہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عقل

خداداد اور حسن سیاست کے ذریعے اس پیچیدہ گتھی کو اس انداز سے سلجھایا کہ یہ خصوصیت کسی مصلح اور فاتح کو کسی دور میں بھی نصیب نہ ہوئی اور نہ ہوگی۔

ہم نے گزشتہ بیان میں مدینہ کی حالت کا ایک مختصر سا خاکہ کھینچا ہے اور مجمل طور پر یہودیوں کی تمناؤں، مشرکین کے ارادوں اور مسلمانوں کے عملی اقدامات پر روشنی ڈالی ہے اور ثابت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بغیر عملی اقدام کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اب ہم یہاں مدینہ کے اطراف واکناف کے مشرکین اور اہل مکہ کی حالت کو بیان کرتے ہیں تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حسن سیاست اور فکر وتدبر کا اندازہ ہو سکے۔

لوگوں کا خیال ہے کہ مکہ ایک خشک سرزمین اور بے آب وگیاہ مقام ہے، جہاں میووں اور غلوں کا نام ونشان نہیں۔ یہ ایک وادی ہے جس میں کاشت نہیں کی جا سکتی لیکن بہت کم افراد اس سے واقف ہیں کہ دعوت اسلامیہ کے ظہور کے وقت مکہ تمام بستیوں میں ایک خوشحال مقام تھا، بلکہ قدیم زمانے میں بہت بڑی تجارتی منڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ قریش اس کے اندر اپنی تجارت کا بیشتر حصہ لیا کرتے اور وہ بہت بڑے تاجر تھے۔ یہ لوگ اپنے اطراف واکناف کی قوموں کے احوال سے بخوبی واقف تھے۔ ان کی ترقی وخوشحالی کا تمام تر دارومدار یہی سیر وسیاحت اور خانہ بدوشی تھی۔ انہوں نے اپنے وطن کو چھوڑ کر دور دور ملکوں میں تجارت کی غرض سے سفر کرنا شروع کیا۔ چنانچہ تاریخ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ ترقی کا اصلی راز تجارت اور سیر وسیاحت میں مضمر ہے۔ قدیم زمانے کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ فنیقیہ کے باشندوں نے اسی تجارت وسیاحت کے ذریعے کتنی ترقی کی اور دنیا کی جدید تاریخ شاہد ہے کہ برطانیہ نے کس قدر حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا۔ ان قوموں کی ترقی کا راز صرف اسی میں پوشیدہ تھا کہ وہ اپنے وطن میں زندگی کی ضرورتوں اور اہم حاجتوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے سے عاجز تھے۔ اسی وجہ سے ان کو اپنی ضروریات زندگی نے عالم کے دور دور ملکوں میں اپنی کسب معاش کے لیے آمادہ کر دیا۔ چنانچہ وہ تمام قوموں اور ملکوں سے دولت وسرمایہ میں سبقت لے گئے۔ یہی حال دعوت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت مکہ میں بھی تھا۔ یہاں کے لوگ بہت ہی خوش حال اور فارغ البال تھے اور قدیم زمانے کے نتائج وثمرات ان کی آسائش کے سامان فراہم کر چکے تھے۔

اس تجارت کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ تجارت صرف ایک خاندان یا گروہ میں محدود نہ تھی بلکہ سیرت کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ ابوسفیان نے جب بدر کے دن اپنے قافلہ پر خطرہ کا اندیشہ محسوس کیا تو تمام باشندگان مکہ کو جمع کیا اور ایک ہزار کا لشکر لے کر نکلا جس کے ساتھ ایک سو گھوڑے اور سات سو اونٹ تھے۔ جب قریش کو بدر کے موقع پر شکست فاش کھانی پڑی تو مکہ والے ابوسفیان کے قافلہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے انتقام لینے کے لیے اکٹھے ہوئے۔ اس وسیع تجارت میں مکہ کے منافع کا اندازہ راس المال سے پچاس فی صد کا لگایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اپنے مہمانوں اور تمام جزیرہ کے حاجیوں کی خاطر تواضع اور مہمان نوازی کیا کرتے تھے۔ اپنے قرابت داروں پر جود وکرم کی بارش برساتے' لہو ولعب' شراب نوشی' جوابازی اور گانے بجانے کی محفلوں وغیرہ میں فضول خرچ کر دیا کرتے تھے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا مدینہ میں جو حال تھا اس کا ذکر ہم نے گزشتہ بیانوں میں کر دیا ہے۔ مہاجرین جن کے مال واسباب اور مکانات وباغات وغیرہ مکہ میں چھین لئے جا چکے تھے' مدینہ میں اس طرح خالی ہاتھ آئے ہیں کہ ان کے پاس سوائے اساس ایمان اور سرمایہ اسلام کے کوئی اور چیز نہیں رہی۔ یہی وہ عمیر ہیں کہ ان کو اپنا بدن تک ڈھانپنے کے لیے کپڑا میسر نہیں ہوتا ہے۔ یہی علی بن ابی طالب ہیں کہ ایک یہودی کے پاس اس کے باغ میں مزدوری کرتے ہیں اور ایک ڈول پانی کھینچنے پر ایک کھجور ملتی ہے۔ یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ مسجد کی طرف گھر سے باہر تشریف لائے ہیں تو ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو راستہ میں پاتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"تم دونوں کس لئے باہر پھر رہے ہو۔؟"

وہ عرض کرتے ہیں:

"ہم کو بھوک نے بے تاب کر دیا ہے' اس لئے ہم گھر سے باہر نکلنے پر مجبور ہو گئے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"مجھے بھی بھوک نے بے تاب کر دیا ہے اسی وجہ سے میں بھی نکلا ہوں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ چھوڑ دیا تو کیا اس کے سبب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وتبلیغ کی نشر واشاعت اور کفر وشرک کی رسوائی وذلت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ تائید پہنچی؟ ہرگز نہیں' بلکہ قریش کے لوگ مسلمانوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان کو استہزاء اور مضحکہ خیزی کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ قوم کے قوی اور سربرآوردہ افراد کمزوروں اور مرعوب اشخاص کو مکروفریب میں مبتلا کر کے اپنی طرف مائل کر لیتے۔ اپنے لات وہبل کی مدد کے لیے قید کر دیتے اور مسلمانوں کو اذیتیں پہنچا کر خوش ہوتے کہ اس طرح انہوں نے لات وعزیٰ کو راضی کر لیا ہے۔

آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رسالت کے علمبردار' عالی ہمت' بلند حوصلہ تھے اور اس دنیا میں سب سے زیادہ نیک اور شجاع ہستی تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے تمام مصائب ومشکلات کو برداشت کیا۔ ان کی مدافعت میں عملی قدم اٹھایا۔ قریش کو ان کی تجارت میں جو ان کو بہت عزیز تھی' سہولتیں بہم پہنچا کر ہدایت پر لانے کی کوشش فرمائی۔ مدینہ کے اردگرد کے عربوں کو شرک وبت پرستی سے باز رکھا۔ مدینہ کی ان فتنہ وشر اور عصبیت کی چنگاریوں کو بجھانے میں جن کو یہود اوس اور خزرج اور مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان بھڑکا رہے تھے' کوشش کی اور امن وامان قائم کرنے میں مصروف رہے۔

یہی وہ تین مہتم بالشان اغراض ومقاصد ہیں جن کو حاصل کرنے کے لیے اولوالعزمی' ہمت واستقامت اور تنظیم کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ یہ وہ علو ہمتی کا کام ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ امتیازی کامیابی نصیب ہوئی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل کسی نبی نے حاصل نہیں کی۔ یہ دور جس میں مدینہ کی اصلاح' مہاجرین اور انصار کی دینی وتمدنی تربیت اور ان کے ذریعے سے تمام لوگوں کی مشکلات مقابلہ کرنا پڑا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حد درجہ آزمائش اور کٹھن مشکلات کا دور تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سیاسی تجربہ اور عسکری نظام کی قوت نصیب ہوئی۔

مدینہ پہنچے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابھی چھ ماہ گزرے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا اسلامی جھنڈا عبیداللہ بن حارث کے ہاتھ بلند کرنے کے لیے عطا کیا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ جنگ بدر سے پہلے آپ

صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے لشکر نے کوئی مادی اور دنیوی فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ انہوں نے تو محض سیاسی اور عسکری اغراض کو (جو استقلال و ثابت قدمی اور سلطنت کے استحکام کے لیے ضروری تھے) کافی طور پر حاصل کر لیا تھا۔ مہاجرین کے دلوں میں آرزوئیں جوش مارنے لگیں۔ ان کی باطنی حالت شان دار ہو گئی اور ان کے بدنوں میں (جو یثرب کی بیماری کا شکار ہو گئے تھے) طاقت و توانائی اور شگفتگی پیدا ہو گئی۔ مسلمان ایک منظم اور متحد طاقت کی شکل میں عمل کرنے کے عادی ہو گئے تھے جس میں ان کے حسب و نسب کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ بلکہ انہوں نے اپنے دلوں سے عصبیت و جنسیت اور قبیلہ و خاندان کے امتیازی جذبات و احساسات کو مٹا دیا تھا۔

اہل مدینہ نے مسلمانوں کی اس فوجی نقل و حرکت سے محسوس کر لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً اینٹ کو جواب اینٹ سے، پتھر کا جواب پتھر سے اور قوت کا جواب قوت سے دینے والے ہیں۔ ادھر اعراب نے اچھی طرح جان لیا کہ جو ہستی قریش کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے لشکر کو ساتھ لے کر نکلی ہے، اس کے بازو کسی کے رعب و قوت سے دبنے والے نہیں۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں کچھ ضعف و اضمحلال کے آثار ان کو نظر آتے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مدینہ پر چڑھائی کر دیتے اور یہاں کے جانوروں اور چرواہوں کو قتل و غارت کر کے اپنے قصوں اور افسانوں میں نہایت فخر و شان کے ساتھ بیان کرتے جنہیں ان کی عورتیں تک پڑھتی رہتیں۔ اسی طرح قریش کو بھی اس کا بخوبی علم ہو گیا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو صرف اس بنا پر ان کے گھروں اور وطن سے نکال دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے دین پر قائم تھے اور اعلاء کلمۃ اللہ کی دعوت دیتے تھے۔ مدینہ میں انہوں نے اپنی اقتصادی زندگی خطرناک اور ردی صورت میں اور دینی زندگی بے خوف و خطر حالت میں گزاری۔ قریش کو معلوم ہو گیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عزیز ترین چیز یعنی تجارت کو ایسا ہی روک دینا چاہتے ہیں، جس طرح سے کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب ترین شے یعنی عقیدہ دین کی راہ میں روڑے اٹکائے تھے۔ اگر وہ تجارت میں آزادی کے طالب و خواہش مند ہیں تو ان پر ضروری ہے کہ وہ حریت اعتقاد کا بھی اعتراف کریں جس کا معاہدہ بدر، احد اور احزاب کی خوں ریز جنگوں کے بعد کیا گیا اور جو صلح حدیبیہ کے نام

سے مشہور ہے۔

عسکری تنظیم اور فوجی تربیت مسلسل دو سال تک برابر جاری رہی۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر جنگ کی قدرت اور معرکہ میں استقامت واستقلال کی صلاحیت کا یقین کر لیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی قدم بڑھانے میں کوئی پس وپیش نہ کی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان بدر میں اپنے صحابہ کے ساتھ قریش کے آنے کا انتظار کیا۔ قریش کثیر ساز وسامان' ایک ہزار مسلح لشکر' سو شہ سواروں اور سات سو اونٹوں کے ساتھ نہایت شان وشوکت سے میدان میں اترے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف تین سو چودہ کا لشکر تھا جس کے پاس چند تلواریں' تین گھوڑے اور سات اونٹ تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اطمینان نفس کی خاطر کہ صحابہ میں جنگ کرنے کی کہاں تک استعداد اور اس کا جذبہ موجود ہے' ان سے اس بارے میں رائے دریافت کی۔ مہاجرین نے سب سے پہلے گفتگو کی اور اپنی بہترین رائے اور اپنی آمادگی کا اظہار کیا۔ مقداد بن عمرو نے یہاں تک کہا:

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اپنے مقصد کو جاری رکھیے! قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق پر مبعوث کیا ہے! اگر آپ ہمیں برک غماد (ملک یمن کا ایک مقام ہے) میں بھی جا کر جنگ کرنے کا حکم دیں تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اس کے اس پار بھی جنگ کرنے کو تیار ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے لوگو! مجھے مشورہ دو۔"

گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ انصار کی طرف تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی بیعت صرف اس حد تک تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب تک ان کے ملک کے حدود میں رہیں یہ حفاظت کریں گے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اندیشہ لاحق ہوا کہ مدینہ میں اگر دشمن آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہو تو شاید اس صورت میں یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد کریں گے اور اگر ان کے بیرون حدود میں حملہ آور ہو تو یہ حمایت ان پر فرض

نہ ہوگی۔ چنانچہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا:

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ ہماری رائے پوچھنا چاہتے ہیں۔؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہاں!"

حضرت سعد نے کہا:

"ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی اور شہادت دی کہ جو کچھ آپ لائے ہیں وہ برحق ہے۔ اس پر ہم نے آپ کی اطاعت و پابندی کے لیے عہد و پیمان باندھا۔ یارسول اللہ! آپ نے جو ارادہ فرمایا ہے اس کو پورا کیجئے! ہم ہر حال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں ۔قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق پر مبعوث کیا ہے! اگر آپ دریا میں گھسنے کا حکم دیں تو ہم آپ کے حکم سے اس میں کود پڑنے کے لیے تیار ہیں۔ ہمارا ایک فرد بھی اس کے خلاف نہ کرنے پائے گا۔ ہمیں کبھی یہ چیز ناپسند نہیں کہ آپ کل کے دن دشمن سے مقابلہ کریں۔ ہم آپ سے عہد کرتے ہیں کہ لڑائی میں صبر و استقامت سے لڑیں گے۔ جنگ کے وقت جواں مردی اور بہادری کے جوہر دکھائیں گے۔ شاید! خدا ہماری وجہ سے آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈک عطا کردے۔ آپ اللہ کا نام لے کر ہمارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائیے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی اس تقریر سے بہت خوش ہوئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آگے بڑھو اور خوش ہو جاؤ! یہ خوشخبری بھی سن لو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے فتح و نصرت عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ بخدا! میں قوم کے پچھڑے جانے کے مقامات کو دیکھ رہا ہوں۔"

جنگ بدر کے دن لشکر اسلامی کی یہ وہ روح تھی جس نے مہاجرین و انصار کے دلوں میں اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کی آمادگی پیدا کردی۔ ان کے نفوس بادۂ ایمان سے لبریز اور ان کے قلوب تنظیم و اتحاد کی طاقت سے صیقل شدہ تھے۔ بطل اعظم کی دوراندیشی اور عقل

وبصیرت کی یہ روشن دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ ووفاداری کو ملحوظ رکھتے ہیں۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ کا ثبوت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے دریافت کرتے ہیں کہ وہ مشورہ دیں حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بخوبی جانتے تھے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ دریا میں گھس پڑیں یا غار میں کود پڑیں تو ہرگز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت نہ کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب اور پاس وفاداری یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انصار سے اجازت طلب فرماتے ہیں، کیونکہ ان سے اس سے قبل ایسی جنگ کے لیے بیعت نہیں لی گئی تھی۔

جب معرکہ آرائی کی گھڑی آ پہنچی تو ایک قلیل گروہ نے ایک بہت بڑی تعداد پر فتح پائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر ان دو ظاہری اصولوں کی وجہ سے غالب رہا۔ پہلا اصول تنظیم واتحاد کی قوت اور دوسرا موت کو حقیر سمجھنا۔ لوگوں نے بدر کے دن اس نظام کے معجزہ کو مشاہدہ کرلیا۔ جب کہ مشرکین کے لشکر نے مضبوط، مستحکم صفوں پر دھاوا بول دیا، ان کو ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹا سکے، ایسی ثابت قدمی اور استقلال کے جوہر دکھائے جو اس سے پیشتر شاید ہی سننے میں آئے ہوں۔ لوگوں نے غزوہ بدر میں اس امر کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ تین سو آدمی جن کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تربیت وتنظیم فرمائی تھی، قلیل مدت کے اندر روئے زمین کو خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے فتح کر لیتے ہیں اور سیاہ وسفید اور سرخ وزرد کے مالک بن جاتے ہیں۔ جنگ بدر کے خاتمہ کے بعد تمام دنیا نے معلوم کرلیا کہ تنظیم واتحاد اور موت کو حقیر سمجھنے کے اندر کس قدر زبردست قوت پوشیدہ ہے۔
پھر اس کے بعد جنگ احزاب میں بھی لوگوں نے اندازہ کرلیا کہ ایک وہ قوم جو اپنی زندگی سے زیادہ حق سے محبت رکھتی ہے' کس طرح فتح یاب ہوجاتی اور تنظیم کی بدولت ایک بہت بڑے لشکر پر غالب آجاتی ہے۔

واقعہ خندق میں منافقین کی قلعی کھل گئی۔ یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد وپیمان کو توڑ ڈالا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر کی تنظیم وتربیت میں کوئی خلل اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر قیادت استقلال واستقامت میں کوئی لغزش واقع نہ ہوئی۔ یہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل وتدبیر اور صبر وشجاعت کے بہترین نتائج تھے کہ مشرکین

کی جماعتیں مدینہ سے تاریک رات میں واپس لوٹ گئیں۔ ان کا شیرازہ منتشر ہو اور ان کی قوتیں تتر بتر ہو گئیں۔

آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی وہ سچی قیادت اور پیشوائی تھی جس نے مدینہ کو جنگ احد میں نجات دلائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت اقدام میں تیزی سے کام لیا جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر دشمن کے مقابلہ سے عاجز ہو گیا تھا۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لشکر کے ساتھ' جس میں تنظیم و اطاعت کی طاقت پیدا ہو چکی تھی' عجلت نہ فرماتے تو قریش کی قوم مدینہ پر دھاوا بول دیتی اور مسلمانوں کے باقی ماندہ لشکر کا بھی خاتمہ کر دیتی۔ یہی وہ اعلیٰ قیادت ہے جس نے قریش پر غلبہ پا لیا اور ایک ایسا دن آیا جس میں ہزیمت خوردہ لوگ فتح مندوں کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔

یہ بعض حقائق و واقعات ہیں جن کو ہم نے نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے جو تاریخ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت و منزلت ایک بادشاہ اور سیاست دان ہونے کی حیثیت سے کیا تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر قیادت کی قوت کہاں تک کارفرما تھی۔

تعجب و تحیر خیز امر تو یہ ہے کہ اس عسکری نظام و ترتیب نے اور واقعات و غزوات' تدبیر و تدبر اور مشورہ رائے کی وجہ سے اسلامی سلطنت کی تشکیل عمل میں آتی ہے جو مقصود بالذات نہیں تھی۔ جس نے تاریخ عالم میں جمہوریت و ریاست کے لیے سنگ بنیاد قائم کیا۔

اب ہم پوری بحث کا خلاصہ مختصر طور پر یوں بیان کرتے ہیں۔ ہرگز اس بات کا شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ سلطنت و حکومت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی غرض و غایت نہیں تھی بلکہ یہ ایک ضمنی اور عرضی شئے تھی اور یہ ایک ذریعہ تھا شرک و بت پرستی کو دور کرنے کا' وسیلہ تھا خدائے وحدہٗ لاشریک کا کلمہ بلند کرنے کا' تدبیر و صورت تھی تبلیغ و دعوت کی نشر و اشاعت کی کیونکہ مکہ والوں نے مسلمانوں پر حد درجہ مظالم ڈھائے اور ان کو بے جا اذیتیں اور تکلیفیں پہنچائیں۔ جب ان کے انسداد کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام جدوجہد رائیگاں گئی۔ اسلامی عقیدہ کی آزادی دشوار اور اس کے معتقدوں اور پیروکاروں کی زندگی دوبھر کر دی گئی اور دعوت و تبلیغ کی راہ میں ایک خلیج حائل ہو گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم قوت کا جواب

قوت ہی سے دینے کے لیے مجبور ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آزادی کامل کا مطالبہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسی طرف قرآن مجید نے فصیح و بلیغ انداز میں یوں اشارہ فرمایا ہے:

''وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ''

(سورۃ الحج، آیت نمبر 40)

''اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعض آدمیوں کو بعضوں کے ذریعہ سے دفع کرتا رہتا' تو گرجا گھر' مندر' عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے تباہ کر دیئے جاتے۔''

الغرض اس جہد و اجتہاد' عملی اقدام اور جارحانہ مدافعت سے ایک اساسی اور بنیادی اصول کا پتہ چلتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ زبردست اور تشدد پسند قوموں میں حریت اعتقاد کو رائج کیا جائے۔ جس طرح بطل اعظم نے شروع اسلام میں مصیبتوں اور ایذاؤں پر صبر و عزیمت سے کام لیا، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنظیم و اتحاد کو مستحکم کرنے اور حکومت الٰہیہ کے قیام کی سعی فرمائی۔

اسلام کا تصور کائنات:

فلسفۂ سیاست کے نقطہ نظر سے اگر تصور کائنات کا جائزہ لیا جائے تو حسب ذیل نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

1: اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کا اور خود انسان اور ان تمام چیزوں کا خالق ہے جن سے انسان اس دنیا میں مستفید ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''کہو اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہی یکتا ہے، سب کو مغلوب کر کے رکھنے والا۔''

(سورۃ نمبر ۲۱، آیت نمبر: ۱۳)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"اسی اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے اور جو کچھ زمین کی تہہ میں ہے۔"

(سورۃ نمبر ۲۰، آیت نمبر: ۸)

2: اس کائنات میں حاکمیت ایک اللہ کے سوا کسی کی ہے، نہ ہو سکتی ہے اور نہ کسی اور کا یہ حق ہے کہ حاکمیت میں اس کا کوئی حصہ ہو۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"فیصلے کا اختیار کسی کو نہیں ہے سوائے اللہ کے۔"

(سورۃ نمبر ۶، آیت نمبر ۵۷)

3: حاکمیت کی جملہ صفات اور اختیارات صرف اللہ ہی میں مرکوز ہیں۔ اس کائنات میں کوئی ان صفات اور اختیارات کا حامل سرے سے ہی نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"وہی اپنے بندوں پر غلبہ رکھنے والا اور وہی دانا اور ہر چیز سے باخبر ہے۔"

(سورۃ نمبر ۶، آیت نمبر: ۱۸)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"وہ اللہ بادشاہ ہے ہر عیب و نقص سے پاک ہے، غلطی سے مبرا ہے۔ وہ امن دینے والا، نگہبان، غالب، بزور حکم نافذ کرنے والا اور کبریائی کا مالک ہے۔"

(سورۃ نمبر ۵۹، آیت نمبر ۲۳)

سورۃ آل عمران میں ارشاد ہے:

"کہو خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے! ساری بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ تو ہر چیز پر قادر ہے۔"

(سورۃ نمبر ۳، آیت نمبر ۳۶)

حاکمیتِ الٰہیہ:

کائنات کے اسی تصور کی بنیاد پر قرآن مجید کہتا ہے کہ انسانوں کا حقیقی فرمانروا اور حاکم بھی وہی ہے جو کائنات کا حاکم و فرمانروا ہے، انسانی معاملات میں بھی حاکمیت کا حق اسی کو پہنچتا ہے اور اس کے سوا کوئی انسانی طاقت بطور خود حکم دینے اور فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں ہے۔

اسلام کہتا ہے کہ کائنات کا رب ہی درحقیقت انسان کا رب ہے اور اس کی ربوبیت تسلیم کی جانی چاہئے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ o مَلِكِ النَّاسِ o اِلٰهِ النَّاسِ o"

"کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب کی، انسانوں کے بادشاہ اور انسانوں کے معبود کی۔"

(سورۃ الناس، آیت نمبر 1 تا 3)

1: اسلام کہتا ہے کہ حکم اور فیصلہ کا حق اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ اسی کی بندگی انسانوں کو کرنی چاہئے اور یہی صحیح طریق کار ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

"حکم اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے، اس کا فرمان ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔"

(سورۃ نمبر ۱۲، آیت نمبر: ۴۰)

2: سورۃ آل عمران میں فرمایا:

"وہ کہتے ہیں کہ ہمارا بھی کچھ اختیار ہے۔؟ کہو اختیار سارا اللہ ہی کا ہے۔"

(سورۃ نمبر ۳، آیت نمبر ۱۵۴)

3: دوسری جگہ ہے:

"خبردار! اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر (حکم) ہے۔"

(سورۃ نمبر ۷، آیت نمبر: ۵۴)

4: اسلام کہتا ہے کہ حکم دینے کا حق اللہ کو اس لئے ہے کہ وہ کائنات کا بادشاہ ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"چور مرد اور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ کے لئے ہے۔؟"

(سورۃ النور)

5: اسلام کہتا ہے کہ اللہ کا حکم اس لئے برحق ہے کہ وہی حقیقت کا علم رکھتا ہے اور وہی صحیح رہنمائی کرسکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناپسند ہو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے ایک چیز تمہیں پسند ہو اور تمہارے لئے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

(سورۃ نمبر ۲، آیت نمبر: ۲۱۶)

اسلام کا مقصد اتنا ہی نہیں کہ افراد کی اخلاقی اصلاح کردی جائے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ تدریجی مگر بنیادی انقلاب بنی نوع انسان کی پوری اجتماعی زندگی میں برپا کیا جائے۔ اسلام نے قومی و نسلی زاویہ نظر کو بدل کر اس کی جگہ خالص انسانی احساس و شعور پیدا کیا۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ صرف اسلام ہی بنیاد و اساس ہے قومیت کی، خواہ اسے تہذیبی مفہوم میں لیا جائے، خواہ سیاسی مفہوم میں۔ یہی سبب ہے کہ قرآن مجید نے صاف صاف اعلان کردیا کہ اگر کسی شخص نے اسلام کے سوا کسی اور ضابطہ حیات و دین کو اختیار کیا تو یہ بات ہرگز قبول نہ کی جائے گی۔

ان وجوہ سے قرآن مجید فیصلہ کرتا ہے کہ اطاعت خالصۃً اللہ کی اور پیروی اسی کے قانون کی ہونی چاہئے۔ اس کو چھوڑ کر دوسروں کی یا اپنی خواہشات نفس کی پیروی ممنوع ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اے نبی! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے۔ پس تم دین کو اللہ کیلئے خالص کر کے اس کی بندگی کرو۔ خبردار! دین خالص اللہ ہی کیلئے ہے۔"

(سورۃ نمبر ۳۹)

اسلام کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی معاملات کو منضبط کرنے کے لئے جو حدیں مقرر کردی ہیں ان سے تجاوز کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔"

(سورۃ نمبر ۲، آیت نمبر: ۲۲۹)

نیز اسلام کہتا ہے کہ اللہ کے خلاف جو حکم بھی ہے نہ صرف غلط اور ناجائز ہے بلکہ کفر اور ظلم و فسق ہے۔ اس طرح کا ہر فیصلہ جاہلیت کا فیصلہ ہے جس کا انکار لازمہ ایمان ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔"
(سورۃ نمبر ۵، آیت نمبر ۴۴)

ایک اور جگہ ارشاد ہے:
"اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔"
(سورۃ نمبر ۵، آیت نمبر: ۴۵)

پھر ارشاد فرمایا:
"اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔"
(سورۃ نمبر ۵، آیت نمبر: ۴۷)

مقام رسول ﷺ:

اللہ کا وہ قانون جس کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے، انسان تک اس کے پہنچنے کا ذریعہ صرف اس کا رسول ہے۔

رسول ہی خدا کی طرف سے اس کے احکام اور اس کی ہدایات انسانوں کو پہنچاتا ہے اور اپنے قول اور عمل سے ان احکام وہدایات کی تشریح کرتا ہے۔ پس رسول انسانی زندگی میں خدا کی قانونی حاکمیت کا نمائندہ ہے اور اس بنا پر اس کی اطاعت لازمی ہے۔

1: اللہ تعالیٰ ہی کا یہ حکم ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر ونواہی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کو بے چون وچرا تسلیم کیا جائے حتیٰ کہ ان پر دل میں ناگواری پیدا نہ ہو۔ ورنہ ایمان کی خیر نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:
"اور جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔"
(سورۃ نمبر ۴، آیت نمبر: ۸۰)

2: پھر فرمایا:
"جو کچھ رسول تمہیں دیں اسے لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے باز رہو اور اللہ سے ڈرو۔ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔"
(سورۃ نمبر ۵۹، آیت نمبر ۷)

3: پھر فرمایا:

"پس نہیں! تیرے رب کی قسم! وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ (اے نبی!) وہ تجھے اپنے باہمی اختلاف میں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں اور پھر جو تو فیصلہ کرے اس پر اپنے دل میں بھی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ تسلیم کرلیں۔"

(سورۃ نمبر۴، آیت نمبر:۶۵)

اللہ اور رسول کا حکم قرآن کریم کی رو سے وہ بالاتر قانون ہے جس کے مقابلہ میں اہل ایمان صرف اطاعت ہی کا رویہ اختیار کر سکتے ہیں۔ جن معاملات میں خدا اور رسول اپنا فیصلہ دے چکے ہیں ان میں کوئی مسلمان خود آزادانہ فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہے اور اس فیصلے سے انحراف ایمان کی ضد ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو اس معاملے میں ان کے لئے کوئی اختیار باقی رہ جائے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔"

(سورۃ نمبر۳۳، آیت نمبر:۳۶)

خلافت:

انسانی حکومت کی صحیح صورت قرآن کریم کے مطابق یہ ہے کہ ریاست اللہ اور رسول کی قانونی بالادستی مانے، اس کے حق میں حاکمیت سے دست بردار ہو جائے اور حاکم حقیقی کے تحت "خلافت" کی حیثیت قبول کرلے۔ اس حیثیت میں اس کے اختیارات تشریعی ہوں، عدالتی ہوں یا انتظامی لازماً ان حدود میں محدود ہوں گے جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اے نبی! ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف حق کے ساتھ نازل کی ہے جو تصدیق کرتی ہے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی اور نگہبان ہے ان پر۔ پس جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے تم اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی میں اس حق سے منہ نہ موڑو جو تمہارے پاس آیات ہیں۔"

(سورۃ نمبر۲۴، آیت نمبر:۵۵)

اس خلافت کا جو تصور قرآن مجید میں دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ زمین میں انسان کو جو قدرتیں بھی حاصل ہیں اس کی عطا اور بخشش سے حاصل ہیں۔ خدا نے خود ان کو اس حیثیت میں رکھا ہے کہ وہ اس کی بخشی ہوئی طاقتوں کو اس کے دیئے ہوئے اختیار سے اس کی زمین میں استعمال کرے۔ اس لئے انسان یہاں خود مختار مالک نہیں، بلکہ اصل مالک کا خلیفہ ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً"

"اور یاد کرو جب تمہارے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔"

(سورۃ البقرۃ، آیت نمبر 30)

لیکن یہ خلافت صحیح اور جائز خلافت صرف اس صورت میں ہوسکتی ہے جبکہ مالک حقیقی کے حکم کے تابع ہو۔ اس سے روگردانی کر کے جو خود مختارانہ نظام حکومت بنایا جائے وہ خلافت کے بجائے بغاوت بن جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"تم میں جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں، اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اس نے اس سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا، انہیں چاہئے کہ وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔"

(سورۃ نمبر ۲۴، آیت نمبر ۵۵)

اس جائز اور صحیح نوعیت کی خلافت کا حامل کوئی ایک شخص یا خاندان یا طبقہ نہیں ہوتا بلکہ وہ جماعت اپنی مجموعی حیثیت میں ہوتی ہے جس نے مذکورہ بالا اصولوں کو تسلیم کر کے اپنی ریاست قائم کی ہو۔ سورۃ نمبر ۲۴ کی آیت نمبر ۵۵ کے الفاظ اس معاملہ میں صریح ہیں۔ ان کی رو سے اہل ایمان کا ہر فرد خلافت میں برابر کا حصہ دار ہے۔ کسی شخص یا طبقہ کو عام مومنین کے اختیاراتِ خلافت سلب کر کے انہیں اپنے اندر مرکوز کر لینے کا حق نہیں ہے، نہ کوئی شخص یا طبقہ اپنے حق میں خدا کی خصوصی خلافت کا دعویٰ کرسکتا ہے۔ یہی چیز اسلامی خلافت کو ملوکیت، طبقاتی حکومت اور تھیا کریسی سے الگ کر کے اسے جمہوریت کے رخ پر موڑتی

ہے، لیکن اس میں اور مغربی تصور جمہوریت میں اصولی فرق یہ ہے کہ مغربی تصور کی جمہوریت عوامی حاکمیت کے اصول پر قائم ہوئی ہے اور اس کے برعکس اسلام کی جمہوریت خلافت میں خود عوام حاکم کی ملکیت تسلیم کر کے اپنے اختیارات کو برضا و رغبت قانون خداوندی کی حدود میں محدود کر لیتے ہیں۔

اس نظام خلافت کو چلانے کے لئے جو ریاست قائم ہوگی عوام اس کی صرف اطاعت فی المعروف (نیکی کے کام میں اطاعت کرنے) کے پابند ہوں گے۔ معصیت میں نہ کوئی اطاعت ہے اور نہ تعاون۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ان میں سے کسی گنہگار اور ناشکرے کی اطاعت نہ کرو۔"

(سورۃ نمبر ۷۶، آیت نمبر ۲۴)

حدیث مبارکہ میں ہے:

"لا طاعة فی المعصیة"

"گناہ کے معاملے میں اطاعت نہیں کی جائے گی۔"

اس ریاست کا پورا کام، اس کی تاسیس و تشکیل سے لے کر رئیس مملکت کے انتخاب اور انتظامی معاملات تک، اہل ایمان کے باہمی مشوروں سے چلنا چاہیے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ مشاورت بلاواسطہ ہو یا منتخب نمائندوں کے ذریعہ سے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور ان مومنوں کا کام آپس کے مشوروں سے چلتا ہے۔"

(سورۃ نمبر ۴۲، آیت نمبر ۳۸)

اولی الامر کی صفات:

اس ریاست کا نظام چلانے کے لئے اولی الامر کے انتخاب میں جن امور کو ملحوظ رکھنا چاہئے وہ یہ ہیں:

1: وہ ان اصولوں کو جانتا ہو جن کے مطابق خلافت کا نظام چلانے کی ذمہ داری اس کے سپرد کی جا رہی ہے۔ اس لئے کہ ایک نظام کو چلانے کی ذمہ داری اس کے اصولی مخالفین پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ اور رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں اولی الامر ہوں۔"

(سورۃ نمبر ۴، آیت نمبر: ۵۹)

2: یہ کہ وہ ظالم، فاسق و فاجر، خدا سے غافل اور حد سے گزر جانے والا نہ ہو، بلکہ ایماندار، خداترس، نیکوکار ہو۔ کوئی ظالم یا فاسق اگر امارت کے منصب پر قابض ہو جائے تو اس کی امارت اسلام کی نگاہ میں باطل ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور تو اطاعت نہ کر کسی ایسے شخص کی جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کی ہے اور جس کا کام حد سے گزرا ہوا ہے۔''

(سورۃ نمبر ۱۸، آیت نمبر: ۲۸)

3: وہ نادان اور جاہل نہ ہو، بلکہ ذی علم، دانا، ذی فہم اور کاروبار کو چلانے کے لئے جسمانی اہلیت رکھتا ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے:

''اپنے اموال جنہیں اللہ نے تمہارے لئے ذریعہ قیام بنایا ہے نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو۔''

4: وہ ایسا امانت دار ہو کہ ذمہ داریوں کا بوجھ اس پر اعتماد کے ساتھ رکھا جا سکے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا''

''اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے حوالے کرو۔''

(سورۃ النساء، آیت نمبر ۵۸)

ریاست اسلامی کے بنیادی اصول:

اس ریاست کا دستور جن بنیادی اصولوں پر قائم ہے وہ یہ ہیں:

''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔''

(سورت نمبر ۴، آیت نمبر ۵۹)

یہ آیت چھ دستوری نکات واضح کرتی ہے:

۱: اللہ اور رسول کی اطاعت کا ہر اطاعت پر مقدم ہونا۔

2: اولی الامر کی اطاعت کا اللہ اور رسول کی تعلیمات کے تحت ہونا۔

3: اولی الامر اہل ایمان سے ہوں۔

4: لوگوں کو حکام اور حکومت سے نزاع کا حق ہے۔

5: نزاع کی صورت میں آخری سند اللہ اور اس کے رسول کا قانون ہے۔

6: خلافت ایک ایسا ادارہ ہونا چاہیے جو اولی الامر اور عوام کے دباؤ سے آزاد رہ کر اس بالاتر قانون کے مطابق جملہ نزاعات کا فیصلہ کرے۔

منتظمہ و مقننہ اور ان کے اختیارات:

منتظمہ کے اختیارات لازماً حدود اللہ سے محدود اور خدا اور رسول کے قانون سے محصور ہوں گے، جس سے تجاوز کر کے وہ نہ کوئی ایسی پالیسی اختیار کر سکتی ہے، نہ کوئی ایسا حکم دے سکتی ہے جو معصیت کی تعریف میں آتا ہو، کیونکہ اس آئینی دائرے سے باہر جا کر اسے اطاعت کے مطالبہ کا حق ہی نہیں پہنچتا (اس کے متعلق قرآن و احادیث کے واضح احکام ہم اوپر بیان کر چکے ہیں)

علاوہ بریں یہ منتظمہ لازماً شوریٰ یعنی انتخاب کے ذریعہ سے وجود میں آنی چاہیے۔ اس اور شوریٰ یعنی مشاورت دونوں کے متعلق قرآن مجید قطعی صورتیں مقرر نہیں کرتا بلکہ ایک وسیع اصول قائم کر کے اس پر عمل درآمد کی صورتوں کو مختلف زمانوں میں معاشرے کے حالات اور ضروریات کے مطابق طے کرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیتا ہے۔

مقننہ لازماً ایک شورائی ہیئت ہونی چاہئے لیکن اس کے اختیارات قانون سازی بہر حال ان حدود سے محدود ہوں گے۔ جہاں تک ان امور کا تعلق ہے جن میں خدا اور رسول نے واضح احکام دیئے ہیں یا حدود اور اصول مقرر کئے ہیں، یہ مقننہ ان کی تعبیر و تشریح کر سکتی ہے مگر ان میں رد و بدل نہیں کر سکتی۔ رہے وہ امور جن کے لئے بالاتر قانون ساز نے کوئی قطعی احکام نہیں دیئے ہیں، ان میں اسلام کی اسپرٹ اور اس کے اصول عامہ کے مطابق مقننہ ہر ضرورت کے لئے قانون سازی کر سکتی ہے، کیونکہ ان کے بارے میں کوئی حکم نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ شارع نے ان کو اہل ایمان کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

عدلیہ اور اس کے اختیارات:

عدلیہ ہر طرح کی مداخلت اور دباؤ سے آزاد ہونی چاہیے، تا کہ وہ عوام اور حکام سب کے مقابلہ میں قانون کے مطابق بے لاگ فیصلہ دے سکے۔ اسے لازماً ان حدود کا پابند رہنا ہوگا اور اس کا فرض ہوگا کہ اپنی اور دوسروں کی خواہشات سے متاثر ہوئے بغیر ٹھیک ٹھیک حق اور انصاف کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کر اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔"

(سورۃ نمبر ۵، آیت نمبر: ۴۸)

مقصد ریاست:

ریاست کو دو بڑے مقاصد کے لئے کام کرنا چاہیے۔

1: انسانی زندگی میں عدل قائم ہو اور ظلم و جور ختم ہو جائے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان بھی نازل کی تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور ہم نے لوہا نازل کیا جس میں سخت قوت اور لوگوں کے لئے منافع ہے۔"

(سورۃ نمبر ۵۷، آیت نمبر ۲۵)

2: ریاست کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ حکومت کی طاقت اور وسائل سے بھلائی اور نیکی کو ترقی دی جائے اور برائی کو دبایا جائے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دیں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔"

(سورۃ نمبر ۲۲، آیت نمبر: ۴۱)

حدیث مبارکہ میں ہے:

"ان اللہ یزع بالسلطان مالا یزع بالقران"

"اللہ تعالیٰ (اپنے اطاعت گزاروں کی) حکومت کی قوت کے ذریعے وہ کام لیتا ہے جو وہ (محض) قرآن (کے تلقینی ذریعے) سے نہیں لیا کرتا۔"

اسلامی ریاست کی خصوصیات:

قرآن مجید کے ان نکات میں جس ریاست کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اس کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

1: ایک آزاد قوم کی طرف یہ شعوری عہد اس ریاست کو وجود میں لاتا ہے کہ وہ پوری خود مختاری کے مالک ہوتے ہوئے اپنی مرضی سے خود رب العالمین کے سامنے سر تسلیم خم کر دے گی اور اس کے ماتحت حاکمیت کی بجائے خلافت کی حیثیت قبول کر کے ان ہدایات واحکام کے مطابق کام کرے گی جو اس نے اپنی کتاب اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے عطا کئے ہیں۔

2: وہ (قوم) حاکمیت کو اللہ کے لئے خاص کرنے کی حد تک تہیا کر لیتی سے الگ ہو جاتی ہے۔ مذہبی پیشواؤں کے کسی خاص طبقے کو خدا کی خصوصی خلافت ٹھہرانے اور حل و عقد کے سارے اختیارات اس طبقے کے حوالے کر دینے کے بجائے وہ حدود ریاست میں رہنے والے تمام اہل ایمان کو (جنہوں نے رب العالمین کے آگے سر تسلیم خم کرنے کا شعوری عہد کیا ہے) خدا کی خلافت کا حامل قرار دیتی ہے اور حل وعقد کے آخری اختیارات مجموعی طور پر ان کے حوالے کرتی ہے۔

3: وہ جمہوریت کے اس اصول میں "Democracy" سے متفق ہے کہ حکومت کا بننا، بدلنا اور چلایا جانا بالکل عوام کی رائے سے ہونا چاہیے، لیکن اس میں عوام مطلق العنان نہیں ہوتے کہ ریاست کا قانون، اس کے اصول حیات کو داخلی وخارجی سیاست اور اس کے وسائل و ذرائع سب ان کی خواہشات کی تابع ہوں اور جدھر وہ مائل ہوں یہ ساری چیزیں بھی اس طرف مڑ جائیں، بلکہ اس میں خدا اور رسول کا بالاتر قانون اپنے اصول وحدود اور اخلاقی احکام وہدایات سے عوام کی خواہشات پر ضبط قائم رکھتا ہے اور ریاست ایک ایسے متعین راستے پر چلتی ہے جسے بدل دینے کے اختیارات نہ اس کی منتظمہ کو حاصل ہوتے ہیں، نہ عدلیہ کو، نہ مقننہ کو، نہ مجموعی طور پر پوری قوم کو، الا یہ کہ قوم خود اپنے عہد کو توڑ دینے کا فیصلہ کر کے دائرۂ ایمان سے نکل

جائے۔

4: وہ ایک نظریاتی ریاست ہے جس کو چلانا فطرتاً انہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو اس کے بنیادی نظریے اور اصول کو تسلیم کرتے ہوں، لیکن تسلیم نہ کرنے والے جتنے لوگ بھی اس کے حدود میں تابع قانون ہو کر رہنا قبول کر لیں انہیں وہ تمام مدنی حقوق اسی طرح دیتی ہے جس طرح تسلیم کرنے والوں کو دیتی ہے۔

5: اسلامی ریاست ایک ایسی ریاست ہے جو رنگ، نسل، زبان یا جغرافیہ کی عصبیتوں کے بجائے صرف اصول کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ زمین کے ہر گوشے میں نسل انسانی کے جو افراد بھی چاہئیں ان اصولوں کو قبول کر سکتے ہیں اور کسی امتیاز وتعصب کے بغیر بالکل مساوی حقوق کے ساتھ اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اس نوعیت کی خالص اصولی ریاست کے لئے ایک عالمی ریاست بن جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، لیکن اگر زمین کے مختلف حصوں میں بہت سی ریاستیں بھی اس نوعیت کی ہوں تو وہ سب کی سب یکساں اسلامی ریاستیں ہوں گی۔ اس طرح کسی قوم سے کشمکش کے بجائے ان کے درمیان پورا پورا برادرانہ تعاون ممکن ہوگا اور وہ کسی وقت بھی متفق ہو کر اپنا ایک عالمگیر وفاق قائم کر سکیں گی۔

6: سیاست کو مفاد اور اغراض کے بجائے اطلاق کے تابع کرنا اور اسے خدا ترسی و پرہیز گاری کے ساتھ چلانا اس ریاست کی اصل روح ہے۔ اس میں فضیلت کی بنیاد اخلاقی فضیلت ہے۔ اس کار خیر کے فرماؤں اور اہل حل وعقد کے انتخاب میں بھی ذہنی وجسمانی صلاحیت کے ساتھ اخلاق کی پاکیزگی سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے۔ اس کے داخلی نظام کا بھی شعبہ دیانت، امانت اور عدل وانصاف پر چلنا چاہئے اور اس کے خارجی نظام کا بھی ہر شعبہ دیانت وامانت اور عدل وانصاف پر چلنا چاہئے۔ اس کی خارجی سیاست بھی پوری راست بازی، قول وقرار کی پابندی، امن پسندی، بین الاقوامی عدل اور حسن سلوک پر قائم ہونی چاہئے۔

7: یہ ریاست محض پولیس کے فرائض انجام دینے کے لئے نہیں ہے کہ اس کا کام صرف نظم وضبط قائم کرنا اور سرحدوں کی حفاظت کرنا ہو، بلکہ یہ ایک مقصدی ریاست ہے

جسے ایجابی طور پر اجتماعی عدل اور بھلائیوں کے فروغ اور برائیوں کے استیصال کے لئے کام کرنا چاہئے۔

حقوق، مرتبے اور مواقع میں مساوات، قانون کی فرمانروائی، نیکی میں تعاون اور بدی میں عدم تعاون، خدا کے سامنے ذمہ داری کا احساس، حق سے بڑھ کر فرض کا شعور، افراد، معاشرے اور ریاست سب کا ایک مقصد پر متفق ہونا اور معاشرے میں کسی شخص کو ناگزیر لوازم حیات سے محروم نہ رہنے دینا یہ اسلامی ریاست کی بنیادی قدریں ہیں۔

اسلام نے فرد اور ریاست کے درمیان اس نظام میں ایسا توازن قائم کیا ہے کہ نہ ریاست مختار مطلق اور ہمہ گیر اقتدار کی مالک بن کر فرد کو اپنا بے بس مملوک بنا سکتی ہے اور نہ فرد بے قید آزادی پا کر خودسر اور اجتماعی مفاد کا دشمن بن سکتا ہے۔ اس میں ایک طرف افراد کو بنیادی حقوق دے کر اور حکومت کو بالاتر قانون اور شوریٰ کا پابند بنا کر انفرادی شخصیت کے لئے نشوونما کے پورے مواقع فراہم کئے گئے ہیں اور اقتدار کی بے جا مداخلت سے اس کو محفوظ کر دیا گیا، مگر دوسری طرف فرد کو بھی ضابطہ اخلاق میں کسا گیا ہے اور اس پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ قانون خداوندی کے مطابق کام کرنے والی حکومت کی دل سے اطاعت کرے، بھلائی میں اس کے ساتھ مکمل تعاون کرے، اس کے نظام میں خلل ڈالنے سے باز رہے اور اس کی حفاظت کے لئے جان و مال کی کسی قربانی سے دریغ نہ کرے۔

بنیادی حقوق:

اس نظام میں رہنے والے مسلم و غیر مسلم باشندوں کے بنیادی حقوق یہ ہیں جنہیں تعدی سے محفوظ رکھنا ریاست کا فرض ہے:

1: جان کا تحفظ۔
2: حقوقِ ملکیت کا تحفظ۔
3: عزت کا تحفظ۔
4: نجی زندگی کا تحفظ۔
5: ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق۔
6: امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔
7: آزادیٔ اجتماع۔
8: ضمیر و اعتقاد کی آزادی کا حق۔
9: مذہبی دل آزاری سے تحفظ کا حق۔
10: بس اپنا جواب دہ ہونا۔

11: بغیر ثبوت کے کاروائی نہ کی جائے۔

12: حاجت منداور معذور افراد کو ضروریات کی فراہمی۔

13: مساوات کا پرچار۔

جان کا تحفظ: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"کسی جان کو جسے اللہ نے حرام کیا ہے حق کے بغیر قتل نہ کرو۔"

(سورۃ نمبر ۱۷، آیت نمبر ۳۳)

حقوق ملکیت کا تحفظ: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اپنے مال آپس میں ناجائز طریقوں سے نہ کھاؤ۔"

(سورۃ نمبر ۲، آیت نمبر: ۱۸۸)

عزت کا تحفظ: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے اور نہ تم ایک دوسرے کو عیب لگاؤ، نہ ایک دوسرے کو برے لقب دو، نہ تم میں سے کوئی کسی کے پیٹھ پیچھے اس کی بدی کرے۔"

(سورۃ نمبر ۴۹، آیت نمبر: ۱۱اور ۱۲)

نجی زندگی کا تحفظ: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو، جب تک کہ اجازت نہ لے لو۔"

(سورۃ نمبر ۲۴، آیت نمبر: ۲۷)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور لوگوں کے بھید نہ ٹٹولو۔"

(سورۃ نمبر ۴۹، آیت نمبر: ۱۲)

ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اللہ کسی پر زبان کھولنا پسند نہیں کرتا الا یہ کہ کسی پر ظلم ہوا ہو۔"

(سورۃ نمبر ۴، آیت نمبر: ۱۴۸)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر: امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں تنقید

کا حق بھی شامل ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"تم وہ بہترین امت ہو جسے نکالا گیا ہے لوگوں کے لئے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

(سورۃ نمبر ۳، آیت نمبر: ۱۱۰)

آزادی اجتماع: اسلام میں آزادی اجتماع کی اجازت ہے بشرطیکہ وہ نیکی اور بھلائی کے لئے استعمال ہو اور معاشرے میں تفرقے اور بنیادی اختلاف برپا کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور ہونا چاہیے تم میں سے ایک گروہ جو دعوت دے بھلائی کی طرف، حکم دے نیکی کا اور روکے بدی سے، ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور نہ ہو جاؤ ان لوگوں کی طرح جو متفرق ہو گئے اور جنہوں نے اختلاف کیا، جبکہ ان کے پاس واضح ہدایت آ چکی تھی۔ ایسے لوگوں کے لئے بڑا عذاب ہے۔"

(سورۃ نمبر ۳، آیت نمبر ۱۰۴ اور ۱۰۵)

ضمیر و اعتماد کی آزادی کا حق: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"دین میں جبر نہیں ہے۔"

(سورۃ نمبر ۲، آیت نمبر: ۲۵۶)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں۔؟"

(سورۃ نمبر ۱۰، آیت نمبر: ۹۹)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"فتنہ قتل سے بھی شدید تر ہے۔"

(سورۃ نمبر ۲، آیت نمبر ۱۹۱)

مذہبی دل آزادی سے تحفظ کا حق: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن معبودوں کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو۔"

(سورۃ نمبر ۶، آیت نمبر ۱۰۸)

اس معاملہ میں قرآن مجید یہ صراحت کرتا ہے کہ مذہبی اختلافات میں بحث تو کی جاسکتی ہے مگر وہ احسن طریقہ سے ہونی چاہیے۔

خود اپنا جواب دہ ہونا: اسلام کہتا ہے کہ ہر شخص صرف اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ دوسروں کے اعمال کی ذمہ داری میں اسے نہ پکڑا جائے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ہر متنفس جو کماتا ہے اس کا وبال اسی پر ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔"

(سورۃ نمبر ۶، آیت نمبر ۸۴)

بغیر ثبوت کے کاروائی نہ کی جائے: اسلام کہتا ہے کہ کسی شخص کے خلاف کوئی کاروائی ثبوت کے بغیر اور انصاف کے معروف تقاضے پورے کئے بغیر نہ کی جائے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو بے جانے بوجھے نقصان پہنچاؤ اور پھر اپنے کئے پر پچھتاؤ۔"

(سورۃ نمبر ۴۹، آیت نمبر:۶)

حاجت مند اور معذور افراد کو ضروریات کی فراہمی:

اسلام کہتا ہے کہ حاجت مند اور محروم افراد کو ان کی ناگزیر ضروریات زندگی فراہم کی جائیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور ان کے مالوں میں حق ہے مدد مانگنے والے اور محروم کا۔"

(سورۃ نمبر ۵۱، آیت نمبر:۱۹)

مساوات کا پرچار: اسلام کہتا ہے کہ ریاست اپنی رعایا میں تفریق اور امتیاز نہ رکھے، بلکہ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"فرعون نے زمین میں سر اٹھایا اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کیا۔ جن میں سے ایک گروہ کو وہ کمزور بنا کر رکھتا تھا۔ یقیناً وہ مفسد لوگوں میں سے تھا۔"

☆☆☆

باب نمبر 6:

اسلام کی معاشی تعلیمات

مذہب اور معاش:

سب سے پہلے قرآن مجید فرد اور جماعت دونوں کے ذہن سے اس باطل نظریہ کو ختم کرتا ہے کہ اخلاق اور مذہب کو معاشی زندگی سے بھلا کیا سروکار؟ قرآن مجید بڑے بلیغ انداز میں معیشت اور اخلاق کا تعلق بیان کرتا ہے۔ ارشاد ہے:

"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ o فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ o"

(سورۃ الجمعۃ، آیت نمبر: 9-10)

"مسلمانو! جب جمعہ کے دن نماز کے لئے اذان دی جائے تو تم اللہ کی یاد (نماز جمعہ) کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ اگر تم جانتے ہو تو یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ پھر جب نماز ختم ہو جائے تو تم زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرتے رہو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

قرآن پاک میں متعدد مقامات پر معاش کو "فضل اللہ" کہا گیا ہے اور اس سے ذہن میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ سب اللہ کی عنایت سے ہے اور معاشی زندگی میں بھی انسان کو اسی طرح خدا کی حدود کا پابند بننا چاہیے جس طرح باقی تمام زندگی میں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"رجال لاتلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله"

"(حقیقی متقی) وہ لوگ (ہیں) جنہیں خرید و فروخت اور تجارت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔"

(سورۃ النور، آیت نمبر: ۳۷)

قرآن مجید کی معاشی تعلیمات کا ایک اہم مقصد انسانوں کے درمیان عدل و انصاف کا قیام ہے۔ مثبت طور پر جو چیزیں ظلم و تعدی کا ذریعہ بنتی ہیں ان کا سدباب کیا گیا ہے۔ اس کام میں جو مرکزی قدر سامنے آتی ہے وہ معاشی عدل کا قیام ہے۔

اسلام کے مثبت معاشی مقاصد میں قیام عدل، معاشی فارغ البالی کا حصول، غربت کا انسداد اور تمام انسانوں کو معاشی جدوجہد کے مساوی مواقع فراہم کرنا بھی شامل ہے۔

اسلام معاشی تنگی کو دور کرنے کا طریقہ یہ بتاتا ہے کہ حصول رزق کی کوشش کی جائے اور پیداوار بڑھانے کے لئے ذرائع کو استعمال میں لایا جائے۔ اسلام محض غربت، افلاس یا معیار زندگی کے گرنے کے خطرے سے انسان کشی اور زندگی کو تلف کرنے کی پالیسی کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کہتا ہے کہ معاشی مسئلہ کا حل انسانوں کو کم کرنا نہیں بلکہ معیشت کو فروغ دینا ہے۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

"ولا تقتلوا اولادكم خشية املاق نحن نرزقهم واياكم ان قتلهم كان خطا كبيرا"

(سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر: ۳۱)

"اور تم اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم تمہیں اور ان کو، سب کو رزق دیں گے۔ بیشک ان کو مار ڈالنا بہت بڑی خطا ہے۔"

یہاں یہ بات خصوصیت سے قابل غور ہے کہ غربت اور افلاس اور معیار زندگی کے گرنے کے خطرے کے سبب قتل اولاد سے منع کیا گیا ہے۔ قرآن مجید آبادی کے حقیقی مسئلے کا حل اضافۂ پیداوار کی شکل میں کرتا ہے، انسان کو کم کرنے کی شکل میں نہیں۔

اسلام پیداوار کے اضافے اور معیشت کے ہمہ جہتی فروغ کی پالیسی اختیار کرتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی شرط بھی لگاتا ہے کہ آمدنی جائز ذرائع سے حاصل کی

جائے۔ وہ اس نفع کو جو حرام ذرائع سے حاصل ہو دوزخ کی آگ قرار دیتا ہے۔ قرآن وحدیث میں رزق حلال کی جتنی اہمیت بیان کی گئی ہے وہ اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ اسلامی آئیڈیالوجی صرف جائز اور حلال رزق کے فروغ کی کوشش کرے گی اور ان تمام ذرائع کا بھی انسداد کرے گی جو حرام ہیں اور جن کو شریعت ناجائز وناروا قرار دیتی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:

"یایھا الناس کلوا مما فی الارض حلالا طیبا"

(سورۃ البقرہ، آیت نمبر:۱۶۸)

"اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے حلال اور پاک چیزیں کھاؤ۔"

پھر ان چیزوں کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے جو حرام ہیں۔ ان میں سب سے بڑھ کر سود ہے۔ خواہ اس کی کوئی بھی شکل ہو۔ قرآن مجید نے سود کو خدا اور اس کے رسول کے خلاف جنگ قرار دیا ہے۔ اس طرح اسلام آمدنی کے اُن تمام ذرائع کو بند کر دیتا ہے جو غیر منصفانہ ہیں اور جس کی وجہ سے معاشرہ میں فساد اور عدم استحکام رونما ہوتا ہے۔

اسلام نے حلال کے ساتھ "طیب" کی بھی قید لگائی ہے۔ مطلب یہ کہ کسب معاش میں محض یہ احتیاط کافی نہیں ہے کہ چیز اللہ کی حرام کی ہوئی اشیاء کی فہرست میں سے نہ ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ چیز جائز ذریعہ سے حاصل کی جائے، ورنہ اگر جائز ذریعہ سے حاصل نہ کی جائے گی تو وہ بھی حرام ہی قرار پائے گی۔

طلب حلال کے ساتھ ساتھ اسلام انسان کو جائز مصارف پر دولت خرچ کرنے کی ترغیب بھی دیتا ہے اور اسراف وتبذیر سے روکتا ہے، جس کی وجہ سے دولت کا بے جا استعمال اور ضیاع رک جاتا ہے اور وہ تعمیری مقاصد کے لئے استعمال ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"ولا تبذر تبذیرا ان المبذرین کانوا اخوان الشیطن"

(سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر:۲۶ اور ۲۷)

"اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ، کیونکہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان

کے بھائی ہیں۔"

اسلام اور گردش دولت:

اسلام نے دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہو جانے کو بھی پسند نہیں کیا اور اس بات کا انتظام کیا ہے کہ مختلف قانونی اور اخلاقی تدابیر سے دولت کی تقسیم زیادہ منصفانہ ہو اور وہ پورے معاشرہ میں گردش کرے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ"

(سورۃ الحشر، آیت نمبر: ۷)

"ایسا نہ ہو کہ مال و دولت صرف تم میں سے امیروں ہی میں محدود ہو کر رہ جائے۔"

اسلام میں دولت کی تقسیم کے لئے مندرجہ ذیل صورتیں تجویز کی گئی ہیں:

1: زکوۃ اور عشر۔ 2: صدقات واجبہ۔
3: انفاق۔ 4: وراثت۔
5: حق سوی الزکوۃ۔ 6: العفو۔

۱۔ زکوۃ:

زکوۃ ہر صاحب نصاب مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ اس کے ذریعہ دولت مستقل امراء سے غرباء کی طرف منتقل ہوتی ہے اور اس طرح اس کی گردش پورے معاشرہ میں عمل میں آتی ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ یہ کوئی خیرات نہیں بلکہ فقراء و مساکین کا "حق" ہے۔

اسی طرح ہر زمیندار پر اس کی پیداوار پر عشر لازم ہے۔ وہ پیداوار سبزی ہو یا فصل۔ دنیا میں دو قسم کے علاقے ہیں۔ ایک وہ جہاں کی پیداور کا انحصار بارش کے پانی پر ہوتا اور دوسرا وہ جہاں خود زمینی پانی لگانا پڑتا ہے۔ پہلی صورت میں عشر (فصل کا دسواں حصہ) اور دوسری صورت میں نصف عشر (بیسواں حصہ) دینا لازم ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ فصل کی زکوۃ ہے۔

۲۔ صدقات واجبہ:

بہت سے صدقات مقرر کئے گئے ہیں جو مختلف مواقع پر ہر صاحب حیثیت مسلمان کو

ادا کرنے ہوتے ہیں۔ جیسے صدقہ فطر وغیرہ۔ یہ صدقات بھی مندرجہ بالا مقاصد کو پورا کرتے ہیں۔

۳۔ انفاق:

اسلام مسلمان میں انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اسلام مال سے محبت کو کم کرتا ہے اور خدا کی راہ میں خرچ کر کے دنیا و آخرت کی کامیابی حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ تقسیم دولت کو منصفانہ کرنے کا یہ ایک موثر ذریعہ ہے۔

۴۔ وراثت:

اسلام میں میت کے وارثوں کے لیے میت کے چھوڑے ہوئے مال سے حصے مقرر کیے ہیں۔ اسلام نے وراثت میں عورت اور مرد دونوں کو شریک کیا ہے حتیٰ کہ اسلام میں خنثٰی بھی وراثت کا حصہ پاتا ہے۔ وراثت کا معنٰی ہے کہ ایک شخص کی وفات پر اس کی دولت کی منصفانہ تقسیم اس کے پورے خاندان میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ۔

۵۔ حق سوی الزکوٰۃ:

زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کے علاوہ اگر ضرورت محسوس ہو تو حکومت کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں سے مزید مال بطور ٹیکس لے اور اسے استحکام حکومت اور قیام انصاف کیلئے صرف کرے۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ"

(جامع الترمذی)

"بیشک مال میں زکوٰۃ کے سوا اور بھی حق ہے۔"

۶۔ العفو:

اسلام نے انسان کو صرف انفاق ہی کی ترغیب نہیں دی بلکہ اس میں یہ جذبہ بھی پیدا کیا ہے کہ اگر اس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ ہو تو وہ اسے خدا کی راہ میں اور دوسروں کی بہتری کے لئے خرچ کر دے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"ویسئلونك ماذا ینفقون قل العفو"

(سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۲۱۹)

''وہ پوچھتے ہیں کہ ہم کتنا خرچ کریں؟ کہہ دیجئے العفو (جو ضرورت سے زیادہ ہو)۔''

فروغ پیداوار اور دولت کی منصفانہ تقسیم:

اسی طرح قرآنی تعلیم پورے معاشرے میں دولت کی تقسیم کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی پالیسی کے دو بنیادی اصول ''فروغ پیداوار'' اور ''دولت کی منصفانہ تقسیم'' ہیں۔

کتاب الٰہی تمام زمین اور وسائل فطرت کو اصلاً خدا کی دین اور اس کی ملکیت قرار دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام معاشی معاملات میں انسان کو عظیم تر ملکیت کے تصور کے تحت ''امین متصرف'' کی حیثیت سے انفرادی ملکیت کا حق دیتی ہے۔ یہی وہ شکل ہے جس میں انسان کی معاشی آزادی محفوظ رہ سکتی ہے اور اچھے اخلاق پروان چڑھ سکتے ہیں، لیکن یہ حق غیر محدود نہیں ہے یعنی اگر ملکیت آلہ ظلم بن جائے یا دوسروں کے حقوق پر اس کا غلط اثر پڑ رہا ہو تو ریاست کو مداخلت کا بھی حق ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کی تعلیمات کی روشنی میں ملکیت کی حیثیت ایک امانت کی سی ہے جسے خالق کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق استعمال کرنا ہے جو ایک انقلابی تصور ہے۔ یہ انقلابی تصور سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے تصور ملکیت سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔

اسلام ریاست کے معاشی وظائف کا بھی ایک مثبت تصور پیش کرتا ہے اور سماجی، فلاحی اور معاشی انصاف کے قیام کو اس کی اولین ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ زکوٰۃ ایک سماجی فلاح کی اسکیم ہے جس کے نظام کو ریاست کے ہاتھوں قائم کیا جاتا ہے۔ معاشی قانون سازی اور عدلیہ کی طاقتوں کے ذریعہ ریاست معاشی انصاف قائم کرتی ہے۔

اسلام کے مطابق جس کا کوئی وارث نہیں، اس کی ریاست وارث ہے۔ ناداروں اور اپاہجوں کی مدد ریاست کا فرض ہے اور یہ بھی اس کی ذمہ داری ہے کہ تمام شہریوں کو ان کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرنے کی ذمہ داری لے۔

کسب معاش کے طریقے اور ناجائز آمدنی کے وسائل کا سدباب

ذرائع معاش کی اہمیت واقسام:

اللہ تعالیٰ نے اس عالم ارضی کو پیدا کیا اور تمام اشیائے کائنات کو انسان کا مطیع وتابعدار بنایا۔ انسان کو عقل سے زینت بخشی، فکر کے زیور سے آراستہ کیا اور اس کے ہاتھ میں ارادہ واختیار کی باگ دی تا کہ دنیا کو قوانین الٰہی کے مطابق آباد کرے۔ نظام عالم کو درست واستوار کرے، تمام چیزوں کو سلیقہ سے استعمال کرے اور اپنے ذرائع معاش کو مکمل طور سے حاصل کرے۔ قرآن عزیز نے اکثر مقامات میں اسی پر روشنی ڈالی ہے۔ بعض تو وہ ہیں جن سے فہم وبصیرت روشن ہوتی ہے اور بعض وہ ہیں جو اعمال کے حسن وخوبی کی ترغیب دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّکُمْ وَیَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ o"

(سورۃ الاعراف، آیت نمبر 129)

"قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تم کو زمین کا خلیفہ بنائے تا کہ دیکھے کہ تم کس طرح کام کرتے ہو۔"

مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ"

(سورۃ النور، آیت نمبر 55)

"اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کیے ہیں، یہ وعدہ کیا ہے کہ ان کو ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا اور یقیناً ان کے لیے ان کے اس دین کو غالب کر دے گا جن کو ان کے لیے اس نے پسند کیا ہے۔"

بنی آدم کے لیے زمین کی تسخیر کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

"وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○"

(سورۃ الاعراف، آیت نمبر 10)

"اور یقیناً ہم نے تمہیں زمین میں جا گزیں بنا دیا اور تمہارے لئے ہم نے مختلف معاش کے ذرائع بنائے۔ تم بہت کم شکر گزار ہو۔"

تلاشِ معاش اور مختلف ذرائع:

روزی کی تلاش اور کسب معاش کے لیے جدوجہد میں ارشاد ہوتا ہے:

"فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ"

(سورۃ الجمعہ، آیت نمبر 10)

"تم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو۔"

ہر شخص کی جدوجہد کا پیمانہ جداگانہ اس کی تلاش و جستجو اور محنت کا ذوق علیحدہ اور ہر کام کی نوعیت الگ الگ ہے۔ اسی کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا"

(سورۃ الزخرف، آیت نمبر 32)

"ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت (طرز زندگی) کو دنیاوی زندگی میں تقسیم کر دیا ہے۔"

اسی قسم کی کھلی ہوئی آیتیں اور قطعی دلیلیں ایک طرف مثالوں کی شکل میں اور دوسری طرف تلاش روزگار اور جدوجہد کی ترغیب میں وارد ہوئی ہیں، تا کہ ان کے ذریعے اس عالم کے اصول عمران کی تکمیل ہو اور اس دنیا کی درستگی ہو جو آخرت کی کھیتی ہے۔ آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"احرث لدنياك كانك تعيش ابدا واحرث لآخرتك كانك تموت غدا"

"تو اپنی دنیا کی کھیتی اس طرح کر کہ گویا تو ہمیشہ زندگی گزارے گا اور آخرت کی

کھیتی کی اس طرح کاشت کر کہ گویا تو کل مرنے والا ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا ایک نعمت ہے، اس کی اصلاح و درستی کی خواہش کرنا واجب ہے اور دنیوی نعمتوں پر شکر انسانی فریضہ ہے۔

متلاشی رزق کی فضیلت:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طلب روزگار اور ہنگامہ عمل پر ترغیب دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ان من الذنوب ذنوبا لایکفرھا الا الھم فی طلب المعیشة"

"بعض گناہ ایسے ہیں جن کو طلب معاش کا ارادہ اور ہمت ہی مٹا سکتی ہے۔"

ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

"من طلب الدنیا حلالا ولحففا عن المساء لة وسعیا علی عیالہ وتعطفا علی جارہ لقی اللہ ووجھہ کالقمر لیلة البدر"

"جس شخص نے دنیا حلال طور پر تلاش کی، دست سوال دراز کرنے سے دامن سمیٹا، اپنے بال بچوں کی معاش کے لیے تگ و دو کی اور اپنے ہمسایہ سے لطف و عنایت سے پیش آیا تو اللہ اس سے اس شان سے ملاقات کرے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہوگا۔"

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"ان اللہ یحب العبد یتخذ الھنة لیستغنی بھا عن الناس"

"اللہ تعالیٰ اس بندہ کو دوست رکھتا ہے جو اس لئے محبت و مشقت اختیار کرتا ہے کہ اس کے ذریعے لوگوں سے بے نیاز رہے۔"

اور فرمایا:

"ان اللہ یحب المومن المحرف"

"خدائے تعالیٰ پیشہ ور مومن کو محبوب رکھتا ہے۔"

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ عمل وسعی کی ترغیب کے بارے میں فرماتے ہیں:

"کوئی شخص تم میں سے طلب روزگار اور تلاش رزق سے یہ کہتا ہوا نہ بیٹھ جائے کہ اے اللہ تو مجھے روزی دے کیونکہ تم بخوبی جانتے ہو کہ آسمان سونے اور چاندی کی بارش تو نہیں برساتا۔"

الغرض سعی وعمل کی فضیلت اور مال حلال کے اکتساب میں بے شمار اقوال وآثار ہیں جن کی یہاں گنجائش کم ہے۔

مختلف فنون وپیشے اور ان کی وجوہ:

چونکہ دنیا میں لوگ زندگی گزارنے کے لیے ایک دوسرے کے محتاج ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لیے کوئی نہ کوئی فن اور پیشہ مسخر کردیا تاکہ وہ کسی ایک پیشے کو اختیار کرکے اور پیشوں پر ترجیح دے۔ اگر یہ تسخیر الٰہی مساعد نہ ہوتی تو تمام لوگ ایک ہی پیشہ اختیار کرلیتے، اس طرح روزگار کا یہ تنوع اور معاش کی نیرنگی وبوقلمونی زائل ہوجاتی۔ نہ یہ کشاکش کا عالم رہتا اور نہ ہنگامہ حیات سرگرم۔ پس اللہ کی حکمت ومشیت نے لوگوں کو مختلف کام اور مختلف صنائع اختیار کرنے کی تسخیر عطا کی۔ بعض لوگ وہ ہیں جو اپنی صنعت پر رضا مند اور اس سے منحرف نہیں ہونا چاہتے، مثلاً: جلاہا جو اپنے پیشہ پر راضی ہے حجام کو معیوب سمجھتا ہے اور حجام جو اپنے پیشہ کو اچھا سمجھتا ہے جولاہے کو معیوب جانتا ہے۔ بعض لوگ تو ایسے ہیں جو طوعاً وکرہاً اس کو اختیار کرتے ہیں گویا کہ ان کو سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں اور نہ اس کا کوئی نعم البدل ہے۔ ان ہی مختلف مظاہر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد روشنی ڈالتا ہے:

"ہر شخص جس چیز کے لیے پیدا کیا گیا ہے اسی کے سزاوار ہے۔"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا"

(سورۃ الزخرف، آیت نمبر 32)

"ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت (طرز زندگی) کو دنیاوی زندگی میں

تقسیم کر دیا ہے۔"

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

" وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً أَتَصْبِرُونَ "

(سورۃ الفرقان، آیت نمبر 20)

"اور ہم نے تمہارے بعض اشخاص کو بعض کے لیے فتنہ بنایا ہے کیا تم صبر کرو گے۔؟"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"لایزال الناس بخیر ماتباینوا فان تساووا ھلکوا"

"لوگ جب تک باہم مخالف و متضاد رہیں گے تب تک ہمیشہ بھلائی پر ہوں گے، اگر وہ آپس میں برابر اور یکساں ہو جائیں گے تو ہلاک ہو جائیں گے۔"

اس قسم کے موضوع پر تفرقہ و اختلاف ہم آہنگی، اتفاق و اجتماع کا سبب ہے۔ جیسا کہ کتابت کی مختلف صورتیں اور شکلیں ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے متباین اور مختلف ہے۔ اگر یہ اختلاف و تباین نہ ہوتا تو کتابت کا کوئی نظام ہی قائم نہ رہتا۔

فراغ دلی اور کاہلت کی بیخ کنی:

اسی سے پتہ چلتا ہے کہ عمل سے قطع تعلق اور فراغ دلی سے عبادت گزاری ہرگز اسلامی مبادی میں سے نہیں، کیونکہ اسلام سستی اور کاہلی کو ناپسندیدہ نظر سے دیکھتا، بیکاری کو حرام قرار دیتا، بیکار رہنے والے کی مذمت کرتا اور کام کرنے والے کو اچھا سمجھتا ہے۔

لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی:

"بیٹا کسب حلال کے ذریعے فقر و فاقہ سے بے نیاز ہو جا، کیونکہ جس کسی کو فقر نے آگھیرا تو اس میں یہ تین خصلتیں گھر کر جاتی ہیں۔

(1) اس کا دین نرم پڑ جاتا ہے۔

(2) اس کی عقل میں کمزوری و فتور واقع ہو جاتا ہے۔

(3) اس کی مروت و انسانیت جاتی رہتی ہے۔ ان تینوں سے بڑھ کر یہ ہے کہ لوگ اس کو حقارت و ذلت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔"

لہٰذا عمل و سعی یہ دونوں انسانی فرائض وواجبات میں سے ہیں؛ اسلام ان دونوں کی ترغیب دیتا ہے۔ جو شخص بیکاری اختیار کرلے، کاہل بن کر بیٹھ جائے، اس کے لیے بہانہ سازی کرے اور حجت پیش کرے تو وہ انسانیت کے دائرہ سے باہر ہو گیا اور مردوں کے زمرہ میں شمار ہونے کے قابل۔

اسلاف کا طریقہ:

اسلامی اسلاف نے مختلف صنعتوں سے دلچسپی رکھی تھی اور خود ان کو اختیار کیا تھا۔ اس دور کی ترقی اور پیشقدمی کی رفتار کے مطابق اپنی طاقت واستطاعت کے مقدار انہوں نے ان پیشوں کا سہارا لیا تھا۔ اس میں وہ کمال ومہارت اور استواری پیدا کر دی جس کی طرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

"ان اللہ یحب الصانع الحاذق"

"اللہ تعالیٰ ماہر وحاذق کاریگر کو دوست رکھتا ہے۔"

ان تمام نظائر وامثال کا مقصد صرف یہی ہے کہ ہمتوں کو جدت پسندی؛ اختراع وایجاد پر آمادہ کیا جائے تا کہ صنائع کو ترقی ہو اور ان سے فائدہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ تمدن وعمران کے اس کمال تک رسائی حاصل ہو جو انسانی فطرت کے عین مطابق اور خلافت الٰہیہ کے مقصد کے مقتضی ہے اور جو انسان کے بلند وبالاتر مطالبات میں سے ہے۔

کوئی نہ کوئی پیشہ:

وہ انسانی صنعتیں جن کو اکثر لوگ اپنی کسب معاش کا ذریعہ بناتے ہیں؛ مختلف اور بے شمار ہیں، کیونکہ انسانوں کے ملکوں؛ ان کی معاشرت اور ان کے جغرافیائی ماحول کے مطابق بے شمار اور گوناگوں کام رائج ہیں۔ لہٰذا کسب معاش؛ حصول روزگار اور سعادت وعزت کے فیضان کے لیے شریعت اسلامیہ نے انسان کو کوئی عمل؛ پیشہ اور صنعت وحرفت اختیار کرنا ضروری قرار دیا ہے۔

خلاصہ بحث:

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ سعی وعمل اور انسانی حقوق وفرائض کی ادائیگی کے ساتھ جائز

طریقوں سے اکتساب مال' خرچ کرنے میں اعتدال' مال جمع رکھنا اور عظیم الشان کام سر انجام دینا' یہ وہ اہم مقاصد ہیں جن سے دنیا کی تہذیب' تمدن اور عمران کا دامن وابستہ ہے اور یہی وہ غرض وغایت ہے جس کو اسلام نے اپنے آداب واصول اور تعلیمات میں ملحوظ رکھا ہے۔

اسلام اور کسب معاش

آلۂ ترقی:

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ کسب معاش یعنی قوت بازو سے روزی پیدا کرنا خواہ صنعت وحرفت کے ذریعہ ہو یا تجارت وزراعت سے، یہ ترقی کے لیے ایک بہترین آلہ ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے انسان محنت ومشقت کا عادی اور سرگرم عمل ہوتا ہے۔ اس کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں افراد میں سستی' کاہلی اور مفت خوری کے مہلک امراض پیدا ہو جاتے ہیں جو قوم کو فنا کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔

تجارت پیشہ مسلم:

یہی حقیقت کبریٰ تھی کہ اسلام نے اپنے متبعین کے کسب معاش پر اتنا زور دیا جس سے دیگر مذاہب کا دامن تعلیم یکسر خالی ہے۔ یوں تو کسب معاش کی مختلف صورتیں ہیں، لیکن قرآن حکیم میں زیادہ تر ''تجارت'' کا لفظ آیا ہے، گویا یوں سمجھئے کہ ضمناً یہ بتایا گیا ہے کہ تجارت مسلمانوں کا مقدس پیشہ ہے۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت اور تعلیم ومدارس:

ہمیں نہایت حسرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان اپنے فطری مذہب کی مقدس تعلیم کو فراموش کر کے بیکاری کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں ٹاک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ غربت وافلاس کے مردم خوار دیو انہیں اپنے آہنی پنجوں میں دبوچے ہوئے ہیں۔ عرصہ حیات ان پر ہر جانب سے تنگ ہو گیا ہے۔ ان کی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے تعلیم کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے لیکن تعلیم کی وسعت کے ساتھ ساتھ بیکاری بھی بڑھتی جا رہی ہے، کیونکہ مدرسوں

کے نصاب خواہ وہ عربی ہوں یا انگریزی' اس قدر ناقص ہیں کہ ان میں صنعت وحرفت کا مطلقاً کوئی شعبہ نہیں رکھا جاتا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اولاً صنعت وحرفت تو کوئی جانتا ہی نہیں، دوسرا یہ کہ خود اسے عار سمجھا جاتا ہے۔ عموماً تعلیم یافتہ اصحاب کے مقابل میں عوام کی زندگی کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اگر ان کے ہاں کوئی آبائی پیشہ ہے تو غنیمت۔ ورنہ وہ بھی اپنی جہالت سے دریوزہ گری جیسے مہلک مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اقتصادی کامیابی:

آیئے! تعلیمات اسلامیہ کو بہ نظر غائر دیکھیے۔ ہماری اقتصادی زندگی کامیاب بنانے کے لیے اس نے کیا سبق دیا۔

حضرت موسیٰ وخضر:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے قوت بازو سے روزی پیدا کرنے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ خوددار رہنے کے لیے حضرت موسیٰ اور جناب خضر کے واقعہ سے ایک دقیق نکتہ نکالا ہے، اس کا ماخذ یہ ہے کہ جب حضرت خضر نے اہل قریہ سے کھانے کی درخواست کی اور وہ مسترد کر دی گئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

"لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا"

(سورۃ الکہف، آیت نمبر 77)

"تم نے مفت کھانا کیوں طلب کیا؟ تمہیں چاہیے تھا کہ اس دیوار کی مرمت میں مزدوری لے لیتے اور اسی سے کھانے کا انتظام کرتے تو ردسوال کی خفت نہ ہوتی۔"

ایام حج اور تجارت:

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ تجارت مسلمانوں کا مقدس پیشہ ہے۔ ایام حج میں اہم عرب خرید وفروخت کرنا تقویٰ کے منافی سمجھتے تھے۔ قرآن حکیم نے ان کے غلط خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ ایام حج میں خرید وفروخت کرنا تقویٰ کے منافی نہیں۔

احادیث اور تجارت:

احادیث میں تجارت کا ذکر اور اس کی تفصیل اس کثرت سے آئی ہے کہ محدثین کرام نے ایک خاص باب ہی کتاب البیوع کا باندھا ہے۔ فضیلت تجارت میں غالباً یہ ایک حدیث کافی ہوگی:

"التاجر الامین الصدوق المسلم مع الشهداء یوم القیامة"

"ایک مسلمان راست گو اور امین تاجر قیامت کے دن شہداء کے ساتھ ہوگا۔"

ممنوعہ تجارت:

احادیث میں جہاں فضیلت تجارت کا ذکر آیا ہے وہاں چند تجارتیں ممنوع قرار دی گئی ہیں جن سے قومی، معاشرتی اور اقتصادی نقصان ہو۔ مثلاً: شراب کی تجارت، اس کا تیار کرنا اور مزدوری کرنا سب حرام ہے۔ مردار کی تجارت، کتے کی تجارت، مردار کی چربی کی تجارت، پھل پکنے سے پیشتر باغ خریدنا یعنی جنس پختہ ہونے سے پہلے کھیت کو لے لینا۔ "بیع غرر" میں وہ تمام صورتیں آجاتی ہیں جن میں دھوکے کا احتمال ہو۔ مثلاً: جانور کے پیٹ کا بچہ، تالاب کی مچھلیاں یا شرط کے ساتھ یہ کہنا کہ جس مال پر یہ کنکری پڑے گی وہ ہمارا ہوگا۔ یہ سب ممنوع صورتیں ہیں۔

فضل اللہ اور معاش کے الفاظ:

قرآن مجید میں تجارت کے ماسوا اور الفاظ بھی آئے ہیں مثلاً:

"فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ"

(سورۃ الجمعہ، آیت نمبر 10)

"نماز ختم ہونے کے بعد اللہ کا فضل (رزق) تلاش کرو۔"

دوسری جگہ فرمایا:

"وجعلنا النهار معاشا"

(سورۃ النباء، آیت نمبر 11)

"ہم نے دن کو روزی کمانے کے لیے بنایا ہے۔"

صنعت وحرفت کا ذکر اور انبیاء کرام:

صنعت وحرفت کا بھی متعدد جگہ ذکر آیا ہے۔ مثلاً: قرآن حکیم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو لوہے کی صنعت سے اچھی واقفیت تھی۔ حدیثوں میں حضرت ذکریا علیہ السلام کو بڑھئی بتایا گیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق بھی تاریخ یہی کہتی ہے کہ وہ بڑھئی تھے۔ حضرت ادریس علیہ السلام کھیتی کرتے تھے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جتنے انبیاء مبعوث ہوئے سبھوں نے بکریاں چرائی ہیں۔ صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا:

"آپ نے بھی۔؟"

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہاں!" "میں نے بھی اہل مکہ کی بکریاں اجرت پر چرائی ہیں۔"

فضیلت کسب حلال:

احادیث کے اندر کسب کی فضیلت میں الفاظ عام آئے ہیں مثلاً:

"ان اطیب ما اکلتم من کسبکم"

"بہترین روزی وہ ہے جو قوت بازو سے پیدا کی جائے۔"

طلب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ"

"فریضۂ عبادت کے بعد سب سے اہم فریضہ حلال روزی کمانا ہے۔"

ای الکسب اطیب قال عمل الرجل بیدہ

پوچھا گیا کہ بہترین کمائی کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاتھ اور قوت بازو کی۔"

طلب الحلال جھاد"

"کمائی حلال روزی پیدا کرنا جہاد ہے۔"

دیگر پیشے زمانہ رسالت میں:

بخاری شریف میں بڑھئی، لوہار اور سنار وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے امام موصوف

کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ یہ تمام پیشے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے، لیکن آپ نے کوئی ممانعت نہیں کی، اس سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

دست سوال:

کسب معاش کا دوسرا مقابل پہلو بے کاری اور محتاجی ہے۔ اسلام نے اس کے متعلق سخت تہدید کی ہے اور بجز انتہائی مجبوریوں کے دست سوال دراز کرنے کو قطعاً حرام قرار دیا ہے، مگر افسوس اس زرین تعلیم کو بھی لوگوں نے حرف غلط کی طرح مٹا دیا اور ارباب دولت کی بے محل خیرات وزکوۃ نے فقراء کی کثیر تعداد کا جال پھیلا دیا ہے۔ اس میں ان کو اتنی کافی آمدنی ہوتی ہے کہ اسی کو مستقل طور پر اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں، صنعت وحرفت سے ان کو مطلقاً سروکار نہیں ہوتا اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب کاہلی، بے کاری اور مفت خوری کسی قسم میں جتنی ہی زیادہ ہوگی اتنی ہی معاصی اور بد اخلاقی بھی بڑھتی جائے گی۔

زکوۃ وخیرات اور ان کا مصرف ومقصد:

اس میں شک نہیں کہ اسلام نے خیرات وزکوۃ پر بہت زور دیا ہے لیکن اس نے یہ طریقہ نہیں بتایا جو ہمارے زمانہ میں رائج ہے، بلکہ اس کا مقصد تو یہ ہے کہ قوم کا کوئی فرد اگر حوادث زمانہ کی زد میں آ گیا ہو اور اس بری طرح آیا ہو کہ تنگدستی کے مردم آزار دیو نے اس کے حوصلہ کو پست اور ہمت کو سست کر دیا ہو تو اس وقت قوم کا یہ فرض ہے کہ اس کی اعانت کرے، اس کو سرمایہ دے کر اس قابل بنا دے کہ وہ اپنے بل پر کھڑا ہو سکے۔ محنت ومشقت کر کے اپنی روزی پیدا کر کے کھائے اور اپنا فرض بجا لائے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا"

(سورۃ البقرۃ، آیت نمبر 273)

"مال صدقہ وزکوۃ ان فقیروں کے لئے ہے جو اللہ کے راستے میں روک دیئے

گئے کہ زمین میں چلنے پھرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ نہ جاننے والا ان کو عدم سوال کی بنا پر تونگر خیال کرتا ہے۔ تم ان کو ان کے بشرے سے پہچان لو گے۔ وہ لوگوں سے الجھ کر نہیں مانگتے۔"

بہتر ہوگا کہ ارباب دولت خیرات وزکوٰۃ کی رقم کو اس طرح غلط طریقہ پر تقسیم کرنے کے عوض کوئی ایسی تجویز اس کے مصرف کی نکالیں جس سے فقرا کی تعداد کم ہو اور لوگ اپنے ہاتھ کی کمائی سے گزر اوقات کیا کریں' اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اسی رقم سے صنعتی مدارس کھولے جائیں جن میں بالخصوص یتیم اور نادار طلبہ کو داخل کر کے کام لیا جائے۔ غرضیکہ ہر شہر والے اپنی حالت اور حیثیت کے مطابق کوئی ایسی مناسب تجویز عمل میں لائیں جس سے ملک وقوم دونوں کا فائدہ ہو۔

عورتوں کی معاش:

مردوں کی طرح ہماری عورتوں کو بھی کاری کی روگ نے طرح طرح کی مصیبتوں میں پھنسا رکھا ہے۔ آج سے چند سال پیشتر یہ حالت تھی کہ عورتیں خانہ داری پیستی تھیں، لیکن جب سے مشینیں ایجاد ہوئیں' ہماری طرح یہ بھی بیکاری کے پنجے میں پھنس گئیں۔ اب تو گیہوں کی بجائے آٹا اور دھان کے عوض چاول خریدا جاتا ہے۔ صرف پکانے کی ایک زحمت باقی رہ جاتی ہے، لیکن اب اکثر یہ شکایت بھی رفع ہو جاتی ہے، کیونکہ بعض بعض شہروں میں مامائیں رکھنے کا عام دستور ہو گیا ہے۔ غریب سے غریب آدمی بھی کم از کم ایک خادمہ ضرور رکھتا ہے۔ وہی کھانا پکاتی ہیں اور جھاڑو دیتی ہیں۔

ہم نے مانا کہ قانونی حیثیت سے عورتیں اس فرض سے سبکدوش ہیں لیکن عرض یہ ہے کہ جس طرح مال اللہ کا فضل ہے اسی طرح قوت بھی اللہ کی عطا کردہ نعمت عظمیٰ ہے۔ پھر ہم کیوں نہ اس سے کام لیں؟ اور اپنی زندگی کا ثبوت دیں۔ آخر سلف کی عورتوں کے لیے بھی تو یہی قانون تھا' لیکن وہ اس طرح بیکار اور ست نہ تھیں۔ محنت ومشقت کرتے تھیں، صنعت وحرفت سیکھتی تھیں، اپنی جائیداد ملکیت کو بڑھاتی اور مذہبی وقومی کاموں میں خرچ کرتی تھیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ہاتھ چکی پیستے پیستے زخمی ہو گیا تھا۔ مہربان باپ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک خادمہ کی درخواست کرتی ہیں لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو

رد کر دیتے ہیں۔ کیا حضرت فاطمہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چارہ جوئی نہیں کر سکتی تھیں؟ اصل یہ ہے کہ اس زمانے کے مرد اور عورت سب ہی سمجھتے تھے کہ زندگی نام ہے نقل و حرکت ہی کا۔

آنحضور کا طرز زندگی:

اب ذرا اسلاف کے مقدس حالات پر ایک نظر کیجئے۔ دیکھئے انہوں نے اس اصول کو کس طرح نبھایا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ملاحظہ فرمایئے "جتنے انبیاء آئے سبھوں نے بکریاں چرائیں اور میں نے بھی اہل مکہ کی بکریاں اجرت پر چرائی ہیں۔" آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کو دیکھئے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی معاش کے لیے کس طرح تجارت کی؟ دور دراز ممالک سے جوتیاں گانٹھ لیتے تھے' کپڑے میں پیوند لگا لیتے اور گھر صاف کر لیا کرتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے بکری کا دودھ دھو لیتے تھے' آج کتنے تعلیم یافتہ ایسے ہیں جو اس کام کو خود کرنا تو درکنار دوسرے کرنے والوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

صحابہ اور حصول معاش:

صحابہ کرام کی جماعت کو دیکھئے۔ اصولی حیثیت سے مہاجرین کا طبقہ مصروف تجارت نظر آئے گا اور انصار کو کاشت کاری میں سرگرم عمل پائیں گے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تاجر تھے۔ ان کا بیان ہے:

"میں قریش میں متمول تاجر تھا۔"

اسلام قبول کرنے کے بعد بھی آپ کا یہی مشغلہ رہا اور تجارتی مال لے کر آپ نے دور دراز ملکوں کا سفر کیا۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ایک سال پیشتر تجارت کے خیال سے آپ بصرہ تشریف لے گئے تھے۔ مسند خلافت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد مجبوراً اس سے کنارہ کشی کرنی پڑی اور یہی حال حضرت عمر و حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا بھی ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب تک مکہ میں تھے ان کے حصول معاش کا اصلی ذریعہ تجارت تھا۔ مدینہ میں پہنچ کر زراعت بھی شروع کر دی تھی۔ اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی معاش کا اصلی ذریعہ تجارت تھا۔ عرب میں ان سے بڑا اور دولت مند کوئی تاجر

نہ تھا۔ چنانچہ اس غیر معمولی دولت وثروت کے باعث ان کو غنی کا خطاب دیا گیا۔ زراعت خود نہیں کرتے تھے لیکن اپنی زمین بٹائی پر دیتے تھے۔

حضرت خباب رضی اللہ عنہ زمانہ جاہلیت میں لوہار تھے۔ ذرا غور کیجئے سیدنا سلمان فارسیؓ رضی اللہ عنہ کی زندگی پر آپ مدائن کے گورنر تھے لیکن بوریا بنا کر وجہ معاش پیدا کرتے۔ اکثر صحابہ محنت ومزدوری پر اوقات بسر کرتے تھے۔ پھاوڑا چلاتے چلاتے ایک صحابی کے ہاتھ سیاہ ہوگئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا:

"کیا تمہارے ہاتھوں پر کچھ لکھا ہوا ہے؟"

وہ بولے:

"نہیں! بلکہ میں پتھر پر پھاوڑا چلاتا ہوں اور اس سے اپنے اہل وعیال کے لیے روزی پیدا کرتا ہوں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر ان کے ہاتھ چوم لئے۔

اصحاب صفہ کا سارا دن تعلیم میں گزرتا تھا۔ فرصت کے وقت نہر سے شیریں پانی لاتے، رات میں جا کر جنگلوں سے لکڑیاں لاتے اور اسی سے اپنی معاش پیدا کرتے۔ ایک مرتبہ ایک صحابی نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر سوال کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا:

"تمہارے پاس کچھ بھی کہ نہیں۔؟"

وہ بولے:

"ایک کمبل اور ایک پیالہ ہے۔"

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جاؤ! اسے لے آؤ"

جب وہ لے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو درہم میں نیلام کر دیا اور انہیں دے کر فرمایا:

"ایک درہم کا غلہ خرید کر گھر میں رکھو اور ایک درہم میں بازار سے کلہاڑی خرید کر لاؤ"

صحابی موصوف نے ایسا ہی کیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے اس میں دستہ لگایا اور فرمایا:

"جاؤ! جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاؤ اور فروخت کرو۔ پندرہ دن کے بعد میرے پاس آنا۔"

صحابی موصوف جب پندرہ دن کے بعد آئے تو ان کے پاس دس درہم فاضل تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جاؤ اسی سے غلہ اور کپڑا خریدو اور آئندہ سے سوال نہ کرنا۔"

ذرا نظر بصیرت سے دیکھئے۔ یہ قدسیوں کا گروہ کس طرح اپنی معاش میں محنت و مشقت کرتا ہے۔ حیف ہے ہم پر کہ ہم انہیں اسلاف کے خلاف ہو کر اپنے طرز عمل سے ان کے دامن تقدس پر دھبہ لگاتے ہیں۔

علمائے سلف کا طرز معاش:

یہ تو صحابہ کرام کے واقعات تھے۔ اگر علمائے سلف کے حالات پڑھیں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ وہ لوگ اپنی معاش قوت بازو سے پیدا کرتے تھے اور ان کا رجحان خاطر اکثر تجارت کی طرف تھا۔ امام یوسف بن عبید' داؤد ابن ابی ہند' وثیمہ اور امام ابو حنیفہ یہ سب لوگ کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ امام ممدوح کی صدر دکان کوفہ میں تھی اور ان کے یجنٹ جا بجا ملک میں پھیلے ہوئے تھے جو مال خرید کر صدر کو بھیجتے تھے۔ ہشام دستوائی بھی کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ دستواء اہواز کا ضلع تھا۔ آپ وہاں سے کپڑے لا کر فروخت کرتے تھے۔ اسی لئے دستوائی لقب پڑ گیا۔ احمد بن خالد قرطبی جبہ فروش تھے۔ امام القراء حمزہ زیارت کوفہ سے روغن زیتون حلوان کو لے جاتے اور وہاں سے پنیر اور اخروٹ لا کر کوفہ میں بیچتے۔ حسن بن ربیع کوفی امام بخاری کے استاد بوریا بیچتے تھے۔ اسی تجارت کی وجہ سے ان کا لقب بواری پڑ گیا۔ امام ابن جوزی کے خاندان میں تانبے کی تجارت ہوتی تھی۔ آپ بھی اپنے نام کے آگے صفاء (ٹھیرا) لکھ دیتے تھے۔ حافظ الحدیث ابن رومیہ عطار تھے۔ اسی تجارت کی وجہ سے ان کا لقب عطار ہو گیا۔ ابو یعقوب لغوی چوبی لٹھا فروخت کرتے اور محمد بن سلیمان گھوڑے کی تجارت کرتے تھے۔

علمائے سلف صنعت وحرفت سے بھی واقف تھے۔ ابوالفضل مہندس دمشقی طبیب مشہور بڑھئی تھے۔ اس فن میں وہ بہت ماہر تھے اور کثرت سے ان کے پاس کام آتا تھا۔ بیمارستان کبیر شاہی شفاخانے کے اکثر دروازے ان کے ہاتھ کے بنائے ہوئے تھے۔ جامع مسجد دمشق کی گھڑیاں انہوں نے درست کی تھی اور ان کی نگرانی کے متعلق انہیں تنخواہ ملتی تھی۔ ابن طاہر، امام ابن الخاضبہ، ابن الہیثم طبیب نامور اور ابوسعید نحوی کتابت کیا کرتے تھے۔ موخر الذکر دس ورق روزانہ لکھتے تھے۔ یہ کام کر کے عدالت قضاء میں اجلاس کرتے۔ انہیں اوراق کی اجرت پر ان کی بسر اوقات تھی۔

علمائے سلف اپنا کام خود کیا کرتے تھے۔ امام ابن طاہر جب فن حدیث کی تحصیل کے لیے امام حبال کی خدمت میں حاضر ہونے چلے تو لوگوں نے ان سے کہہ دیا کہ امام موصوف بازار سے اپنا کام خود کرلاتے ہیں، وہاں بھی ان کو تلاش کر لینا۔ چنانچہ جب یہ ان کے شہر میں پہنچے تو پہلے بازاروں میں گشت لگائی۔ تلاش کرنے سے ان کو امام حبال ایک عطار کی دکان پر اس حالت میں ملے کہ دامن میں وہ تمام ضروریات کی چیزیں بھری تھیں جو بازار سے خرید کرلائے تھے۔ اس وقت امام موصوف کی عمر اناسی برس کی تھی۔

امام بخاری نے شہر بخارا کے باہر ایک مہمان سرا بنوائی تھی، اس کی تعمیر کے وقت جو مزدور معماروں کو اینٹیں پہنچاتے تھے ان میں خود امام بخاری بھی شامل تھے۔ یہ امام ربانی اپنے سر پر اینٹیں رکھ کر لے جاتے اور معماروں کو دیتے۔ ایک شاگرد نے عرض کی کہ آپ کو اس محنت کی کیا ضرورت ہے؟ امام ممدوح نے فرمایا کہ اس میں میرا بہت فائدہ ہے۔

اسلام میں فقر وافلاس کا علاج اور اس کا اقتصادی نظام

موجودہ اور سابقہ صدیوں کا اہم ترین مسئلہ اور اسلام:

فقر وافلاس کا مسئلہ جو انیسویں، بیسویں اور اکیسویں صدی عیسوی میں اقتصادیات واجتماعیات کے ماہرین کا مرکز بحث ونظر بنا ہوا ہے ایک ایسی خوفناک صورت اختیار کر چکا ہے جس کے تصور سے دنیا کا دل لرز رہا ہے اور اس کے مسموم اثرات سے فضائے عالم مکدر ہوگئی ہے۔ جا بجا مختلف گروہ بن گئے، جس کی وجہ سے مزدور اور سرمایہ دار طبقہ میں ایک کشمکش

اور طوفانی جنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے بڑے بڑے عالی دماغ اور ارباب فکر چکر میں ہیں' لیکن اسلام نے آج سے چودہ سو برس قبل ہی اس کی اہمیت ونوعیت کا اندازہ کر لیا تھا اور اس کے نتائج وعواقب پر نظر کرتے ہوئے اس نے اس مسئلہ کا وہ آسان حل پیش کیا جس کو موجودہ تخریبی نظام اور سطحی طرز معاشرہ ماننے سے انکار کرے تو کرے' لیکن موجودہ انقلابی آثار بتا رہے ہیں کہ قوموں کو ایک نہ ایک دن اپنی روش بدلنے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آئے گا اور انجام کار ساری دنیا کو اسلام کے اس تعمیری نظام اور گہرے طرز معاشرہ میں نجات اور بہبودی کی سبیل تلاش کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

کیا یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کا عظیم الشان اقتصادی معجزہ نہیں ہے۔؟ کیا اسلام نے ایک ایسے خطرناک مسئلہ کی پیچیدہ گتھی کو نہیں سلجھایا جس کا گمان بھی اس زمانے میں دشوار تھا؟ جس کے خطرات ونتائج سے لوگوں کے اذہان نا آشنا تھے' حالانکہ ہر زمانے میں یہ چیز سوسائٹی کے لئے مہلک اور ضرر رساں تھی' مگر اسلام نے اس کی تمام خرابیوں اور نقصانات کو اول نظر میں سمجھ لیا تھا' پھر اس نے اجتماعی اضطراب کی صحیح تشخیص کر کے اس کا وہ نسخہ پیش کیا جس میں سوسائٹی کی مہلک بیماری کا علاج بدرجہ اتم موجود ہے۔

فقر وافلاس کی اجمالی تاریخ:

اسلام کے اس اقتصادی معجزہ کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے یہاں مسئلہ فقر وافلاس کی اجمالی تاریخ اور اس کی تشخیص وعلاج پر علم اجتماع کے اصول وقوانین کی روشنی میں ایک سرسری نظر ڈالی جاتی ہے۔

ارباب بحث وفکر نے ہر قدیم قوم کے عناصر کا جائزہ لیا تو ان کو طبقے نظر آئے ایک مزدور جبکہ دوسرا سرمایہ دار۔ ان کے علاوہ انہیں کوئی تیسرا گروہ نہیں ملا۔ ان میں ایک خاص چیز یہ نظر آئی کہ سرمایہ دار طبقہ وسیع حد تک خوشحال تھا اور اس کے برعکس مزدور طبقہ افلاس وتنگ دستی کا شکار ہو چلا تھا' جس کی وجہ سے اجتماعی بنیادیں کمزور پڑ گئی تھیں۔ عیش پرست اور خوشحال طبقہ اس سے نا آشنا تھا کہ کس جانب سے اس پر اس عمارت کی چھت گر پڑے گی۔

مصر کی سرزمین اپنے قدیم زمانے میں رشک فردوس بنی ہوئی تھی' وہاں کی پیداوار اس قدر تھی کہ اس کے دو چند باشندوں کے لیے بھی کافی ہو سکتی تھی، لیکن مزدور طبقہ نہایت

پریشان حال تھا۔ اس کی زندگی افلاس اور تنگ دستی میں بسر ہوتی تھی' اس لئے کہ سرمایہ دار خوش حال گروہ تمام جائیدادوں اور غلوں پر قابض تھا۔ جب اٹھارھویں صدی میں سرمایہ داری کا دور دورہ ہوا اور فقر و افلاس کی گھٹائیں مزدوروں کی زندگیوں پر چھا گئیں تو انہوں نے سرمایہ داروں کے ہاتھ اپنے آپ کو فروخت کر ڈالا' مال داروں نے انہیں بری طرح مصائب کے شکنجہ میں جکڑ دیا اور ان پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے۔

بابل اور نینوا کی سلطنت کا بھی وہی حال تھا جو مصر کا تھا' غریب اور مزدور طبقہ کا ان کی زمینوں کے غلوں اور پھلوں میں کوئی حصہ نہیں تھا، حالانکہ فراعنہ کے ممالک بلحاظ پیداوار' نشوونما اور شادابی کے دیگر شہروں سے ممتاز تھے' ایران کی بھی تقریباً یہی حالت تھی۔

قدیم یونانیوں کا حال اس سے بھی بدتر تھا' ان کے ملکوں کی بعض روایات ایسی ملتی ہیں جن کے سننے سے بدن کو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غریب اور مفلس جماعت سے بدترین کام لئے جاتے تھے' اس کے لیے ان پر کوڑے استعمال کئے جاتے تھے اور ادنیٰ غلطیوں پر جانوروں کی طرح سے ان کو ذبح کر دیا جاتا تھا۔

اسپارٹا کے بعض ملکوں میں سرمایہ دار طبقہ مزدوروں کے لیے ایسی زمین چھوڑ دیتا تھا جو ناقابل کاشت ہوتی اور پیداوار کی مطلق صلاحیت نہیں رکھتی تھی' اس طرح وہ قسم قسم کے فقر و افلاس کی مصیبتوں کا شکار تھے۔

ایتھنز میں مال دار لوگ غریبوں پر اس حد تک حکومت کرتے تھے کہ ان پر عائد کردہ لگان نہ ادا کرنے کی صورت میں ان کو غلاموں کی طرح فروخت کر دیتے تھے۔

روم جو شرائع و قوانین کا سرچشمہ اور فقہاء اور قانون دانوں کا ملک کہلاتا ہے' یہاں کے مالدار لوگ عوام پر بری طرح مسلط تھے' اپنے لئے وہ اس قدر امتیازات اور مراتب مقرر کر چکے تھے کہ عوام کی ان کے نزدیک کوئی ہستی نہیں تھی۔ صرف ان کی اس قدر حیثیت تھی جیسا کہ ہندوستان کے برہمن طبقہ کے پاس شودروں کی۔ ان سے سخت ترین کام لئے جاتے تھے جس کی وجہ سے بسا اوقات ان کو اپنا شہر اور اپنی جماعت چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں ہجرت کرنی پڑتی تھی۔

مشہور مورخ "علامہ میشلر" نے سلطنت رومانیہ کے اس پہلو کو اس طرح بیان کیا ہے:

''سلطنت رومانیہ میں روز بروز غریبوں کی تعداد میں فقر وفاقہ کی وجہ سے اضافہ ہوتا تھا اور سرمایہ دار طبقہ اور زیادہ مال دار ہوتا تھا' یہ اپنی زبان سے کہا کرتا تھا کہ اگر اہل وطن میدان جنگ میں جانے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں تو ان کو بھوکوں مر جانا اور ہلاکت کے گھاٹ اتر جانا چاہیے۔''

جب دولت رومانیہ کا خاتمہ ہو گیا اور یورپی ممالک اس پر قابض ہو گئے تو مزدوروں اور غریبوں کی حالت مزید بدترین ہو گئی۔ وہ اپنی جائیداد سمیت چوپائیوں کی طرح فروخت کیے جاتے تھے۔

فقر وافلاس کے حل کی کوششیں:

جب انیسویں صدی کا ظہور ہوا' علوم اجتماعیہ کی پیداوار غیر معمولی طور پر بڑھ گئی اور لوگوں کے اذہان قوموں اور سوسائٹیوں کے اتحاد و کشمکش اور یکجہتی و تفرقہ پردازی کے اسباب سے آگاہ ہوئے تو سبھوں نے فقر وافلاس کی متعدی اور مہلک بیماری کا احساس کیا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ یہی چیز قوموں کے لئے آفات کا موجب اور اجتماعی بنیادوں کو کمزور کرنے کا باعث ہے۔

چنانچہ ایک گروہ نے یہ تحریک پیش کی کہ مالداروں کو غریبوں کے لیے اپنے مال سے صدقہ دینا چاہیے۔ مخالف جماعت نے اس کے خلاف آواز بلند کی کہ اس کے نتیجہ میں خود اعتمادی اور علوِ ہمتی کے جذبات فنا ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ بیکاری بڑھ جائے گی اور سوسائٹی کے لیے فتنہ وخلل کا پیش خیمہ ثابت ہو گی۔

بعضوں نے یہ رائے پیش کی کہ ان کے لئے ہجرت کے دروازے کھول دیے جائیں اور اس کی طرف ان کو دعوت دی جائے تو کہیں اس پر اعتراض پیش کیا گیا کہ اس سے بہت سے خطرات لاحق ہونے کا اندیشہ ہے۔

آخر کار ان مختلف نظریات سے اتنا تو ہوا کہ انجمن ہائے امداد باہمی کی تشکیل وجود میں آئی۔ اس سے بہترین نتائج برآمد ہوئے کیونکہ انجمنوں کے اندر اتنی صلاحیت تھی کہ وہ مزدوروں کی ضرورتوں اور ان کی کمزوریوں کی گہرائی تک پہنچ کر حکومتوں سے ان کے حقوق کا مطالبہ کریں اور ان کے وجود کے لیے بہترین اور مفید قوانین صادر کرانے کی سعی کریں۔

اگرچہ ان انجمنوں سے بے شمار پیچیدگیاں بڑھ گئیں اور جماعتوں میں ایک انقلاب رونما ہو گیا۔ چنانچہ یہ مسئلہ اجتماعی مسائل میں بہت ہی اہم شکل اختیار کر چکا ہے اور ہر قسم کے طبقہ کا موضوع بحث بن گیا ہے۔ مشاہدہ کے لیے یہی کافی ہے کہ آج تین چار کروڑ مزدور بیکاری کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں' نہ ان کو کوئی کام ملتا ہے اور نہ ہی کھانے کا کوئی ذریعہ۔ حکومتیں مجبور ہو گئی ہیں کہ ان کے لیے قوم سے مال لے کر کوئی روزگار کا دروازہ کھولیں۔

فقر وافلاس کا اسلامی حل:

یہی وجہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقیروں اور غریبوں پر خاص توجہ صرف کی اور آپ فقر کی بے حد قدر رو وقعت فرماتے تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''كاد الفقر ان يكون كفرا''

''ڈر ہے کہ کہیں فقر کفر نہ ہو جائے۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

''اللهم انى اعوذبك من الفقر''

''اے خدا! میں فقر سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔''

کیا ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے ہیں کہ آج فقر وافلاس کتنی زندگیاں تباہ و برباد کئے ہوئے ہے اور تہذیب کی بنیادوں کو کس حد تک ڈھانے پر آمادہ ہے۔؟

سوال یہ ہے کہ اسلام نے اس معرکہ آرا مسئلہ کا کیا حل پیش کیا ہے؟ اس نے ایک ایسا اقتصادی نظام ایجاد کیا ہے جو تمام عمرانی اصولوں پر مشتمل ہے۔ جس سے فقر وافلاس کا ازالہ اور اس کے خطرناک امراض کا علاج ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مال داروں کو اس امر پر مجبور کیا ہے کہ وہ اپنے اموال سے صدقہ دیا کریں۔ صدقہ عرف عام میں زکوٰۃ کو کہتے ہیں اور زکوٰۃ ہر مالدار پر اجباری انکم ٹیکس ہے جو اجتماعی اغراض و مصالح کے لئے حکومتی اموال سمجھ کر سرمایہ داروں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ وہ صدقہ نہیں ہو سکتا جو ہمتوں کو پست اور ارادوں کو سست کر کے کاہلی اور بیکاری کا سبب بنے۔ اسلام نے ان اموال میں تصرف کرنے کا حکم خاص کر حکومت کو عطا کیا ہے کیونکہ حکومت ہی اجتماعی حالات اور وقتی ضروریات و حاجات کے

پیش نظر مال خرچ کرتی ہے۔ سرمایہ داروں سے زکوٰۃ حاصل کرنے کا یہ وہ اصولی طریقہ ہے جس کی طرف آج تمام مغربی حکومتوں کو مجبور ہونا پڑا ہے۔ جو سرمایہ' میراث' اشیائے تجارت غرضیکہ ہر چیز پر انکم ٹیکس عائد کر رہی ہیں' ان تمام سے مقصود غریبوں' حاجت مندوں اور مزدوروں کی حاجت روائی ہے' لیکن اسلام اس میدان میں ان سے چودہ سو تیس سال پیشتر نظام زکوٰۃ مقرر کر کے گویا سبقت لے گیا ہے۔ درحقیقت یہ نظام سرمایہ داروں کی عیش پرستی اور ان کی خوش حالی کے خلاف ایک اصلاحی اور تعمیری صدائے احتجاج ہے۔

میشلیر نے یہ جو کہا ہے کہ ایک طرف مال دار لوگ ہر سوسائٹی میں بڑھتے جاتے تھے اور دوسری طرف مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا تھا' یہ وہ مدافعانہ حرکت ہے جو ہمیشہ سے مال دار طبقہ کا خاصہ رہی ہے' جس کے نتیجہ میں اس کا مخالف گروہ بھی ہمیشہ اس کے خلاف اپنی مدافعت اختیار کرتا ہے' اسی باہمی کشمکش میں دونوں طبقات میں توازن برقرار رہتا ہے۔ اسلام نے جو نظام زکوٰۃ مقرر کیا ہے' اس کا مقصد یہ ہے کہ سرمایہ کو چند اشخاص کے ہاتھوں میں محدود نہ کر دیا جائے جس سے عام طبقہ مستفید ہونے سے محروم ہو جائے۔

اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے فقر و افلاس کی بیخ کنی کرنے اور اس کے خطرات میں تخفیف کرنے کے لیے مذکورہ بالا حل کے ساتھ دیگر عمرانی اصولوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ہجرت کی دعوت دی ہے:۔

"وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً"

(سورۂ نساء، آیت نمبر 100)

"اور جو شخص اللہ کے راستہ میں وطن چھوڑ دے تو اس کے مقابلہ میں بہت جگہ اور کشائش پائے گا۔"

سوسائٹی کے تعاونِ باہمی پر خاص طور سے ترغیب دی ہے:

"وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ"

(سورۂ مائدہ، آیت نمبر 2)

''اور بھلائی اور پرہیزگاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر باہم امداد نہ کرو''

ان مشاہدات سے معلوم ہو گیا کہ اسلام نے فاقہ کو کم کرنے کے لیے ایسے اصول مقرر کیے اور ان تمام سے ایک ایسا محکم نظام پیش کیا' جس پر عمل درآمد کر کے سوسائٹی میں منظم ادارہ کی شکل میں اقتصادی حرکت کی جا سکتی ہے۔ اس لئے زکوٰۃ فرض کر کے یہ احتمال رفع کر دیا کہ تمام سرمایہ محض چند افراد کے ہاتھوں میں جمع رہے۔ پھر ملکی سرمایہ پر سے غیر معمولی دباؤ کو کم کرنے کے لیے اور سوسائٹی کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے دوسرے ممالک کی طرف ہجرت کرنے کی ترغیب دی اور اس سے اسی معاون جماعت کی تشکیل کا نظریہ پیش کیا جو سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان عافیت اور صلح و امن سے زندگی کے نشیب و فراز کو ہموار کرتی رہے۔

اس کے علاوہ اسلام نے اختیاری صدقہ پر بھی ترغیب دی ہے۔ اس طریقہ کے ایجاد کرنے میں اسلام ہی تنہا نہیں بلکہ اس نے تمام ادیان و مذاہب اور اخلاقی اصول و تعلیمات کو پیش نظر رکھا اور ان کی تائید کی۔ اس امکان کو دور کر دیا کہ یہ صدقہ سوسائٹی کے بعض طبقات کے لیے آرام پسندی کا باعث ہو۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب لوگ دور دور سے ہجرت کر کے آتے تھے اور ان کے لیے کوئی روزگار کی سبیل نہ تھی اور اس وقت امت اسلامیہ ابھی تکوینی مراحل سے گزر رہی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مسجد میں ٹھہرنے کا حکم فرماتے۔ چنانچہ ان کی تعداد چار سو تک پہنچ گئی۔ یہ جنگ کے موقعوں پر آپ کے ساتھ شریک ہوتے اور جنگ ختم ہونے کے بعد پھر مسجد میں چلے آتے اور لوگ ان کے اخراجات برداشت کرتے تھے۔ جب حضرت عمر بن خطاب خلیفہ ہوئے اور عرب کی سلطنت وسیع تر ہو گئی تو آپ نے یہ کہہ کر ان کو وہاں سے جانے کی اجازت دے دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہاری دیکھ بھال ایک ایسے زمانے میں کی جب کہ تمہارے لئے کوئی ذریعہ معاش نہ تھا' لیکن آج تمہارے سامنے وسیع حد تک روزگار کے بے شمار راستے کھلے ہوئے ہیں' اب تم اپنا فرض انجام دو اور اوروں کے ساتھ مل کر کام کرو۔

مخالفین اسلام کی یہ کس قدر بددیانتی اور جہالت ہے کہ انہوں نے اسلام کے اس

نظام پر بے سمجھے بوجھے اعتراض کیا ہے اور اپنے دعویٰ میں یہ پیش کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ' اپنے ابتدائی زمانے میں محرومی کی زندگی بسر کرتے تھے اس لئے صدقہ کی ترغیب دی' لیکن ان کو نہیں معلوم کہ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کا انتقال ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش کا ذمہ لیا' جو قریش کے سردار تھے، جن کا گھر محتاجوں' مسافروں اور مہمانوں کا مرجع تھا۔ ان کے انتقال کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل بنے جو کہ قریش کے مشہور سرداروں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بیکار نہ رہے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچپن ہی سے تجارت شروع کی اور بعثت تک برابر یہ شریف پیشہ اختیار کیے رہے۔ یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ ابتداء میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی فاقہ میں بسر ہوتی تھی اور آپ خوش حالی سے محروم تھے۔

کیا یہ تمام شواہد اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تفوق شان کی واضح دلیل نہیں ہیں؟ کیا ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قوموں کی تعمیر اور خاندانوں کی تشکیل و تنظیم کے عظیم الشان کارکن اور بانی کی حیثیت رکھتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتماعی طبقات کو تشکیل دینے اور اجتماعی اہم مسائل کو سلجھانے میں جو فکر و نظر صرف کی اور جو اقتصادی نظام پیش کیا' اس کے نقش قدم پر اکیسویں صدی کی قوموں کو چلنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔

☆☆☆

باب نمبر 7:

اسلام کی اخلاقی تعلیمات

اخلاق اور اس کی اہمیت:

انسان کو باقی حیوانی دنیا سے ممیز کرنے والی چیز اخلاق ہی ہے۔ اس کے سنوارنے سے انسان کا سنوار ہے اور اس کے بگاڑنے سے انسان کا بگاڑ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ تہذیب میں معاشرے، جس چیز پر متفق نظر آتے ہیں وہ "حسن اخلاق" ہے۔

سچائی، پاس عہد، رحم، فیاضی، صبر، تحمل، بردباری، اُولوالعزمی، شجاعت، ضبط نفس، خودداری، میل ملاپ، شائستگی، فرض شناسی، اتفاق اور دوسری اچھی صفات کو سب معاشروں نے سراہا ہے اور اس کے برعکس تمام معاشروں نے جھوٹ، بدعہدی، ظلم، بخل، بے صبری، بزدلی، ذلت، ترش روئی، خیانت، چغلی، غیبت اور تمام دوسری برائیوں کو برا سمجھا ہے۔ یہ اقدار انسانیت کا مشترکہ ورثہ ہیں اور اسلام نے ان معروفات اور منکرات کو اپنے نظام میں سمولیا ہے۔ البتہ جس پہلو سے قرآن مجید کا نظام اخلاق منفرد ہے وہ یہ ہے کہ اس نے فلسفہ اخلاق کے تمام بنیادی امور کے بارے میں ایک منظم اور مربوط نظریہ پیش کیا ہے اور وہ اپنا ایک خاص اخلاق اور قوت محرکہ رکھتا ہے۔ نظریہ اور خاص قوت محرکہ مل کر اس کے فلسفۂ اخلاق کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔

اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی پہلی بنیاد یہ نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں آزمائش اور امتحان کے لئے بھیجا ہے اور ایک دن انسان کو پوری زندگی کا حساب اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کرنا ہوگا۔ اسلام نے اخلاقی امور کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر ادا کئے جائیں کہ یہ خدا کے احکام ہیں اور انسانوں کو خدا کے بتائے ہوئے معیار خیر و شر کے مطابق عمل کرنا ہے۔ اسی میں ان کی فلاح ہے۔

انسان خود اپنے برے بھلے کے متعلق محض اپنی عقل کی بنا پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک چیز کو اچھی اور مفید سمجھتا ہے لیکن در حقیقت وہ مضر ہوتی ہے اور بعض چیزوں کو وہ مضر سمجھتا ہے حالانکہ وہ اس کے لئے حد درجہ مفید ہوتی ہیں۔ قرآن مجید کے یہ الفاظ اسی مضمون کی ترجمانی کرتے ہیں:

"وعسیٰ ان تکرھوا شیاء وھو خیرلکم وعسیٰ ان تحبوا اشیاء وھو کرہ لکم واللہ یعلم وانتم لاتعلمون"

"عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھی بھلی لگے اور وہ تمہارے لئے مضر ہو۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

(سورۃ البقرہ، آیت نمبر:۲۱۶)

آخر میں وجہ بھی بتادی کہ اللہ ہی حقائق اشیاء سے کماحقہ باخبر ہے اور تمہارے علم کا دائرہ محدود ہے۔ اگر ہر انسان یا انسانی گروہ اپنے لئے خود اخلاقی ضابطے وضع کرنے لگے تو انسانی معاشرہ انتشار کا شکار ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاق کا تعلق باہمی معاملات و مسائل سے ہے۔ دنیا کی ساری خوشی، خوشحالی اور امن و امان اسی اخلاق کی بدولت ہے۔ اسی دولت کی کمی کو حکومت اپنی قوت اور طاقت کے قانون سے پورا کرتی ہے۔ اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاق و فرائض کو پوری طرح خود انجام دیں تو حکومت کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو۔ اس لئے بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں پر اتنا ہو کہ وہ ان کے قدم بقدم کو سیدھے راستے سے بھٹکنے نہ دے۔

اس اعتبار سے اسلام دنیا کے تمام مذاہب اور نظاموں سے کہیں زیادہ جامع ہے۔ اخلاق کے دائرے میں تو زندگی کے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی پہلو بھی آجاتے ہیں لیکن ہم اپنے مطالعے کی آسانی کے لئے اخلاق کو اس کے معروف تصور تک محدود رکھیں گے اور اس ضمن میں قرآن مجید کی بنیادی تعلیمات کو اختصار کے ساتھ پیش کریں گے۔

اسلام میں چونکہ اخلاق بھی دوسرے مذہبی امور کی طرح ایک عبادت ہے، اس لئے اس کی غرض و غایت بھی ہر قسم کی دنیاوی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہئے۔ اگر ایسا

نہیں ہے تو اس کی حیثیت کچھ ہے اور نہ ہی ان اخلاقی امور کا کوئی اخروی فائدہ ہوگا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"ومن یرد ثواب الدنیا نوته منها"

(سورۃ آل عمران، آیت نمبر:۱۴۵)

"اور جو شخص دنیا میں (اپنے اعمال) کا بدلہ چاہے اس کو ہم یہیں بدلہ دیں گے۔"

خلق حسن کو اپنانے کا حکم:

1: کوئی بھلائی کا کام اگر بدنیتی اور ریاکاری سے کیا جائے وہ باطل ہوگا اور اس کا کوئی اجر نہ ملے گا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"یایها الذین امنوا لا تبطلوا صدقتکم بالمن والاذی"

"مومنو! اپنے صدقات کو احسان رکھنے اور ایذا دینے سے برباد نہ کرو۔"

(سورۃ البقرہ، آیت نمبر:۲۶۴)

2: اخلاق درحقیقت انسانوں کے باہمی تعلقات میں اچھائی برتنے کا نام ہے۔ انسانوں کے باہمی میل جول سے جو فرائض اور ذمہ داریاں ایک دوسرے پر عائد ہوتی ہیں ان کا بحسن ادا کرنا اخلاق کہلاتا ہے۔ اس لئے اخلاق کے وجود کے لئے انسانوں کا باہمی میل جول ضروری ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے رہبانیت کو جائز قرار نہیں دیا۔ قرآن کریم کہتا ہے:

"ورهبانية ابتدعوها ما كتبنها عليهم"

(سورۃ الحدید، آیت نمبر:۲۷)

"اور رہبانیت جسے انہوں نے از خود گھڑا ہم نے ان کو اس کا حکم نہیں دیا تھا۔"

3: اسلام میں جماعت کے افراد پر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے۔ اس اخلاقی اور شرعی فرض کا نام "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" ہے۔ قرآن کریم کی وضاحت کے پیش نظر امت مسلمہ کی فضیلت اس بات پر ہے کہ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر"

"تم بہترین امت ہو جو سارے انسانوں کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔"

(سورۃ آل عمران)

لہٰذا ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ جہاں بھی برائی کو دیکھے اسے مٹانے کی کوشش کرے اور ہر حالت میں حق بات کہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر"

"اور مومن ایک دوسرے کو حق کی اور صبر کرنے کی وصیت کرتے ہیں۔"

(سورۃ العصر، آیت نمبر:۳)

4: عدل وانصاف کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہئے، کسی فرد یا قوم کی دشمنی کی وجہ سے راہ اعتدال سے ہٹنا یا سچی شہادت سے گریز کرنا ناجائز ہے، خواہ اس کی خاطر رشتہ داروں، دوستوں اور انتہا یہ کہ اپنی ذات کے خلاف ہی گواہ کیوں نہ بننا پڑے۔ اسی طرح اگر دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرنے کا معاملہ پیش آئے تو بے لاگ فیصلہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

"واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل"

(سورۃ النساء، آیت نمبر:۵۸)

"اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کا فیصلہ کرو۔"

سورۃ المائدہ میں ارشاد ہے:

"ولا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا"

(سورۃ المائدہ، آیت نمبر:۸)

"اور لوگوں کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف چھوڑ دو۔"

پھر فرمایا:

"کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علی انفسکم

او الوالدین و الاقربین"

"انصاف پر قائم رہو! اللہ واسطے کے گواہ بنو! خواہ تمہاری گواہی تمہارے یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔"

5: اس سے بھی آگے بڑھ کر قرآن مجید نے عدل کے ساتھ احسان کو بھی مسلمانوں کی ایک اخلاقی خصوصیت بتایا ہے۔ احسان کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی کمی کو پورا کر دینا تاکہ معاشرے اور زندگی میں حسن قائم رہے۔ اسلامی مملکت میں عدل کا تعلق بڑی حد تک ریاست کے ہاتھ میں ہوگا، لیکن احسان ہر شخص کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ان اللہ یامر کم بالعدل و الاحسان"

(القرآن الکریم)

"بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔"

6: اسلام کہتا ہے کہ باہمی میل ملاپ میں اور بات چیت میں تواضع اور شیریں زبانی سے کام لو اور غرور و بدمزاجی سے پرہیز کرو۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"قولو اللناس حسنا"

"سب لوگوں سے اچھی بات کہو۔"

7: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور مومنین کے لئے اپنے بازو جھکا لو۔"

(سورۃ الحج، آیت نمبر:۸۸)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"و اخفض جناحك لمن التبعك من المومنين"

"ان مومنوں کے ساتھ خاطر تواضع سے پیش آؤ جو آپ کے تابع ہیں۔"

(سورۃ الشعراء، آیت نمبر:۲۱۵)

8: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"والکاظمین الغیظ"

"اور وہ (مومن) غصہ پی جانے والے ہوتے ہیں۔"
(سورۃ آل عمران، آیت نمبر:۱۳۴)

9: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"والعافین عن الناس"
"اور وہ (مومن) لوگوں سے درگزر کرنے والے ہوتے ہیں۔"
(سورۃ آل عمران، آیت نمبر:۱۳۴)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وان تعفوا اقرب للتقوی"
"اگر تم معاف کردو تو یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔"

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ولیعفوا والیصفحوا"
"انہیں چاہئے کہ معاف کردیں اور درگزر سے کام لیں۔"
(سورۃ النور، آیت نمبر:۲۲)

10: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ولمن صبر وغفر ان ذلك لمن عزم الامور"
"اور جو صبر کرے اور درگزر سے کام لے تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔"
(سورۃ الشوریٰ، آیت نمبر:۴۳)

11: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذلك قواما"
"اور (حقیقی مومن) وہ لوگ (ہیں کہ) جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ تنگی اور بخل سے کام لیتے ہیں، بلکہ اس کے درمیان اعتدال کے ساتھ خرچ کرتے ہیں۔"

اخلاق مذمومہ سے بچنے کی تاکید:

قرآن مجید کے نزدیک وہ تمام صفات مذموم ہیں جو معاشرے کی اخلاقی فضاء کو مکدر کریں، مسلمانوں کے اتحاد و ضبط کو نقصان پہنچائیں اور جن سے اس بات کا خطرہ ہو کہ پوری سوسائٹی ناقابلِ اعتبار قرار پائے گی۔ مثلاً: جھوٹ، انتشار وافتراق، افترا پردازی، بدگمانی، چغلی، غیبت، نفاق اور تحقیر وغیرہ کہ یہ وہ محرکات ہیں جن سے کسی سوسائٹی کی فضا مکدر ہوسکتی ہے۔ ان سب سے بچنے کے لئے ہدایات دی گئیں ہیں۔

اسلام میں مسلمانوں کی جان، مال، عزت اور آبرو سب محترم ہیں۔ ناحق کسی کی جان لینا، بے عزت کرنا یا ذلیل وخوار کرنا جائز نہیں ہے، جیسا کہ خیانت، بددیانتی، ظلم، فخر وغرور، خودستائی، حسد، بغض، ناپ تول میں کمی بیشی، انتقام اور قتل ناحق وغیرہ قرآن مجید کے نزدیک یہ سب مذموم صفات ہیں۔

1: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"لاتخونوا اللہ والرسول وتخونوا امنتکم"

"اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کے مرتکب ہو۔"

(سورۃ الانفال، آیت نمبر: ۲۷)

2: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ولا تصعر خدك للناس"

"اور لوگوں سے گال پھیلائے نہ رکھو (غصہ میں نہ رہو)۔"

(سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر: ۳۷)

3: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ولاتمش فی الارض مرحا"

"اور نہ زمین پر اکڑ کر چلو۔"

(سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر: ۳۷)

4: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"فلا تزکوا انفسکم"
"پس اپنی پاکبازی نہ جتاؤ۔"
(سورۃ النجم، آیت نمبر:۳۲)

5: ارشاد باری تعالیٰ ہے:
"ومن شر حاسد اذا حسد"
"اور حاسد کے حسد سے پناہ مانگتا ہوں جب وہ حسد کرے۔"
(سورۃ الفلق، آیت نمبر:5)

6: ارشاد باری تعالیٰ ہے:
"ان الذین یرمون المحصنت الغفلت المومنت لعنوا فی الدنیا و الاخرۃ"
"جو لوگ پاک دامن بھولی بھالی اور بے خبر مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا و آخرت دونوں میں لعنت ہے۔"
(سورۃ النور، آیت نمبر:۲۳)

7: ارشاد باری تعالیٰ ہے:
"واللہ لا یحب الظالمین"
"اللہ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا۔"

8: ارشاد باری تعالیٰ ہے:
"فاوفوا الکیل والمیزان ولا تبخسوا الناس اشیاء ھم"
"ناپ تول پورا کیا کرو اور لوگوں کو چیزیں کم نہ دیا کرو۔"

9: قرآن مجید کا یہ بھی حکم ہے کہ جائز سفارش کرو اور کسی کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ یعنی بطور رشوت یا کسی اور ناجائز ذریعہ سے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
"ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وتدلوبھا الی الحکام لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون ○"
(سورہ البقرۃ)

"اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ اس کو حاکموں کے پاس پہنچاؤ تا کہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ناجائز طور پر کھا جاؤ اور اسے تم جانتے بھی ہو۔"

10: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ"

(سورۃ الحجرات، آیت نمبر:11)

"اے ایمان والو! ایک قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اُڑائے، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہو۔ اور نہ ہی عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔"

11: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝"

"اور بچتے رہو جھوٹی بات سے۔"

(سورۃ الحج، آیت نمبر 30)

دوسری جگہ فرمایا:

"كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝"

"سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔"

(سورۃ التوبہ، آیت نمبر 119)

12: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ"

(سورۃ الحجرات، آیت نمبر:11)

"اور برے نام نہ ڈالو۔ ایمان لانے کے بعد کسی کا برا نام ڈالنا بہت بڑا فسق ہے۔"

13: ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

" یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ز اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ "

"قیاس آرائیوں سے بچو۔ بعض قیاس آرائیاں یقیناً گناہ ہوتی ہیں۔"

(سورۃ الحجرات، آیت نمبر 12)

14: ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

" وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ "

"اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔ کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھاؤ؟ یقیناً تم اسے ناپسند کرتے ہو (تو پھر غیبت بھی نہ کیا کرو)۔"

(سورۃ الحجرات، آیت نمبر 12)

15: ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

" وَلَا تَجَسَّسُوْا "

"ٹوہ میں نہ لگے رہو۔"

(سورۃ الحجرات، آیت نمبر 12)

16: ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

" وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ "

"ایک دوسرے کے عیب نہ لگاؤ۔"

(سورۃ الحجرات، آیت نمبر:11)

17: اسلام کہتا ہے کہ مسلمان معاشی نقطہ نظر سے ایسی روش اختیار کریں جس میں قناعت ہو، خرچ میں اعتدال ہو اور اسراف سے دور رہیں۔ اگر اللہ نے کسی کو زیادہ دیا ہے تو لالچ نہ کریں اور نہ اس سے حسد کریں۔ اگر اللہ نے انہیں زیادہ دیا ہے تو اسراف نہ کریں اور نہ بخل سے کام لیں۔

18: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ام يحسدون الناس على ما اتاهم الله من فضله"

"یا وہ جلے مرتے ہیں اس نعمت پر جو خدا نے لوگوں کو عطا کی۔"

(سورۃ النساء، آیت نمبر:۵۴)

19: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ولا تتمنوا ما فضل الله به بعضكم على بعض"

"اور جس چیز میں خدا نے تم میں سے بعض کو فضیلت دی ہے اس کی ہوس مت کرو۔"

(سورۃ النساء، آیت نمبر:۳۲)

20: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ولا تجعل يدك مغلولة الى عنقك"

"اور نہ اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو (کنجوسی و بخل نہ کرو)۔"

(سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر:۲۹)

21: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ولا تبسطها كل البسط"

"اور نہ اپنے ہاتھوں کو کھلا چھوڑ دو (فضول خرچی نہ کرو)۔"

(سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر:۲۹)

مکارم اخلاق سے آراستگی:

انسان کی ہستی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر دو مختلف حیثیتیں پائی جاتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں اور باہم دگر ملی جلی بھی۔ اس کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ وہ اپنا ایک طبعی وحیوانی وجود رکھتا ہے جس پر وہی قوانین جاری ہوتے ہیں جو تمام طبیعات وحیوانات پر فرمانروائی کر رہے ہیں۔ اس وجود کی کارکردگی منحصر ہے ان آلات ووسائل پر، ان مادی ذرائع پر اور ان طبعی حالات پر جن پر دوسری تمام طبعی اور حیوانی موجودات کی کارکردگی کا انحصار ہے۔ یہ وجود جو کچھ کرسکتا ہے قوانین طبعی کے تحت، آلات

وسائل کے ذریعے سے اور طبعی حالات کے اندر ہی رہتے ہوئے کر سکتا ہے اور اس کے کام پر عالم اسباب کی تمام قوتیں مخالف یا موافق اثر ڈالتی ہیں۔ دوسری حیثیت جو انسان کے اندر نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کے انسان ہونے کی یا بالفاظ دیگر ایک اخلاقی وجود ہونے کی حیثیت ہے۔

یہ اخلاقی وجود طبیعات کا تابع نہیں ہے بلکہ ان پر ایک طرح سے حکومت کرتا ہے۔ یہ خود انسان کے طبعی وحیوانی وجود کو بھی آلہ کے طور پر استعمال کرتا ہے اور خارجی دنیا کے اسباب کو بھی اپنا تابع بنانے اور ان سے کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی کارکن قوتیں وہ اخلاقی اوصاف ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان میں ودیعت فرمائے ہیں اور اس پر فرماں روائی بھی طبعی قوانین کی نہیں بلکہ اخلاقی قوانین کی ہے۔

یہ دونوں حیثیتیں انسان کے اندر ملی جلی کام کر رہی ہیں اور مجموعی طور پر اس کی کامیابی وناکامی اور اس کے عروج وزوال کا مدار مادی اور اخلاقی دونوں قسم کی قوتوں پر ہے۔ وہ بے نیاز تو نہ مادی قوت سے ہو سکتا ہے اور نہ اخلاقی قوت سے۔ اسے عروج ہوتا ہے تو دونوں کے بل پر ہوتا ہے اور وہ گرتا ہے تو اسی وقت گرتا ہے جب یہ دونوں طاقتیں اس کے ہاتھ سے جاتی رہتی ہیں یا ان میں وہ دوسروں کی بہ نسبت کمزور ہو جاتا ہے لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی زندگی میں اصل فیصلہ کن اہمیت اخلاقی طاقت کی ہے نہ کہ مادی کی۔ اس میں شک نہیں کہ مادی وسائل کا حصول، طبعی ذرائع کا استعمال اور اسباب خارجی کی موافقت بھی کامیابی کے لیے شرط لازم ہے اور جب تک انسان اس عالم طبعی میں رہتا ہے یہ شرط کسی طرح ساقط نہیں ہو سکتی، مگر وہ اصل چیز جو انسان کو گراتی اور اٹھاتی ہے جسے اس کی قسمت کے بنانے اور بگاڑنے میں سب سے بڑھ کر دخل حاصل ہے وہ اخلاقی طاقت ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم جس چیز کی وجہ سے انسان کو انسان کہتے ہیں وہ اس کی جسمانیت یا حیوانیت نہیں بلکہ اس کی اخلاقیت ہے۔ آدمی دوسری موجودات سے جس خصوصیت کی بنا پر ممیز ہوتا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ جگہ گھیرتا ہے یا سانس لیتا ہے یا نسل کشی کرتا ہے بلکہ اس کی وجہ امتیازی خصوصیت جو اسے ایک مستقل نوع ہی نہیں بلکہ خلیفۃ اللہ فی الارض بناتی ہے وہ اس کا اخلاقی اختیار ہے اور اخلاقی ذمہ داری کا حامل ہوتا ہے۔ پس جب

اصل جوہرِ انسانیت اخلاق ہے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اخلاقیات ہی کو انسانی زندگی کے بناؤ اور بگاڑ میں فیصلہ کن مقام حاصل ہے اور اخلاقی قوانین ہی انسان کے عروج و زوال پر فرماں روا ہیں۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد جب ہم اخلاقیات کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہ اصولی طور پر ہمیں دو بڑے شعبوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔ ایک بنیادی انسانی اخلاقیات، دوسرے اسلامی اخلاقیات۔

بنیادی انسانی اخلاقیات سے مراد وہ اوصاف ہیں جن پر انسان کے اخلاقی وجود کی اساس قائم ہے اور ان میں وہ تمام صفات شامل ہیں جو دنیا میں انسان کی کامیابی کے لیے بہر حال شرط لازم ہیں۔ خواہ وہ صحیح مقصد کے لیے کام کر رہا ہو یا غلط مقصد کے لیے ان اخلاقیات میں اس سوال کا کوئی دخل نہیں ہے کہ آدمی خدا اور وحی اور رسول اور آخرت کو مانتا ہے یا نہیں۔ طہارت نفس، نیت خیر اور عمل صالح سے آراستہ ہے یا نہیں۔ اچھے مقصد کے لیے کام کر رہا ہے یا برے مقصد کے لیے۔ قطع نظر اس سے کہ کسی میں ایمان ہو یا نہ ہو اور اس کی زندگی پاک ہو یا ناپاک اور اس کی سعی کا مقصد اچھا ہو یا برا۔ جو شخص اور جو گروہ بھی اپنے اندر وہ اوصاف رکھتا ہو گا جو دنیا میں کامیابی کے لیے ناگزیر ہیں وہ یقیناً کامیاب ہو گا اور ان لوگوں سے بازی لے جائے گا جو ان اوصاف کے لحاظ سے اس کے مقابلہ میں ناقص ہوں گے۔ مومن ہو یا کافر، نیک ہو یا بد، مصلح ہو یا مفسد، غرض جو بھی ہو وہ کارگر انسان ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں جب کہ اس کے اندر ارادے کی طاقت اور فیصلے کی قوت ہو، عزم اور حوصلہ ہو، صبر و ثبات اور استقلال ہو، تحمل اور برداشت ہو، ہمت اور شجاعت ہو، مستعدی و جفاکشی ہو، اپنے مقصد کا شوق اور اس کے لیے ہر چیز قربان کر دینے کا بل بوتا ہو، حزم و احتیاط اور معاملہ فہمی و تدبر ہو، باضابطگی کے ساتھ کام کرنے کا سلیقہ ہو، فرض شناسی اور احساس ذمہ داری ہو، حالات کو سمجھنے اور ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے اور مناسب تدبیر کرنے کی قابلیت ہو، اپنے جذبات، خواہشات اور ہیجانات پر قابو ہو اور دوسرے انسانوں کو اپنا بنانے، ان کے دل میں جگہ پیدا کرنے اور ان سے کام لینے کی صلاحیت ہو۔ پھر ناگزیر ہے کہ اس کے اندر وہ شریفانہ خصائل بھی کچھ نہ کچھ موجود ہوں جو فی الحقیقت جو

ہر آدمیت ہیں اور جن کی بدولت آدمی کا وقار و اعتبار دنیا میں قائم ہوتا ہے۔ مثلاً: خودداری، فیاضی، رحم دلی، ہمدردی، انصاف، وسعت قلب ونظر، سچائی، امانت، راستبازی، پاس عہد، معقولیت، اعتدال، شائستگی، طہارت و نظافت اور ذہن و نفس کا انضباط، یہ اوصاف اگر کسی قوم یا گروہ کے بیشتر افراد میں موجود ہوں تو گویا یوں سمجھئے کہ اس کے پاس وہ سرمایہ انسانیت موجود ہے، جس سے ایک طاقتور جماعت وجود میں آسکتی ہے، لیکن یہ سرمایہ مجتمع ہو کر بالفعل ایک مضبوط و مستحکم اور کارگر اجتماعی طاقت نہیں بن سکتا جب تک کہ کچھ دوسرے اخلاقی اوصاف بھی اس کی مدد پر نہ آئیں۔ مثلاً: تمام یا بیشتر افراد کسی اجتماعی نصب العین پر متفق ہوں اور اس نصب العین کو اپنی انفرادی اغراض بلکہ اپنی جان، مال اور اولاد سے بھی عزیز تر رکھیں۔ ان کے اندر آپس کی محبت اور ہمدردی ہو، انہیں مل کر کام کرنا آتا ہو، وہ اپنی خودی و نفسانیت کو کم از کم اس حد تک قربان کر سکیں جو منظم سعی کے لیے ناگزیر ہے۔ وہ صحیح و غلط رہنما میں تمیز کر سکتے ہوں اور موزوں آدمیوں ہی کو اپنا رہنما بنائیں۔ ان کے رہنماؤں میں اخلاص اور حسن تدبر اور رہنمائی کی دوسری ضروری صفات موجود ہوں اور خود قوم یا جماعت اپنے رہنماؤں کی اطاعت کرنا جانتی ہو۔ ان پر اعتماد رکھتی ہو اور اپنے تمام ذہنی جسمانی اور مادی ذرائع ان کے تصرف میں دے دینے پر تیار ہو۔ نیز پوری قوم کے اندر ایسی زندہ اور حساس رائے عام پائی جاتی ہو جو کسی ایسی چیز کو اپنے اندر پنپنے نہ دے جو اجتماعی فلاح کے لیے نقصان دہ ہو۔

یہ ہیں وہ اخلاقیات جن کو میں ''بنیادی انسانی اخلاقیات'' کے لفظ سے تعبیر کرتا ہوں۔ کیونکہ فی الواقع یہی اخلاقی اوصاف انسان کی اخلاقی طاقت کا اصل منبع ہیں اور انسان کسی مقصد کے لیے بھی دنیا میں کامیاب سعی نہیں کر سکتا جب تک کہ ان اوصاف کا زور اس کے اندر موجود نہ ہو۔ ان اخلاقیات کی مثال ایسی ہے جیسے فولاد کہ وہ اپنی ذات میں مضبوطی و استحکام رکھتا ہے اور اگر کوئی کارگر ہتھیار بن سکتا ہے تو اسی سے بن سکتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ غلط مقصد کے لیے استعمال ہو یا صحیح مقصد کے لیے۔ آپ کے پیش نظر صحیح مقصد ہو تب بھی تو آپ کے لیے مفید وہی ہتھیار ہو سکتا ہے جو فولاد سے بنا ہو نہ کہ سڑی ہوئی پھس پھس لکڑی سے جو ایک ذرا سے بوجھ اور معمولی سی چوٹ کی تاب بھی نہ لا سکتی ہو۔ یہی وہ بات

ہے جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے:

"خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام"

"تم میں جو لوگ جاہلیت میں اچھے تھے وہی اسلام میں بھی اچھے ہیں۔"

یعنی زمانہ جاہلیت میں جو لوگ اپنے اندر جوہر قابل رکھتے تھے وہی زمانہ اسلام میں مردان کار ثابت ہوئے' فرق صرف یہ ہے کہ ان کی قابلیتیں پہلے غلط راہوں میں صرف ہو رہی تھیں اور اسلام نے آ کر انہیں صحیح راہ پر لگا دیا۔ مگر بہرحال ناکارہ انسان نہ جاہلیت کے کسی کام کے تھے نہ اسلام کے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں جو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور جس کے اثرات تھوڑی ہی مدت گزرنے کے بعد دریائے سندھ سے لے کر اٹلانٹک کے ساحل تک دنیا کے ایک بڑے حصے نے محسوس کر لیے اس کی وجہ یہی تو تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں بہترین انسانی مواد مل گیا تھا جس کے اندر کریکٹر کی زبردست طاقت موجود تھی۔ اگر خدانخواستہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بودے' کم ہمت' ضعیف الارادہ اور ناقابل اعتماد لوگوں کی بھیڑ مل جاتی تو کیا پھر وہ نتائج نکل سکتے تھے۔؟

اب اخلاقیات کے دوسرے شعبے کو لیجئے جسے میں "اسلامی اخلاقیات" کے لفظ سے تعبیر کر رہا ہوں۔ یہ بنیادی انسانی اخلاقیات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی تصحیح اور تکمیل ہے۔

اسلام کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو ایک صحیح مرکز ومحور مہیا کر دیتا ہے' جس سے وابستہ ہو کر وہ سراپا خیر بن جاتے ہیں۔ اپنی ابتدائی صورت میں یہ کہ وہ بس ایک کاٹ ہے جو ڈاکو کے ہاتھ میں جا کر آلۂ ظلم بھی بن سکتی ہے اور مجاہد فی سبیل اللہ کے ہاتھ میں جا کر وسیلۂ خیر بھی۔ اسی طرح ان اخلاقیات کی طاقت بھی کسی شخص یا گروہ میں ہونا بجائے خود خیر نہیں ہے بلکہ اس کا خیر ہونا موقوف ہے اس پر کہ یہ قوت صحیح راہ میں صرف ہو۔ اس کو صحیح راہ پر لگانے کی یہ خدمت اسلام انجام دیتا ہے۔ اسلام کی دعوت توحید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں انسان کی تمام کوششوں اور محنتوں اور دوڑ دھوپ کا مقصد وحید اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو۔ والیك نسعی ونحفد اور اس کا پورا دائرہ فکر وعمل ان حدود سے محدود ہو جائے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دی ہے۔ ایاك نعبد ولك نصلی

و نسب جلد۔ اس اساسی اصلاح کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمام بنیادی اخلاقیات جن کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے صحیح راہ پر لگ جاتے ہیں اور قوت جو ان اخلاقیات کی موجودگی سے پیدا ہوتی ہے' بجائے اس کے کہ نفس، وجدان، قوم یا ملک کی سربلندی ہر ممکن طریقے سے صرف ہو' خالص حق کی سربلندی پر صرف جائز طریقوں سے صرف ہونے لگتی ہے۔ یہی چیز اس کو ایک مجرد قوت کے مرتبے سے اٹھا کر یکجا ایک بھلائی اور دنیا کے لیے ایک رحمت بنا دیتی ہے۔

دوسرا کام جو اخلاق کے باب میں اسلام کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو مستحکم بھی کرتا ہے اور پھر ان کے اطلاق کو انتہائی حدود تک وسیع بھی کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر صبر کو لیجیے۔ بڑے سے بڑے صابر آدمی سے غذا ال رہی ہو' اس کی برداشت اور اس کے ثبات و قرار کی بس ایک حد ہوتی ہے جس کے بعد وہ گھبرا اٹھتا ہے لیکن جس صبر کو توحید کی جڑ سے غذا ملے اور جو دنیا کے لیے نہیں بلکہ اللہ رب العالمین کے لیے ہو' وہ تحمل و برداشت اور پامردی کا ایک اتھاہ خزانہ ہوتا ہے جسے دنیا کی تمام ممکن مشکلات مل کر بھی لوٹ نہیں سکتیں۔ پھر غیر مسلم کا صبر نہایت محدود نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ ابھی تو گولوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں نہایت استقلال کے ساتھ ڈٹا ہوا تھا اور ابھی جو جذبات شہوانی کی تسکین کا کوئی موقع سامنے آیا تو وہ نفس امارہ کی ایک معمولی تحریک کے مقابلہ میں بھی نہ ٹھہر سکا۔ لیکن اسلام صبر کو انسان کی پوری زندگی میں پھیلا دیتا ہے اور اسے صرف خطرات' مصائب اور مشکلات ہی کے مقابلہ میں نہیں بلکہ تمام ایسے لالچوں' خطروں' اندیشوں اور خواہشوں کے مقابلہ میں بھی ٹھہراؤ کی ایک ایسی زبردست طاقت بنا دیتا ہے جو آدمی کو راہ راست سے ہٹانے والے ہوں۔ درحقیقت اسلام مومن کی پوری زندگی کو ایک صابرانہ زندگی بناتا ہے۔ جس کا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ عمر بھر صحیح طرز خیال اور صحیح طرز عمل پر قائم رہو۔ خواہ اس میں کتنے ہی خطرات و نقصانات اور مشکلات ہوں اور دنیا کی زندگی میں اس کا کوئی مفید نتیجہ نکلتا نظر نہ آئے اور کبھی فکر و عمل کی برائی نہ اختیار کرو خواہ فائدوں اور امیدوں کا کیسا ہی خوش نما سبز باغ تمہارے سامنے لہلہا رہا ہو۔ یہ آخرت کے قطعی نتائج کی توقع پر دنیا کی ساری زندگی میں بدی سے رکنا اور خیر کی راہ پر جم کر چلنا اسلامی صبر ہے اور اس کا ظہور لازماً ان شکلوں میں بھی ہوتا ہے جو بہت محدود پیمانے پر کفار کی زندگی میں نظر آتی

ہیں۔ اسی خیال پر دوسرے تمام بنیادی اخلاقیات کو بھی آپ قیاس کر سکتے ہیں جو کفار کی زندگی میں صحیح فکری بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے ضعیف اور محدود ہوتے ہیں، اسلام ان سب کو ایک صحیح بنیاد دے کر محکم بھی کرتا ہے اور وسیع بھی کر دیتا ہے۔

اسلام کا تیسرا اہم کام یہ ہے کہ وہ بنیادی اخلاقیات کی ابتدائی منزل پر اخلاق فاضلہ کی ایک نہایت شاندار بالائی منزل تعمیر کرتا ہے جس کی بدولت انسان اپنے شرف کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے۔ وہ اس کے نفس کو خود غرضی سے، نفسانیت سے، ظلم سے، بے حیائی اور خلاعت و بے قیدی سے پاک کر دیتا ہے۔ اس میں خدا ترسی، تقویٰ و پرہیزگاری، اور حق پرستی پیدا کرتا ہے۔ اس کے اندر اخلاقی ذمہ داریوں کا شعور و احساس، رحم، ہمدردی، امین، بے غرض خیر خواہ، بے لوث منصف اور ہر حال میں صادق اور استباز بنا دیتا ہے اور اس میں ایک ایسی بلند پایہ سیرت پرورش کرتا ہے جس سے ہمیشہ صرف بھلائی ہی متوقع ہو اور برائی کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔ پھر اسلام آدمی کو محض نیک ہی بنانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ حدیث رسول کے الفاظ میں وہ اسے:

"مفتاح للخير مغلاق للشر"

"بھلائی کا دروازہ کھولنے والا اور برائی کا دروازہ بند کرنے والا بناتا ہے۔"

یعنی وہ اپنا یہ مشن اس کے سپرد کرتا ہے کہ دنیا میں بھلائی پھیلائے اور برائی کو روکے۔ اس سیرت و اخلاق میں فطرتاً وہ حسن ہے، وہ کشش ہے، وہ بلا کی قوت تسخیر ہے کہ اگر کوئی منظم جماعت اس سیرت کی حامل ہو اور عملاً اپنے اس مشن کے لیے سعی کرے جو اسلام نے اس کے سپرد کیا ہے تو اس کی جہانگیری کا مقابلہ کرنا دنیا کی کسی قوت کے بس کا کام نہیں ہے۔

اخوت و مساوات:

اشخاص و افراد کے درمیان جمعیت کا رشتہ اس وقت تک مضبوط نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ ان کے دل ایک محکم اساس اور ایک مضبوط رابطہ کے ساتھ مربوط و مطمئن نہ ہوں۔ کوئی رشتہ اسلامی رابطہ سے بڑھ کر محکم و استوار نہیں ہو سکتا۔ اسلام کا یہ رابطہ "اخوت" کہلاتا ہے، یہی وہ مقدس رشتہ ہے جو حقیقی فرزندی کے رشتہ سے بھی مضبوط اور قوی ہے، کیونکہ فرزندی کا

اتصال ایک شرعی امر ہے۔ جس کے درمیان کفر حائل ہے۔ جب لڑکا کافر ہو جائے تو اس کا رشتہ اپنے ماں باپ سے جدا ہو جائے گا۔ جب ماں باپ کافر ہو گئے تو ان کا رشتہ اپنے بیٹے سے کٹ جائے گا۔ نہ یہ اس کے وارث ہوں گے اور نہ لڑکا ان کا وارث بنے گا۔ حالانکہ ان دونوں حالتوں میں حقیقی فرزندی کا رشتہ ثابت ہے۔

اس سے یقینی طور پر یہ معلوم ہو گیا کہ رابطہ اخوت اسلامیہ جو حکم الٰہی سے محکم و مربوط ہے' تمام رشتہ داریوں پر مقدم ہے۔ اس کے بعد کے درجہ میں قرابت داروں اور برادروں کے مراتب کا شمار ہو گا۔ پھر اسلام نے اخوت اسلامیہ کو عالم اسلامی کے مابین رنگ و نسل اور قبیلہ و وطن کے اختلاف و رنگارنگی کے باوجود برقرار رکھا۔ کہا گیا:

"انما المومنون اخوة"

"تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔"

دوسری جگہ فرمایا:

"اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ"

(سورۃ الاحزاب، آیت نمبر 6)

"نبی زیادہ مقدم ہیں مومنوں پر ان کے نفسوں سے اور نبی کی بیویاں مومنوں کی مائیں ہیں۔"

یہ مذہبی و اسلامی نسبت ہے جو حکم الٰہی سے قائم ہے' کسی طرح یہ رشتہ منقطع نہیں ہوتا۔ حکم دیا گیا کہ تمام مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج طاہرات کے جو امہات المومنین ہیں' فرزند کہلاتے ہیں۔ اس کی تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے بھی ہوتی ہے:

"انما انا لکم بمنزلة الوالد اعلمکم"

"میں بلا شک تمہارے لئے باپ کے قائم مقام ہوں جو تمہیں تعلیم دیتا ہوں۔"

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ قول بھی مروی ہے:

"انا جد کل تقی"

"میں ہر تقویٰ شعار کا جدِ امجد ہوں۔"

ابتداء اسلام میں ہجرت کے زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے مواخاۃ (بھائی چارہ) کو انجام دیا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر دو مہاجروں کے مابین اخوت اور بھائی چارہ پیدا کرا دیا۔ ان میں سے ہر محتاج و مالدار کو رشتہ اخوت سے مضبوط کر دیا تا کہ وہ دونوں تنگی و مصیبت کے وقت باہمی تعاون کریں۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ کا حکم دیا۔

چونکہ قبیلوں اور خاندانوں پر فخر و غرور اخوت اسلامیہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے القاب و اسماء کے ساتھ عجب و تعلّی کرنے سے منع فرمایا اور ان کی علت غائی یہ بتلائی گئی:

"جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا"

(سورۃ الحجرات، آیت نمبر 13)

"ہم نے تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں اس لئے تقسیم کیا کہ تم ان کے ذریعے باہمی تعارف حاصل کرو۔"

یہاں لام تعلیل کا ہے یعنی یہ گروہ اور قبائل اس لئے بنائے گئے ہیں تا کہ لوگ ان سے ایک دوسرے کو پہچانیں۔ اس لئے نہیں کہ ایک دوسرے کو برتر اور مافوق سمجھیں اور اپنے قبیلہ پر فخر و غرور کرنے لگ جائیں، کیونکہ یہ سارے قبائل ایک اصل پر منتہی ہوتے ہیں۔ گویا یہ ایک خاندان کے مختلف افراد ہیں جو تمدنی و عمرانی حاجتوں اور ضرورتوں کی بنا پر جدا جدا ہو گئے اور مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ پھر اللہ نے فخر و کرامت کو اس طرح محصور کر دیا:

"اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ"

(سورۃ الحجرات، آیت نمبر 13)

"بے شک تم میں زیادہ قابل تکریم اللہ کے نزدیک وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔"

تقویٰ و پرہیز گاری اور خشیت الٰہی ہی مجد و کرامت کا موجب ہے اور اس کے علاوہ معیار فخر باطل اور زوال پذیر ہے:

"ومن یھن اللہ فمالہ من مکرم"

اللہ جس کو ذلیل کر دے تو پھر اس کو مرتبہ ومقام بخشنے والا کوئی نہیں۔"

اس کی تائید اللہ نے آخرت کے ہولناک منظر کو پیش کرتے ہوئے کی ہے:

"فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَآ أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَآءَلُونَ"

(سورۃ المومنون، آیت نمبر 101)

"جب صور پھونکا جائے گا تو اس دن ان کے درمیان کے سارے رشتے کالعدم ہو جائیں گے اور نہ یہ باہمی کچھ پوچھیں گے۔"

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

"لَن تَنفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَآ أَوْلَٰدُكُمْ يَوْمَ الْقِيَٰمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ٥"

(سورۃ الممتحنۃ، آیت نمبر 3)

"قیامت کے دن ہرگز نہ تمہاری رشتہ داریاں فائدہ پہنچائیں گی اور نہ تمہاری اولاد تمہارے درمیان جدائی رہے گی اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے بہت باخبر ہے۔"

اسی حقیقت کے اظہار میں بے شمار احادیث آئی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"ان اللہ قد اذھب عنکم عتیۃ الجاھلیۃ و فخرھا بالآباء مون تقی و فاجر شقی انتم بنو آدم و آدم من تراب لیدعن رجال فخرھم باقوام انما ھم فحم من فحم جھنم اولنکونن اھون علی اللہ من الجعلان التی تدفع بانفھا الفتن"

"اللہ نے تم سے جاہلیت کے عیب و نخوت اور باپ دادا پر فخر کرنے کو دور کر دیا ہے' مسلمان پرہیز گار ہے اور بدکار گنہگار' تم آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے۔ لوگوں کو اپنی قوموں پر فخر کرنا چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ وہ جہنم کا ایندھن ہیں۔ ورنہ وہ اللہ کے نزدیک اس کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل

ہو جائیں گے جو اپنی ناک سے گندگی برپا کرتا ہے۔"

دوسری جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لیس منا من دعا الی عصبیة ولیس منا من قاتل علی عصبیة ولیس منا من مات علی عصبیة"

"یہ اشخاص میری جماعت سے نہیں ہوں گے: جو عصبیت کی طرف دعوت دے، جو عصبیت پر جنگجوئی کرے اور جو عصبیت کی موت مر جائے۔"

اسی قبیل سے وہ حدیث ہے جس کو حصین بن عبدالرحمٰن بن عقبہ نے اپنے باپ سے بیان کیا ہے۔ یہ ایک غلام تھے' غزوۂ احد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے اور مشرکین کے ایک شخص پر یہ کہتے ہوئے وار کیا:

"اس وار کو سنبھال' میں فارسی غلام ہوں۔"

ان کا ارادہ اس سے اپنی قوم کو باعزت سمجھتا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا:

"تو نے یہ کیوں نہ کہا کہ یہ میرا وار سنبھال میں انصاری غلام ہوں۔؟"

اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ وحدت جامعیت اسلامیہ کی طرف تھا اور عصبیت وجنسیت کی طرف دعوت دینے یا اس کو باعزت سمجھنے سے روکنا مقصد تھا۔ اس کی تصدیق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

"ولا فضل لعربی علی عجمی ولا لاحمر علی اسود الا بالتقویٰ"

"سوائے تقویٰ کے نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت وفوقیت ہے اور نہ گورے کو کالے پر۔"

اس لئے کہ جمہور حاضرین کی تعداد عربوں کی تھی' معلوم ہے کہ وہ اپنے حسب ونسب پر آپس میں فخر کیا کرتے تھے۔ اس تصریح سے اوروں پر ان کی فضیلت کا مدار تقویٰ ہی پر رکھا گیا۔

اس کو ثابت کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک وفد حاضر ہوا ان میں سے ایک نے کہا:

"آپ ہمارے آقا ہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آقا تو اللہ تبارک وتعالیٰ ہی ہے۔"

انہوں نے کہا:

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں افضل اور جودوکرم میں ہم سے بڑھ کر ہیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تمہارے اس قول میں تمہیں شیطان نہ ابھارے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام یا لونڈی کو اس کے لقب سے یاد کرنے کو بھی منع فرمایا۔

اسی طرح غلام کو یہ کہہ کر پکارنے سے منع فرمایا:

"میرا آقا۔ میری مالکہ۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس شخص کو تہدید شدید فرمائی جو اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر وتوہین کا ارادہ کرے۔ فرمایا:

"كل المسلم على المسلم حرام ماله وعرضه ودمه"

"ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا مال، اس کی آبرو اور اس کا خون حرام ہے۔"

ایک مرتبہ فرمایا:

"حسيب امرى من الشر يحقر اخاه المسلم"

"کسی شخص کے برا ہونے کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے۔"

ایک اور حدیث میں آیا ہے:

"مامن امرى يخذل امرء امسلما فى مرضع تنهتك فيه حرمته وينتقص فيه من عرضه الا خذ له الله فى موطن

یحب فیہ نصرتہ وما من مسلم ینصر مسلما فی موضع ینتقص فیہ وینتھک فیہ من حرمتہ الا نصرہ اللہ فی موطن یحب فیہ نصرتہ"

"جو مسلمان کسی مسلمان کو ایسے مقام میں اپنی مدد کرنے سے چھوڑ دے گا جہاں اس کو بے حرمت کیا جا رہا ہے اور اس کی آبروریزی ہو رہی ہو تو خدا اس کو بھی ایسے موقعہ پر رسوا کر دے گا جب کہ وہ اس کی مدد چاہتا ہے۔ جو مسلمان کسی مسلمان کی ایسے مقام پر مدد کرے گا جہاں اس کی بے عزتی اور حرمت ریزی ہو رہی ہے تو اللہ اس کی ایسے موقعہ پر امداد کرے گا جس میں وہ اس کی مدد کا طالب ہے۔"

دوسری جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یسلمہ من کان فی حاجۃ اخیہ فان اللہ فی حاجتہ ومن فرج عن مسلم لربۃ فرج اللہ عنہ بھا کربۃ من کرب یوم القیامۃ ومن ستر مسلما سترہ اللہ یوم القیامۃ"

"مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ یہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس سے کنارہ کشی کرے۔ جو شخص اپنے بھائی کا محتاج ہو تو سمجھنا چاہیے کہ اللہ کو اس کی حاجت ہے۔ جو شخص کسی مسلمان کی تکلیف کو دور کرے گا تو اللہ اس کے ذریعے قیامت کے دن اس کی بھی پردہ پوشی کرے گا۔"

اسلام نے غیبت اور کسی کی عیب جوئی و نکتہ چینی سے منع کیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتا"

"کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ اپنے بھائی کا مردار گوشت کھاؤ۔؟"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیبت کا معنی اس طرح واضح کیا:

"ذكرك اخاك بما يكره"

"تم اپنے بھائی کا تذکرہ ایسے الفاظ میں کرو کہ وہ سن پائے تو اس کو ناپسند معلوم ہو۔"

دریافت کیا گیا:

"خواہ اپنے بھائی کے اندر وہ سب کچھ موجود ہو جو میں کہتا ہوں۔؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو کچھ تم کہہ رہے ہو اگر اس کے اندر موجود ہو تو تم نے اس کی پس پشت عیب جوئی کی اگر جو کچھ تم کہتے ہو اس کے اندر نہ پایا جائے تو تم نے اس پر بہتان تراشی کی۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں انتہائی سختی برتی اور وعید سنائی ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایک شخص زنا کرے اور توبہ کرلے تو اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے' لیکن پس پشت عیب جوئی کرنے والا کبھی معاف نہیں کیا جائے گا تاوقتیکہ عیب زدہ اس کو نہ معاف کردے۔"

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لايومن احدكم حتى يحب لاخيه مايحب لنفسه"

"تم میں سے کوئی مسلمان نہ ہوگا تاوقتیکہ اپنے بھائی کے لیے وہ چیز پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔"

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

"لايحل لمسلم ان يحجر اخاه فوق ثلاث"

"کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زائد جدا رکھے۔"

قرآن مجید کی آیات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ثابت ہو گیا کہ اخوت اسلامیہ کے لیے شریعت کی نظر میں عظیم الشان مقصد ہے۔

اسلامی تعلیمات کا اثر:

اب میں یہاں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اس دعوت کا اجتماعی حیثیت سے کیا اثر ہوا' وہ تبلیغ جو ایک خاندان اور گروہ میں قابل پذیرائی نہیں ہو سکتی تھی' کس طرح چند ہی سال کے اندر یعنی بیس سال کی قلیل مدت میں مشرق و مغرب میں پھیل جاتی ہے۔

اس دعوت کا فوری اثر یہ ہوا کہ اس نے ایک قوم کے اندر حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا اور اس کو بالکل جداگانہ شکل و صورت میں بدل دیا۔ وہ قوم جس میں اخوت اسلامیہ کی نشوونما ہوئی' امت عربیہ ہے۔

عربوں کی قوم تنگدست تھی۔ زمین کے پست حصہ میں سکونت گزین تھی' روم و فارس کے متمدن و مہذب اور شائستہ قوموں کی نظر میں ذلت و حقارت سے دیکھی جاتی تھی۔ اس کے لئے نہ کوئی نظام فکر تھا اور نہ کوئی قدر و منزلت۔ عرب کے لوگ جاہلیت میں مختلف قبائل میں منقسم تھے۔ ان میں ہر دم جنگ و جدل کا سلسلہ جاری تھا۔ سرداری کے لیے باہم معرکہ آرائی ہوتی۔ آپس میں معمولی سی بات پر جھگڑ بیٹھتے تھے۔ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ پر غلبہ حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا اور اپنے حسب و نسب کے ساتھ فخر و مباہات کیا کرتا تھا۔ ان کا فخر و ناز تمام تر لوٹ مار، قتل و غارت اور ظلم و فساد پر ہوتا' ظلم و ستم ان کی زندگی کا بیش بہا سرمایہ اور لازمہ ہو گیا تھا۔

عمرو بن کلثوم شاعر جاہلیت کہتا ہے:

"ہم سرکش' باغی اور ظالم ہیں' مظلوم نہیں ہیں' لیکن ہم نے ظلم سے ابتداء کی ہے۔"

زہیر شاعر جاہلیت کہتا ہے:

"جو شخص اپنے حوض کی اپنے ہتھیار سے حفاظت نہ کرے گا تو وہ ڈھا دیا جائے گا اور جو شخص لوگوں پر ظلم نہیں کرتا ہے' اس پر ظلم کیا جائے گا۔"

اسلامی شاعر قسطامی' اسلامی قبائل میں جاہلیت کی صفت کی تعریف بیان کرتا ہے:

"جس شخص نے لشکر جمع کیا تو اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے پاس بھی سخت اور ٹھوس نیزے اور بہترین گھوڑے ہیں۔ ہم جب کسی پر لوٹ مار کرنے کا ارادہ

کرتے ہیں تو جناب اور ضبہ پر اور کبھی ہمارے بھائی بکر پر ہی' جب کہ ان کے
سوا کوئی نہ ملے لوٹ مار کرتے ہیں۔"

یہ اشعار جاہلیت کے عربی قبائل کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ اس تبلیغ کے اثر نے ایک ایسی قوم کو جو اپنے بھائیوں اور ہمسایہ پر لوٹ مار کرنے کو باعث فخر وناز گردانتی تھی ایشیاء وافریقہ میں سیاہ وسفید کے درمیان عدل وانصاف قائم کرنے والی' قانون دان اور مبلغ اسلام بنا دیا۔ ایسی وحشی اور بدوی قوم کے افراد ایک ہی صدی کے اندر تہذیب وتمدن کے علمبردار اور نظام عالم کے مالک ہو جاتے ہیں۔

جاہلیت میں ہر شخص اپنے قبیلہ کا پابند تھا اور دوسرے قبیلہ پر عرصہ حیات تنگ کر چکا تھا۔ قبیلوں کے درمیان اتحاد واتفاق اور باہم نصرت وتعاون مفقود اور بھلائی کا نام ناپید تھا۔ بلکہ یہ لوگ ان چیزوں کو سمجھنے سے بھی قاصر تھے۔ جس طرح یہ انسانیت سے ناآشنا تھے' اسی طرح امت عربیہ کے وجود کا انکار کرتے تھے۔ محض دشمنی اور بغض وعناد کو زندگی کا واحد مقصد اور ذریعہ جانتے تھے۔ ہر قبیلہ ہر ممکن طریقہ سے اپنی حفاظت وحمایت اور سرداروں پر غلبہ حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا۔ اس وقت دعوت محمدی نے ان کی تمام برائیوں کو دور کر دیا، عصبیت وجنسیت کے فتنہ وشر کا انسداد کر دیا اور تمام قبائل اور خاندانوں کو ملا کر ایک ہی امت بنا دیا۔ انسانی حقوق کو قائم کیا، لوٹ مار' قتل وخونریزی کے بجائے باہم نصرت واعانت' اتحاد واتفاق اور پاک عقیدہ پیدا کر دیا۔ عربوں نے اس دعوت کو قبول کیا اور انسانیت واخلاق کی اعلیٰ صفات سے متصف ہو گئے۔ اسلامی شریعت تمام پر فائق ہو گئی۔ اس نے قصاص کو برقرار رکھا' ظلم وستم کی بیخ کنی کر دی اور عدل وانصاف کو عام کر دیا۔

اسلام نے ہر فرد' ہر سوسائٹی اور ہر قبیلہ کو اپنا اپنا ذمہ دار ٹھہرایا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى"

(سورۃ الانعام، آیت نمبر 163)

"ایک کا بوجھ دوسرے کی گردن پر ڈالا نہیں جاتا۔"

"كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝"

(سورۃ المدثر، آیت نمبر 38)

''ہر نفس اپنی کمائی کا آپ مرہون ہے۔''

''وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی o''

(سورۃ النجم، آیت نمبر 39)

''اور یہ کہ انسان کو اس کی کوشش کے موافق ہی صلہ ملے گا۔''

عزت وغلبہ کو شریعت اور اس کے چلانے والے کے لیے خاص کر دیا اور جاہلیت کے تمام دعوے باطل کر دیئے گئے۔ غرضیکہ قانون عدل وانصاف اور تبلیغ اخوت اسلامیہ کا بول بالا ہو گیا۔

ہر شخص کو اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار دیا گیا' کسی حیثیت سے اس کو جاہلیت کا دعویٰ کام نہیں دے سکتا اور وہ میدان عمل میں اپنے حسب ونسب اور جاہ ومال کو پیش نہیں کر سکتا۔

ارشاد ہے:

'فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ o وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ o''

(سورۃ الزلزال، آیت نمبر 7 اور 8)

''پس جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا تو وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے تو وہ اس کا پھل دیکھے گا۔''

نیز کہا گیا:

''اِنَّھَآ اِنْ تَکُ مِثْقَالَ حَبَّۃٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَکُنْ فِیْ صَخْرَۃٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِھَا اللّٰہُ اِنَّ اللّٰہَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ o''

(سورۃ لقمان، آیت نمبر 16)

''بے شک اگر وہ رائی کے دانہ برابر بھی ہو اور وہ چٹان میں ہو یا آسمان یا زمین میں اللہ تعالیٰ اس کو حاضر کر دے گا۔''

دعوت محمدی سے تمام لوگوں میں مساوات قائم ہو گئی' اخوت اسلامیہ کا بول بالا ہو گیا، آقا وغلام اور شریف وکمتر کا کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ عمل سے ہر ایک کو فضیلت ہے۔ خدا سے ڈرنے والا ہی عزت مند ہے:

''یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ

شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ"

(سورۃ الحجرات، آیت نمبر 13)

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے خاندان اور قبیلے بنائے ہیں' تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو' بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ بزرگ وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبۂ حجۃ الوداع میں عربوں کی اس مساوات و اخوت کو تمام دنیا کے انسانوں کے لیے قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اے لوگو! تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم ہی سے پیدا کیے گئے ہو۔ کسی عربی کو عجمی پر سوائے تقویٰ و پرہیز گاری کے کوئی فضیلت اور فوقیت نہیں۔"

یہی وہ اصل الاصول تھا' جو عربوں کی فتوحات میں اساسی دستور کا حکم رکھتا تھا۔ اس جنسیت اور قومیت کے عدم امتیاز نے اسلامی فتوحات کے دائرہ کو وسیع کر دیا اور اس کے ہمیشہ باقی رہنے والے اثرات مشرق و مغرب میں پائے جاتے ہیں۔

دعوت محمدی نے راہ حق پر گامزن ہونے اور بھلائیوں میں سبقت کرنے اور باہم غالب آنے اور اعمال صالحہ میں ایک دوسرے پر بڑھنے کی اجازت دی، تشویش و ترغیب دلائی اور اس کے علاوہ ناجائز غلبہ و مسابقت کو حرام قرار دیا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ فِیْہِ تَخْتَلِفُوْنَ o"

(سورۃ المائدہ، آیت نمبر 48)

"بھلائیوں میں تم ایک دوسرے پر سبقت کرتے رہو۔ تم تمام کا ٹھکانا اللہ ہی کی طرف ہے' پس وہ تم کو خبر کر دے گا کہ تم کیا کیا کرتے تھے۔"

شریعت اسلامیہ نے قبیلہ کی جگہ قوم' ظلم کی جگہ انصاف' بے جا غرور و تعلّی کی جگہ مساوات اور حسب و نسب پر فخر کرنے کی جگہ عمل صالح کو اصل الاصول قرار دیا۔ عربوں سے بغض و عناد اور نفرت کے خیالات کو دور کر کے ان کے دلوں میں محبت و ہمدردی اور اتحاد کے جذبات کو پھیر دیا اور علی الاعلان کہہ دیا:

"قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ"

(سورۃ الانعام، آیت نمبر 151)

"اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے کیا چیز حرام کی ہے۔"

عرب میں بت پرستی کا دور دورہ تھا، ان میں مختلف اور بے شمار دیوتا اور خدا پائے جاتے تھے۔ وہ ان سے کبھی اپنی مرادیں مانگتے، کبھی ان سے نفرت کرنے لگتے اور بھلائی طلب کرتے۔ اگر وہ اپنے مقاصد اور اپنی مرادوں میں کامیاب نہ ہوتے تو ان کو گالیاں دیتے اور برا بھلا کہتے جیسا کہ آج کل بھی بعض حبشی قبائل کیا کرتے ہیں کہ وہ اپنے فرضی معبودوں سے بارش مانگتے ہیں۔ اگر وہ ناامید ہو جائیں تو اپنے معبود کو قتل کر دیتے ہیں۔

عربوں کو اپنی زندگی میں عمل کرنے کے لیے کوئی واضح راستہ نہیں تھا تو دعوت محمدی نے ان کو ایک خدا پر ایمان لانے کی تلقین کی اور حلال وحرام کو سمجھا دیا۔

لوگوں کے معاملہ میں ہر چیز میں توحید کو پیش کیا اور سکھلایا کہ اللہ ایک ہے، تمام انسانوں کی اصل ایک ہے، لوگ آپس میں برابر ہیں، تمام قومیں کارگاہ حیات میں برابر اپنا حق رکھتی ہیں، جن رسولوں نے ادیان پیش کیے وہ سب ایک ہیں، ان کے حقائق مقاصد اور اغراض ایک ہیں۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

"شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ"

(سورۃ الشوریٰ، آیت نمبر 13)

"تمہارے لئے وہ دین جاری کیا گیا ہے جس کی وصیت نوح کو کی گئی تھی اور جس کی وحی ہم نے تیری طرف کی ہے۔"

اسلام نے ایک ہی نصب العین بتایا جس سے وہ لوگوں کے ساتھ حسن معاملہ کر سکے۔ تبلیغ محمدی نے اس متحد قوم کے اندر وہ روح پھونکی کہ اس کے سامنے دنیوی شان وشوکت، لشکر کی کثرت، فوجی قوت، موروثی باطل عقائد، بادشاہوں کا دبدبہ اور روساء کا طنطنہ وطمطراق غرضیکہ کوئی چیز حائل نہ ہو سکی، ان کی نظروں میں نہ جچی اور نہ ان کے مقاصد کو روک سکی۔

☆☆☆

باب نمبر 8:

اسلام اور اقوام عالم کی اصلاح

اسلام نے عالم انسانی کی اصلاح کے لئے حسب ذیل چھ چیزوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ جب تک یہ سات امور کسی سوسائٹی میں مجتمع نہ ہوں اس کی اصلاح پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی:

1: دین صحیح۔ 2: حکومت راشدہ۔ 3: عدل شامل۔ 4: امن عام۔ 5: اسباب سہولت کی فروانی۔ 6: مقاصد آفرینی۔ 7: مخلوق کی خیر خواہی۔

دین صحیح:

دین کیا ہے؟ انسان کے لیے دین کا ہونا کیوں ضروری ہے؟ اس بحث کو تفصیل سے بیان کرنے کا یہ موقعہ نہیں۔ یہاں صرف اس قدر ذکر کردینا مناسب ہے کہ دین وہ نظام اطاعت ہے جو کائنات ارضی وسماوی کو خالق حقیقی کے رشتہ سے جوڑ دیتا ہے۔ کائنات حیوانی و جمادی تو بلا شعور و اختیار اللہ کے مطیع و منقاد ہے، لیکن عالم انسانی کی اطاعت گزاری اور اس کا تعین اختیار و ارادہ سے ہوا کرتا ہے۔ دین انسانی نفوس میں خواہشات' جذبات اور مختلف ہیجانات کو قابو میں رکھنے کا ذریعہ ہے۔ ظاہر و باطن اور خلوت و جلوت میں انسانی اعمال کا محتسب و نگران کار ہے۔ اسلام میں دین کا تصور ایک انقلابی اور ہمہ جہتی ہے جو افراد کے اندر طبائع کا تزکیہ کرتا اور ان کو ایک اجتماعی صلاحیت کا مالک بناتا۔ دین نام ہے انسان کی خودی کو اجاگر کرنے' تمام عالم کائنات پر چھا جانے' زمین و آسمان کی چیزوں کو مسخر کرنے اور پھر خالق ارض و سماوات کے حلقہ اطاعت میں اپنے آپ کو پیش کردینے کا۔

حکومت راشدہ:

حکومت کا اسلامی تصور یہ ہے کہ کائنات ارضی و سماوی خدا کی بادشاہت ہے۔ زمین کے کسی چپہ کو انسان کا اپنی ملک قرار دینا نہیں۔ اقتدار اعلیٰ محض اللہ کے لیے ہے۔ انسان

صرف خدائی احکام اور الٰہی قوانین کو دنیا میں پھیلانے والا اور ان پر عمل درآمد کرنے والا ہے۔ اسلامی احکام کی روشنی میں زمین کا بادشاہ، حاکم، سلطان انسان نہیں ہوا کرتا اور نہ ہی انسان کو حاکیت، بادشاہت اور سلطنت کا دعوے دار ہونے کا حق پہنچتا ہے۔ دنیا میں اسلامی تعلیمات کو رائج کرنے، حکومت الٰہیہ کے قوانین کو نافذ کرنے اور اسلامی احکام و آئین کو چلانے کے لیے اسلام نے امام اور امامت کبریٰ کا تخیل پیش کیا ہے۔ یہی امام اسلامی تبلیغ ودعوت کی راہ میں حائل ہونے والی تمام طاغوتی قوتوں اور باطل طاقتوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ دین کی حفاظت امن وسلامتی کو عام کرنا اور شر وفساد کو روکنا اسی امام کا کام ہے۔ اسی کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ان اللہ حراسا فی السماء و حراسا فی الارض فحراسه فی السماء الملائکة و حراسه فی الارض الذین یقبضون ارزاقهم ویذبون عن الناس"

"آسمان اور زمین میں اللہ کی طرف سے پاسبان اور محافظ مقرر کیے گئے ہیں۔ آسمان میں فرشتے نگران کار ہیں اور زمین میں اللہ کی طرف سے مقرر کردہ محافظ وہ ہیں جن کو ان کی روزی ملتی ہے اور وہ لوگوں کے شر وفساد کو دور کرتے ہیں۔"

مسلمانوں میں امامت کبریٰ کا مستحق اور خلافت اسلامیہ کا اہل وہی شخص ہوسکتا ہے جس میں اس بار امانت کو اٹھانے کی استطاعت ہو، جو حکومت الٰہیہ کے مفہوم سے واقف، احکام شریعت کا پابند، اسلامی اصول وقوانین کو نافذ کرنے اور خود ان پر عمل پیرا ہونے کی قدرت رکھتا ہو۔ جب یہ تمام صفات وخصوصیات اس میں پائی جائیں گی تو وہ امت کا امام اور پیشوا ہوگا۔ رعایا کا فرض ہوگا کہ وہ اس کے ساتھ محبت واخلاص اور اس پر اعتماد رکھے۔ اس مفہوم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے:

"خیر آئمتکم الذین تحبونهم ویحبونکم وشر آئمتکم الذین تبغضونهم وتبغضونکم وتلعونهم ویلعونکم"

"تمہارے بہترین امام اور پیشوا وہ ہیں جن سے تم محبت رکھتے ہو اور وہ تمہیں چاہتے ہیں۔ تمہارے برے آئمہ اور لیڈر ہیں جن سے تم بغض رکھتے ہو اور وہ

تم سے نفرت رکھتے ہیں۔ وہ تمہیں لعن طعن کرتے ہیں اور تم ان پر لعنت ملامت بھیجتے ہو۔"

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو لکھا:

"اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو دوست رکھتا ہے تو وہ اس کو اپنی مخلوق میں ہر دلعزیز بنا دیتا ہے۔ تم اپنا مقام و مرتبہ جو اللہ کے پاس ہے جان سکتے ہو کہ تمہاری لوگوں میں قدر و منزلت کیسی ہیں اور وہ تمہیں کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ اللہ کے پاس بھی تمہاری وہی قدر و وقعت ہے جو لوگوں کے نزدیک ہو رہی ہے۔"

اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا خوف جس شخص کے دل پر چھایا ہوا ہو گا تو وہ اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق کا پورا لحاظ رکھے گا۔ اللہ کی اطاعت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ شخص مخلوق میں بھی الٰہی قانون کا پاس رکھے گا۔ اس طرح اسے بالواسطہ خدائے تعالیٰ محبوب بنا لے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مخلوق کی محبت اس کے خوف خدا اور خیر خواہی خلق پر دلیل ہے۔ مخلوق کا بغض و کینہ اس کے خباثت نفس اور عدم اعتماد پر بیّن شہادت ہے۔

عدل شامل:

عدالت قانون الٰہی کا ایک اہم عنصری جز ہے۔ عدل کے بغیر زندگی کا کوئی گوشہ تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا۔ آسمان و زمین کی چیزوں میں ہم آہنگی اور ہمواری کا راز عدل ہی میں مضمر ہے۔ انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر، جماعتی تنظیم اور اجتماعی تشکیل یہ تمام ایک عادلانہ نظام کے رہین منت ہیں۔ قرآن مجید نے جابجا اقامت عدل پر زور دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ"

(سورۃ النحل، آیت نمبر 90)

"بے شک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔"

قومی دشمنی کے مقابلہ میں ضرر رساں اور کوئی چیز نہیں، اسی لیے اس کے پیدا شدہ اثرات سے اس طرح منع کیا گیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

"وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى"

(سورۃ المائدہ، آیت نمبر 8)

"کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل کرنا چھوڑ دو۔ تم عدل کیا کرو کیونکہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔"

ایک اور جگہ عدل کا وسیع مفہوم اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ"

(سورۃ النساء، آیت نمبر 135)

"ایمان والو! تم عدل قائم کرنے والے اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہو جاؤ۔ خواہ گواہی تمہارے اپنے نفسوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو یا ماں باپ اور رشتہ داروں کے۔"

عدل کے صحیح طور پر رائج ہو جانے سے بہت سے فائدے رونما ہوتے ہیں۔ محبت واتحاد، اطاعت کیشی اور خلوص و یگانگت کا دامن اسی سے وابستہ ہے۔ تمدنی اور عمرانی ترقی کا دارومدار اسی پر ہے۔ ظلم و جور سے بڑھ کر تباہی و بربادی برپا کرنے والی اور مخلوق کے قلب و دماغ کو منتشر کرنے والی اور کوئی شے نہیں کیونکہ ظلم کی کوئی حد ہے اور نہ انتہا۔ اس کا ہر شرارہ فتنہ و فساد کا ایک شعلۂ جوالہ ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ظلم کی ہلاکت آفرینی پر کس قدر صادق ہے:

"ثلاث منجیات و ثلاث مهلكات فاما المنجیات فالعدل فی الغضب و الرضاء و خشیة الله فی السر و العلانیة والقصدفی الغنی و الفقر، و اما المهلكات فشح مطاع و هو متبع اعجاب المرء بنفسه"

"تین چیزیں نجات دہندہ ہیں اور تین ہلاکت آفریں۔ نجادت دہندہ یہ ہیں: "غضب و رضا میں عدل، خلوت و جلوت میں خوف خدا اور، تونگری و غریبی کی حالت میں میانہ روی۔ ہلاکت آفریں یہ ہیں: بخل جس کی اطاعت کی جائے، خواہشات جن کی پیروی کی جائے اور انسان کی خود پسندی۔"

عدل کی بے شمار قسمیں ہیں۔

1: انسان اپنی ذات پر عدل کرے۔ یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو نیکیوں پر آمادہ کرے اور برائیوں سے روکے۔ کسی کام کو اختیار کرنا چاہے تو کمی وبیشی کو دیکھ کر معتدل کام اختیار کرے کیونکہ کسی کام میں حد سے تجاوز کر جانا ''جور'' ہے اور اس میں کمی کرنا ظلم۔ جو شخص اپنے اوپر ظلم کرتا ہے وہ دوسروں کے لیے اور زیادہ ظلم کر سکتا ہے۔

2: انسان دوسروں پر عدل کرے۔ مثلاً بادشاہ اپنی رعایا پر اور سردار اپنے ماتحتوں پر۔ ان کے مابین عدل چار امور سے متعلق ہے۔ سہل کاموں کا اتباع' مشکلات کا ازالہ' سخت گیری اور قوت وطاقت کے ذریعے اثر جمانے سے پرہیز اور سیرت وکردار میں حق کی روش اختیار کرنا۔ جن آئمہ (حکام) اور پیشواؤں میں یہ چار چیزیں جمع نہ ہوں تو ان سے فتنہ وفساد اور اختلاف بڑھ جائے گا۔

3: انسان اپنے بالادست اشخاص کے ساتھ عدل کرے۔ مثلاً محکوم اپنے حاکموں اور ماتحت اپنے افسروں کے ساتھ انصاف کو ملحوظ رکھیں۔

4: انسان اپنے دوستوں اور ہمعصروں کے ساتھ عدل کرے۔ اس کی علامت طنز آمیز گفتگو کرترک کرنا اور اذیت رسانی سے محفوظ رہنا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنا بہترین قول فرمایا ہے:

''کیا میں تمہیں بدترین شخص کی خبر نہ دوں۔؟''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا:

''بے شک یارسول اللہ!''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو تنہا اترے اپنی امداد سے روکے اور اپنے غلام کو تازیانے لگائے۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کیا میں تمہیں اس سے بھی بدترین شخص کی خبر نہ دوں۔؟''

صحابہ کرام نے عرض کیا:

''بے شک یارسول اللہ!''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’جس سے کسی بھلائی کی امید نہ رکھی جائے اور اس کی برائی سے لوگ بے خوف نہ رہیں۔‘‘

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’کیا میں تمہیں اس سے بھی بدترین آدمی سے آگاہ نہ کروں۔؟‘‘

صحابہ کرام نے عرض کیا:

’’بے شک یارسول اللہ!‘‘

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’جو لوگوں سے بغض رکھے اور لوگ اس سے نفرت کریں۔‘‘

امن عام:

اس سے کسی کا انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیا میں اطمینان اور آسائش کی زندگی بسر کرنے کے لیے امن کی بے حد ضرورت ہے۔ کمزوروں کے چین اور ناداروں کے سکھ کا ذریعہ امن عام ہی ہے۔ علوم وفنون کی ترقی اور ذہنی نشوونما کا دارومدار اسی پر ہے۔ اسلام نے جنگ پر امن اور صلح کو مقدم رکھا ہے۔

اسباب سہولت کی فراوانی:

کسی ملک یا قوم کی خوش حالی کا انحصار اس کے اسباب سہولت کی فراوانی پر ہے' جس کے افراد کو اپنی جولانی طبع دکھانے کا خوب موقعہ دستیاب ہوتا ہے۔ اگر نفوس کی حوصلہ افزائی کا سامان فراہم کیا جائے تو ان کی ہمتیں اجاگر ہوتی ہیں' قوم کا غریب اور مال دار طبقہ یکساں اشتراک عمل کر سکتا ہے۔ حسد' بغض اور فتنہ وفساد کا قلع قمع ہو جاتا ہے' افلاس اور غریب کی بیخ کنی ہو جاتی ہے' غم خواری اور ہمدردی کے جذبات خواب ابھرتے ہیں' سخاوت اور امانت نشوونما پاتی ہے۔ اسلام کے نظام حیات میں اس قسم کی بہت لچک پائی جاتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا:

’’تم شریف' ذی عزت یا مالدار کو ہی قاضی بناؤ' کیونکہ شریف آدمی انجام سے ڈرتا ہے اور مالداروں کے مال میں حرص نہیں کرتا۔‘‘

یہی وجہ ہے کہ قوم کے مصلح کو اپنے اصلاحی پروگرام میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی تاوقتیکہ وہ قوم کی خوش حالی کے اسباب کو فراواں کرنے کی طرف توجہ نہ کرے اور افلاس و غربت کے ذرائع کا انسداد نہ کرے، کیونکہ قوم کی خوش حالی اس کی اصلاح اور ترقی کی ذمہ دار ہے۔

مقاصد آفرینی:

انسان کی عمر بہت کم ہے۔ اس کے باوجود امید و آرزو کی ایک چنگاری اس کے مقاصد و عزائم کی تکمیل پر اس کو آمادہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ وہ مستقبل حیات کی تعمیر کے لیے اپنی اختراعی قوت کو ابھارنے لگتا ہے۔ اگر آنے والی نسل اپنے اسلاف کی بیش بہا ایجادات و اختراعات اور علوم و فنون سے استفادہ نہ کرتی تو ہر زمانے میں نئے سرے سے ہر فرد عمرانی' معاشی اور تمدنی حوائج و ضروریات کو پیدا کرنے کا محتاج ہوتا۔ اس میں جو مشکلات اور خطرات ہیں وہ محتاج بیان نہیں ہیں۔

وسیع امید و مقصد آفرینی انسانی اصلاح اور تمدنی وسائل فراہم کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلاف کا علمی ذخیرہ' تمدن کا بیش بہا سرمایا اور ان کی ذہنی و فکری معلومات نسلاً بعد نسل ہر دور میں منتقل ہوتی رہتی ہیں' اسی طرح دنیا کا نظام برقرار ہے۔ اگر امیدوں اور آرزوؤں میں کمی واقع ہو جائے تو زمانے کی ضروریات کی رفتار ہی رک جائے اور تباہی و بربادی میں تیزی واقع ہو جائے۔ اسی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا:

"الامل رحمة من الله لامتی"

"امید و آرزو میری امت کے لیے اللہ کی رحمت ہے"

مخلوق کی خیر خواہی:

دین اسلام کے احکام و اصول نہایت سہل اور قابل عمل ہیں۔ اسلام نے رواداری کا حکم دیا ہے۔ وہ مسلمانوں پر یہ لازمی قرار دیتا ہے کہ وہ اوروں کے لیے بھی وہی پسند کریں جو اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ لوگوں کو اسلام کی طرف حکمت و موعظت کے پہلو سے دعوت دین اعتدال کو ملحوظ رکھیں اور پراگندگی و انتشار برپا کرنے سے پرہیز کریں۔ حق کی تبلیغ نہایت واضح انداز اور سہل ترین طریقے سے کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔ جب تک کوئی انسان نامعلوم چیزوں کا علم حاصل نہ

کرے اس وقت تک وہ نہ ان کا اعتقاد رکھ سکتا ہے اور نہ ان پر عمل درآمد کر سکتا ہے۔ ان کے دل میں شکوک وشبہات پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان کو تاوقتیکہ وہ بحث وتمحیص سے دور نہ کرے کسی طرح وہ مطمئن نہیں ہو سکتا۔

دعوت وتبلیغ حق کے باب میں مسلمانوں کا شعار آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہونا چاہیے آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعوت الی اللہ میں کائنات ارضی وسماوی کی کھلم کھلی نشانیاں اور آثار قدرت کو پیش کیا کرتے تھے۔ جن لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی دعوت دیتے ان سے نرمی کا سلوک کرتے اور بوقت ضرورت ان کے شکوک وشبہات کو باحسن وجوہ دور فرماتے۔ اگر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دور بھاگتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی الفت ومحبت اور اپنے اخلاق وکردار کی کشش سے ان کو اپنی طرف مائل کر لیتے۔ اگر وہ جلد بازی کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مہلت دیتے۔ اگر وہ سختی اور تیزی کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض نہ ہوتے، کسی معاملہ کی تحقیق وتمحیص کے وقت اگر وہ ہیجان میں آجاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم غضبناک نہیں ہوتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اس وقت تک یوں ہی نہیں چھوڑ دیتے تاوقتیکہ ان کے شکوک وشبہات کو ایسے دلائل وبراہین کے ذریعے دور نہ فرمادیتے جو ان کے اذہان وعقول کے مناسب ہوتے تھے۔

اسلام نے اسلامی مبلغین پر یہ فریضہ عائد کیا ہے کہ کسی انسان سے برابرتاؤ نہ کیا جائے، جہلاء وعوام کو معذور سمجھ کر ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی جائے، واضح دلیلوں اور تشفی بخش بیانوں سے ان کے شک وشبہ اور جہل ونادانی کو رفع کرنے کی سعی کی جائے۔ اگر وہ ماننے سے انکار کر دیں اور گھمنڈ اور سرکشی کریں تو یہ شیوہ ہونا چاہیے کہ ان کے افکار وآراء پر تنقید وتبصرہ کرنا چاہیے نہ کہ ان کی ذاتیات اور شخصیات کو نشانہ طعن وتشنیع بنایا جائے۔ راہِ حق پر ان کو گامزن کرنے کے لیے صبر واستقامت سے کام لیا جائے اور جذبہ انتقام کو کسی صورت استعمال نہ کیا جائے۔

کیا یہ واقعہ نہیں کہ جب سید الشہداء حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ غزوۂ احد میں شہید ہوئے تو مشرکین عرب نے آپ کی نعش کی بے حرمتی کی۔ جب مسلمانوں نے بھی مشرکین کے مقتولوں کے ساتھ یہی سلوک کرنا چاہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انسانیت سوز

ارادہ سے مسلمانوں کو باز رکھا' کیونکہ جہاد کا یہ مقصد نہیں کہ جنگجو اشخاص سے ذاتی عداوت رکھی جائے۔ یہ جہاد اسلام میں محض اس لئے مشروع ہوا ہے کہ ان گھنگھور گھٹاؤں کو زائل کیا جائے جس کی وجہ سے مخالفین کی آنکھیں الٰہی نورانی شعاعوں کو دیکھنے سے معذور ہیں۔ ان لوگوں سے جنگ اسی لئے کرنی پڑی کہ یہ عداوت حق کے مظہر تھے۔ اس کی بین دلیل یہ ہے کہ وحشی حبشی جس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا جب اسلام سے مشرف ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کوئی باز پرس نہ کی، بلکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کی صف میں داخل ہو گیا۔

ہندہ نے حضرت حمزہ کی نعش کے ساتھ کیسا انسانیت سوز سلوک کیا تھی کہ اس نے آپ کا کلیجہ نکال کر چبایا اور اپنی عداوت اور اپنے بغض وکینہ کا ثبوت دیا۔ فتح مکہ کے دن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا خون بہانے کا حکم دے دیا' جب عرصۂ حیات اس پر تنگ ہو گیا تو وہ بھیس بدل کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور مسلمان ہو گئی۔ اسلام لا چکی تو اپنے چہرے سے نقاب اٹھا دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پہچان گئے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو درگزر کر دیا اور کوئی باز پرس اس سے نہ کی۔

ان تمام آثار وشواہد سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اسلام انسانوں سے کوئی مواخذہ نہیں کرتا تاوقتیکہ ان پر حق وصداقت واضح طور پر روشن نہ ہو جائے۔ یہاں سے یہ امر بھی صاف ہو گیا کہ اسلامی مقاصد میں سے یہ بھی ہے کہ مخلوق کے ساتھ خیر خواہی کی جائے' حتی الامکان ان کی مصیبت کو دور کیا جائے۔ اس کے ساتھ حق کو قبول کرنے اور اسلامی اصول ونظریات کو تسلیم کرنے کے لیے ان کو حریت فکر وضمیر عطا کی جائے لیکن تبلیغ وہدایت کے کام کو کسی طرح چھوڑا نہیں جا سکتا' کیونکہ ناآشنائے حق مرد بیمار کی طرح ہے۔ اس کا علاج تبلیغ دین وارشاد ہے۔ اس کی طرف سے بے رخی برتنا اس کے لیے موجب ضرر وہلاکت ہے۔ علماء کا فریضہ ہے کہ جہلاء کو تعلیم دینے سے کسی طرح پیچھے نہ ہٹیں۔

یہ وہ چھ امور ہیں جن قوموں کی حالت درست ہوتی ہے اور ان کی زندگی ایک نظام میں مربوط ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک میں خلل پیدا ہو جائے تو فتنہ وفساد کا دروازہ کھل جاتا ہے اور ان کی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

باب نمبر 9:

اسلام کی معاشرتی تعلیمات

انسانی طبقات و مدارج کا اقرار:

اسلام نے نسلی، وطنی اور قومی برتری و تفوق کو ایک دم کالعدم قرار دیا ہے، لیکن وہ اس سے انکار نہیں کرتا کہ انسانی فضائل و کمالات کے چند حدود و مدارج ہیں۔ علم و جہل، روشنی اور تاریکی، قوت و ضعف اور شرافت و ذلت کے درمیان حد فاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً"

(سورۃ المائدہ، آیت نمبر 48)

"اگر اللہ چاہتا تو لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا۔"

لیکن اس نے انسانوں کے طبقات و مدارج بنائے ہیں اور ہر ایک کے لیے ایک خاص مرتبہ اور ایک خاص مقام ہے۔ اگرچہ تمام انسان خدائی قوانین و احکام اور اسلامی اوامر و نواہی میں یکساں ہیں، معاملات اور حدود میں عالم و جاہل برابر ہیں، ہر ایک کا ایک حق ہے جس سے اس کو محروم نہیں کیا جا سکتا، ایک حد ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتا۔ ایک فریضہ ہے جس کو وہ چھوڑ نہیں سکتا، ان تمام کے مابین فضیل و کرامت، تفوق و برتری کا معیار محض تقویٰ پر ہے۔ علم اور جہل ایک نہیں ہو سکتے، اسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا:

"هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ"

(سورۃ الزمر، آیت نمبر 9)

"کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں۔؟"

بنی اسرائیل سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ

وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ o "

(سورۃ البقرۃ، آیت نمبر 47)

" اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جس سے میں نے تم کو نوازا ہے اور یقیناً میں نے تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت دی۔"

عورتوں پر مردوں کی فضیلت کے باب میں فرمایا:

"وَلِلرِّجَالِ عَلَیْہِنَّ دَرَجَۃٌ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ o"

(سورۃ البقرۃ، آیت نمبر 228)

" اور عورتوں پر مردوں کا درجہ ہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔"

رسولوں کو ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہے:

"تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَہُمْ عَلٰی بَعْضٍ مِنْہُمْ مَّنْ کَلَّمَ اللّٰہُ وَرَفَعَ بَعْضَہُمْ دَرَجٰتٍ "

(سورۃ البقرۃ، آیت نمبر 253)

" یہ رسول ہیں جن کو ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت دی' ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا۔"

اللہ نے بعض انسانوں میں کو اپنی رسالت کے لیے منتخب فرمایا:

" اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰہِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ o"

(سورۃ آل عمران، آیت نمبر 33)

" بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم' نوح' آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہانوں پر برگزیدہ کیا۔"

حضرت مریم علیہا السلام کی برگزیدگی کے بارے میں ارشاد فرمایا:

"وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَہَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ o "

(سورۃ آل عمران، آیت نمبر 42)

"اے مریم! بے شک اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور تجھے پاکیزہ بنایا اور تجھے تمام جہانوں کی عورتوں پر پسند کیا۔"

آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات امت کی دوسری عورتوں کی طرح سے نہیں۔ ارشاد فرمایا:

"یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ"

(سورۃ الاحزاب، آیت نمبر 32)

"اے نبی کی عورتو! تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو۔"

امت محمدیہ کو عالم کی تمام اقوام پر ترجیح اور فوقیت عطا کی:

"کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ"

(سورۃ آل عمران، آیت نمبر 109)

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی ہے۔"

اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے والا اور اللہ کو ناراض رکھنے والا یہ دونوں ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ فرمایا:

"اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○"

(سورۃ آل عمران، آیت نمبر 162)

"کیا اللہ کی خوشنودی طلب کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو اللہ کے غضب سے پھر گیا، جس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور یہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔"

پاک اور بری چیز میں یقیناً زمین آسمان کا فرق ہے۔ ارشاد فرمایا:

"قُلْ لَّا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ"

(سورۃ المائدہ، آیت نمبر 100)

"برا اور اچھا کبھی برابر نہیں ہوتا۔ اگرچہ تجھے برے کی بہتات تعجب میں ڈالے۔"

اللہ تعالیٰ نے ہر طبقہ کے رجحانات اور آرزوئیں مخصوص کر رکھی ہیں؛ کسی کو ایک دوسرے کی سرحد میں قدم رکھنا سزاوار نہیں۔ چنانچہ فرمایا:

"وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ"

(سورۃ النساء، آیت نمبر 32)

"اللہ نے تمہارے ایک دوسرے پر جو فضل و کرم کیا ہے تم اس کی تمنا نہ کرو۔ مردوں کے لئے ان کی کمائی کا حصہ ہے اور عورتوں کے لیے ان کی کمائی کا حصہ ہے۔"

اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے یقیناً ان لوگوں سے بدرجہا بہتر ہیں جو گھر میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

"فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً"

(سورۃ النساء، آیت نمبر 95)

"اللہ نے مجاہدین کو ان کے مالوں اور نفسوں میں بیٹھے رہنے والوں پر ایک درجہ بڑھایا ہے۔"

اندھا اور نابینا دونوں برابر نہیں ہیں:

"هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝"

(سورۃ الانعام، آیت نمبر 50)

"کہہ دو کیا اندھا اور دیکھنے والا دونوں برابر ہیں۔؟ کیا تم فکر و بصیرت سے کام نہیں لیتے۔؟"

خلافت ارضی کا سہرا بعض انسانوں کے سر باندھا گیا ہے اور انسانوں میں بعض کو بعض پر ترجیح دی گئی ہے:

"وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰىكُمْ"

(سورۃ الانعام، آیت نمبر 165)

”وہی (اللہ) ہے جس نے تمہیں زمین میں اپنا جانشین بنایا ہے اور تمہارے ایک دوسرے کے درجات بلند کیے ہیں تا کہ وہ اپنی عطا کردہ چیزوں میں تمہیں آزمائے۔“

مسلمانوں کو کافروں پر بہر حال فضیلت حاصل ہے:

”مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمٰى“

(سورۃ الھود، آیت نمبر 24)

”دونوں گروہ (مومن وکافر) کی مثال اندھے اور بینا شخص کی طرح ہے۔“

غرضیکہ قرآن مجید اس قسم کے بے شمار شواہد و آثار سے معمور ہے۔ احادیث وسنن بھی ان ہی حقائق وواقعات کی تشریح سے لبریز ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

”انزلوا الناس منازلھم“

”تم لوگوں کو ان کے مرتبہ ومقام تک پہنچاؤ۔“

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

”اذا اتاکم کریم قوم فاکرموہ“

”جب تمہارے پاس قوم کا معزز شخص آئے تو تم اس کی تعظیم کرو۔“

ایک اور حدیث میں آیا ہے:

”الناس معادن خیارھم فی الجاھلیة خیارھم فی الاسلام اذا فقھوا“

”لوگ کانوں کی مثال ہیں، تم میں جو لوگ جاہلیت میں اچھے تھے وہی اسلام میں بھی اچھے ہیں جب کہ وہ سمجھ سے کام لیں۔“

دوسری حدیث میں آیا ہے:

”ارحموا عزیز قوم ذل وغنی قوم افتقر“

”قوم کا معزز شخص ذلیل ہو گیا ہے تو تم اس پر رحم کھاؤ اور قوم کا کوئی مالدار فقیر ہو گیا ہے تو اس پر ترس کھاؤ۔“

اسلام نے کمسنوں اور سن رسیدہ اشخاص کی عزت وتوقیر کی ایک حد مقرر کردی' یہ کس قدر زرین اصول ہے:

"من لم یرحم صغیرنا ویعرف حق کبیرنا فلیس منا"

"جو شخص چھوٹوں پر رحم نہ کھائے اور بڑوں کے حق کو نہ پہچانے وہ ہم میں سے نہیں"

علماء کی شان وتوقیر کو اس طرح بڑھایا گیا:

"وقروا علماء امتی فانهم نجوم الارض"

"تم میری امت کے عالموں کی قدر وقعت کرو کیونکہ وہ زمین کے ستارے ہیں۔"

صحابہ کی فضیلت کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

"لاتسبوا اصحابی فلو انفق احدکم مثل احد ذهبا مابلغ مد احدهم ولا نصیفه من سب اصحابی فعلیه لعنة الله والملائکة والناس اجمعین"

"میرے اصحاب کو تم برا بھلا نہ کہو کیونکہ تم میں سے کوئی احد برابر سونا بھی خرچ کردے تب بھی ان میں سے کسی ایک کے مرتبہ تک اور نصف مقام تک نہیں پہنچ سکتا جو شخص میرے صحابہ کو برا کہے گا تو اس پر اللہ کی' فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت اور پھٹکار ہوتی ہے۔"

ایک اور حدیث میں آیا ہے:

"ان من اشراط الساعة ان یلتمس العلم عند الاصاغر"

"بے شک قیامت کی ایک علامت یہ ہے کہ علم کو کمینوں کے پاس سے تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔"

افراد انسانی کی تعظیم وتوقیر کے بارے میں نہ صرف احادیث وسنن ہی مروی ہیں بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار وکردار بھی اس باب میں بے شمار ہیں۔ جس کی بین

دلیل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد نجران کے لیے (جو نصاریٰ کا وفد تھا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاقات کے وقت اپنی چادر بچھائی۔ عامر بن طفیل کو جب کہ وہ کافر تھا اعزاز واکرام بخشا' کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں وفد کی شکل میں آنے والے تمام کے تمام اپنی قوم کے معزز اشخاص تھے اور عامر بھی اپنی قوم کا سردار تھا۔

ہمارے گزشتہ بیانات اور تشریحات سے واضح ہوتا ہے کہ تمام انسان قانون الٰہی کے آگے برابر ہیں۔ ان میں فضیلت و برتری کا انحصار تقویٰ پر ہے، لیکن مخصوص صفات کی حیثیت سے ان کے مختلف درجے اور مقام ہو سکتے ہیں۔ اس بناء پر ان کی دو بڑی قسمیں ہیں:

1: مسلم۔ 2: غیر مسلم۔

مسلمانوں کے درمیان اولاً اخوت اسلامی کا مضبوط رشتہ ہے۔ اس کے بعد ماں باپ بھائی اور بہنوں اور رشتہ داروں کے تعلقات محکم واستوار ہیں۔ اس لحاظ سے وہ ایک خاندان اور ایک قبیلہ میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ ان گوناں گوں رشتوں کے باوجود ان کے درمیان اتحاد اسلامی کا رابطہ اور اخوت اسلامیہ کا محکم رشتہ ہے۔ مرتبہ و مقام میں اختلافات کے باوجود یہ تمام کے تمام قوانین الٰہیہ اور احکام اسلامیہ کے سامنے برابر ہیں۔ اس اختلاف و تفاوت کی وجہ سے کسی سے فریضۂ دینی اور کوئی قانون الٰہی ساقط نہیں ہوتا۔ اس حقیقت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول بین شہادت ہے:

"لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطع محمد يدها"

"اگر فاطمہ بنت محمد چوری کرتیں تو محمد اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔"

دوسری قسم جو غیر مسلموں سے عبارت ہے اور یہ پانچ قسموں میں منقسم ہے:

1: اہل ذمہ۔ 2: اہل عہد و پیمان۔
3: صلح جو۔ 4: پناہ گزیں۔
5: جنگجو۔

اہل ذمہ:

یہ وہ لوگ ہیں جو اسلامی حکومت کے تابع ہیں اور اسلامی دین پر نہیں چلتے۔ مسلمانوں کے لیے جو حقوق و آئین ہیں ان ذمیوں کے لیے بھی وہی ہوں گے۔ ان کے مال'

آبرو اور ان کی جان پر کسی قسم کا ظلم نہیں روا رکھا جائے گا۔ اگر کوئی اس جرم کا ارتکاب کرے گا تو اس کو وہی سزا ملے گی جو ایک مسلمان پر تعدی کرنے کی صورت میں ملتی ہے۔

اہل عہد و پیان:

یہ ایسا طبقہ ہے جس کے اور خلافت اسلامیہ کے مابین مضبوط عہد و پیان کیا جا چکا ہے۔ عہد نامہ کے مدونہ شرائط و قوانین کے مطابق اس طبقہ کو حقوق دیئے جائیں گے۔ اس کو اسلامی قوانین و احکام اور اس کے واجبات و حدود کا احترام اور ان کی پابندی کرنی پڑے گی۔ یہ شرائط نقض عہد تک باقی رہیں گے۔ اگر جان بوجھ کر عہد شکنی ہوئی تو عہد نامہ منسوخ اور اس کے احکام خود بخود ہٹ جائیں گے۔ صرف ان کی جان' آبرو اور ان کا مال محفوظ رہے گا بشرطیکہ وہ کسی اور تک کوئی ظلم و تعدی نہ کریں۔ اس وقت ان پر وہی تعزیرات عائد کی جائیں گی جو ایک مسلمان پر کی جاتی ہیں جب کہ وہ اس قسم کے فعل کا ارتکاب کرے۔

صلح جو:

یہ وہ گروہ ہے جس کے درمیان اور مسلمانوں کی جماعت کے مابین صلح نامہ طے ہوا ہو۔ صلح نامہ کے شروط کے مطابق عمل درآمد کیا جائے گا۔

پناہ گزیں:

یہ ایسا گروہ ہے جس سے خلافت اسلامیہ کی طرف سے نہ کوئی عہد و پیان باندھا گیا ہے' نہ صلح ہے' نہ جنگ اور نہ کسی قسم کا ذمہ لیا گیا ہے۔ اگر اس قسم کے طبقہ کا کوئی فرد ممالک اسلامیہ میں کسی ضرورت کے لئے آئے تو اس کو پناہ گزیں کے حقوق دیئے جائیں گے۔

اس کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کی جائے گی اور اسے کسی قسم کی تکلیف نہ دی جائے گی۔ اس پر بھی سوسائٹی کا احترام کرنا واجب قرار دیا جائے گا۔ یہ کسی کی مضرت کے درپے نہ ہوگا' جب تک یہ مسلمانوں کے درمیان ہے مسلمانوں کے احکام کا پابند و مطیع ہوگا۔

جنگجو:

اس گروہ کے احکام و قوانین جنگ اور جنگی اسباب کے گوناگوں ہونے پر بدلتے رہیں گے۔ جنگ ختم ہونے تک یہ گروہ اقتضائے حالات کے تابع رہے گا۔ اس کے بعد وہ

مذکورہ بالا طبقات چہارگانہ میں سے کسی ایک طبقہ میں شمار کیا جائے گا۔ اگر وہ قیدی بن کر آیا ہے تو حسب شروط وقوانین مقررہ قید و بند کا حکم اس پر نافذ کیا جائے گا۔

ان تمام بیانات سے اسلام کا مقصد تمام طبقات عالم کے درمیان امن وسلامتی کو عام کرنا ہے۔ تمام قوموں پر اسلام یہ امر واجب قرار دیتا ہے کہ وہ انسانی سوسائٹی کی بھلائی کا خیال رکھیں اور برائیوں کو دور کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے دنیا سے ظلم وطغیان اور شروفساد کو روکنے اور اس راہ میں مشکلات وخطرات کی مدافعت کرنے کے لیے جہاد کو مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے اور اس کی ترغیب دی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ○"

(سورۃ آل عمران، آیت نمبر 169)

"جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہوئے ہیں تم ہرگز ان کے متعلق یہ خیال نہ کرو کہ وہ مر گئے بلکہ وہ زندہ ہیں اور اللہ کے پاس سے رزق پاتے ہیں۔"

جمیعۃ اسلامیہ کی طرف سے دفاع کے لیے جو دنیا میں کافرانہ نظام کی بیخ کنی کرنے، طاغوتی قوتوں کا سر نیچا کرنے اور دنیا میں حکومت الٰہیہ کے قیام اور دین اسلامی کو عام کرنے کے لیے تبلیغ ودعوت کے اہم فریضہ کو لے کر اٹھتی ہے۔

ان تمام موانعات' مشکلات اور خطرات کی روک تھام کرنے کے لیے جو اس دعوت وتبلیغ کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔

اسلام نے جنگ کا حکم اسی وقت دیا ہے جب کہ اس نے اپنی دعوت وتبلیغ کے پھیلانے کے لیے تمام اسباب وحیل استعمال کر لئے لیکن مشکلات وموانع حسب دستور بحال رہے ایسی صورت میں اس کو جنگ کرنے کے سوائے کوئی چارۂ کار اور راہ گریز نظر نہیں آئی۔ اس کے ساتھ ساتھ مصالحت مسلمانوں کا شیوہ اور طرۂ امتیاز ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا:

"اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ"

(سورۃ المومنون، آیت نمبر 96)

"باحسن وجوہ مدافعت کیا کرو۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کبھی دو کاموں میں سے کسی ایک کے کرنے کا اختیار دیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے سہل اور آسان کام انتخاب فرمایا بشرطیکہ وہ موجب گناہ نہ ہو۔ اگر اس میں گناہ کا شائبہ پایا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے کوسوں دور ہی رہتے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"یسروا ولا تعسروا"

"آسان پسند بنو مشکل پسند نہ بنو۔"

اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو اس طرح واضح فرمایا:

"وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا"

(سورۃ الانفال، آیت نمبر 61)

"اگر وہ صلح کے لیے اپنا بازو جھکا دیں تو تم بھی صلح کے لیے اپنا بازو جھکا دو۔"

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ"

(سورۃ البقرۃ، آیت نمبر 195)

"تم اپنے آپ کو (جان بوجھ کر) ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

مومن و کافر...... نسل انسانی کے دو گروہ:

اسلام نے معاشرت کے جو اصول وضع کیے ہیں وہ ہمہ گیر بنیادوں پر استوار کیے گئے ہیں۔ اسلام نے معاشرتی تعلیمات میں سب سے زیادہ اہمیت عقیدہ اور مقاصد کی ہم آہنگی کو دی ہے۔ دو مختلف انسانوں کے درمیان تعلقات اسی وقت استوار ہو سکتے ہیں جب ان کے درمیان عقیدہ اور عمل کا اتحاد پایا جاتا ہے۔ اس لئے قرآن مجید نے انسانی سوسائٹی کو صرف دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے:

1: مومن۔ 2: کافر۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"هو الذی خلقکم فمنکم کافر و منکم مومن"

(سورۃ التغابن، آیت نمبر۲)

"وہی اللہ ہے جس نے تم کو پیدا فرمایا۔ تو تم میں کچھ کافر ہیں اور کچھ مومن۔"

اسلام نے مومنین کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا گیا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"انما المومنون اخوة"

(سورۃ الحجرات، آیت نمبر:۱۰)

"بیشک مومن بھائی بھائی ہیں۔"

دوسری جگہ قرآن کریم نے یہ حکم دیا ہے کہ کوئی مومن دوسرے مومن کو چھوڑ کر کافر سے دوستی پیدا نہ کرے، کیونکہ ان دونوں کے درمیان عقیدہ اور مقاصد میں سے کسی کی بھی یگانگت نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے

"لایتخذ المومنون الکفرین اولیاء من دون المومنین"

(سورۃ آل عمران، آیت نمبر:۲۸)

"مومنین اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا ہمدرد و ہمساز ہرگز نہ بنائیں۔"

درس مساوات:

قرآن کریم کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور سارے حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے درمیان رنگ و نسل اور زبان وغیرہ کی بنیاد پر فرق و امتیاز جائز نہیں۔ ایمان اور عمل صالح یعنی تقویٰ ہی وہ بنیاد ہے جس کی رو سے ایک انسان دوسرے انسان کے مقابلے میں فضیلت اور برتری حاصل کر سکتا ہے۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے:

"یایها الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی و جعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقکم"

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ خدا کے نزدیک تم میں سب

سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"
(سورۃ الحجرات، آیت نمبر:۱۳)

اور اس نکتہ کی وضاحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی:

"لا فضل لعربی علی عجمی و لا لعجمی علی عربی الا بالتقوی"

"کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ ہی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت ہے، مگر صرف تقویٰ کے لحاظ سے۔"

قرآن کریم نے اپنی معاشرتی تعلیمات کی بنیاد تمام انسانوں کی مساوات اور انسانی شرافت پر رکھی ہے اور پوری انسانیت کے فطری شرف کا یوں اعلان عام کیا ہے:

"ولقد کرمنا بنی ادم"

"بے شک ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی۔"

اور فرمایا:

"فضلنھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا"

"ہم نے انسان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔"

(سورۃ بنی اسرائیل، آیت نمبر:۷۰)

اس شرف وفضیلت میں قرآن مجید کی رو سے مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ قرآن مجید اس بات کا انکار کرتا ہے کہ عورت اولین گناہ کا سبب بنی، صنف نازک انسانی نقطہ نظر سے مرد کے مقابلے میں فروتر ہے یا وہ کوئی ناگزیر برائی ہے جیسا کہ بعض فلاسفراسے اسی طرح پیش کرتے ہیں۔ اسلام تمام مخلوق کو "عیال اللہ" سمجھتا ہے جس سے اللہ کو یکساں محبت ہے۔

عائلی زندگی:

اسلام نے انسانی زندگی کی تنظیم کرتے وقت خاندان کو خشت اول قرار دیا ہے۔ اس طرح وہ معاشرت کی بنیاد مرد اور عورت کے تعلقات کے توازن پر رکھتا ہے۔ قرآن مجید نے مرد کے لئے جو دائرہ کار موزوں تھا وہ اس کے لئے اور عورت کے لئے جو دائرہ کار فطری طور پر مناسب تھا وہ اس کے لئے مقرر کر دیا۔ اس سلسلے میں گھر کی دیکھ بھال، بچوں کی پرورش اور

دیگر امور خانہ داری کو سرانجام دینا عورت کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اس فریضہ کی خاطر خواہ تکمیل اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ عورت گھر کے دائرہ کو اپنی مملکت سمجھے۔ یہ دائرہ محدود نہیں بلکہ نہایت وسیع ہے اور انسانی معاشرہ کی بنیاد ہے کیونکہ خاندان انسانی معاشرہ کی اکائی ہے۔ مرد اور عورت کے باہمی تعلق سے ایک خاندان بنتا ہے، جو کہ اسلامی معاشرت میں ایک اہم اور مستقل یونٹ قرار پاتا ہے اور اس کی تشکیل رشتہ ازدواج سے ہوتی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے رشتہ ازدواج معاشرتی زندگی کی اولین بنیاد ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ مسلم معاشرے میں نکاح کو سہل بنایا جائے۔ اسلام میں چند مخصوص قریبی رشتہ دار عورتوں اور مشرکات کو چھوڑ کر باقی تمام عورتوں سے نکاح کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ اگر ازدواجی زندگی میں کشیدگی ہو تو مرد کے لئے طلاق اور عورت کے لئے خلع کا راستہ کھلا رکھا ہے۔ اس طرح مرد وعورت کے آزادانہ اور بے لگام میل جول کی جڑ کاٹ دی گئی۔

خاندانی زندگی کے بارے میں قرآن کریم نے جو خصوصی ہدایات دی ہیں یا مرد اور عورت کے لئے جو حدود کار اور فرائض اور حقوق مقرر کئے ہیں وہ مختصراً حسب ذیل ہیں:

1: مرد کو خاندان کے معاش، تمدنی اور سیاسی زندگی کا نگران مقرر کیا گیا ہے اور عورت کو خاندان کی گھریلو زندگی، بچوں کی تربیت، نشوونما، ان کی تعلیم اور دوسری ضروریات کا نگہبان مقرر کیا گیا ہے۔

2: عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ پردہ کریں، اندرونہ خانہ کے فرائض سرانجام دیں، حتی الامکان عام حالات میں مرد کے ساتھ گھر سے باہر کی تگ ودو میں شریک نہ ہوں اور آرائش وزیبائش کا برملا اظہار نہ کریں۔ اگر انہیں کسی کام کے لئے باہر جانا بھی پڑے تو پردہ کریں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن الجاهلية الاولیٰ"

"اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور جس طرح پہلے جاہلیت کے دنوں میں اظہار تجمل کرتی تھیں اس طرح زینت نہ دکھاؤ۔"

(سورۃ الاحزاب، آیت نمبر:۳۳)

3: مرد اور عورت کا باہمی تعلق نہایت مقدس ہے۔ مرد اور عورت دونوں کو حکم ہے کہ وہ ایک

دوسرے کے مخلص اور وفادار رہیں، بلکہ یک جان دو قالب ہوں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"هن لباس لكم وانتم لباس لهن"

"وہ (عورتیں) تمہارا (مردوں کا) لباس ہیں اور تم (مرد) ان (عورتوں) کا لباس ہو۔"
(سورۃ البقرہ، آیت نمبر:۱۸۷)

سورۃ الروم میں ارشاد ہے:

"ومن ايته ان خلق لكم من انفسكم ازواجا لتسكنوا اليها وجعل بينكم مودة ورحمة"

"اور اس کے نشانات میں ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے ازدواج پیدا کیں تا کہ تم ان کی طرف مائل ہو کر آرام حاصل کرو اور تم میں محبت اور مہربانی پیدا کر دی۔"

(سورۃ الروم، آیت نمبر:۲۱)

4: عورتیں اپنے شوہروں کے لئے وجہ تسکین ہوتی ہیں۔ مرد اور عورت کے ازدواجی تعلق کا مقصد محض شہوت اور تسکین نفس قرار نہیں دیا گیا بلکہ اسے تمدنی فریضہ قرار دیا گیا ہے، جس سے نسل انسانی کا ارتقاء ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب عورت کا فرض بچے پیدا کرنا ہی نہ ہو بلکہ ان کی تعلیم وتربیت کی مناسب پرورش بھی ہو۔

5: اسلام نے وسیع تر انسانی مفاد اور ضرورت کے تحت ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دی ہے۔ اسلام نے اس صورت میں حکم دیا ہے کہ اگر بیویاں ایک سے زیادہ ہوں تو مرد کو چاہئے کہ ان کے درمیان ممکنہ حد تک انصاف وعدل کا رویہ اختیار کرے۔ ایک ہی طرف نہ جھک جائے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"فلاتميلوا كل الميل فتذروها كالمعلقة"

"اور ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ادھر لٹکتا ہوا چھوڑ دو۔"

6: اسلام کا حکم ہے کہ اگر مرد اور عورت کے درمیان جدائی ناگزیر بھی ہو تو بھی شرافت اور

ہمدردی کے ماحول میں ہو۔ اگر اس سے قبل عورت کو ہدایہ اور تحائف دیئے گئے ہوں تو وہ واپس نہ لئے جائیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"ولا یحل لکم ان تاخذو امما اتیتموھن شیاء"

"اور تمہارے لیے حلال نہیں کہ جو تم نے ان کو دیا اس میں سے کچھ لو۔"

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"فمتعوھن و سرحوھن سراحا جمیلا"

(سورۃ الاحزاب، آیت نمبر:۴۹)

"ان کو کچھ متاع اور کوئی فائدہ دے کر اچھی طرح سے رخصت کرو۔"

شادی اور اس کی اہمیت و فرائض: معاشرت کی اولین کڑی ازدواج ہے۔ اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت میں سے قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"النکاح من سنتی و من یرغب عن سنتی فقد رغب منی"

"نکاح میری سنت میں سے ہے جو شخص میری سنت سے اعراض کرے اس نے مجھ سے روگردانی کرلی۔"

ازواج جماعتی توازن کو برقرار رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ حدیث میں ہے:

"من تزوج فقد احرز شطر دینہ فلیتق اللہ فی الشطر الثانی"

"جس نے شادی کرلی اس نے اپنے دین کا ایک حصہ محفوظ کرلیا۔ اب دوسرے نصف حصہ میں اللہ سے ڈرتا رہے۔"

شادی نہ کرنے کی اس طرح تہدید اور اس کے کرنے کی جو ترغیب دلنشین اور حکیمانہ پیرایہ میں دی گئی ہے اس کا منشا عین فطری قوانین اور طبعی و عمرانی اصولوں کے مطابق ہے۔ اسلام نے جس طرز زندگی اور نظام جماعت کے جن طریقوں کو پیش کیا ہے ان کا دارومدار زیادہ تر افراد کے طبائع کی اصلاح و تہذیب اور ان کے اخلاق و کردار اور سیرت کی تعمیر پر ہے۔ اس کی اولین اصلاحی کوشش شادی میں مضمر ہے۔

شادی کے اجتماعی فوائد: جماعت کی تنظیم اور تمدن و تہذیب کی ترقی و اصلاح کے لیے شادی سے جو فوائد مرتب ہوتے ہیں۔ وہ پانچ ہیں۔

1: بقائے نسل اور جنس کی حفاظت کے لیے اولاد کی پیداوار ضروری ہے۔ شادی کے فلسفہ میں یہی ایک اصل و بنیاد ہے تا کہ دنیا انسانوں سے کبھی خالی نہ رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کا یہی مقصد ہے:

"تناکحوا تناسلوا"

"باہمی شادی بیاہ کرو اور نسل کا سلسلہ جاری رکھو۔"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِن يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ"

(سورۃ النور، آیت نمبر 32)

"تم اپنی جماعت کی بیواؤں، نیک بندوں اور اپنی لونڈیوں سے نکاح کرو۔ اگر وہ فقیر محتاج ہوں تو اللہ ان کو اپنے فضل و کرم سے مالدار کر دے گا۔"

ان ہی الٰہی قوانین اور طبعی فرائض و واجبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے نہ تو اسلام نے رہبانیت کا حکم دیا اور نہ مسلمانوں کے کسی دور میں شادی کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی یا سوائے عذر شرعی کے دائمی تجرد پسندانہ زندگی کی اسلام نے کبھی تعلیم دی۔

2: شادی کا دوسرا فائدہ طبعی ضرورت کو پورا کرنا ہے تا کہ خواہشات نفسانی کی آگ سرد پڑ جائے۔ نفس انسانی جذبات فاسدہ سے محفوظ رہے۔ افراد کی سیرت عالیہ کی تعمیر ہو اور شرعی مطلوبہ عفت و عصمت کی بنیادیں محکم و استوار ہو جائیں۔ اس کے علاوہ شادی سوسائٹی کے اندر فاسد اخلاق اور مہلک عادتوں کے وقوع پذیر ہونے کو روکنے کا بہترین ذریعہ اور اہم حفاظتی تدبیر ہے۔

3: شادی کا مقصد سکونِ نفس، راحتِ قلب اور نشاطِ روں ہے تا کہ انسان اپنے حواس کو ناجائز کاموں میں صرف نہ کرے۔ اپنے دن کو نشاط اور فراغ دلی کے ساتھ اپنے معاشی کاموں میں گزارے اور زندگی کی مطلوبہ مشکلات کو برداشت کرے۔ حدیث میں

آیا ہے:

"لایکون العاقل طامعاً الافی ثلاث' تزودلمعادو حرفة لمعاش ولذة فی غیر محرم"

"عاقل ودانا صرف تین چیزوں کی خواہش کرے۔ آخرت کا زادِ راہ تیار کرنا' معاش کے لیے کوئی پیشہ اختیار کرنا اور غیر محرم سے لذت حاصل کرنا۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں:

"تم اپنے دلوں کو ایک ساعت راحت بخشو' کیونکہ جب وہ سختی سہتے ہیں تو اندھے ہوجاتے ہیں۔"

4: گھریلو انتظام مثلاً کھانا پکانا' پوشاک' بستر' برتنوں کی صفائی اور گھر کے دیگر لوازمات کی فراہمی عورت کی ذمہ دار ہے۔ اسی لیے لڑکیوں کو صحیح گھریلو تربیت دینا واجب ہے' کیونکہ جب وہ قوم کے مردوں کی عورتیں بنیں گی تو ان کو اس وقت اپنے گھر کے تمام فرائض و واجبات کا سیکھنا ضروری ہوگا' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"من کان لہ ثلاث بنات فانفق علیھن واحسن الیھن حتی یغنیھن اللہ عنہ اوجب اللہ لہ الجنة البتة"

"جس کے پاس تین لڑکیاں ہوں ان پر خرچ کیا اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا' یہاں تک کہ اللہ نے اس کو ان سے بے نیاز کر دیا تو اللہ اس کے لیے جنت واجب کر دے گا۔"

یہاں احسان سے مراد ان کی اچھی تربیت ہے۔

5: مجاہدہ نفس، تلاش روزگار اور کسب حلال میں زیادہ جدوجہد کرنے پر آمادہ کرنا شادی کا اہم ترین مقصد ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

"کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ"

"تم میں سے ہر ایک محافظ ہے اور ہر ایک اپنی رعایا کا ذمہ دار۔"

آداب زوجین: شوہر اور بیوی کے درمیان حسن معاشرت اور خوشگوار تعلقات

کو قائم رکھنے کے لیے اسلام نے ان دونوں کے حقوق و آداب مقرر کر دیے ہیں۔ شوہر پر کیا ذمہ داریاں ہیں اور بیوی کو کن چیزوں کا پاس لحاظ رکھنا ضروری ہے' ان دونوں کے اصول و آداب بے شمار ہیں جن میں سے یہاں چند پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

1: میاں اور بیوی کے درمیان حسن معاشرت اور محبت و الفت کو خوشگوار ہونے کے لیے اخلاق حسنہ کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ"

(سورۃ النساء، آیت نمبر 19)

"اور عورتوں سے بھلائی اور نیکی کے ساتھ میل جول کرو۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"اکمل المومنین ایمانا احسنھم خلقا والطفھم باھلہ"

"وہ مسلمان ایمان میں زیادہ کامل ہے جو بہترین اخلاق سے آراستہ ہو اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ حد درجہ لطف و عنایت سے پیش آئے۔"

2: خرچ میں بہر حال اعتدال کے دائرہ سے تجاوز نہ کریں۔ یہی اصول مرد اور عورت سے ہر چیز میں مطلوب ہے۔

3: غیرت و حمیت کے دامن کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیں' غیرت کا مطلب یہ ہے کہ ان ابتدائی اور بنیادی امور سے انجان نہ ہوں جن کا انجام آئندہ خطرناک صورت اختیار کر لے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بدگمانی میں مبالغہ نہ کیا جائے:

"اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ"

"کیونکہ بعض قیاس آرائیاں یقیناً گناہ ہوتی ہیں۔"

(سورۃ الحجرات، آیت نمبر 12)

4: شوہر کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی بیوی کو دینی و دنیوی ضروری علوم و معارف کی تعلیم دے۔

5: دونوں اپنی اولاد کو ادب سکھلائیں اور ان کو بہترین تعلیم و تربیت سے سنواریں۔

6: اگر میاں بیوی میں کوئی اختلاف اور ناچاقی کی صورت پیدا ہو جائے تو رشتہ داروں میں سے کوئی شخص حکم بن کر دونوں کے درمیان سمجھوتہ کرا دے:

"فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا"

(سورۃ النساء، آیت نمبر:35)

"ایک حکم شوہر کے رشتہ داروں میں اور ایک حکم بیوی کے رشتہ داروں میں سے روانہ کرو۔"

لوگوں کے اختلافات کو عموماً اور میاں بیوی کی نااتفاقیوں کو خصوصاً درست کرنا اور ان کے درمیان مصالحت کرنا ایک مقصدِ عظیم ہے جس کی ترغیب پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دی اور اس کی طرف دعوت دی۔

7: شوہر کے لیے ایک سے چار بیویاں موجود ہوں تو اس کا فرض ہے کہ ان سب کے درمیان عدل کرے اور ان شروط و قوانین کو ملحوظ رکھے جو کثرتِ ازدواج کے جواز میں پیش کیے گئے ہیں۔

حقوقِ اولاد:

میاں بیوی کے دائرہ کار کی علیحدگی اور باہمی تعلقات کے انضباط کے بعد ان کا اور ان کی اولاد کا تعلق سامنے آتا ہے۔ والدین کے بارے میں قرآن مجید نے واضح تعلیمات دی ہیں اور کہا ہے کہ انہیں "اف" تک نہ کہو یعنی انہیں اپنے کسی قول یا عمل سے ذرا بھی دکھ نہ پہنچاؤ اور جب تک وہ صریح اسلامی تعلیمات کے خلاف حکم نہ دیں ان کی حکم عدولی نہ کی جائے۔ دوسری طرف والدین کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت کا خاص خیال رکھیں، بھوک، افلاس اور جاہلیت کے عار کی بنا پر بچوں کو قتل نہ کریں اور نہ ان کی ایسی تربیت کریں کہ وہ معاشرہ کے معزز فرد نہ بن سکیں۔

اسلام کے مطابق والدین کو اولاد کے لیے یہ دعا مانگنی چاہیے:

"واجعله رب رضيا"

"اے رب! اس (بچے) کو خوش اطوار بنا دے۔"

والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں۔ چنانچہ

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"و کان یامر اھلہ بالصلوٰۃ و الزکوٰۃ"

"اور وہ (حضرت اسماعیل علیہ السلام) اپنے اہل وعیال کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔"

(سورۃ نمبر ۱۹، آیت نمبر ۵۵)

سورۃ الفرقان کے آخر میں مومنین کی یہ دعا درج ہے:

"وہ عرض کرتے ہیں: "اے پروردگار! ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی رکھ اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔"

(سورۃ الفرقان، آیت نمبر: ۷۴)

مفسرین کے نزدیک ان آیات میں متقین سے مراد "افرادِ خاندان" ہیں۔

اسلامی صلہ رحمی:

1: خاندان کی تنظیم کے بعد اسلام نے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیا ہے۔ صلہ رحمی میں تمام رشتہ دار شریک ہیں۔ اس دائرے میں ایک خاندان سے آگے بڑھ کر کئی خاندان شریک ہو جاتے ہیں جن میں باہمی خونی تعلق ہوتا ہے یا رشتے ناطے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے ایک خاندان کے افراد کے باہمی تعلق کے لئے لفظ "احسان" کا استعمال کیا ہے اور اس کے بعد حکم دیا ہے کہ اپنی خوشیوں میں ذوالقربیٰ کو یاد رکھا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"وبالوالدین احسانا وبذی القربی"

"اور والدین اور قریبی رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرو۔"

(سورۃ النساء، آیت نمبر: ۳۶)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"واتی المال علی حبہ ذوی القربی"

"اور باوجود عزیز رکھنے کے مال اپنے رشتہ داروں کو دے۔"

(سورۃ البقرۃ: آیت نمبر: ۱۷۷)

2: ایک خاندان اور اس کے قریبی رشتہ داروں کے بعد اس خاندان اور اس کے ہمسایہ خاندان کے تعلقات کا مرحلہ آتا ہے۔ اس میں ہمسایہ، اہل محلہ اور جان پہچان والے دوسرے لوگوں کا باہمی تعلق سامنے آتا ہے۔ قرآن کریم نے ہمسائے سے حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور یہی حکم ان لوگوں کے بارے میں بھی ہے جن سے معمولی میل جول ہو، اس دائرے میں اہل محلہ بھی آتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"والجار ذی القربیٰ والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبیل"

"اور احسان کرو ہمسایوں، اجنبی ہمسایوں، پاس بیٹھنے والوں اور مسافروں کے ساتھ۔"

(سورۃ النساء، آیت نمبر:۳۶)

اہل محلہ کے لئے مسجد کو پورے محلے کا محور بنایا گیا جہاں وہ پنج وقتہ نماز کے لئے جمع ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔

3: اسلام میں حکم دیا گیا ہے کہ مسلمانوں سے ملاقات کی ابتدا "سلام" سے کی جائے۔ اس طرح یہ تعلیم دی گئی ہے کہ آپ سے بات کرنے والا جس انداز سے بات کرتا ہے، آپ کا فرض ہے کہ آپ بھی اسی انداز سے بات کریں یا اس سے بھی اچھے انداز سے بات کریں۔ سلام کے لئے یوں تعلیم دی گئی:

"واذا حییتم بتحیه فحیوا باحسن منها اوردوها"

"جب کوئی احترام کے ساتھ سلام کرے تو اس کو اس سے بہتر طریقہ کے ساتھ جواب دو یا کم از کم اس کی طرح۔"

(سورۃ نمبر۴، آیت نمبر:۸۶)

4: اسلام نے معاشرے کے نادار، اپاہج، یتیم اور بیوہ افراد کی نگہبانی کو ضروری قرار دیا ہے۔ سورۃ الماعون میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ شخص خوف آخرت نہیں رکھتا:

"یدع الیتیمo ولایحض علی طعام المسکینo"

"جو یتیموں کو دھکے دیتا ہے اور ناداروں کو کھانا کھلانے کے لئے ترغیب نہیں دیتا۔"

اور دوسری جگہ ہے:

"وفی اموالھم حق للسائل والمحروم"

"ان (مسلمانوں) کے اموال میں سائل اور نادار کا بھی حق ہے۔"

(سورۃ نمبر ۵۱، آیت نمبر ۱۹)

اس مقصد کے لئے شریعت نے زکوٰۃ اور صدقات کو مشروع قرار دیا ہے اور حکم ہوا کہ یہ فقراء و مساکین کا حق ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"انما الصدقات للفقراء والمساکین"

"بے شک صدقات فقراء اور مساکین کے لئے ہیں۔"

(سورۃ نمبر ۹، آیت نمبر ۶۰)

افرادِ خاندان کے ساتھ حسنِ معاشرت:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین سے اچھا برتاؤ کرنے' بھائیوں اور بہنوں سے نرمی اور عنایت سے پیش آنے اور تمام رشتہ داروں کے ساتھ حسن معاملہ کرنے کی ترغیب دی ہے۔ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے' ان کے حقوق ادا کرنے' ان کے ساتھ ادب کو پیش نظر رکھنے' صلہ رحمی کرنے اور رشتہ داروں کے ساتھ محبت و مودت کرنے کے متعلق متعدد قرآنی آیات اور بیشتر نبوی احادیث وارد ہوئی ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلہ رحمی کی فضیلت میں فرماتے ہیں:

"من سرہ ان ینسأ لہ فی اثرہ ویوسع علیہ فی رزقہ فلیصل رحمہ"

"جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی عمر میں تاخیر کی جائے اور اس پر رزق کے دروازے وسیع کر دیئے جائیں تو اس کو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔"

والدین کی نافرمانی اور قرابت داروں پر ظلم وستم ان رذیل خصلتوں اور خلاف انسانیت حرکتوں میں سے ہے جن سے شدت کے ساتھ روکا گیا ہے۔

اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ بالخصوص اور بنی نوع انسان کے ساتھ بالعموم میل جول رکھنے کے بہت سے حقوق و آداب ہیں جن سے ہر انسان کو آراستہ ہونا لازمی ہے، کیونکہ انسان بذات خود کم صحبت کرتا ہے بلکہ اس کا اکثر وقت اوروں کے ساتھ گذرتا ہے۔ اجتماعی محبت والفت میں وسیع پیمانہ پر اثر انداز ہونے والی چیز عام طور سے حسن خلق ہے۔ دین اسلام نے اس پر اکثر مقامات میں زور دیا ہے۔ کیونکہ یہ باہمی محبت، اتحاد اور الفت کا موجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی حسن خلق کے ذریعے کی ہے:

"وانك لعلی خلق عظیم"

(سورۃ القلم، آیت نمبر 5)

"یقیناً آپ عظیم الشان اخلاق کے مالک ہیں۔"

حدیث شریف میں وارد ہے:

"اکثر مایدخل الناس الجنة تقوی الله وحسن الخلق"

"اللہ کا تقویٰ اور حسن خلق اکثر و بیشتر لوگوں کو جنت میں داخل کر دیتے ہیں۔"

ایک دوسری حدیث میں آیات ہے:

"احسن الحسن الخلق الحسن"

"حسن صورت حسن سیرت سے ہے۔"

حسن اخلاق اس نفسی تقویٰ شعاری کا نام ہے جو نفسِ مطمئن اور ذوقِ سلیم کے ہم آہنگ ہے، جو بہترین معاشرتی حالات سے آراستہ ہونے سے حاصل ہوتا ہے، خواہ دینی طریقہ ہو یا اجتماعی آداب کے وسیلہ سے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّآ أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۝"

(سورۃ الانفال، آیت نمبر 63)

"اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو جوڑ دیا۔ اگر تو زمین کی تمام چیزوں کو بھی خرچ کرتا تو ان کے دلوں کو نہیں جوڑ سکتا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان الفت پیدا کر دی۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق فاضلہ سے آراستہ ہونے والوں کی مدح میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اقربکم منی مجلسا احاسنکم اخلاقا الموطئون اکنافا الذین یالفون ویولفون"

"میری مجلس کے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق بہترین ہوں' جو اپنے بازوؤں کو جھکائے رہتے ہیں' یہ الفت کرتے ہیں اور دوسرے بھی ان سے الفت کرتے ہیں۔"

دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا:

"المومن من الف مالوف ولا خیر فیمن لایالف ولا یولف"

"مسلمان سراپا الفت ہے اور دوسروں کی الفت کا سامان ہے۔ اس شخص میں کوئی بھلائی نہیں جو نہ الفت کرتا ہے اور نہ اس سے کوئی الفت کر سکتا ہے۔"

دوستی کے حقوق و آداب:

جماعت انسانی کے افراد مختلف ذوق اور گوناگوں مسلک رکھنے والے ہوتے ہیں۔ دوستی افراد انسانی کو ہم ذوق و ہم مشرب بنانے اور مختلف طبائع کے مابین اتحاد و یگانگت کے رشتہ کو مضبوط و مربوط کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ انسانی نفوس میں باہمی کشش اور جاذبیت رکھی گئی ہے جس کا مظہر ہم آہنگی و رفاقت ہے۔ لوگوں کی طبیعتیں مختلف' مزاج جداگانہ اور شکلیں الگ ہوتی ہیں۔ جس میں قریبی مشابہت اور جاذبیت رہے گی اسی قدر دوسرا اس کی طرف کشاں کشاں چلا آئے گا۔

دوستی کے چند حقوق و آداب ہیں اور حق دوستی کو ادا کرنے کے لیے ان کا لحاظ ضروری ہے۔ وہ حسب ذیل ہو سکتے ہیں:

1: دوست کو مال میں حق پہنچنا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"مثل الاخوین مثل الیدین تغسل احدھما الاخریٰ"

"دو بھائیوں کی مثال دونوں ہاتھوں کی طرح ہے کہ ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو دھوتا ہے۔"

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہے کہ مالی شعبوں میں قرض کے ذریعہ دستگیری کی جائے اور امداد کے لیے ہاتھ بڑھایا جائے خواہ اس کے لیے اپنے اوپر ایثار ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ جیسا کہ عہد نبوی میں اسلامی مروت درجۂ کمال تک پہنچ چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ"

(سورۃ الحشر، آیت نمبر 9)

"اور وہ دوسروں کو مقدم رکھتے ہیں اپنے نفسوں پر خواہ ان پر فاقہ ہی ہو۔"

2: بھائیوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں نفسی اعانت کرنا۔

3: دوستوں کی عیب جوئی' ان کی نکتہ چینی اور ان کی تحقیر کرنے سے زبان پر مہر سکوت لگانا' ان کی جان، آبرو اور مال میں حسد کرنے سے باز رہنا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ایحب احد کم ان یاکل لھم اخیہ "

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 49، آیت نمبر 11-12)

"کیا تم میں سے کوئی اس کو پسند کرے گا کہ اپنے بھائی کا مردار گوشت کھائے۔؟"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"ولا تحسبوا ولا تحسبوا ولا تباغضوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللہ اخوانا"

"تم آپس میں ایک دوسرے کا کھوج نہ کرو' کان دھرے نہ رہو' باہمی بغض نہ رکھو' ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو اور تم اللہ کے بندے اور مخلص دوست بن جاؤ۔"

4: شیریں کلامی کرنا' بھائیوں کی خوبیاں اور ان کے محاسن کو شمار کرنا' دوستوں کے درمیان بات چیت میں لطیفہ گوئی کو رائج کرنا' ادبی ذوق کو تازہ کرنا اور فحش گوئی اور غیبت

سے پرہیز کرنا۔

5: معمولی لغزشوں کو درگزر کرنا اور ادنیٰ گستاخیوں سے چشم پوشی اختیار کرنا جن سے کوئی انسان محفوظ نہیں۔ نیز اس کا لحاظ رہے کہ کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں جو قطع تعلق اور مفارقت کی موجب ہو۔

6: اخلاص و وفا یہ دونوں دوستی کے دوام و پختگی میں نہایت قوی عنصر ہیں۔ اخلاص کی وجہ سے رشتۂ مودت کبھی نہیں ٹوٹتا خواہ جسمانی دوری ہو۔ وفا کی وجہ سے زندگی میں اور موت کے بعد محبت کے قدم ثابت و پائیدار ہوتے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"قليل الوفاء بعد الممات خير من كثيره حال الحياة"

"موت کے بعد کی تھوڑی سی وفا زندگی کے زمانے کی زیادہ وفاداری سے بہتر ہے۔"

7: میانہ روی، اعتدال پسندی اور تکلف سے احتراز بہترین آداب اور عظیم الشان اصولوں میں سے ہیں۔ بعض حکما نے کہا ہے:

"جو شخص اپنے دوستوں کے نزدیک اپنے آپ کو اپنی طاقت سے بڑھ کر پیش کرے تو وہ بھی گنہگار ہوا اور انہوں نے بھی گناہ مول لیا' جو اپنی قدرت کے مطابق پیش کرے تو خود بھی تکلیف اٹھائی اور ان کو بھی زحمت دی اور جو اپنی طاقت سے کم پیش کیا تو وہ محفوظ رہا اور وہ بھی بچ رہے۔"

میانہ روی اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ تکلیف سے کنارہ کشی نہ اختیار کر لی جائے۔

لوگوں میں الفت و محبت کو زیادہ کرنے والی چیزیں یہ ہیں: سلام کو عام کرنا' نرم کلامی' زبان کو ایذا رسانی سے محفوظ رکھنا اور اعضاء و جوارح سے کسی کو تکلیف پہنچانے سے باز رہنا۔ درج ذیل حدیث کا مصداق بھی یہی ہے:

"المسلم من سلم الناس من لسانه ويده"

"مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں۔"

نیز بعض لغزشوں سے درگزر کرنا' سن رسیدہ اور ذی مرتبت اشخاص کی قدر و منزلت' نیکی و احسان' کمزوری اور مسکینوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ' مظلوموں کی دادخواہی' برائیوں کا ازالہ اور لوگوں کے درمیان مصالحت یہ تمام دوستی اور مودت میں اضافہ کرنے والی چیزیں ہیں۔

عام معاشرتی امور و معاملات میں صداقت' راست بازی' امانت و دیانت داری' لین دین میں عدل و انصاف' عہد و پیمان میں وفا کا پاس' اپنے اوپر انصاف' ان تمام اصول کی نگہداشت ضروری ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابودرداء رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں:

"یاابا الدرداء احسن مجاملة من جارك تكن موافقا واحب للناس ماتحب لنفسك تكن مسلما"

"اے ابودرداء! اپنے ہمسایہ سے حسن دوستی سے پیش آؤ جو تیرے مزاج کے موافق ہو جائے اور لوگوں کے لیے وہ چیز پسند کر جو تو اپنے لئے پسند کرتا ہے تو پورا مسلمان ہو جائے گا۔"

اسلام میں حقوق ہمسائیگی:

اسلام نے جس نظام کی بنیاد ڈالی تھی' اس کا مقصد یہ تھا کہ ملت اسلامیہ کو ایک خاندان کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے' یہ کیوں؟ اس لئے کہ کشمکش حیات پر قابو پایا جا سکے۔ وہ تمام اسباب و وسائل جن سے اس قسم کے تعاون کی راہیں ہیں اسلام نے ان کی طرف دعوت دی اور ان پر گامزن ہونے کے لیے آمادہ و تیار کیا۔ کہا گیا:

"وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ"

(سورۂ مائدہ، آیت نمبر 2)

"اور بھلائی اور پرہیز گاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر باہم امداد نہ کرو۔"

ان اسباب و وسائل میں حقوق ہمسائیگی کا پاس ایک بنیادی چیز ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو

صرف اسی ایک چیز کی تکمیل امت کو ایسی وحدت میں تبدیل کر سکتی ہے، جسے "بنیان مرصوص" کہنا بالکل بجا ہوگا اور جس میں دوسروں کی ریشہ دوانیوں کے لیے کوئی راہ باقی نہ رہے گی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لا یؤمن عبد حتی یامن جارہ بوائقہ"

"کسی کے ایمان کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کا پڑوسی اس کی ہلاکت باریوں سے مامون و مطمئن نہ ہو جائے۔"

یہ حدیث بتاتی ہے کہ تکمیل ایمان کے لئے ایک خاص شرط کا وجود ضروری ہے، اب سوچنا یہ ہے کہ ایمان ہی وہ چیز ہے جس پر دنیا و آخرت کی بھلائیوں کا دارومدار ہے اور ایمان کی تکمیل اس بات پر موقوف ہے کہ مومن کا پڑوسی اس کی ایذا رسانی سے محفوظ و مامون ہو جائے تو معلوم ہوا کہ پڑوسی کی مامونیت ایک اہم ترین شے ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسی کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

1: جس کا ایک حق ہو۔
2: جس کے دو حق ہوں۔
3: جس کے تین حق ہیں۔

تین حق والا پڑوسی وہ ہے جو مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ قرابت دار بھی ہو اس کے تین حق اس طرح پر ہیں۔

1: حق ہمسائیگی۔
2: حق اسلام۔
3: حق قرابت۔

دو حق والا پڑوسی وہ ہے جو مسلمان ہو اس کا ایک حق "ہمسائیگی" دوسرا حق "اسلام" ایک حق والا وہ پڑوسی ہے جو غیر مسلم ہو۔

نظام اجتماعی کی یہ کس قدر بلند سطح ہے جس کے اوپر کسی اور چیز کی گنجائش نہیں۔ سلسلہ حق ہمسائیگی کی یہ درازی کہ جس میں غیر مسلم بھی پرو دیئے گئے ہوں، قبل اسلام میں یہ چیز ہیں نظر نہیں آتی۔ اس لئے یہ بات محتاج وضاحت نہیں کہ اسلام نظم اجتماعی کی ان تمام راہوں کی پاسبانی کرتا ہے، جو انسانیت کے ہر شعبہ کے لیے ضروری ہیں اور مقتضائے مدنیت کی یہی آخری انتہائی شکل ہے۔

متمدن زندگی بسر کرنے والا انسان ناممکن ہے کہ اردگرد کچھ ایسے پڑوسی نہ رکھتا ہو جن کا بلحاظ مذہب مختلف ہونا یقینی نہ ہو اور جن سے اس کا مختلف قسم کا معاملاتی تعلق نہ ہو۔ تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کے ساتھ معاملہ تو جائز ہو لیکن ان کے ساتھ اچھا سلوک جائز نہ ہو۔ اسی لیے اسلام نے اس معاملہ میں بھی مساوات کا حکم دیا ہے خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب سے تبادلہ ملاقات' ان کی شادی و غمی میں شرکت اور ان کے ساتھ اکل و شرب حتی کہ شادی بیاہ کے تعلقات کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ دوسرے مذاہب کے لوگوں نے مسلمانوں کی ہمسائیگی میں ان تمام حقوق کو ہمیشہ حاصل کیا جو ایک اقلیت ایک شریف و متمدن اکثریت سے حاصل کر سکتی ہے۔

امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس موجود تھا۔ آپ کا غلام بکری بھون رہا تھا۔ آپ نے فرمایا:

"جب بھون چکو تو پہلے ہمارے یہودی پڑوسی کو دو۔"

آپ نے اس جملے کو کئی مرتبہ دہرایا۔ خادم نے عرض کیا:

"کتنی مرتبہ فرمائیں گے۔؟"

آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کو پڑوسی کے متعلق ہمیشہ وصیت فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم لوگوں کو یہ خیال ہونے لگا کہ کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑوسی کو وارث بھی بنا دیں۔"

غور کرنا چاہیے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے یہودی پڑوسی کا کس قدر لحاظ کیا۔ اپنے مذہب اور اس میں کوئی تفریق نہ کی، بلکہ خادم کو حکم دے دیا کہ کھانا پہلے یہودی کو پہنچنا چاہیے۔ اس حکم سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ خادم کو کہیں یہ شبہ نہ ہو جائے کہ یہودی اپنی یہودیت کی بنا پر ہمسائیگی کے حقوق سے مستثنٰی ہوگا اور اسی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل فرما دیا۔ یہ نظم و تمدن کا کتنا کھلا ہوا ثبوت اسلامی اصول سے ملتا ہے۔؟

حقوق ہمسائیگی کے سلسلہ میں سب سے اہم نقطہ جو ایک مسلمان کے لیے جاذب توجہ بن سکتا ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسی کی

شہادت کو خدا کے ہاں نیکی وبدی کا معیار قرار دیا۔ چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب میں کوئی نیکی یا بدی کروں تو میں اسے کس طرح جان سکتا ہوں۔؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب تم اپنے پڑوسیوں کو کہتے ہوئے سنو کہ تم نے نیکی کی تو یہ سمجھ لو کہ تم نے نیکی کی اور جب تم یہ کہتے ہوئے سنو کہ تم نے برائی کی تو سمجھ لو کہ تم نے برائی کی۔"

سوچو اور غور کرو کہ اس حدیث کو سن کر کس شخص کی یہ مجال ہوگی کہ اپنے پڑوسی کو اپنی مذمت میں مصروف دیکھے اور اس پر کوئی اثر نہ ہو۔ نہیں بلکہ اس کی انتہائی کوشش اس بات پر صرف ہوگی کہ اپنے پڑوسی کی مذمت تعریف سے بدل جائے۔ عمرو بن شعیب (چند واسطوں سے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اتدرون ماحق الجار؟ اذا استعان بك اعنته وان استنصرك نصرته وان استقرضك اقرضته وان مرض عدته وان مات شيعت جنازته وان اصابه خير هنأ ته وان اصابته مصيبته عزيته ولاتستطل عليه بالبناء فتحجب عنه الريح الا باذنه ولا توذه واذا اشتريت فاكهة فاهدله وان لم تفعل فادخلها سترا ولا يخرج بها ولدك ليغيظ بها ولده ولا توذه بقتار قدرك الا ان يخرج بها ولدك ليغيظ بها ولده ولا توذه بقتار قدرك الا ان تغرف له منها (ثم قال) اتدرون ماحق الجار؟ والذی نفسی بیدی لا یبلغ حق الجار الا من رحمة الله"

"کیا تم لوگ جانتے ہو کہ پڑوسی کا کیا حق ہے؟ اگر تم سے مدد چاہے تو اس کی مدد کرو، اگر تم سے قرض مانگے تو قرض دو، اگر محتاج ہو تو اس کو سامان بہم پہنچاؤ، مریض ہو تو اس کی عیادت کرو، مر جائے تو اس کے جنازے میں شریک ہو،

اسے کوئی اعزاز ملے تو مبارک باد دو' مبتلائے مصیبت ہو تو ہمدردی کرو' اپنی عمارت کو اس قدر اونچا نہ بناؤ کہ اس کے مکان کی ہوا رک جائے مگر ہاں اس کی اجازت سے اس کو تکلیف نہ دو' پھل خرید و تو اس کو ہدیۃً بھیجو' اگر ایسا نہ کرو تو چھپا کر لاؤ، لیکن تمہارے بچے اس کو لے کر باہر نہ نکلیں کہ اس (پڑوسی) کی اولاد کو رنج و تکلیف پہنچے گی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم جانتے ہو کہ پڑوسی کا کیا حق ہے۔؟ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! پڑوسی کے حق کو پورا پورا وہی ادا کر سکتا ہے جس پر اللہ مہربان ہو۔"

اس حدیث میں پڑوسی کے حق کے متعلق پوری تفصیلات موجود ہیں اور کسی گوشہ کو نہیں چھوڑا گیا، لیکن ہو سکتا ہے کہ آج کی تہذیب وتمدن کے پیش نظر کوئی شخص اس وہم میں مبتلا ہو جائے کہ حقوق کی یہ صورت ادا کرنا ناممکن ہے مگر اس کا وہم ایک خیال باطل سے زیادہ نہیں۔ اس لئے کہ یہ تمام حقوق مقتضائے عقل کے مطابق ہیں۔ معمولی عقل رکھنے والا انسان صرف عقل پر اعتماد رکھتے ہوئے پڑوسی کے حقوق کی اس تفصیل کو بالکل ضروری قرار دے گا بشرطیکہ وہ بہیمیت وحیوانیت کے اثرات کو تھوڑی دیر کے لیے اپنے دل سے نکال دے۔

اب ذرا تفصیل کے ساتھ اس اجمال پر نظر ڈالئے۔ بھلا سوچئے کہ یہ کتنی پست ہمتی ہوگی کہ کسی افتاد نا گہانی سے تنگ آ کر ایک پڑوسی آپ سے امداد کا طالب ہو اور آپ انکار کر دیں۔ اس کے گھر میں چور یا بھیڑیا گھس آیا ہے، وہ آپ سے مدد کا خواستگار ہے اور آپ منہ پھیر لیتے ہیں اور پروا بھی نہیں کرتے کہ وہ درندے کی نذر ہو جائے گا۔ وہ اپنی پریشانی میں چند روپے آپ سے قرض کے طور پر مانگتا ہے، مگر آپ دینے سے انکار کرتے ہیں۔ اس کے اہل وعیال بھوک کے پنجے میں گرفتار ہیں، آپ قدرت کے باوجود اس کی مصیبت کا ازالہ نہیں کرتے۔ وہ بیمار ہے' آپ سے دلجوئی وغمخواری کا طالب ہے مگر آپ اس کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ مر چکا ہے مگر آپ چند قدم اس کے جنازے کے ساتھ چلنے میں بخل کرتے ہیں۔ وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہے لیکن اس سے ہمدردی کرنے میں آپ کی شان گھٹتی جاتی ہے۔ آپ اپنے مکان کو بلند کر کے اس کے مکان سے دھوپ اور ہوا کو روک دیتے ہیں اور ذرا بھی اپنی دناءت طبع کا احساس نہیں کرتے۔ آپ اپنی اولاد کے لیے الوان

نعمت مہیا کرتے ہیں لیکن پڑوسی کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی آپ کو کوئی پروا نہیں ہوتی۔

اگر آپ ان مذکورہ جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں تو کیا یہ آپ کی کوتاہی اور بے راہ روی نہیں ہے۔؟ ہے اور یقیناً ہے۔ تو پھر موجودہ تہذیب وتمدن میں اس کے وجوہ جواز کی تلاش عبث و بیکار ہے۔ اس لئے کہ یہ تہذیب تو نام ہی ہے سخت دلی' بخل' لاپروائی' غیر انسانیت اور بے تعلقی کا۔ حقیقت یہ ہے کہ تہذیب حاضر ان تمام خصائل حسنہ سے نا آشنائے محض ہو چکی ہے اور اسی غفلت شعاری کا نتیجہ ہے کہ قوم کی قوم مبتلائے مصیبت ہے۔ فقیروں کو مالداروں کی ثروت ایک آنکھ نہیں بھاتی' ناکاروں کو کامیابیوں پر حسد ہے اور ایک دوسرے کو مبتلائے آلام کرنے کی فکر میں غلطاں ہے۔ صاحب حاجت اس فکر میں ہے کہ کس طرح نظام عالم میں برہمی پیدا کر کے حصول مطلب کی سعی کرے' ان بیماریوں کا یورپ خصوصیت سے بے انتہا شاکی ہے، بلکہ ان بیماریوں کے مسلسل دن بہ دن بڑھتے رہنے سے وہ اس قدر خوف زدہ ہے کہ حد بیان سے باہر ہے۔ یہ سب موجودہ تمدن کی برکات ہیں، ورنہ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے اسلام نے حقوق ہمسائیگی کو اس جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس سے زیادہ ناممکن ہے۔ اس نے پڑوسی کی ایذا رسانی کو سخت ترین جرم قرار دیا۔ یہاں تک کہ حکم دے دیا کہ ایسے لوگوں کے اعمال صالحہ برباد و ضائع ہو جائیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا:

"فلاں شخص دن کو روزہ رکھتا ہے' رات کو مصروف عبادت رہتا ہے' لیکن پڑوسی کو تکلیف دیتا ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دوزخ میں داخل کیا جائے گا۔"

اس سلسلہ میں سخت سے سخت تنبیہ جو کی جاسکتی تھی' کر دی گئی۔ فرمایا:

"اگر تم نے پڑوسی کے کتے کو مارا تو تم نے گویا اپنے پڑوسی ہی کو ایذا پہنچائی۔"

مسلمانوں نے اس نصیحت کو گرہ سے باندھ لیا تھا۔ حالت یہ ہو گئی تھی کہ اتنی تکلیف بھی پڑوسی کو پہنچانا گوارا نہ تھا جتنی کہ اس کی جانب سے پہنچتی تھی۔ ایک روایت ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا:

"مجھے میرا پڑوسی تکلیف پہنچاتا ہے' گالیاں دیتا ہے اور تنگ کرتا ہے۔"

آپ نے فرمایا:

"جاؤ! اگر وہ تیرے معاملہ میں خدا کی نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے تو تم ایسا نہ کرو۔"

آپ نے اس کو بدلہ لینے کی اجازت نہیں دی' اس لئے کہ پڑوسی کی ایذا رسانی پر اس طور پر اغماض کرنا کہ وہ از خود نادم و شرمندہ ہو۔ قرآن کی اس آیت کا مصداق بنتا ہے:

"اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ○"

(سورۃ حم السجدہ، آیت نمبر 34)

"بطریق احسن مدافعت کرو۔ پس وہ شخص جس سے تمہارا جھگڑا ہے وہ ایک مخلص دوست بن جائے گا۔"

اگر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ یہ مشورہ دیتے کہ تم بھی ویسا ہی کرو جیسا کہ پڑوسی نے کیا ہے تو درحقیقت یہ اصول تمدن پر ایک کاری ضرب ہوتی۔ اس لئے کہ یہ معاملہ پھر ایک تک محدود نہ رہتا بلکہ ہر شخص اپنے پڑوسی کے ساتھ یہی برتاؤ کرتا۔ لہٰذا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس مصیبت کا پہلے ہی سے اندازہ کر کے اس کی کم سے کم صورت کا بھی سدباب کر دیا اور آنے والے کو صبر کی نصیحت کی۔ یہ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تعمیل ہے جو ایک آنے والے شخص سے فرمایا گیا تھا۔ جس نے پڑوسی کی سخت گیریوں کی شکایت کی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تلقین صبر کی تھی۔ وہ کئی مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا مگر ہر مرتبہ صبر کی ہدایت کی گئی' البتہ جب چوتھی بار آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اپنا اسباب سرِراہ بکھیر دو۔"

اس نے تعمیل ارشاد کی۔ اب ہر راہ گیر اس سے پوچھتا کہ کیا ہوا۔ وہ پڑوسی کی بدسلوکی کا دکھڑا سنا دیتا۔ لوگ ہمسایہ کو برا بھلا کہتے۔ اس چیز نے ہمسایہ کو متاثر کیا۔ وہ دوڑا ہوا آیا اور کہا:

"اپنا اسباب اٹھا لے جاؤ! واللہ! اب پھر ایسا نہ کروں گا۔"

امام زہری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا

اور پڑوسی کی شکایت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مسجد کے دروازے پر یوں منادی کر دو:

''الا ان اربعین دار اجار''

''سن لو! کہ واقعی اس نے چالیس گھروں پر ظلم کیا۔''

زہری نے چاروں سمت اشارہ کر کے اس حدیث کو روایت فرمایا۔ مقصد یہ تھا کہ ہر سمت کے چالیس چالیس گھروں کو تکلیف پہنچائی گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صورت شکایت کرنے والے کے جواب میں ارشاد فرمائی۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ایک شخص مسلسل چالیس گھروں کا پڑوسی ہے اور جو چالیس کے حقوق کی رعایت ونگہداشت کا مکلف ہو اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ایک کو ذرا سا بھی تنگ کرے۔ تادیب و تعلیم کی یہ کتنی بہترین صورت ہے جو دربار رسالت کے سوا کہیں نہیں ملتی۔

حقوق ہمسائیگی سے متعلق تاریخ اسلام میں سدہا عجیب وغریب اور حامل صد عبرت واقعات تلاش جستجو سے مل سکتے ہیں۔ سنا گیا ہے کہ ابن المقفع کو معلوم ہوا کہ اس کا مقروض پڑوسی ادائیگی قرض کی کوئی صورت نہ دیکھ کر اپنا مکان فروخت کر رہا ہے۔ ابن المقفع نے جو اس کی دیوار کے سایہ میں بیٹھا کرتا تھا کہا:

''اگر وہ افلاس کے باعث ایسا کر رہا ہے تو میں وہ ہوں جو ہمسایہ سے استفادہ کی مکافات کا اب تک کوئی طریقہ نہ اختیار کر سکا۔''

اس کے بعد پڑوسی کو گھر کی قیمت یہ کہتے ہوئے حوالہ کی کہ اسے نہ بیچو۔

کسی نے ابن المقفع سے شکایت کی کہ تمہارے گھر میں چوہے بہت ہیں۔ بلی پال لو تو پھر بہتر ہے۔ اس نے کہا:

''میں یہ ڈرتا ہوں کہ بلی کی آواز سن کر چوہے پڑوسیوں کے گھروں میں پہنچیں گے اور یہ بھی مجھے گوارا نہیں کہ اپنے آرام کی خاطر پڑوسی کی تکلیف کا باعث بنوں۔''

بطور نمونہ یہ دو واقعے پیش کیے گئے۔ ذرا آپ ایک سرسری نظر ہی ڈالیے اور پھر آج جو کچھ آپ دیکھ اور سن رہے ہیں اس سے مقابلہ کیجئے۔ باہمی اجنبیت کا یہ حال ہے کہ ایک ہی عمارت میں دس آدمی رہتے ہیں۔ اسی طور پر مدتیں گزر جاتی ہیں مگر ایک دوسرے سے

آشنا نہیں ہوتے اور جو لوگ الگ الگ گھروں میں رہتے ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا۔ یورپ کے تمام متمدن ملکوں کا حال یہی ہے۔

پڑوسیوں کی اتنی قسمیں ہو چکی ہیں کہ جن کا احاطہ ناممکن ہے۔ کم سے کم اور چھوٹی سے چھوٹی تکلیف جو پڑوسی کو پہنچائی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ نوجوان کھڑکیوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں، دروازوں کی سیدھ میں بیٹھ جاتے ہیں تا کہ گھر والے اپنی بے تکلفیوں کو جاری نہ رکھ سکیں۔ گویا وہ تنگ آ کر اپنی کھڑکیوں کو بند رکھنے پر مجبور ہو جائیں اور آفتاب کی شعاعوں اور اس کی روشنی سے محروم ہو جائیں۔ درآں حالیکہ یہ دونوں صحت جسمانی کے لیے ضروریات میں سے ہیں۔

کھلم کھلا سخت تر تکلیف یہ پہنچائی جاتی ہے کہ گھر کا کوڑا کرکٹ پڑوسی کے دروازے پر ڈال دیا جاتا ہے اور ذرا بھی ڈالنے والے کو اس حرکت بیجا کا احساس نہیں ہوتا۔ دوپہر کے وقت لڑکوں کو بے لگام چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وہ ساری دوپہر پڑوسیوں کے آرام میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ شام کے وقت گرد وغبار اڑانا ان کا بہترین مشغلہ ہوتا ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ پڑوسی کو اس سے تکلیف ہوتی ہے مگر ہم ذرا محسوس نہیں کرتے۔

شہر کو چھوڑ کر مضافات میں جائیے۔ وہاں بھی یہی زبوں حالی نظر آئے گی مگر دوسری شکل میں بچوں کی طفلانہ لڑائیوں سے متاثر ہو کر ماؤں کا گالی گلوچ کرنا پھر اس میں مردوں کی مداخلت کبھی گالیوں پر خاتمہ ہو گیا اور کبھی مار پیٹ تک نوبت پہنچ گئی۔ باغوں اور زمینوں کے معاملہ میں بھی یہی حال ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے حق کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ ایک شخص پڑوسی کی ملحقہ زمین پر قبضہ غاصبانہ کر بیٹھتا ہے یا موقعہ پا کر اپنے مویشیوں کو پڑوسی کے کھیت میں چھوڑ دیتا ہے۔ کبھی کھیتوں کے سیراب کرنے والے پانی کے معاملہ میں جھگڑتا ہے، کبھی بلاوجہ پانی کی راہ روک دیتا ہے۔

ضرورت ہے کہ اسلام کی صحیح تعلیم کو ایمان داری کے ساتھ پیش کیا جائے اور پیش کرنے سے پیشتر خود اس پر پوری طرح عامل ہوں تا کہ کامیابی کی توقع کی جاسکے۔ اس سلسلہ میں ایک مفید عملی اقدام یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ کا ایک جال پھیلا دیا جائے۔

اسلامی معاشرت کی بنیاد:

اسلام کے معاشرتی نظام کی بنیاد عالم گیر برادری، رنگ و نسل کے بجائے عقائد و اخلاق، عائلی نظام کی مضبوطی، جنسی تعلقات کے انضباط، مرد و عورت کے دائرہ کار کی علیحدگی اور عام انسانی دوستی کے قواعد اور اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ ایک مسلمان، جس طرح اپنے خاندان اور اپنے محلے کا ہمدرد ہوتا ہے اسی طرح وہ انسانیت کا ہمدرد ہوتا ہے۔ قرآنی نقطہ نظر سے وہ معاشرہ اسلامی معاشرہ نہیں ہے، جس میں پڑوسی ایک دوسرے کا دشمن ہو اور ایک ہی منزل کے دو مختلف حصوں میں رہنے والے ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوں اور یہ دونوں مسلمان ہوں۔

یہ ہے ایک مجمل خاکہ قرآنی نظام معاشرت کا، اس کی جھلکیاں آج کسی حد تک مسلمانوں کے معاشرے میں موجود ہیں۔ صدیاں گزر گئیں جب کہ مسلمانوں کا اجتماعی اور سیاسی نظام تحلیل ہو چکا ہے، بلکہ کئی مسلم معاشرے صدیوں غیر مسلم حکومتوں کی ماتحتی میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود آج بھی مسلم معاشرے میں قرآنی نظام کے آثار موجود ہیں اور انہیں نہیں مٹایا جا سکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے اسلامی نظام معاشرت کے لئے کچھ خاص اور مستحکم حفاظتی تدابیر اختیار کیں جن کی بدولت نامساعد حالات کے باوجود آج اسلامی معاشرہ ہے۔ وہ تدابیر مختصراً حسب ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

اسلام نے قرآن و سنت کی شکل میں اسلامی نظریہ کے تصور کو زندہ رکھا۔ مسلمانوں کے عقائد درست ہیں اور سنت رسول نے ہمیشہ انہیں حسن سلوک اور حسن سیرت پر ابھارے رکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے:

"من سن سنة فله اجرها واجر من عمل بها"

"جس نے بھی کسی اچھی روایت کی بنیاد رکھی، اسے اس کا اجر ملے گا اور اس پر قیامت تک جو بھی عمل کرے گا اس کا اجر بھی۔"

اچھی روایت قائم کرنا بھی اسلامی معاشرت کے بقا کا ضامن ہوا۔ چنانچہ مسلمانوں نے ہمیشہ ایسی روایات کو سینے سے لگائے رکھا جن کا تعلق حسن سلوک، فیاضی، مہمان نوازی، بڑوں اور اساتذہ کا ادب اور دوسرے آداب سے تھا۔

تعلیم کی وسعت اور اشاعت بھی اسلامی نظام معاشرت کے تحفظ کا اہم ذریعہ رہی۔

قرآن مجید نے علم، تدبیر اور حکمت کو حد درجہ اہمیت دی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حصول علم کو انسانی فریضہ قرار دیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ علم دوست رہے۔

مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ بھلائی کا حکم دیں، اسے پھیلائیں اور برائی سے روکیں۔ یہ کام ہر شخص پر اس کی استطاعت کے مطابق فرض ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنے معاشرے میں ہمیشہ منکر پر نکیر کی اور اسے پنپنے نہیں دیا۔ اس کے برخلاف اسلام نے ہمیشہ معروف کی حوصلہ افزائی کی اور یہ شعور اس حد تک آج بھی موجود ہے کہ جو لوگ بذات خود منکر میں مبتلا ہیں ان کی اکثریت بھی معروف کو پسند کرتی ہے اور اس کا احترام کرتی ہے۔

شریعت نے قرآنی نظام معاشرت کی اولین بنیاد "خاندان" کو اس حد تک مضبوط کیا ہے کہ مسلمانوں میں خاندانی نظام اور خاندان کی گرفت آج تک مضبوط ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے سیاسی، معاشی، قانونی اور تعلیمی نظام کے اضمحلال کے باوجود اسلامی معاشرہ کسی قدر زندہ ہے۔

بنی نوع انسان کے ساتھ حسن سلوک:

حکماء نے کہا ہے کہ انسان بالطبع تمدن پسند واقع ہوا ہے۔ اس کو اپنی ضروریات زندگی کی تکمیل اور اسباب معیشت فراہم کرنے کے لیے اپنے ابنائے جنس سے انس والفت رکھنا ضروری ہے۔ اکثر وبیشتر حیوان ایک طرح سے جماعتی زندگی بسر کرنے میں انسان کے شریک ہیں لیکن ان کے طرز زندگی اور مشارکت کی ترتیب وکیفیت مختلف وجداگانہ ہے۔

قرآن مجید نے اجتماع انسانی اور اس کے آداب واصول کو اکثر مقامات میں بیان کیا ہے۔ قوموں کی باہمی برتری وشرف کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ"

(سورۃ الحجرات، آیت نمبر 13)

"اے لوگو! بیشک ہم نے تمہیں خاندانوں اور قبیلوں میں منقسم کیا ہے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ یقیناً اللہ کے نزدیک تم میں بہتر وہ ہے جو زیادہ تقویٰ شعار ہے۔"

تعاون اور امداد باہمی کی اس طرح ترغیب دی گئی ہے:

"وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ"
(سورۃ المائدہ، آیت نمبر 2)

"اور بھلائی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی امداد کرو اور گناہ اور زیادتی پر باہمی تعاون نہ کرو۔"

اسی طرح قریبی رشتہ داروں، خاندان والوں اور سسرال کے حالات اور طرز معاشرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی جماعت کے افراد کے درمیان باہمی تعاون وکفالت کو اجتماعی ادب اور اس کی بنیادی حقیقت قرار دیا ہے:

"المومن للمومن کالبنیان یشتد بعضه بعضا"

"ایک مومن دوسرے مومن کے لیے بنیاد کی طرح ہے جس کو ایک دوسرا مضبوط و استوار کرتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرماتا ہے:

"اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ"

"یقیناً تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں پس تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرلو۔"
(سورۃ الحجرات، آیت نمبر 10)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"مثل المومنین فی توادھم وتراحمھم کمثل الجسد اذا اشتکی عضو منه تداعی له سائرہ بالحمی والسھر"

"مسلمانوں کی مثال باہمی اتحاد و مودت اور آپس کی رحمدلی کے لحاظ سے ایک جسم کی طرح ہے کہ اگر اس کا ایک عضو بھی تکلیف میں مبتلا ہو تو سارے جسم کو بخار اور بیداری لاحق ہو جاتی ہے۔"

باب نمبر 10:

اسلام......اصلاح افراد اور اس کے وسائل

۱۔عقائد کے ذریعے افراد کی ظاہری و باطنی اصلاح

آسمانی مذاہب کا مقصد:

دنیا میں جتنے مذاہب اللہ تعالیٰ کی جانب سے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے ان کا مقصد یہی تھا کہ نفوس انسانی میں معرفت الٰہی اور وجود حقیقی کے اعتقاد کی شمع روشن کریں اور ان کو ذات باری تعالیٰ اور اس کی صفات کمالیہ سے حسب طاقت بشری روشناس کرایا جائے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور قدسی تک جتنے انبیاء مبعوث ہوئے ان تمام کا مقصد اولین صرف توحید تھا یعنی سب کے سب اس ایک مقصد پر متفق تھے کہ اللہ ایک ہے وہ جملہ صفات کمال سے متصف' صفات نقصان سے پاک اور وہ علی الاطلاق معبود ہے۔ اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن مجید اور عقیدہ توحید:

قرآن مجید کا دارومدار بھی تمام تر عقائد پر ہے شان توحید کا اس طرح مظاہرہ کیا گیا ہے:

"قل هو الله احد الله الصمد"

(سورۃ اخلاص، آیت نمبر 1)

"کہہ دو کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔"

"وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا"

(سورۃ توبہ، آیت نمبر 31)

"ان کو صرف ایک ہی ذات کی عبادت کا حکم ملا ہے۔"

"وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝"

(سورۂ انبیاء، آیت نمبر 25)

"ہم نے تمہارے پیشتر جس رسول کو بھی بھیجا اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ بلاشبہ میرے سوائے کوئی معبود نہیں اس لئے تم میری ہی پرستش کرو۔"

اسلام اور شرک:

اسلام سے پیشتر حضرت ابراہیم وحضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے عہد سے عربوں میں توحید پائی جاتی تھی' لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ان کی توحید پرستی پر کفر وظلمت اور اصنام پرستی کی گھٹائیں چھا گئیں۔ وہ اس ارشاد الٰہی کے پورے مصداق بن چکے تھے:

"وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ۝"

(سورۂ یوسف، آیت نمبر 106)

"ان میں سے اکثر لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے مگر ساتھ ہی شریک بھی کرتے ہیں۔"

اسلام نے تمام باطل عقائد کو مٹا کر شان توحید کی نئے رنگ میں تجدید کی اور ان تمام فاسد اوہام وخیالات کو نیست ونابود کر دیا جن سے دین خالص کے اصول واحکام تاریکیوں میں پڑ گئے تھے۔ اسلام ہی وہ فطری مذہب ہے جو انسانوں کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

"ان الدین عند اللہ السلام ومن یبتغ غیر السلام دینا فلن یقبل منہ"

(سورۃ آل عمران)

"بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔ جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین تلاش کرلے تو ہرگز مقبول نہ ہوگا۔"

معلوم ہوا کہ توحید ہی دین کی اصل بنیاد اور اسلام کا سب سے بڑا رکن ہے' کیونکہ یہ معرفت الٰہی تک پہنچنے کا راستہ ہے اور اسی پر سعادت کا انحصار ہے۔ قرآن مقدس اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عظمت واہمیت کو بیان فرماتے ہوئے اس کو تمام انواع خیر و بر میں دل کا درجہ عطا کیا ہے' اس کے اصلاح وفساد سے دوسری چیزوں کا کون وفساد وابستہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر مادون ذلک لمن یشاء" (سورۃ النساء)

"بے شک اللہ تعالیٰ اس شخص کی مغفرت نہیں کرتا جو اس کے ساتھ شرک کرے اور اس کے سوا جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔"

اسی حقیقت کا اظہار حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کیا ہے:

"من مات لا یشرک باللہ شیئا دخل الجنۃ"

"جو شخص اس حالت میں وفات پائے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ کرتا ہو تو وہ جنت میں داخل ہو گیا۔"

توحید الٰہی کے چار مظاہر ہیں:

1: ذات واجب تعالیٰ ہی سرچشمہ وجود ہے۔

2: اللہ تعالیٰ ہی نے کائنات ارضی وسماوی کو وجود بخشا ہے۔

3: وہ ایک ہی ذات ہے۔ اس میں مطلق کسی کا شمار نہیں ہو سکتا۔

4: ملک وملکوت کی تدبیر میں تنہا ہے اور اس کو اس میں ہر قسم کا تصرف کرنے کا اختیار و حق حاصل ہے۔ اس کے نافذ کردہ قوانین واحکام میں کسی کو دم مارنے کا یارا اور چوں وچرا کرنیکی گنجائش نہیں۔

عقیدۂ صحیحہ پیدا کرنے کے وسائل:

موجودات، عالم اور انسان: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مقدس میں بے شمار مقامات پر انسانوں کو موجودات عالم میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے تا کہ اس کی توحید وربوبیت' صفات کمال وذات جلال وجمال کے مناظر' اس کی عمومی قدرت کے مظاہر' اس کی کبریائی وجبروت' لطف واحسان' علم وحکمت اور اس کے غضب ورضا کا حال پورے طور پر بندوں پر واضح ہو جائے

انسان کی پیدائش: عجائبات قدرت میں سے ایک انسان ہے، جس کی پیدائش اپنے اندر بے شمار اسرار پوشیدہ کئے ہوئے ہے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیدائش انسان میں غور وخوض کرنے کے بارے میں متعدد بار توجہ دلائی ہے کہ انسان کو سب سے پہلے اپنی تخلیق کی گہرائیوں میں ڈوب جانا چاہیے:

"فلینظر الانسان مما خلق"

(سورۃ الطارق، آیت نمبر 5)

"انسان کو غور کرنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔"

کائنات عالم کا ذرہ ذرہ کتاب قدرت کا ایک روشن باب ہے جو انسانی نفوس کے تاریک گوشوں میں فکر ونظر کی قندیل روشن کر رہا ہے کہ وہ اپنی تخلیق میں غور کریں کہ وہ کس طرح وجود کی روشنی حاصل کرنے سے پیشتر عدم کی تاریکیوں میں خاکی ذات کی شکل وصورت میں حیران وسرگرداں تھے:

"ومن ایاته ان خلقلکم من تراب لم اذاانتم تنتشرون"

(سورۂ روم)

"اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر اب تم زمین میں پھیلے پڑے انسان ہو۔"

دور کیوں جاتے ہو؟ دفتر کائنات کا مطالعہ کرنے سے پہلے اپنے نفسوں کے اوراق کو الٹ کر اور ضمیروں کو ٹٹول کر دیکھو کہ ان کے گوشوں میں کتنے ایسے جہاں کروٹیں لے رہے ہیں اور فطرت کائنات کی کتنی رنگینیاں سمٹ کر آ گئی ہیں:

"وفی انفسکم افلاتبصرون"

(سورۃ ذاریات)

"اور خود تمہارے ہی نفوس کے اندر اس کی نشانیاں ہیں کیا تم نہیں دیکھتے ہو؟"

جو کچھ تم اس بسیط عالم میں ڈھونڈنا چاہتے ہو وہ سب اپنے آئینہ دل میں محسوس کر لو گے، جن عجائبات قدرت کا مظاہرہ تم اس وقت اس عالم میں کر رہے ہو اس کا مشاہدہ

اپنے نفس میں اچھی طرح کر سکتے ہو اور پھر اس کے ذریعہ سے موجودہ مشاہدات عالم اور آثار قدرت کی طرف قدم بڑھا کر دونوں جہانوں کا موازنہ کر سکتے ہو۔

نر و مادہ : ارباب فکر ونظر کے لیے شان رحمت کی اس سے بڑھ کر اور کیا نشانی ہو سکتی ہے کہ قدرت نے دلی سکون اور نفسی طمانیت کے لیے مرد و عورت کا جوڑا پیدا کیا اور دونوں کے دلوں میں عشق و محبت کے جذبات کی موجیں بہا دیں:

"ومن آیاته ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیها وجعل بینکم مودة ورحمة ان فی ذالك لآیات لقوم یتفکرون"

(سورۂ روم)

"اور اس کی نشانیوں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری قسم میں سے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان کے پاس چین پاسکو اور تمہارے درمیان محبت اور مہربانی رکھی، البتہ اس میں غور وفکر کرنے والی قوم کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔"

زبان و رنگ کا امتیاز: "ومن آیاته خلق السموات والارض واختلاف السنتکم والوانکم فی ذالك لآیات للعالمین"

(سورۂ روم)

"اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں کی تبدیلیاں اور ان کا اختلاف ایک فطرت پرست فلسفی اور باریک بین عالم کے قدرتی مطالعہ کے لئے کافی نہیں ہیں۔"

دن و رات کا مختلف ہونا: سکون وراحت کے لیے رات کو سکون پرور آغوش میں خواب نوشیں کے مزے، فکر معاش اور حصول روزگار کے لئے دن کی بیداریاں۔ یہ سب ایک بیدار مغز اور زندہ قوم کے لیے بساط نظر و بصیرت پیش کر رہے ہیں:

"ومن آیاته منامکم باللیل والنهار وابتغاء من فضله ان

فی ذالک لآیات لقوم یسمعون"

(سورۂ روم)

"اور اس کی نشانیوں سے رات اور دن میں تمہارا سونا اور اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ بے شک اس میں سننے والوں کے لیے پتے کی باتیں ہیں۔"

نظام بارش : یہ چمکتی ہوئی بجلیاں جن میں شوخی قدرت کے حسین و دلکش نظارے رقصاں ہیں اور یہ آسمان سے اترتا ہوا پانی، جس سے اجڑی ہوئی کائنات از سرِ نو زندگی اور تروتازگی حاصل کرتی ہے، قدرت کی نشانیوں کو آشکار کرنے اور عقل و شعور رکھنے والے ضمیروں کو بیدار کرنے کے بیش بہا سامان ہیں:

"ومن ایاته یریکم البرق خوفا وطمعا وینزل من السماء ماء فیحی به الارض بعد موتها ان فی ذلك لایات لقوم یعقلون"

(سورۂ روم)

"اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تم کو بجلی ڈر اور اُمید کے لیے دکھاتا ہے اور آسمان سے پانی اتارتا ہے، پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے، اس میں عقل مندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔"

زمین و آسمان اور حکم ربانی: علی الاطلاق اقتدار الٰہی کا ایک اور بین ثبوت یہ ہے کہ آسمان وزمین کی بسیط حکومت جس ہستی کے تفویض ہے اس کی ایک آواز پر باشندگان ارضی لبیک کہتے ہوئے نکلیں گے:

"ومن ایاته ان تقوم السماء والارض بامره ثم اذا دعاكم دعوة من الارض اذاانتم تخرجون"

(سورۂ روم)

"اور اس کی نشانیوں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے کھڑے ہیں، پھر جب تم کو ایک بار پکارے گا زمین میں سے اس وقت تم نکل پڑو گے۔"

انسان کا اپنا نفس و بدن: مذکورہ بالا آیتوں کی طرح قرآن مجید میں اور بے شمار آیات اس قسم کی موجود ہیں جن میں تخلیق انسان اور کائنات عالم میں فکر و نظر صرف کر کے مظاہرہ قدرت اور آثار فطرت کا مطالعہ کرنے کے لئے دل آویز اور دلنشیں پیرایہ میں دعوت دی گئی ہے' کیونکہ انسانی تخلیق پروردگار عالم پر زبردست دلیل ہے اور اس کا قریبی مظہر خود انسان کا نفس ہے۔ اس میں وہ عجائب ہیں جو عظمت خالق پر دلالت کرتے ہیں جن کی بعض گہرائیوں تک پہنچنے کے لیے انسانی عمریں ناکافی ہیں۔

بدن انسانی کے مشمولات اس کے پٹھوں، ہڈیوں، رگوں اور نسوں پر غور کریں کہ کس طرح دست قدرت نے ایک دوسرے کو مضبوطی کے ساتھ باندھ رکھا ہے اور کس طرح ہڈیوں کو گوشت کا لباس پہنا کر ان کو محفوظ کر دیا ہے۔

ہڈیوں کی ترکیب میں حکمت خالق کا کتنا بلیغ ثبوت ہے کہ وہ بدن کے لیے ستون ہیں' پھر ان کی نوعیت' مقدار اور بوقلموں اشکال میں مختلف آثار قدرت پائے جاتے ہیں۔ بعض ہڈیاں چھوٹی اور بڑی ہیں، بعض لمبی اور پست' بعض ٹیڑھی جھکی ہوئی اور گول تو بعض باریک اور کشادہ اور ٹھوس اور جوف دار۔

نظام سر اور اس کی بے شمار ہڈیوں میں غور کریں کہ کس طرح قدرت نے سر کو بدن پر سوار کرایا ہے اور اسے سب سے اونچے مقام پر رکھا ہے اور کس حکمت سے اس کے اندر پانچ محسوس کرنے والی قوتوں (حواس خمسہ یعنی دیکھنا' سننا' سونگھنا، چکھنا اور چھونا) کو پیدا کیا ہے۔ دیکھنے کی قوت (حاسئہ بصارت) کو سب سے مقدم رکھا تاکہ بدن کے لیے دربان اور قاصد بن کر رہے۔ ہر آنکھ میں سات طبقات بنائے' ہر طبقہ سے ایک امتیازی وصف اور مخصوص مقدار اور خاص منفعت وابستہ ہے۔ ان میں سے اگر ایک طبقہ بھی زائل ہو جائے یا ان کی شکل وہیئت میں کچھ بھی تبدیلی رونما ہو جائے تو آنکھ اپنی بصارت کھو بیٹھتی ہے۔ موجد ازلی نے ان سات طبقات کے اندر عدسہ کی مقدار میں پتلی کو مرکوز کیا ہے' جو مشرق و مغرب اور زمین و آسمان کے درمیان کی لامحدود وسعتوں کو دیکھ سکتی ہے۔ جس طرح دل تمام اعضاء کا سرچشمہ ہے' یہ پتلی بھی آنکھ کے لیے بمنزلہ قلب کے ہے' گویا یہ ملکہ ہے اور یہ طبقات پلکیں' پپوٹے سب اس کے خادم' محافظ اور دربان ہیں۔ اگر ان میں سے کسی میں بھی

کمی وبیشی ہو تو سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

فتبارك الله احسن الخالقين

آسمان اور نظارہ قدرت: آسمانوں کی بلندیوں پہنائیوں' ان کی عظمت اور مضبوطی' بنیاد میں قدرت کی کتنی عجیب کاریگری نمایاں ہے' ان کو کس حسن ونزاکت سے بنایا ہے' پھر چاند' سورج اور ستاروں کی گردش' ان کی مختلف شکلوں اور صورتوں کا معائنہ کریں کہ وہ کس طرح مشرق ومغرب کی دور دراز مسافت طے کرتے رہتے ہیں' ان کا ذرہ ذرہ حکمت وعبرت کی دنیا لیے ہوئے نظر آئے گا۔

قرآن مقدس آسمانوں اور زمینوں کے ذکر سے جابجا آراستہ وپیراستہ ہے۔ جو شخص ان کے بار بار دہرائے جانے کے راز کو دریافت کرنا چاہے تو وہ حسب ذیل امور پائے گا:

(1) آسمانوں اور زمینوں کی عظمت ووسعت کی خبر دینا۔

(2) ان کی قسم ارشاد فرمائی ہے۔

(3) ان میں فکر ونظر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

(4) کائنات ارض وسماء کے خالق کی عظمت وقدرت پر استدلال کرنے کے لیے بندوں کو ارشاد فرمایا گیا ہے۔

(5) ربوبیت الٰہی سے واحدانیت کا استدلال کریں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی سرچشمہ ربوبیت وعبودیت ہے اور اس کے سوا دوسری کوئی ہستی معبود نہیں۔

(6) ان کی مضبوطی' حسن کاری اور ان کے اجزاء کے باہم ملاپ اور ربط وضبط سے کمال قدرت اور انتہائی حکمت کا روشن ثبوت۔

غرضیکہ قرآن مجید میں چاند' سورج' ستاروں اور قدرت کے اور بے شمار عجائب موجود ہیں' جن کی گہرائیوں تک انسانی عقول پہنچنے سے درماندہ وعاجز ہیں۔ چنانچہ بے شمار مقامات پر ان کی قسمیں ارشاد فرمائی ہیں۔ مثلاً:

"والسماء ذات البروج"

"قسم ہے برج والے آسمان کی۔"

"والسماء والطارق"

"قسم ہے آسمان کی اور اندھیری رات میں آنے والے کی۔"

"والسماء ومابناها"

"قسم ہے آسمان کی اور جیسا کہ اس کو بنایا۔"

"والسماء ذات الرجع"

"قسم ہے چکر مارنے والے آسمان کی۔"

"والشمس وضحاها"

"قسم ہے سورج کی اور اس کے دھوپ چڑھنے کی۔"

"والنجم اذاهوی"

"قسم ہے تارے کی جب گرے۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کی جو اس کی ربوبیت و وحدانیت کا وجودی نمونہ ہیں' اس لیے قسم ارشاد فرمائی ہے تا کہ اس کے بندے اس سے متعارف ہو جائیں اور اس کی قدرت کا اعتراف کر لیں جو اتنے وسیع ولامحدود آسمانوں کو اپنے قبضہ میں لیے ہوئے ہے اور ان کو اس طرح ثابت و برقرار کر رکھا ہے کہ نہ تو ان کے اوپر کوئی علاقہ ہے اور نہ ان کے نیچے کوئی ستون۔

"اللہ الذی رفع السموات بغیر عمد ترونها"

(سورۃ الرعد)

"اللہ کی ذات وہ ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے اونچا کیا ہے جس کو تم دیکھ رہے ہو۔"

زمین اور اسکی نشانیاں: "والقی فی الارض رواسی ان تمید بکم"

"اور زمین پر پہاڑ رکھ دیئے کہ تم کو لے کر جھک نہ پڑے۔"

"وبث فیها من کل دآبة وانزلنا من السماء ماء فانبتنا فیها من کل زوج کریم"

"اور اس میں ہر طرح کے جانور بکھیر دیئے اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا پھر زمین میں ہر قسم کے خاصے جوڑے اگا دیئے۔"

"ھذا خلق اللہ فارونی ماذا خلق الذین من دونہ بل الظالمون فی ضلال مبین"

"یہ سب کچھ اللہ کا بنایا ہوا ہے۔ اب مجھے دکھلاؤ اس کے سوا اوروں نے جو بنایا ہے۔ کچھ نہیں بلکہ بے انصاف صریح بھٹک رہے ہیں۔"

قدرت کی ان روشن نشانیوں میں قوموں کی زندگی وموت اور بقا وزوال کا راز مضمر ہے:

"لیھلك من ھلك عن بینة ویحیا من حی عن بینة وان اللہ سمیع علیم"

(سورۃ الانفال)

"تا کہ ہلاک ہو جس کو ہلاک ہونا ہے قیام حجت کے بعد اور جیے جس کو جینا ہے قیام حجت کے بعد اور بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

عالم..... انسان کا گھر: قرآن حکیم نے کائنات عالم میں غور وخوض کرنے کی دعوت دی ہے کہ یہ عالم کس ترتیب اور حسن نظام سے بنایا گیا ہے۔ اس وسیع کارخانے کے اجزا وعناصر کیوں کر ایک دوسرے سے مربوط ہیں' اگر انسان ان تمام حقائق میں فکر ونظر کرے تو خلاق عالم کی کمال قدرت وحکمت اور اس کی حسن لطافت وتدبیر کا بلیغ ثبوت مل جائے۔ قدرت نے نہ صرف اس عالم کو بنایا بلکہ انسان کے لیے اس کو ایک گھر کی صورت میں پیدا کر دیا' جس میں زندگی کی تمام ضروریات اور ساز وسامان کو فراہم کر دیا ہے۔

چنانچہ آسمان ایک بلند چھت ہے' زمین فرش اور باشندوں کے لیے رہائش گاہ ہے۔ آفتاب ومہتاب دو روشن چراغ ہیں جو اس میں روشنی پھیلاتے رہتے ہیں۔ ستارے زینت بخش قمقمے ہیں جو اس گھر کے راستہ چلنے والوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ جواہر اور کانیں اس کے اندر بطور ذخیرہ وسرمایہ کے پوشیدہ رکھے گئے ہیں۔ یہاں ہر چیز حسب حال فراہم کر دی گئی ہے۔ مختلف قسم کی نباتات پیدا کی گئی ہیں' ہر طرح کے جانور اپنے اپنے کام انجام دینے میں مصروف ہیں۔ جن سے سواری' غذا' دودھ' لباس اور مختلف فائدے حاصل کئے جاتے

ہیں۔ انسان کو ان تمام چیزوں کا مالک بنایا گیا ہے۔ وہ کائنات پر حکمرانی کرتا اور ان اشیاء میں اپنے حسب منشاء تصرف کرتا ہے۔

یہ تمام مظاہر اس امر پر برہان ہیں کہ اس عالم کو کسی زبردست قادر و برتر ہستی نے پیدا کیا ہے، جس کی تشکیل و نظام کا معیار سب سے اونچا ہے۔

دست قدرت کا عظیم شاہکار: انسان دست قدرت کا ایک عجیب و غریب شاہکار ہے جس کا پیکر قدرتی نقش و نگار کا روشن نمونہ ہے۔ یہ درمیانی قدوقامت، حسین و جمیل خط و خال جو حسن کاری کا آئینہ ہیں، یہ بہترین شکل و صورت جو پیکر انسانی کو پہنائی گئی ہے، علم و عرفان کی شمع جو عقل و ضمیر میں روشن کی گئی ہے اور اخلاق حسنہ اور علوم و معارف کو حاصل کرنے کے لیے جو بے نظیر فکر و نظر کا مادہ ودیعت کیا گیا ہے، کیا یہ تمام چیزیں موجد ازلی کی صناعی و حسن کاری کی آئینہ دار نہیں ہیں؟ کیا یہ سب وجود خالق پر بین شہادت پیش نہیں کر رہے ہیں۔؟

انسان کو عقل و شعور، حسن صورت اور حسن فکر و نظر سے سرفراز کر کے یونہی نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ اس کے اندر تسخیر عالم کی کشش رکھی گئی ہے۔

انسانی خادم...... نظام عالم: ساری چیزیں انسان کی خدمت گزار، اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کی تکمیل میں کوشاں ہیں' آسمان مطیع و منقاد ہو کر انسانی مصلحتوں کے محور پر گردش کر رہا ہے۔ چاند' سورج' ستارے تسخیری قلادہ پہنے ہوئے اپنے مقررہ حدود و اوقات پر چکر کاٹتے ہیں' کائنات جوی' ہوا، بادل' برق و باراں اور عالم ارضی کی تمام موجودات' زمین' پہاڑ' سمندر' نہریں درخت' پھل پھول' نبات و حیوان سب کے سب انسانی اعراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے مسخر کر دیئے گئے ہیں:

"ولتجری الفلك فیه بامره ولتبتغوا من فضله لعلكم تشكرون وسخر لكم مافی السموات والارض جمیعا منه ۔ ان فی ذلك لایات لقوم یتفكرون"

(سورۂ جاثیہ)

"اور تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتی چلے اور تاکہ تم اس کے فضل سے تلاش

کرو تاکہ شکر گزار ہو جاؤ اور تمہارے لئے آسمان اور زمین کی تمام چیزوں کو مسخر کر دیا۔ اس میں سوچنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔"

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

"اللہ الذی خلق السموات والارض وانزل من السماء ماء فاخرج بہ من الثمرات رزقا لکم وسخر لکم الفلک لتجری فی البحر بامرہ وسخر لکم الانھار وسخر لکم الشمس والقمر دائبین وسخر لکم اللیل والنھار واتاکم من کل ماسالتموہ وان تعدوا نعمۃ اللہ لاتحصوھا ان الانسان لظلوم کفار"

(سورۂ ابراہیم)

"اللہ وہ ہے جس نے آسمان اور زمین بنائے اور آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعہ پھلوں میں سے تمہاری روزی نکالی اور تمہارے لئے کشتی کو مسخر کر دیا تاکہ وہ اس کے حکم سے دریا میں چلے اور مسخر کر دیا تمہارے لئے ندیوں کو اور مسخر کر دیا تمہارے لئے سورج اور چاند کو دستور کے برابر اور مسخر کر دیا تمہارے لئے رات اور دن کو اور تم کو تمہاری خواہش کی تمام چیزیں دیں اور اگر اللہ کے احسان کو شمار کرو گے تو پورا نہ کر سکو گے۔ بے شک انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔"

مشاہدے کی دولت: قرآن مجید کی یہ اور اسی قسم کی دوسری آیات سے پتہ چلتا ہے کہ جو شخص آثار و مظاہر قدرت میں غور و فکر کرتا ہے وہ اپنا دامنِ ایمان مشاہدہ کی دولت سے بھر لیتا ہے۔ بخلاف اس کے وہ شخص کتنا بدقسمت ہے جو اپنی عادت وطبیعت کی سرحد سے باہر قدم نہ اٹھائے اور اپنے ابنائے جنس کی زندگی پر راضی ہو کر خود کو ان میں ایک فرد شمار کر بیٹھے اور نسلی وخاندانی الجھنوں میں پھنس جائے۔ اس کو یہ بھی خبر نہ ہو کہ دنیا میں عزت کی زندگی بسر کرنے کا حق اسی شخص کو حاصل ہے جو کٹھن منزلوں اور دشوار گزار راستوں

کو طے کرکے آفاق کی سیر و سیاحت کرتا ہے اور توحید الٰہی، اس کی صفات کمال، جلال وجبروت اور کائنات میں فطرت کے بے شمار مظاہر و مشاہدات کا مطالعہ کرتا ہے۔ بعثت انبیاء کے مقصد، جزا وسزا کے مسئلہ پر غور اور اپنے ایمان وعقیدہ میں درستگی واستقامت پیدا کرتا ہے۔ اس کے سامنے یہ امر روشن ہو جاتا ہے کہ یہ تمام چیزیں انسانی فطرت میں پیدا کردی گئی ہیں۔ اگر انسانی فطرت اس مرکز سے ہٹ جائے جس پر اس کو قائم رہنا چاہئے تھا اور توحید الٰہی اور صفات باری تعالیٰ کا انکار کر بیٹھے تو پروردگار عالم انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیج کر گمراہ انسانوں کو راہ راست پر لاتا ہے اور ان کو اپنی فطرت سلیمہ کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتا ہے۔

الحاصل قرآن مجید نے اصلاح عقیدہ کے باب میں مکمل وجامع تعلیمات پیش کی ہیں۔ اگر دنیا کے تمام عقلمند اور روشن ضمیر اصحاب مل کر اس بارے میں کچھ سوچتے تو اس سے بہتر یا اس کے مماثل اصول ہرگز پیش نہ کرسکتے۔ اس سے بڑھ کر شان وحدانیت اور کمال الوہیت کی اور کون سی روشن اور واضح دلیل مل سکتی ہے۔؟

چند قرآنی آئین و اصول : قرآن عزیز کے پیرایہ بیان سے یہ امر پائے ثبوت وتحقیق کو پہنچتا ہے کہ قدرت نے انسانی فطرت کے اندر وہ تمام صفات پیدا کردی ہیں جو زندگی میں ہر وقت تمام اشخاص کو پیش آیا کرتی ہیں جن پر کاربند ہو کر انسان انسانیت کے مقام بلند تک پہنچ سکتے ہیں۔ وہ آئین واصول جن سے فطرت انسانی عبارت ہے یہ ہیں: عدل ومحبت، سچائی، نیکی، بھلائی، ایفائے عہد، مخلوق کی خیر خواہی، مسکینوں کے ساتھ رحم وکرم، حاجت مندوں کی دست گیری، مظلوموں کی امداد، دردمندوں کی غم خواری، امانتوں کی ادائیگی، اچھائی کا بدلہ اچھائی سے دینا، برائی سے درگزر، مصیبتوں میں صبر وتحمل، انتقام لینے کی جگہ انتقام، وقار وطمانیت، نرمی ورحم دلی، حسن اخلاق، باہمی محبت، رشتہ داروں اور اجنبیوں سے نیک سلوک، کسی کے عیب کی پردہ پوشی، ضرورت کے وقت ایثار، مصیبتوں میں اوروں کے کام آنا، ہر قسم کی نیکی اور بھلائی پر تعاون، ہمت واستقلال، اظہار حق پر ثابت قدم رہنا، لوگوں کی اصلاح کرنا، دو کشیدہ خاطر انسانوں کے درمیان مصالحت پیدا کرانے کی کوشش، بزرگوں کی تعظیم، لوگوں کے مراتب کا پاس لحاظ، ہر شخص کے حقوق کی نگہداشت،

گمراہوں کو راہ راست پر لانا' جہالت کی تاریکیوں کا علم کی روشنی سے بدلنا' حق کا شکرو احسان بجالانا غرضیکہ یہ اور اس قسم کی دوسری صفات سے انسانی فطرت آراستہ و پیراستہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فطرت کو ان اشیاء کے مخالف و متضاد امور سے بھی روشناس کرایا گیا ہے' پھر انہی فطری چیزوں کو سمجھانے' بھلائیوں کا حکم کرنے اور برائیوں سے روکنے کے لیے انبیائے کرام تشریف لائے۔ اس لحاظ سے شریعت کے جتنے احکام اور تعلیمات ہیں وہ تمام کے تمام فطرت کے عین مطابق ہیں۔ چنانچہ مذہب سے اپنی تعلیمات و احکام پر فطرت کو گواہ ٹھہرا کر دنیا کے انسانوں کو ایمان و عمل صالح' فوز و فلاح اور سعادت و نجات کی طرف دعوت دی اور اپنی روشن نشانیوں سے کفر و ضلالت کے تاریک و کثیف پردوں کو چاک کر دیا اور عقل و فطرت دونوں کی ہم آہنگی کے ساتھ شرعی تعلیمات و احکام کے فطری آئین و اصول کے مطابق ہونے کی شہادت دی:

"فطرة الله التی فطر الناس علیها لا تبدیل لخلق الله ذلك الدین القیم ولكن اكثر الناس لا یعلمون"

"وہی تراش اللہ کی جس پر لوگوں کو تراشا' اللہ کے بنائے ہوئے کو بدلنا نہیں' یہی ہے سیدھا دین لیکن اکثر لوگ سمجھے نہیں۔"

قرآن اور انسان : اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے کہ انسانی عقول نے قرآنی محاسن کا ادراک کیا، اس کے افضل و اعلیٰ ہونے پر گواہی دی اور اس بات کا اعتراف کر لیا کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر بہتر و جامع اور مکمل دین کسی نے پیش نہیں کیا۔ اس لحاظ سے وہ خود اپنے آپ پر گواہ اور گواہی دیئے جانے کے قابل ہے۔ خود ہی دلیل اور خود ہی دعویٰ و برہان ہے۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر کوئی برہان بھی پیش نہ فرماتے تو خود ان کی ذات اس امر پر دلیل و برہان تھی کہ وہ منجانب اللہ ہے۔ یہ ایک نعمت عظمیٰ اور برہان کبریٰ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر اتاری ہے۔ اس سے بڑھ کر بڑی نعمت اور روشن ہدایت اور کون سی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو راہ راست دکھایا اور اپنی رحمت کا سایہ ان کے سر پہ رکھا:

"لقد من الله علی المومنین اذ بعث فیهم رسولا من

انفسھم یتلوا علیھم ایاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین"

(سورۃ المائدہ)

"اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں ان ہی سے رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا اور ان کو شرک وغیرہ سے پاک کرتا اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، وہ تو پہلے سے صریح گمراہی میں تھے۔"

دین کامل: "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورحیت لکم الاسلام دینا"

(سورۃ المائدہ)

"آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے مذہب اسلام پسند کیا۔"

اہل بصیرت کی فضیلت: دین کو سمجھنے اور اس کو قبول کرنے کے لئے اہل بصیرت کی ضرورت ہے جن کی نگاہیں اس سرچشمہ نور کا مشاہدہ کرتی ہیں، یہاں سے ان کے دلوں پر انوار و تجلیات کا فیضان ہوتا ہے جن کے ذریعہ سے ان کے نفوس یقین و مشاہدہ کی اس مقدس سرزمین میں پہنچ جاتے ہیں جو کہ دینی کمالات و محاسن کا مرکز ہے۔

یہی فرق ہے ان ارباب بصیرت اور اس گروہ کے درمیان جس کی توصیف حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ وہ ہر گمراہ پیش رو کے پیرو ہیں، ہر چیخنے والے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، یہ علم کی روشنی سے کوسوں دور ہو گئے اور ان کو کوئی مستحکم مرکز نہ ملا۔

یہی امتیازی فرق ہے اہل ایمان اور باطل پرست طبقہ کے درمیان جس نے ایمان افروز بصیرت کو اپنے اوپر حرام کر لیا۔ وہ کبھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو گھٹا ٹوپ تاریکی، بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے سوا اور کوئی چیز نہیں پاتے۔ ان کی نگاہیں رحمت الٰہی اور حیات ابدی کی سرحد کو عبور کر کے قدرت کے سربستہ رازوں کو معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتیں۔

لیکن وہ ہستیاں جو اسلامی شان و عظمت کو بلند مقام تک پہنچانا چاہتی ہیں اور اعلاء کلمۃ

اللہ کی خاطر اپنی زندگی کی پرواہ نہیں کرتیں، عقل وبصیرت کے جگمگاتے ہوئے ستارے اور ہمت وعزیمت کی مضبوط چٹانیں ہیں۔ جن کے دل انوار الٰہی کی جلوہ گاہ، جن کے مقدس نفوس میں خلاق عالم کی صفات کی شمع روشن اور جن کی نگاہوں میں بارگاہ قدس کے تمام مظاہر قدرت نمایاں ہیں۔

تبدیلئ کائنات: ان ہی اہل عرفان وبصیرت نے کائنات کے تغیر وتبدیل کے اندر قانون قدرت کا مشاہدہ کیا تو ان کی نظریں اس معادی مسئلہ کے امکان اور شرونشر کے اس بنیادی نظریہ کی گہرائی تک پہنچ گئیں جس کو انبیائے کرام نے پیش کیا ہے۔ ان پر یہ امر اچھی طرح واضح ہوگیا کہ قرآن وسنت محض اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ عالم سرے سے تباہ نہیں ہوگا بلکہ اس کے اندر تغیر وتبدل واقع ہو جائے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن وسنت نے جو یہ کہا ہے کہ تبدیل کائنات کے بعد جو آسمان وزمین ہوں گے وہ موجودہ آسمان وزمین سے بالکل جداگانہ ہوں گے، آسمان شق ہوگا، سورج اپنی اصلی حالت میں لوٹ جائے گا، ستارے منتشر ہو جائیں گے دریا پھٹ پڑیں گے، قبروں سے مردے اٹھائے جائیں گے پہاڑوں کو روئی کی طرح پرزے پرزے کر دیا جائے گا، زمین پھیل جائے گی اور آفتاب لوگوں کے سروں کے قریب آجائے گا، گویا کہ یہ تمام امور وہ ہیں جن میں نہ اعتراض کی گنجائش ہے اور نہ شک وشبہ کا مقام۔

کیا قرآن مجید اس کی خبر نہیں دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کرے گا اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ انسانی اعضاء اور ان کا گوشت پوست کہاں کہاں زمین میں بکھرا پڑا ہے اور کتنا کم ہوگیا ہے، پھر ان کو جمع کرکے دوبارہ از سر نو زندگی بخش دے گا، لیکن کتاب وسنت سے اس بات کا کہیں پتہ نہیں چلتا کہ اللہ تعالیٰ روحوں کو ایک دم فنا کرکے پھر ان کی جدید تخلیق کرے گا یا یہ کہ وہ آسمانوں اور زمین کو سرے سے نیست ونابود کرکے پھر نئے طور پر ان کو وجود بخشے گا بلکہ قرآن وسنت کی روشنی میں صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ آسمان وزمین کو بدل دیا جائے گا، ان کی شکل وصورت اور ہیئت ایسی نہ رہے گی جو موجودہ ہے۔ کیا کوئی علمی تحقیق وتفتیش اس کا انکار کرنے کی جرأت کرسکتی ہے؟

حقیقت تبدیلئ کائنات اور انسانیت کے دو گروہ: اتنی

بات ضرور ہے کہ قرآنی بیانات اور آثار سنت اس کی حقیقت کے اظہار میں خاموش ہیں۔ اسی وجہ سے اس کی حقیقت اور اصل حالت پردۂ اخفا میں چلی گئی۔ مختلف لوگوں نے اس کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کی، اہل عقل و تجربہ نے اس حقیقت پر سے پوشیدہ پردے اٹھانے میں جاں فشانی سے کام لیا لیکن سب بے سود ثابت ہو کر رہ گئے، بلکہ اس راہ کے سالک جس قدر اس کٹھن منزل میں قدم آگے بڑھانے کی کوشش کرتے رہے، اسی قدر ان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور وہ علم کی روشنی کے بجائے جہل کی تاریکیوں میں گھر گئے۔ اس کا اصل سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے ناواقفیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے روگردانی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔؟ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن کی ہوئی شمع کی روشنی میں کسی مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کریں تو منزل مقصود تک آسانی سے رسائی ہو سکتی ہے اور تمام مشکلات اور پیچیدگیوں سے نجات پانے کی یہی واحد صورت ہے لیکن جو لوگ آسان اور سیدھے راستہ کو چھوڑ کر خاردار وادی میں قدم رکھنا چاہتے ہیں تو ان کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ رب العزت نے ایسے ہی اصحاب کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے:

"وقالوا لو كنا نسمع او نعقل ما كنا فى اصحاب السعير" (سورۂ ملک)

"اور کہیں گے اگر ہم سنتے یا سمجھتے ہوتے تو دوزخ والوں میں سے نہ ہوتے۔"

۲۔ عبادات کے ذریعے افراد کی ظاہری وباطنی اصلاح

اشرف المخلوقات:

مبداء فیاض کی جانب سے انسان کو عقل و شعور کی بے بہا قوت عطا ہوئی ہے، جس کے ذریعہ سے اس کو تمام مخلوقات پر برتری و شرف حاصل ہے۔ انسان اسی خاصہ کی وجہ سے دیگر حیوانات و جمادات سے ممیز اور عبادت الٰہی کا مکلف قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے:

"ہم نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر امانت پیش کی، انہوں نے اس کو

اٹھانے سے انکار کر دیا' اور اس سے ڈر گئے اور اس کو انسان نے اٹھا لیا' بے شک وہ بے ترس اور نادان تھا تا کہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو عذاب کرے اور اللہ ایمان دار مردوں اور عورتوں کو معاف کرے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

(سورۂ احزاب)

اس آیت میں مفسرین کے قول کے مطابق امانت سے مراد تکلیف کا قلادہ انسان کے گلے میں پہنانا اور اطاعت و معصیت کے نتیجہ میں ثواب وعذاب کا مرتب کرنا ہے۔ انسان کی فطرت میں امانت کے اس بار گراں کو اٹھانے کی قابلیت و استعداد پائی جاتی تھی اس لئے اس کو یہ تکلیف دی گئی اور چونکہ زمین و آسمان اور پہاڑوں میں اس بار امانت کے برداشت کرنے کی قوت و تاب اور قابلیت و صلاحیت نہیں تھی' اس لیے ان کو معذور رکھا گیا اور ان کے کندھوں پر یہ بھاری بوجھ نہیں ڈالا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: "انہ کان ظلوما جھولا" (بے شک وہ ظالم و جاہل تھا) انسانی فطرت پر ایک بلیغ استدلال ہے۔ کیوں کہ ظالم وہی ہے جو عدل و انصاف نہ کرے جبکہ اس کے اندر عالم ہونے کی قوت و صلاحیت پائی جاتی ہو' یہی حال انسان کا بھی ہے۔ اس کے علاوہ دو قسمیں ہیں۔ پہلا گروہ وہ ہے جو سراپا عالم و عادل ہو' جس میں جہل و ظلم کا ادنیٰ شائبہ تک نہ پایا جائے۔ یہ فرشتوں کا گروہ ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جس میں سرے سے علم و عدل نہ پایا جائے اور نہ اس میں اس کی استعداد ہو جیسے حیوانات' جمادات۔

انسان کی قوت فکر کا صحیح مصرف:

جب انسان تمام مخلوقات میں سے انتخاب کر لیا گیا ہے اور اس کو عقل و بصیرت کی روشنی عطا کی گئی ہے جس کے ذریعہ سے وہ بہیمیت کے تاریک غاروں میں ٹھوکریں کھانے سے محفوظ رہ سکے تو آسمان و زمین کی عجیب و غریب چیزوں میں غور و فکر کرنے کا انسان ہی کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ کارخانہ قدرت کے عجائب میں اپنی قوت فکر و نظر خرچ کرے' کائنات کی تمام چیزوں' آسمانوں' ستاروں' چاند' سورج' حیوانات' نباتات اور ان کے پوشیدہ اسرار معلوم کر کے اپنی زندگی میں ان سے کام لے۔ جیسا کہ ان آیات جلیلہ سے واضح ہوتا ہے:

"اللہ الذی خلق السموات والارض وانزل من السماء ماء فاخرج به من الثمرات رزقا لکم وسخر لکم الفلك لتجری فی البحر بامره وسخر لکم الانهار وسخر لکم الشمس والقمر دائبین وسخر لکم اللیل والنهار اتاکم کل ما سالتموه وان تعدوا نعمة اللہ لاتحصوها"

(سورۂ ابراہیم)

"اللہ کی ذات وہ ہے جس نے آسمان اور زمین بنائے اور آسمان سے پانی اتارا' پھر اس کے ذریعہ سے تمہارے لیے پھلوں میں سے روزی نکالی اور تمہارے لئے کشتی کو مسخر کردیا تاکہ وہ اس کے حکم سے دریا میں چلے اور تمہارے لئے ندیوں کو مسخر کردیا اور مسخر کردیا تمہارے لئے چاند اور سورج کو دستور کے مطابق اور مسخر کردیا تمہارے لئے رات اور دن کو اور تم کو تمہاری خواہش کی ساری چیزیں دیں اور اگر اللہ کے احسان کو شمار کرنا چاہو تو پورا نہ کر سکو گے۔"

احکام وحدود:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس وسیع کائنات کا حکمران بنا کر اس پر اپنے احکام وحدود کی پابندیاں عائد کردیں' اپنے احسانات کا شکر' حقوق اللہ وحقوق العباد کی نگہداشت اور خدائے واحد ہی کی پرستش کرنے کو واجب قرار دیا۔ اسی بات کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس بلیغ انداز میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو مخاطب فرمایا ہے:

"یامعاذ هل تدری ماحق اللہ علی عباده وماحق العباد علی اللہ' قال معاذ اللہ ورسوله اعلم' قال فان حق اللہ علی عباده ان یعبدوه ولا یشرکوا به شیئا وحق العباد علی اللہ الا یعذب من لا یشرك به شیئا"

"اے معاذ! کیا تجھے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حق اپنے بندوں پر اور بندوں کا

حق اللہ پر کیا ہے۔؟" حضرت معاذ نے جواب دیا: "اللہ اور اس کا رسول ہی خوب جانتے ہیں۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ کا حق اپنے بندوں پر یہ ہے کہ وہ اسی کی پرستش کریں' اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں اور بندوں کا حق اللہ پر یہ ہے کہ جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا وہ اسے عذاب نہ دے۔"

اہمیت عبادت:

اللہ تعالیٰ نے عبادت کو دین اسلام کا جزو اعظم ٹھہرایا ہے اور عبادت کو ظاہری و باطنی ذرائع کے لیے حسن و جمال کا غازہ' تہذیب اخلاق و عادات اور اصلاح حالات کا وسیلہ قرار دیا ہے، طہارت و پاکیزگی بھی عبادت کا اہم ترین حصہ ہے۔ اس موضوع کو درج ذیل عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے:

1: استنجاء۔ 2: وضو و غسل۔

3: نماز۔ 4 روزہ۔

استنجاء:

اسلام میں "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ" کا حکم ہے یعنی خود کو اللہ تعالیٰ جیسی اخلاقیات سے مزین کرو۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات برتر اور نہایت پاک ہے۔ اس کی ذات ہر قسم کی برائی کی آلودگی سے پاک ہے۔ اسی لیے مشہور ہے کہ صفائی میں خدائی جلوے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے۔ اس کی صفات پاکیزہ اور محمود ہیں۔ وہ حمید و مجید ہے۔ تو حکم ہے کہ اے مسلمانو! مخلوق ہوتے ہوئے تمہارے لیے جہاں تک ممکن ہے تم بھی اخلاقیات اور اوصاف الٰہیہ کو اپنی ذات میں راسخ کرو۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ واضح ہوا کہ ایک حقیقی اور باعمل مسلمان کی زندگی ہر لحاظ سے پاک، صاف اور برائی کے ہر جراثیم سے محفوظ ہوتی ہے۔ وہ ہر قسم کی ظاہری و باطنی آلودگی سے پاک اور صاف ہوتا ہے۔ اسے حکم ہے کہ وہ حسد و بغض نہ رکھے۔ چوری ڈاکہ زنی نہ کرے۔ گالی گلوچ نہ کرے۔ ہمیشہ سچ بولے اور جھوٹ سے محفوظ رہے۔ ریاکاری

سے بچے، فریب اور دھوکا دہی ہر گز نہ کرے۔ اپنے کردار و گفتار کی خوبی میں ہر مسلمان اپنی مثال آپ ہو۔ دوسرے لوگوں کو ہر گز تنگ نہ کرے اور نہ کوئی نقصان پہنچائے۔ بلکہ ہر وقت دوسروں کی مدد اور رہنمائی کے لیے کمر بستہ رہے۔ کمزور کی مدد کرے، پڑوسیوں سے بہتر سلوک کرے اور دوسروں کے حقوق کو مجروح نہ کرے۔

ارشادِ مصطفیٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا:

"اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ"

"حقیقی اور کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔"

ایک اور ارشاد عالی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے بھی وہی کچھ نہ چاہے جس کی وہ خود اپنی ذات کے لیے خواہش کرتا ہے۔"

(الصحیح البخاری، باب من الایمان ان یحب لاخیہ، رقم 13)

ہر مسلمان کے لیے حکم ہے کہ حلال کھائے، حرام سے بچے، اپنے خیالات کو پاک وصاف رکھے، جسم کو پاک رکھے، لباس کو صاف رکھے اور اپنے کلام و کردار کی صفائی پیش کرے کہ بات میں جھوٹ نہ بولے اور کردار کو صاف رکھے۔ گویا کہ یوں محسوس ہو کہ ہر مسلمان مکمل طور پر ظاہری اور باطنی صفائی کا مجسمہ ہے۔

اسلامی تعلیمات و عبادات میں نماز کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ نماز ادا کرنے کے لیے شرط ہے کہ آدمی کا جسم پاک وصاف ہو، اسکا لباس صاف ستھرا ہو اور وہ باوضو ہو۔

نماز سے پہلے ہر قسم کی جسمانی طہارت ضروری ہے اسی لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ"

(الصحیح المسلم، جلد نمبر 1، عربی صفحہ 118)(مشکوۃ المصابیح، عربی صفحہ نمبر 38)

"طہارت ایمان کا حصہ ہے۔"

ایک اور جگہ فرمایا:

"اَلطُّهُوْرُ نِصْفُ الْاِیْمَانِ"

(سنن ترمذی، عربی صفحہ 190)

"طہارت نصف ایمان ہے۔"

اس سے واضح ہوا کہ ایک مسلمان کے لیے اپنے ایمان کے حصے کو ہر وقت اپنے پاس رکھنا چاہیے۔ یعنی اسے ہر وقت پاکیزگی اپنانی چاہیے۔ اسلام نے ظاہری و باطنی طہارت کا ایسا سبق دیا کہ غیر مسلموں کے رہبر و رہنما بھی یہ بات ماننے پر مجبور ہو گئے کہ اسلام جیسی تطہیر اور کوئی دین و مذہب نہیں سکھاتا۔

چنانچہ "ڈاکٹر رابرٹ سمتھ" مشہور سرجن مسلمہ ماہر سرجری لکھتا ہے:

"ہم نے تطہیر کا عمل اسلام سے سیکھا ہے۔"

سب سے بڑی گندگی وہ ہے جو انسان کے جسم سے پاخانے اور پیشاب کی صورت میں خارج ہوتی ہے۔ اسلام نے اس کے خروج کے بعد اچھی طرح استنجا کرنے کا حکم دیا۔

چنانچہ حکم ہے کہ اگر انسان کو پیشاب یا پاخانہ کی حاجت ہے تو سب سے پہلے اس حاجت ضروریہ سے فارغ ہو جائے پھر طہارت یعنی استنجا کرے۔ پہلے اچھی طرح مٹی کے ڈھیلوں سے صفائی کرے اور پھر دوبارہ پانی سے اچھی طرح صفائی کرے یا پھر پانی پر ہی اکتفا کرے۔

صفائی کرتے ہوئے بائیں ہاتھ کو استعمال کیا جائے۔ پاخانہ یا پیشاب کرتے وقت نہ قبلہ کی طرف پیٹھ کی جائے اور نہ ہی منہ، چاہے میدان ہو یا گھر۔ اگر کبھی بھول کر ایسا کر لیا تو یاد آنے پر فوراً رخ بدل لے۔ پیشاب یا پاخانہ کرتے وقت ننگے سر نہ جائے اور نہ ہی ہوا کے رُخ پیشاب کرے۔

پیشاب اور پاخانہ کو جاتے وقت مستحب ہے کہ باتھ روم میں داخل ہونے سے پہلے یہ دعا پڑھے:

"بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ"

(الصحیح البخاری، جلد نمبر 1، عربی صفحہ 45) (الصحیح المسلم، جلد نمبر 1، عربی صفحہ 283) (فتح الباری، جلد نمبر 1، عربی صفحہ نمبر 244)

"اللہ کے نام سے، اے اللہ! بیشک میں خبیث جنوں اور خبیث جنیوں سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔"

پھر پاخانہ کرنے والا بایاں پاؤں اندر رکھے۔ جب بیٹھنے کے قریب ہو تو کپڑا بدن سے ہٹائے اور ضرورت سے زیادہ بدن نہ کھولے۔ پھر پاؤں کشادہ کرکے بائیں پاؤں پر زور دے کر بیٹھے اور خاموشی سے سر جھکائے فراغت حاصل کرے۔ جب فارغ ہو جائے تو مرد بائیں ہاتھ سے اپنے آلۂ تناسل کو جڑ کی طرف سے سرے کی طرف سونتے تاکہ جو قطرے رُکے ہوں وہ نکل جائیں۔ پھر پانی، ڈھیلوں یا پھر یکے بعد دیگرے دونوں سے طہارت حاصل کرے۔ یوں کہ پہلے تین ڈھیلوں سے طہارت کرے اور پھر پانی سے یا پھر فقط پانی سے ہی طہارت حاصل کرلے۔

داہنے ہاتھ سے پانی بہائے اور بائیں ہاتھ سے دھوئے اور پانی کا لوٹا اونچا نہ رکھے تاکہ چھینٹیں نہ پڑیں۔ پہلے پیشاب کا مقام دھوئے، پھر پاخانہ کا مقام، پاخانہ کا مقام دھوتے وقت سانس کا زور نیچے کو دے کر ڈھیلا رکھے اور پھر خوب اچھی طرح دھوئے یہاں تک کہ دھونے کے بعد ہاتھ میں بو باقی نہ رہے۔ پھر کسی پاک کپڑے سے پونچھ لے اور اگر کپڑا نہ ہو تو بار بار ہاتھ سے پونچھے کہ برائے نام تری رہ جائے اور اگر وسوسہ کا غلبہ ہو تو رومالی پر پانی چھڑک لے۔ اس بات کا خیال رکھے کہ کھڑے ہونے سے پہلے بدن چھپالے، پھر تہبند درست کرلے اور باہر آجائے۔ نکلتے وقت پہلے داہنا پاؤں باہر نکالے اور باہر نکل کر یہ دعا پڑھے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنِّیْ مَا یُؤْذِیْنِیْ وَاَمْسَكَ عَلَیَّ مَا یَنْفَعُنِیْ"

"اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے جس نے مجھ سے اس چیز کو دور فرمادیا جو مجھے نقصان پہنچا سکتی تھی اور اس چیز کو میرے قریب کردیا جو مجھے نفع دیتی ہے۔"

باتھ روم سے باہر نکلنے کے بعد ایک اور دعا بھی احادیث میں مرقوم ہے وہ یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فراغت حاصل کرتے تو اس جگہ سے جدا ہو کر کہتے:

"غُفْرَانَكَ"

(اے اللہ! میں تیری) ''بخشش کا طلب گار ہوں۔''

(زادالمعاد، جلد نمبر 2، عربی صفحہ نمبر 387)

استنجا پانی یا ڈھیلوں سے یا پھر یکے بعد دیگرے دونوں سے کرنا چاہیے۔ ہڈی اور گوبر وغیرہ سے استنجاء منع ہے کیونکہ اس کے بہت سے نقصانات ہیں جو عنقریب انشاء اللہ! بیان ہوں گے۔

قضائے حاجت انسان کی طبعی ضروریات میں سے ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ایک عمل میں نسلِ انسانی کو تحفظ اور سہولت عطا فرمائی۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو دیکھا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قدم قدم پر عافیت اور حفاظت دے گی۔

آج دنیا پھر سے انہیں طریقوں پر واپس آ رہی ہے جس طریقے سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں زندگی گزارنے کا حکم فرمایا اور جس طریقہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود زندگی گزاری۔ استنجا کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے سائنسی وطبی چیدہ چیدہ فوائد پیش کیے جاتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کے لیے بہت دور تشریف لے جاتے تھے۔ قضائے حاجت کے لیے چل کر دور جانا بہت زیادہ بہتر ہے۔ سائنس اور طب کی رو سے چند حقائق ملاحظہ فرمائیں۔

اس وقت جدید سائنس زیادہ چلنے پر زور دے رہی ہے، حتیٰ کہ امریکہ کے بڑے بڑے ہسپتالوں میں یہ بات نمایاں لکھی ہوئی ہے:

''پاؤں پہلے پیدا ہوا یا پہیہ۔؟''

ظاہر ہے کہ پاؤں پہلے پیدا ہوا، اس معقولے کا مقصد قوم کو زیادہ سے زیادہ پیدل چلنے کی طرف دعوت دینا ہے۔

بائیو کیمسٹری کے ایک ماہر نے نکتے کی بات کہی۔ وہ کہتے ہیں:

''جب سے شہر پھیلنے لگے ہیں، آبادی بڑھنے لگی ہے اور کھیت ختم ہونے لگے ہیں اس وقت سے اب تک امراض کی بہتات ہوگئی ہے۔ کیونکہ جب سے دور

چل کر قضائے حاجت کرنا چھوڑ دیا ہے اس وقت سے اب تک قبض، گیس، تبخیر اور جگر کے امراض بڑھ گئے ہیں۔"

چلنے سے آنتوں کی حرکات تیز ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے قضائے حاجت تسلی بخش ہوتی ہے۔ آج کیونکہ ہم بیت الخلاء ہی میں پیشاب کرتے ہیں اور باہر چل کر نہیں جاتے اسی لیے آج حاجت غیر تسلی بخش ہوتی ہے، جسکی وجہ سے بیت الخلاء میں زیادہ وقت گزارنا پڑتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کے لیے کچی اور نرم زمین کا انتخاب فرماتے تھے۔ اس میں بھی بہت زیادہ سائنسی فوائد ہیں۔ چند ایک ملاحظہ فرمائیں۔

"لیول پاول" اپنی کتاب "اصول صحت" میں لکھتا ہے:

"انسانیت کی بقا مٹی سے ہے اور فنا بھی مٹی ہے۔ جب سے مٹی پر قضائے حاجت چھوڑ کر ہم نے سخت زمین (فلش، کموڈ اور ڈبلیوسی وغیرہ) استعمال کرنا شروع کی ہے، اس وقت سے اب تک مردوں میں جنسی کمزوری اور پتھری کا رجحان بڑھ گیا ہے اور اس کے اثرات پیشاب کے غدود پر پڑتے ہیں۔"

دراصل جب آدمی کے جسم سے فضلات نکلتے ہیں تو مٹی ان کے جراثیم اور تیزابی اثرات جذب کر لیتی ہے۔ جبکہ فلش وغیرہ اس کیفیت سے عاری ہیں۔ اس لیے وہ تیزابی اور جراثیمی اثرات جو مٹی جذب کر لیتی تھی، فلش میں پیشاب کرنے کی وجہ سے وہ جراثیمی اثرات دوبارہ ہمارے جسم پر براہ راست پڑتے ہیں اور جسمِ انسانی صحت سے مرض کی طرف مائل ہونے لگتا ہے۔

اور ایک ماہر طب لکھتے ہیں:

"نرم اور بھر بھری زمین ہر چیز کو جذب کر لیتی ہے۔ چونکہ پیشاب اور پاخانہ جراثیمی فضلہ ہے اس لیے ایسی زمین چاہئے جو کہ اس کو جذب کرنے اور اس کے چھینٹے اڑ کر بدن اور کپڑوں پر پڑنے کو روکے۔"

جبکہ یہ کیفیت فلش (ٹائلٹ) میں نہیں ہوتی۔ وہاں بھی چھینٹوں کا احتمال رہتا ہے اور

مزید یہ کہ فضلے کو جذب کرنے کی صلاحیت اس میں نہیں۔ فلش میں پیشاب کرنے کی وجہ سے فضلے کے بخارات جذب نہیں ہو پاتے جس کی وجہ سے فضلے سے اٹھنے والے بخارات صحت کے لیے مضر ثابت ہوتے ہیں۔

اس مغربی تہذیب نے ''کموڈ'' متعارف کرایا ہے کہ لوگ اس پر کرسی کی مانند بیٹھ جاتے ہیں اور پاخانہ و پیشاب کرتے ہیں۔ کموڈ کو استعمال میں لا کر آدمی اچھی طرح فراغت حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ غیر فطری طریقہ ہے۔ اسی کموڈ کی وجہ سے پاخانہ صحیح خارج بھی نہیں ہونے پاتا کہ انتڑیوں میں پھنسا رہتا ہے۔ نیز کموڈ کو استعمال کرنے کے بعد علیحدہ جگہ پر بیٹھ کر شرمگاہ کو دھونا پڑتا ہے۔

ڈبلیوسی پر قضائے حاجت کرنے سے کئی ایک مہلک امراض لاحق اور کئی ایک نقائص انسانی جسم میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

ڈبلیوسی پر بیٹھ کر قضائے حاجت کرنے سے اعصابی تناؤ اور کھچاؤ پیدا ہو جاتا ہے جس سے جسمِ انسانی ڈسٹرب ہونے کا غالب امکان ہے۔

ڈبلیوسی (W.C) کی مدد سے پاخانہ کرنے کی وجہ سے حاجت بھی غیر تسلی بخش ہوتی ہے جو کہ انتہائی پیچیدہ بیماریوں کو جنم دیتی ہے۔ جیسے قبض، تبخیر، معدے کی جلن، شرمگاہ کی خارش، شرمگاہ کی جلن، گیس اور بواسیر وغیرہ۔

ڈبلیوسی (W.C) پر قضائے حاجت کرنے کے لیے کرسی کی طرح بیٹھنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے پاخانے کا صحیح اور طبعی اخراج ممکن نہیں ہو پاتا اور فضلہ بڑی آنت میں اٹک کر رہ جاتا ہے۔ جو بے شمار بیماریوں کو جنم دیتا ہے۔

ڈبلیوسی (W.C) پر قضائے حاجت کے باوجود بعد میں پیشاب کے قطرات گرنے کا غالب گمان رہتا ہے اور قطرات گرنے سے خارش اور دوسری کئی متعدی امراض وجود میں آتی ہیں۔

ڈبلیوسی (W . C) کی مدد سے قضائے حاجت کرنے سے آنتوں اور معدے پر زور نہیں پڑتا جس کی وجہ سے معدے اور آنتوں کے بے شمار امراض پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے معدے کی جلن، بدہضمی اور معدے کا السر وغیرہ۔

یہ جدیدیت کی پہچان ڈبلیوسی (W.C) وضعِ جسم کی فطری کیفیت کے خلاف ہے۔ جب سنت کے مطابق قضائے حاجت کی جاتی ہے تو اس وقت دماغ پورے جسم کو ڈھیلے رہنے اور پاخانے کے مقام کو پاخانہ خارج کرنے کا حکم ارسال کرتا ہے۔ لیکن ڈبلیو سی (W.C) کو استعمال کرنے سے پورا جسم ڈھیلا نہیں ہو پاتا اور پاخانہ کا مقام بھی کسا رہتا ہے، جس کی وجہ سے بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے نہایت مفید ہیں بلکہ کسی مذہب میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ جب تک پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم والا طریقۂ طہارت نہ اپنایا جائے گا تو طہارت واستنجا کا اصل مقصد پورا نہیں ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قدر خوبی کے ساتھ انسان کو طہارت و پاکیزگی کا نظام عطا فرمایا کہ آج طبی ماہرین بھی یہ بات کہنے پر مجبور ہیں کہ......

"واقعی پیغمبر اسلام مصطفیٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم والا نظامِ طہارت بے مثل و بے مثال ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے اور اپنائے ہوئے طریقے نہایت مفید ہیں۔"

بہرحال اول الذکر (فلش) فطری انداز اور طریقے کے قریب تر ہے۔ اسی لیے اس کے نقصانات کموڈ اور ڈبلیوسی (W.C) سے بہت کم ہیں...... لیکن جو فوائد کچی زمین اور نرم مٹی پر حاجت کرنے کے ہیں وہ یہاں میسر نہیں ہو سکتے۔ چونکہ مٹی اور میدان ہر جگہ میسر نہیں اس لیے فلش بہرحال بہتر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پاؤں کشادہ کر کے اور بائیں پاؤں پر زور دے کر خاموشی سے سر جھکائے فراغت حاصل کرتے۔ اس طریقے میں بھی بڑے سائنسی وطبی فوائد ہیں۔ ان میں سے چند ملاحظہ فرمائیں۔

فزیالوجی کے ایک سینئر پروفیسر کہتے ہیں:

"میں مراکش میں تھا۔ ایک یہودی ڈاکٹر کے پاس بخار کی دوائی کے لیے جانا پڑا۔ ڈاکٹر کافی بوڑھا تھا۔ جب میں نے اپنا نام لکھوایا تو وہ کہنے لگا:

"کیا تم مسلمان ہو۔؟"

میں نے کہا:

''جی ہاں! میں مسلمان ہوں۔''

یہودی ڈاکٹر کہنے لگا:

''اگر ایک طریقہ جو خود تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، زندہ ہو جائے تو لوگ کئی امراض سے بچ جائیں۔''

میں حیران ہوا اور میں نے پوچھا:

''ڈاکٹر! وہ کون سا طریقہ ہے۔؟''

یہودی ڈاکٹر نے کہا:

''وہ قضائے حاجت کا طریقہ ہے۔ اگر قضائے حاجت کے لیے اسلامی طریقے پر بیٹھا جائے تو اپنڈے سائٹس، دائمی قبض، بواسیر اور گردوں کے امراض پیدا ہی نہیں ہوں گے۔ اگر مسلمان اپنے نبی (کریم صلی اللہ علیہ وسلم) والا طریقۂ حاجت اپنائیں گے تو وہ ان تمام بیماریوں سے بچ جائیں گے۔''

پروفیسر صاحب کہتے ہیں:

''میں اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریقے سے واقف نہ تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے علمِ دین کو تھوڑا سا وقت بھی نہ دیا کہ اُتنے اہم اور ضروری مسائل ہی سیکھ لیتا۔ اس وقت مجھے اس طریقے سے شناسائی کا اشتیاق ہوا۔ میں نے اس یہودی ڈاکٹر سے تو نہ پوچھا، ہاں مراکش میں ہی ایک عالمِ دین تھے میں ان کے پاس حاضر ہوا اور ان سے طریقہ دریافت کیا۔ جب انہوں نے مجھے وہ طریقہ بتایا اور سمجھایا تو میں نے فی الفور اس پر عمل شروع کر دیا۔ پہلے پہل تو مجھے کچھ دقت ہوئی لیکن اس کے فوائد جلد ہی میری سمجھ میں آگئے اور اس وقت سے اب تک میں حاجت کے لیے وہی طریقہ استعمال کرتا ہوں جو میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمایا ہے۔''

جدید سائنس حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قضائے حاجت کے طریقے پر

مسلسل ریسرچ کر رہی ہے اور اب تو غیر مسلم سائنسدان بھی یہ کہتے ہیں:

"صحت و زندگی کی بقا اور خوشحالی کے لیے پیغمبر اسلام علیہ السلام کے حاجت والے طریقے سے بڑھ کر کوئی طریقہ نہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریقے پر عمل کرنے سے گیس، تبخیر، بدہضمی، قبض اور گردوں کے امراض واقعی کم ہو جاتے ہیں اور مستقل آپ صلی اللہ علیہ وسلم والا طریقہ اپنا کر ان امراض کو ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استنجا کے لیے پہلے ڈھیلے استعمال فرماتے اور ڈھیلے طاق عدد میں استعمال فرماتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت مبارکہ میں بھی بہت سے سائنسی اور طبی فوائد ہیں، ان میں سے چند ملاحظہ فرمائیں۔

جدید سائنس کی ریسرچ کے مطابق مٹی میں نوشادر اور اعلیٰ درجے کے دافع تعفن اجزاء موجود ہیں۔ چونکہ پاخانہ اور پیشاب سارے کا سارا فضلہ ہوتا ہے اور جراثیموں سے لبریز ہوتا ہے اس لیے اس کا جلدِ انسانی کو لگنا انتہائی نقصان دہ ہے۔ اگر اس کے کچھ اجزاء جلد پر چپک جائیں یا ہاتھ پر رہ جائیں تو بے شمار امراض کے پھیلنے کا اندیشہ رہتا ہے۔

"ڈاکٹر ہلوک" لکھتا ہے:

"ڈھیلے کے استعمال نے سائنسی اور تحقیقی دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا تھا لیکن اب یہ حقیقت سامنے آ گئی ہے کہ مٹی کے تمام اجزاء جراثیموں کے قاتل ہیں۔ جب ڈھیلے کا استعمال ہوگا تو پوشیدہ اعضاء پر مٹی لگنے کی وجہ سے ان پر بیرونی طور پر چپٹے ہوئے تمام جراثیم مر جائیں گے۔ بلکہ تحقیقات نے تو یہ بھی ثابت کر دکھایا ہے کہ مٹی کا استعمال شرمگاہ کو کینسر سے بچاتا ہے۔ میں نے ایسے مریضوں کو جن کی شرمگاہ پر زخم تھے اور خراش بھی پڑ گئی تھی، مستقل مٹی استعمال کرائی اور انہیں مٹی سے استنجا کرنے کو کہا تو مریض حیرت انگیز طریقے سے صحت مند ہو گئے۔"

الغرض میرا، تمام محقق سائنسدانوں اور اطباء کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ مٹی سے بنا ہوا انسان پھر مٹی سے عافیت پائے گا۔ چاہے دنیا کے تمام فارمولے استعمال کر لے اس کو فقط

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں ہی سے بیماریوں سے تحفظ ملے گا۔

آج کل استنجا اور طہارت کے لیے ٹشو پیپر یا پھر ٹائلٹ پیپر کا استعمال کیا جاتا ہے اور لوگ بڑے شوق سے اس کا استعمال کرتے ہیں۔ تمام لوگوں کو معلوم ہے کہ ٹائلٹ پیپر سے اچھی طرح صفائی نہیں ہوتی۔ کچھ نہ کچھ گندگی جسم پر باقی رہ جاتی ہے جو صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ اگر غسل کی حاجت بھی ہو تو انسان اسی طرح ٹائلٹ پیپر سے باقی ماندہ گندگی کے ساتھ ہی پانی میں بیٹھ جاتا ہے جس سے نہ صرف وبائی امراض بڑھتے ہیں بلکہ ٹب کا سارا پانی بھی پلید اور گندا ہو جاتا ہے جو کہ غسل کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اگر پھر بھی انسان اس سے نہالے تو اس کا سارے کا سارا جسم ناپاک اور گندا ہو جاتا ہے۔ یہ مغربی تہذیب کا انسان کے حق میں نقصان ہے جو کسی بھی مسلمان کو ہرگز گوارہ نہیں ہونا چاہیے۔

ٹائلٹ پیپر بنانے والی فیکٹری کے ایک ملازم سے ایک ڈاکٹر اور ماہر طب کی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اس ملازم سے پوچھا:

"بھئی! بتاؤ! کیا اس نرم، ملائم اور لطیف ٹائلٹ پیپر کی تیاری میں کوئی خطرناک کیمیکل استعمال ہوتا ہے۔؟"

ملازم کہنے لگا:

"ڈاکٹر صاحب! اس کے بنانے میں بے شمار کیمیکل استعمال ہوتے ہیں۔ بعض کیمیکل تو انتہائی مہلک ہیں جن سے جلدی امراض، ایگزیما اور جلد کی میں رنگت کی تبدیلی کے امراض پیدا ہو سکتے ہیں۔"

اس وقت تمام یورپ ٹائلٹ پیپر استعمال کر رہا ہے۔ پچھلے دنوں اخبارات نے اس خبر کو شائع کیا کہ اس وقت یورپ میں شرمگاہ کے مہلک امراض خاص طور پر شرمگاہ کا کینسر تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اس کے سدِّ باب کے لیے جب تحقیقی بورڈ بیٹھا تو اس بورڈ کی رپورٹ صرف دو چیزوں پر مشتمل تھی۔ بورڈ کا کہنا ہے کہ یہ مہلک امراض اور شرمگاہ کا کینسر فضلے کی صفائی کے لیے ٹائلٹ پیپر استعمال کرنے اور پانی استعمال نہ کرنے کی وجہ سے بڑھ رہا ہے۔

یورپ نے ہمیں یہ تحفہ جو کاغذ کی شکل میں دیا ہے یہ ہمارے لیے بہتر ہے یا نقصان دہ

فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

چونکہ یورپین استنجا کے لیے صرف ٹائلٹ پیپر پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور پانی استعمال نہیں کرتے اسی لیے ٹائلٹ پیپر ان کے لیے مہلک ثابت ہوتا ہے لیکن اگر ٹائلٹ پیپر کے استعمال کے بعد پانی استعمال کیا جائے تو اس کے مضر اثرات نہ ہونے کے برابر ہو جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استنجا کے لیے پہلے مٹی کے ڈھیلے استعمال فرماتے اور پھر پانی۔ خالی پانی سے بھی استنجا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حدیث اقدس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"پانی سے استنجا کرنا انبیاء کرام علیہم السلام کی سنتوں میں سے ہے۔"

(الصحیح المسلم، باب خصال الفطرة، عربی صفحہ نمبر 604)

لیکن یورپین لوگ پانی سے استنجا کرنے کی بجائے ٹشو پیپر وغیرہ استعمال کرتے ہیں جن کے بہت زیادہ نقصانات ہیں۔ ان میں سے چند ایک نقصانات مندرجہ ذیل میں قارئین نے ملاحظہ فرمائے۔ اب چند اور پیشِ نظر ہیں۔

ایک یورپین ڈاکٹر "کیلن ڈیوس" نے پوری یورپی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اگر تم اسی طرح زندگی گزارتے رہے کہ غلاظت اور پاخانہ کے مقام کو پانی کی بجائے ٹائلٹ پیپر سے صاف کرتے رہے تو پھر بہت جلد تم درج ذیل امراض کے لیے تیار ہو جاؤ:

(1): شرمگاہ کا کینسر (2): بھگندر یا فسچولہ

(3): پھپھوند کے امراض۔ (4) جلدی انفیکشن۔

غلاظت اور گندگی سے لبریز یورپی زندگی میں پانی سے استنجا نہیں کیا جاتا۔ جس کی وجہ سے باقی ماندہ غلاظت و گندگی بالوں اور جسم میں اٹک کر طرح طرح کے امراض کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔

پانی کائنات کی عظیم نعمت ہے۔ یہ ہر غلاظت کو طہارت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اسلام نے نظامِ طہارت کو اتنا واضح اور پاک بنا دیا ہے کہ اس کو مانے بغیر چارہ نہیں۔ ہم کیا غیر مسلم سائنسدان اور اطباء بھی اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔

"جانٹ طمن" مستشرق کا کہنا ہے:

"اسلام پاکیزگی اور صفائی کا مذہب ہے۔ تمام مذاہب اس سے اپنی پاکیزگی کا باب پورا کرتے ہیں۔ اسلام کا طریقۂ استنجا بھی بے مثل و بے مثال ہے کہ اس سے جسم پر گندگی کا ذرہ بھی باقی نہیں رہتا۔ اگر کسی جسم کو پانی لگائے بغیر صاف کیا جائے تو تجربات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ حصۂ جسم کبھی بھی صاف نہیں ہوگا بلکہ مختلف بیماریوں کا پیش خیمہ بن جائے گا۔ پھر پانی کے استعمال سے تو جسم کے اس حصے (شرمگاہ) کا درجۂ حرارت نارمل ہو جاتا ہے جو کہ نہایت مفید ہے کہ اس سے بواسیر وغیرہ نہیں ہونے پاتی۔ اگر پانی استعمال نہ کیا جائے تو حاجت کے وقت مخصوص اعضائے کے علاوہ تمام اعضائے جسم کا درجہ حرارت بھی بڑھ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے انسان مختلف بے شمار امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"

ممنوعات: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشاب سے بچنے کے بارے میں پرزور احکامات ارشاد فرمائے۔ اس کے علاوہ پیشاب کو روکنے، کھڑے اور چلتے پانی میں پیشاب کرنے، راستہ میں پیشاب کرنے، سایہ دار اور پھلدار درخت کے نیچے پیشاب کرنے، ہوا کے رُخ پر پیشاب کرنے، بل اور سوراخ میں پیشاب کرنے، غسل خانے میں پیشاب کرنے، کھڑے ہو کر پیشاب کرنے، لید، گوبر، ہڈی سے استنجا کرنے اور قبلہ رُخ منہ یا پیٹھ کر کے پیشاب کرنے سے منع فرمایا۔

نیز طہارت کے لیے دایاں ہاتھ پانی ڈالنے اور بائیں ہاتھ سے صفائی کرنے، قضائے حاجت کے بعد کسی چیز (صابن یا مٹی) سے ہاتھ دھو لینے اور قضائے حاجت کرتے ہوئے پردے کا سخت خیال رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ ان تمام تعلیمات کے بے شمار سائنسی اور طبی فوائد ہیں۔ ان تعلیمات میں سے ہر ایک کے مختصر مختصر چند فوائد بیان کیے جاتے ہیں۔

1: احادیث میں کثرت کے ساتھ پیشاب سے نہ بچنے پر وعیدیں آئی ہیں اور محدثین نے اپنی کتابوں میں ہزار ہا ایسی احادیث نقل فرمائیں ہیں جن میں پیشاب سے

بچنے، تعلیماتِ اسلام کے مطابق پیشاب اور استنجا کرنے کا حکم ارشاد فرمایا گیا ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"پیشاب سے بچو کیونکہ اکثر عذابِ قبر پیشاب سے نہ بچنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔"
مستشرق "ڈاکٹر جانٹ طن" کہتا ہے:
"رانوں کی خارش اور پھنسیوں، پیڑو کی جلد کا ادھڑنا، سرینوں اور اس کی اطرف کی الرجی اور عضوِ خاص کے زخم کے مریض جب بھی میرے پاس آتے ہیں تو میرا اُن سے پہلا سوال یہی ہوتا ہے کہ "کیا وہ پیشاب سے بچتے ہیں۔؟ ان میں اکثر پیشاب سے نہیں بچتے اور پھر لا علاج اور مشکل امراض لے کر میرے پاس آتے ہیں۔"
جینز اور پینٹ کی زنجیری اور بٹن کھول کر پیشاب کرنے اور پھر بغیر استنجا کے فوراً باندھ لینے کی صورت میں پیشاب کے قطرات اعضائے جسم پر گرتے رہتے ہیں جس سے جلدی امراض اور دیگر بے شمار امراض پیدا ہوتے ہیں۔
واللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کتنی اعلیٰ ہیں کہ سائنسی تحقیق سے ہزاروں سال پہلے ہی فرما دیا کہ پیشاب پلید ہے، گندا ہے، کئی بیماریوں کا موجب اور عذابِ قبر کا سبب ہے، اس لیے اس سے بچو۔
2: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشاب کو روکنے سے منع فرمایا اور فقہاء رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں:
"پیشاب اگر سواری پر آ جائے تو اسی وقت دیر کیے بغیر سواری کو روکے اور پہلے پیشاب کرے۔ اسی طرح اگر جماعت کا وقت ہو گیا ہے اور پیشاب آ گیا ہے تو پہلے پیشاب کرے، پھر وضو اور پھر جماعت کے ساتھ ملے۔ کسی کام کو کرتے ہوئے پیشاب آ جائے تو پہلے پیشاب سے فراغت حاصل کرنی چاہیے۔"
پیشاب کو نہ روکنے اور بروقت پیشاب کر دینے کے درج ذیل طبی فوائد ہیں:

میڈیکل کے اصولوں میں سے ایک اصول یہ ہے کہ جب بھی پیشاب یا پاخانہ آ جائے تو اسی وقت اس سے فراغت حاصل کی جائے۔ میڈیکل نے حاجت ضروریہ ،پیشاب اور پاخانے کو روکنے سے منع کیا ہے۔

میڈیکل فیلڈ کے ساتھ تعلق رکھنے والے سٹیر کہتے ہیں:

''حاجت ضروریہ کو روکنا گونا گوں بے شمار امراض کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ اس میں زیادہ نقصان دماغ ،معدہ ،اعصاب اور گردوں کا ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو حاجت ضروریہ کے روکنے سے قے اور چکر شروع ہو جاتے ہیں جو کہ نہایت ہی مضر ثابت ہوتے ہیں۔''

3: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے پانی میں پیشاب اور پاخانہ کرنے سے منع فرمایا۔ اس کے طبی اور سائنسی فوائد ملاحظہ فرمائیں۔

کنواں ،تالاب ،جوہڑ اور جھیل جیسے کھڑے پانی میں اگر قضائے حاجت کی جائے گی تو پانی میں جراثیموں کے داخل ہونے سے تمام پانی آلودہ اور خطرناک امراض کا سبب بن جائے گا۔ اب اگر کوئی ذی روح (پرندے اور جانور یا انسان وغیرہ) اس پانی کو پئے گا تو وہ کئی ایک مہلک بیماریوں کا شکار ہو جائے گا۔

ایسا پانی پینے والے کو تپ محرقہ ،ٹائی فائیڈ ،جراثیمی یرقان ،آنتوں کے کیڑوں کے انڈے کی پیدائش ،پیراسائٹ اور طفیلی کیڑوں کی پیدائش جیسے مہلک امراض لاحق ہو جائیں گے۔

اس کے علاوہ کھڑے پانی میں پیشاب کرنے والا خود بھی کئی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب کھڑے پانی میں پیشاب کیا جاتا ہے تو پیشاب کے چھینٹے اُڑتے ہیں جو کئی بیماریوں کا موجب بنتے ہیں۔ کھڑے پانی میں پیشاب کرنے سے ایک قسم کی بھاپ اٹھتی ہے ،جو پیشاب کرنے والے کو کئی بیماریوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس بھاپ سے سونگھنے کی قوت سلب ہو جاتی ہے ،آدمی آنکھوں کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور دماغ و گلے پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے۔

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے پانی میں پیشاب اور پاخانہ کرنے سے منع فرمایا تا کہ کسی آدمی کی وجہ سے کسی جانور یا انسان کو کوئی بھی تکلیف نہ پہنچے اور اسلامی

معاشرہ ہمیشہ تندرست اور بیماریوں سے محفوظ رہے۔

4: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چلتے پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا۔ سائنس اور طب میں اسکی وجہ ملاحظہ فرمائیں:

چلتا پانی جیسے دریا، نہریں اور نالے کیونکہ قریہ قریہ گزر کر جاتے ہیں۔ کئی انسان اور جانور اس پانی سے نفع لیتے ہیں۔ اگر فضلے کی وجہ سے یہ پانی آلودہ ہو جائے تو چلتے چلتے جراثیم کا گڑھ بن جاتا ہے اور بیماریاں پھیلاتا جاتا ہے۔ اگر کوئی آدمی اس نہر یا نالے وغیرہ کو پار کرنے کے لیے پانی سے گزرے گا تو اس کا جتنا جسم پانی میں جائے گا اس کو نقصان کا اندیشہ ہے۔ اس پانی سے الرجی، پھوڑے، پھنسیاں اور وبائی خارش وغیرہ بھی پھیلتی ہے۔ اس کے علاوہ جب کوئی شخص چلتے پانی میں پیشاب کرے گا تو اس سے بو اُٹھے گی جو کہ دماغ اور پھیپھڑوں کے لیے انتہائی مضر ہے۔

5: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گزرگاہوں اور راستوں میں پیشاب کرنے سے بڑی سختی سے منع فرمایا۔ اس کے طبعی، طبی اور سائنسی فوائد درج ذیل ہیں:

راستہ سے ہر کوئی گزرتا ہے اور جب راستہ میں پیشاب کیا جاتا ہے تو پیشاب کی بو اور جراثیم فضا میں معلق ہو جاتے ہیں اور ہوا کی وجہ سے اس راستے سے گزرنے والوں کے جسم میں سرایت کر جاتے ہیں جس سے سانس کی پرابلم پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ پیشاب کی بو اور جراثیم سے آلودہ ہوا اگر انسان کے اندر پہنچ جائے تو دل، جگر اور پتے کی بیماریوں کا بھی غالب گمان کیا جا سکتا ہے۔

6: احادیث اور فقہ میں سایہ دار اور پھلدار درخت کے نیچے پیشاب کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ اس کے چند طبعی، طبی اور سائنسی فوائد یہ ہیں:

سایہ دار درخت لوگوں کے قیام اور سکون کی جگہیں ہیں۔ یہاں فضلہ کرنا انتہائی برا ہے اور اس سے یقیناً برے اثرات مرتب ہوتے ہیں کہ اس درخت کے سائے میں بیٹھنے والے کئی قسم کی وبائی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔

پھلدار درخت جہاں لوگوں کے قیام و آرام کی جگہ ہیں وہاں اس سے پھل بھی حاصل کیے جاتے ہیں اور لوگ اسی کے سائے میں بیٹھ کر اس کے پھل تناول کرتے ہیں

۔اگر وہاں گندگی ہوگی تو وہاں بیٹھ کر کھانا مشکل ہو جائے گا جس کی وجہ سے لوگ متنفر ہو جائیں گے۔نیز پھلدار درخت سے خود بخود پھل بھی گرتے ہیں۔اگر پھلدار درخت کے نیچے پیشاب وپاخانہ کیا جائے گا تو وہ پھل بھی ضرور اس گندگی پر گریں گے جس کی وجہ سے وہ انسان کے استعمال کے قابل نہیں رہیں گے اور اگر کسی نے وہ پھل استعمال کر لیا (خصوصاً جیسے ناسمجھ بچے وغیرہ) تو وہ بھی کئی امراض میں مبتلا ہو جائے گا جن سے تکلیف واذیت پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

7: احادیث اور فقہ میں ہوا کے رخ پر پیشاب کرنے سے منع کیا گیا ہے۔اس کے طبی وسائنسی فوائد درج ذیل ہیں۔

اگر ہوا کے رُخ پیشاب کیا جائے تو ہوا کے دباؤ کی وجہ سے وہ پیشاب اُڑ کر جسم ،چہرے اور کپڑوں پر پڑے گا جس سے جسم اور کپڑے پلید ہو جائیں گے۔نیز اس پیشاب کے جراثیم بھی مساموں کے راستے سے جسم میں داخل ہو کر الرجی ،خارش ،فسادِ خون اور کئی اور جلدی امراض پیدا کریں گے۔

اگر ہوا کی وجہ سے پیشاب اُڑ کر منہ یا آنکھوں میں چلا گیا تو بہت شدید نقصان پہنچے گا۔مثلاً آنکھیں سوج جائیں گی ،سرخ ہو جائیں گی ،آنکھوں میں خارش ہوگی ،آنکھوں سے پانی بہنے لگے گا اور اس کے ساتھ ساتھ کئی ایک قسم کی آنکھوں کی وبائی بیماریاں لاحق ہو جائیں گے۔اگر علاج نہ کرایا گیا تو یہ بیماریاں بڑھ کر پورے جسم میں فساد برپا کر دیں گی۔

اگر ہوا کے رُخ پر پیشاب کیا گیا اور پیشاب اُڑ کر منہ میں چلا گیا تو اس سے بھی کئی ایک امراض پھیل جائیں گے۔مثلاً منہ کی بیماری لاحق ہو جائے گی ،منہ کا فالج بھی ہو سکتا ہے ۔اس کے علاوہ منہ میں زخم ،مسوڑھوں میں پیپ اور دانتوں کی بیماری پیدا ہوں گی۔زبان بھی بری طرح متاثر ہوگی اور گلہ بھی خراب ہو جائے گا جس سے پانی تک نہ نگلا جائے گا۔

8: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بل اور سوراخ میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا۔چنانچہ مشکوۃ شریف میں حضرت عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص سوراخ میں ہرگز پیشاب نہ کرے۔''

(مشکوۃ المصابیح، عربی صفحہ 43)

بل اور سوراخ میں پیشاب کرنے سے روکنے میں بھی بے شمار سائنسی وطبی فوائد ہیں۔ چند ایک ملاحظہ فرمائیں۔

اگر زہریلے جانور کے بل میں پیشاب کیا گیا تو اس جانور کے باہر نکل کر نقصان پہنچانے کا خطرہ ہوتا ہے۔

بعض زمینیں کلرزدہ اور شورہ زدہ ہوتی ہیں اور ان کے بلوں اور سوراخوں میں تیزاب اور شورہ کے مادے جمع ہوتے ہیں۔ اگر ان میں پیشاب کیا گیا تو پیشاب چونکہ خود ایک تیزاب ہے اور جب ایک تیزاب دوسرے تیزاب سے ملے گا تو زہریلے بخارات اُٹھ کر جسم انسانی کو نقصان پہنچائیں گے۔

9: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کی جگہ پیشاب کرنے سے منع فرمایا اور فرمایا:

''اس سے بیشتر وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔''

فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں:

''غسل کی جگہ پیشاب نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ اس سے عقل اور ذہن پر اثر پڑتا ہے، یادداشت کمزور ہو جاتی ہے اور آدمی کئی وسوسوں میں پھنس کر شیطان اور بیماری کا شکار ہو جاتا ہے۔''

ایک سائنس میگزین بنام ''سائنس اور صحت'' میں لکھا ہے:

''غسل کی جگہ پیشاب کرنے سے شہوت نفاسیہ کی زیادتی ہوتی ہے اور اس سے معاشرتی مہلکات پیدا ہوتے ہیں۔ غسل کی جگہ پیشاب کرنے سے انسان نفسیاتی امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ غسل کی جگہ پیشاب کرنے سے گردے میں پتھری پیدا ہوتی ہے۔ بہر حال غسل کی جگہ پیشاب کرنے سے اور بھی بہت سے نقصانات کا قوی اندیشہ ہے۔''

10: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے سے منع

فرمایا۔ چنانچہ بیہقی شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی آدمی کھڑے ہو کر پیشاب کرے۔

(بیہقی شریف، جلد 1، عربی صفحہ 102)

اسلام بیٹھ کر پیشاب کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اگر کھڑے ہو کر پیشاب کیا جائے تو اس سے بے شمار اندرونی و بیرونی نقصانات ہوتے ہیں۔ چونکہ پیشاب جراثیموں سے پُر ہوتا ہے اور بعض اوقات اس میں بعض امراض (سوزاک، آتشک، گردوں کا جراثیمی انفیکشن وغیرہ) کی وجہ سے پیپ بھی موجود ہوتی ہے۔ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے سے اس کے چھینٹے بدن اور لباس کو آلودہ کر دیتے ہیں جس سے کئی امراض وجود میں آتے ہیں۔

کھڑے ہو کر پیشاب کرنے سے غدۂ قدامیہ پر برا اثر پڑتا ہے اور وہ متورم ہو کر بڑھ جاتا ہے جس کی وجہ سے پیشاب بند ہو جاتا ہے، قطرہ قطرہ آتا ہے اور دھار بھی پتلی ہو جاتی ہے، اسکے علاوہ اور بھی کئی امراض جنم لیتے ہیں۔

11: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لید اور ہڈی سے استنجا کرنے سے منع فرمایا۔

چنانچہ مسلم شریف میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لید (جانور کے گوبر) اور ہڈی سے استنجا نہ کیا کرو۔"

(الصحیح المسلم، جلد نمبر 1، صفحہ نمبر 130) (المشکوۃ المصابیح، عربی صفحہ 42)

لید میں بے شمار مہلک جراثیم ہوتے ہیں کیونکہ یہ ایک (جانور کا) فضلہ (پاخانہ) ہے اور ہر پاخانہ جراثیموں سے پُر ہوتا ہے۔ لید میں تشنج اور تپ محرقہ کے جراثیم بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر لید سے استنجا کیا جائے تو وہ جراثیم جسم میں منتقل ہو کر بیمار کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس سے شرمگاہ کو بھی بہت سی بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں۔ جیسے خارش، جلن، پیپ کا پڑھنا اور شرمگاہ کا کینسر وغیرہ۔

ہڈی سے گوشت کھا کر جب پھینک دیا جاتا ہے تو اس کو جانور کھاتے ہیں۔ بعض جانوروں کے لعاب میں خطرناک جراثیم ہوتے ہیں، مثلاً کتے کے لعاب میں ایک خاص

جرثومہ ہوتا ہے جو اس کی کھائی ہوئی ہڈی پر لعاب کے ساتھ منتقل ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ ہڈی پر مٹی، گردوغبار اور گندگی وغیرہ جم جاتی ہے اور اس گردوغبار وغیرہ میں گوناگوں جراثیم پائے جاتے ہیں۔ اب اگر یہ ہڈی استنجا کے لیے استعمال کی جائے گی تو دیگر جراثیموں کے ساتھ ساتھ کتے کا خاص جرثومہ بھی جسم میں منتقل ہو جائے گا جس سے فسادِ خون، دل، جگر، پتا، آنتڑیوں اور معدے کے امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔

ہڈی کی سطح ناہموار، کھردری اور نوک دار ہوتی ہے، اس سے جسمِ انسانی کے زخمی ہونے کے خطرات ہوتے ہیں۔ نیز ہڈی پر حشرات الارض میں سے کوئی چھوٹا دکھائی نہ دینے والا موذی جانور بھی ہو سکتا ہے کہ استنجا کرتے وقت اس کے نقصان پہنچانے سے تکلف ہوگی۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں:

"ایک نوجوان کو میں نے یہ حدیث مبارک سنائی کہ ہڈی، گوبر اور لید سے شرمگاہ کو صاف نہ کیا جائے تو اس نے مذاق اُڑایا۔ اتفاق سے کسی دن اسے ضرورت پڑی تو رفع حاجت کے بعد اس نے صفائی ہڈی کے ساتھ کی۔ جس کی وجہ سے اس کے پاخانہ کے مقام پر شدید سوزش اور تکلیف دہ ورم ہو گیا۔ ہوا یوں کہ اس نے جس ہڈی کے ساتھ استنجا کیا تھا اس پر چھوٹی چھوٹی سرخ اور زہریلی چیونٹیاں تھیں جو وہ دیکھ نہ سکا۔ جب اس نے استنجا کرنے کے لیے اس ہڈی کو پاخانے کے مقام پر رکھا تو ان چیونٹیوں نے اسے کاٹ کھایا۔"

وہ بزرگ فرماتے ہیں کہ اس نوجوان کو جب زیادہ تکلیف ہوئی تو وہ میرے پاس غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے شرمندگی کی حالت میں علاج کے لیے آیا۔ میں نے اس سے کہا:

"جس محسن ہستی کی حدیث مبارک کا تم نے مذاق اُڑایا تھا اس پر درود بھیجو، اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی طلب کرو۔ پس جب اس نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مصیبت دور فرما دی۔"

ہڈی اور گوبر میں کئی طرح کے غلیظ کیڑے بھی ہوتے ہیں لہٰذا طبعی، سائنسی اور طبی

قواعد کے مطابق بھی ان سے صفائی کرنا منع ہے۔

12: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق قبلہ کی طرف تھوکنا، پیشاب کرتے ہوئے پیٹھ اور منہ کرنا منع ہے۔ چنانچہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں قضائے حاجت کے دوران قبلہ کی طرف منہ اور پیٹھ کرنے سے منع فرمایا۔"

(الصحیح البخاری، عربی صفحہ 57)(الصحیح المسلم، جلد 1، عربی صفحہ 130)(المشکوۃ المصابیح، عربی صفحہ 24-42)(سنن ابی داؤد، جلد نمبر 1، صفحہ نمبر 3)

قضائے حاجت کے دوران قبلہ کی طرف منہ اور پیٹھ نہ کرنے میں کئی ایک طبی و سائنسی فوائد ہیں۔

چنانچہ ڈاکٹر "ڈارون"، ڈاکٹر "لیڈ بیٹر" اور ڈاکٹر "الیگزینڈرا" کی تحقیق کے مطابق "کاسمک ولڈ" کا نظام انسانی زندگی پر حاوی ہے۔ خانہ کعبہ کے چاروں اطراف سے نکلنے والی مثبت شعاعیں پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ پیشاب، پاخانہ اور تھوک جو کہ خالص منفی شعاعیں ہیں کعبہ کی طرف ڈالنے سے آدمی کے لیے مسلسل نقصان کا باعث بنیں گی۔

مشہور پیرا سائیکالوجسٹ "ڈاکٹر کامن بیم" نے اس بات کو اپنی تحقیقی زندگی کا حصہ بنایا ہے کہ مسلمانوں کے کعبہ کی طرف سے مسلسل مثبت شعاعیں پوری کائنات میں پھیل رہی ہیں اور اس طرح منفی شعاعوں (تھوک، پیشاب اور پاخانہ وغیرہ) کا رجحان ضرر کا باعث ہے۔

13: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"طہارت کے لیے پانی دائیں ہاتھ سے ڈالو اور صفائی کے لیے بایاں ہاتھ استعمال کرو۔ خبردار دایاں ہاتھ استنجا کے لیے استعمال نہ کرو۔ جب کوئی شخص قضائے حاجت کے لیے جائے تو اپنی شرمگاہ کو بھی اپنے دائیں ہاتھ سے نہ چھوئے۔"

(الصحیح البخاری، جلد 1، عربی صفحہ نمبر 27)(الصحیح المسلم، جلد نمبر 1، عربی صفحہ 130)(المشکوۃ المصابیح، عربی صفحہ 42)

اس ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی کئی ایک طبی، طبی اور سائنسی فوائد پائے جاتے ہیں جو کہ پیشِ نظر ہیں۔

استنجا فقط بائیں ہاتھ سے کرنا چاہیے۔ اسکی کئی وجوہات ہیں۔ دائیں ہاتھ سے مثبت اور بائیں ہاتھ سے منفی شعاعیں نکلتی ہیں۔ اگر استنجا کے لیے دائیاں ہاتھ استعمال کیا جائے تو جسم کا شعاعی نظام بگڑ جائے گا اور اس کے بداثرات دماغ اور حرام مغز پر پڑیں گے۔

نیز چونکہ کھانے کے لیے دایاں ہاتھ استعمال کیا جاتا ہے اس لیے اگر استنجا کے لیے بھی دایاں ہاتھ استعمال کیا جائے تو پھر کھانا کھاتے وقت مادۂ نفرت کے پھیلنے کا ڈر ہے۔

14: قضائے حاجت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ مٹی پر ہاتھ رگڑ رگڑ کر دھوتے تھے۔ اس میں بیشمار طبی فوائد ہیں۔ چند ایک ملاحظہ فرمائیں:

قضائے حاجت کے بعد دونوں ہاتھوں کو دھونا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ اس سے جسمِ انسانی کو بہت سارے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

مثلاً............

ہم مختلف اشیاء کو ہاتھوں سے ہی پکڑتے ہیں، نیز ہاتھ ننگے رہتے ہیں اس طرح ہاتھوں پر مختلف بیماریوں کے جراثیم یا مختلف کیمیکلز موجود رہتے ہیں جو ہمارے ہاتھوں کو آلودہ کر دیتے ہیں، اگر ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کھا لیا جائے، کھانے والے برتن میں ہاتھ داخل کر دیئے جائیں، کلی کر لی جائے یا ناک میں پانی ڈال لیا جائے تو یہ جراثیم باآسانی ہمارے کھانے، منہ یا ناک کے ذریعے جسم کے اندر جا سکتے ہیں اور جسم کو مختلف بیماریوں میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ اسی لیے دنیا بھر میں ہاتھ دھونے پر بہت زور دیا جا رہا ہے تاکہ مختلف آلائشیں ہمارے جسم کے اندر منتقل نہ ہو سکیں۔

جب ہم ہاتھ دھوتے ہیں تو انگلیوں کے پوروں میں سے نکلنے والی شعاعیں ایک ایسا حلقہ بنا لیتی ہیں جس کے نتیجے میں ہمارے اندر دَور کرنے والا برقی نظام تیز ہو جاتا ہے اور برقی رَو ایک حد تک ہاتھوں میں سمٹ آتی ہے۔ اس عمل سے ہاتھ خوبصورت ہو جاتے ہیں۔ صحیح طریقہ پر ہاتھ دھونے سے انگلیوں میں ایسی لچک پیدا ہو جاتی ہے جس سے آدمی کے اندر تخلیقی صلاحیتوں کو کاغذ یا کینوس پر منتقل کرنے کی خفتہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ قضائے حاجت کے بعد ہاتھوں کو مٹی سے مَل مَل کر دھوتے تھے۔ چونکہ ہاتھوں کو جراثیم لگے ہوتے ہیں اور بعض جراثیم ایسے بھی ہوتے ہیں جو عام پانی سے ضائع نہیں ہوتے اس لیے ہاتھوں کو مٹی یا صابن وغیرہ سے صاف کر لینا ایک اہم سنت اور طبی وسائنسی اصول ہے۔

مٹی اعلیٰ درجے کی ''انٹی سپٹک'' ہے۔ حتیٰ کہ اس میں کتے کے جراثیموں (جو کہ سب سے زیادہ قوی جراثیم ہوتے ہیں) کو بھی مار ڈالنے کی قوت وطاقت موجود ہے، اس لیے یہ عام جراثیموں کو تو فوراً ہی ختم کر دیتی ہے۔

قضائے حاجت کے بعد ہاتھوں کو مَل مَل کر مٹی یا صابن سے دھونا ویسے بھی فطرت میں شامل ہے کیونکہ فطرت انسانی گندگی کو پسند نہیں کرتی۔

مسواک......اسلام اور انسانی صحت:

اسلام جہاں مسلمانوں کو روحانی پاکیزگی کا حکم دیتا ہے، وہاں اس کی تعلیمات مسلمانوں کے جسم ولباس کی تطہیر کا بھی درس دیتی ہیں۔ اگر اسلامی طہارت کے طریقوں پر غور کیا جائے تو اس کا معیار سائنس کے طریقوں سے بھی اعلیٰ وارفع نظر آئے۔ نماز سے پہلے مسواک اور وضو کا حکم دیا گیا۔ یہ روحانی وجسمانی دونوں فوائد پر حاوی ہے، اسی وجہ سے خود مسواک کو روحانی عبادت کا درجہ دیا گیا ہے۔

ایک مسلمان پنج گانہ نماز میں ایک دن میں پندرہ مرتبہ منہ کو صاف کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسلمان نمازی آدمی کا منہ اندر سے بالکل صاف رہتا ہے۔ نمازی نے نماز میں بزرگ وبرتر خالق ومالک کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اس کی حمد وثناء بیان کرنا ہوتی ہے لہٰذا منہ کا صاف وپاک ہونا ازحد ضروری ولازمی ہے۔ منہ صاف نہ ہو تو بدبو آتی ہے، ساتھ والے نمازی بھی متنفر اور بیزار ہوتے ہیں، نیز گندے منہ سے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور عبادت کا انسان کے دل ودماغ پر اثر نہیں ہوتا اور نہ ہی نماز میں خشوع وخضوع حاصل ہوتا ہے۔ اگر مسواک اور پانی سے منہ کو اچھی طرح صاف کیا جائے تو منہ میں ایسی شعاعیں بن جاتی ہیں جن کے باعث تلاوت قرآن اور حمد وتسبیح میں حلاوت وسرور پیدا ہوتا ہے۔

منہ کی صفائی کے لیے مسواک کرتے رہنے سے دانت مضبوط اور چمکدار ہو جاتے

ہیں۔ دانتوں کے متعدد امراض کا خطرہ نہیں رہتا۔ جبڑے مضبوط ہو جاتے ہیں۔ آدمی کی قوت ذائقہ میں اضافہ ہو جاتا ہے اور آدمی گلے وغیرہ کی بیماریوں سے بچا رہتا ہے۔

مسواک کے متعلق احادیث ملاحظہ فرمائیں:

1: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ حتیٰ کہ فرمایا:

"مسواک کو اپنے اوپر لازم کر لو کیونکہ اس میں پندرہ خوبیاں ہیں:

منہ کو پاک وصاف کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ خوش ہو جاتا ہے۔

شیطان ناخوش ہوتا ہے۔

فراخدستی اور خوشحالی حاصل ہوتی ہے۔

میری (رسول اللہ) کی سنت ہے۔

ناخونہ آنکھ کی بیماری دور ہو جاتی ہے۔

بینائی میں صفائی پیدا ہوتی ہے۔

حرارت کی تکلیف دور ہو جاتی ہے۔

سر کا درد ختم ہو جاتا ہے۔

منہ خوشبودار ہو جاتا ہے۔

بلغم قطع ہو جاتی ہے۔

مسوڑھے مضبوط ہو جاتے ہیں۔

فرشتے مسواک کرنے والے سے محبت کرتے ہیں۔

افلاس اور تنگدستی دور ہو جاتی ہے۔

مسواک کر کے جو نماز ادا کی جائے اس کا ثواب ساٹھ سے زیادہ نمازوں کے برابر ہوتا ہے۔

2: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مسواک سے غفلت نہ کرو۔ کیونکہ یہ داڑھ کے درد کو دور کرتی ہے، اس کے ساتھ دانت چمکدار رہتے ہیں اور اس کے استعمال سے قوتِ حافظہ زیادہ ہو جاتی ہے۔''

3: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جمعہ کے دن مسواک کرنا ہر مسلمان پر ضروری ہے۔''

4: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''پیغمبروں کی صفات میں سے ایک صفت مسواک کرنا بھی ہے۔''

5: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کھانا کھانے کے بعد مسواک کرنا دو کمسن غلام آزاد کرنے سے افضل ہے۔''

6: حضور نبی کریم رؤف ورحیم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ عالی شان ہے:

''مسواک کر کے نماز پڑھنا اس نماز سے ستر درجہ افضل ہے جس کے وضو میں مسواک نہ کی گئی ہو۔''

7: نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جبرائیل امین علیہ السلام نے مسواک کی اتنی فضیلت بیان کی اور اس کے استعمال کی اتنی تاکید کی گویا کہ مجھے خوف ہوا کہ کہیں مسواک مجھ پر اور میری امت پر فرض نہ ہو جائے۔''

8: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم لوگ مسواک سے اپنے منہ پاک وصاف رکھو کیونکہ یہی منہ کا حق ہے۔''

9: ''عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لو لا ان اشق علیٰ امتی لامرتھم بالسواک عند کل صلوۃ''

(الصحیح المسلم، باب السواک، صفحہ نمبر 589)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ میری امت مشقت میں پڑ جائے گی تو میں ان کو

ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

10: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مسواک کرنا پیغمبروں کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔''

(سنن ترمذی، باب ما جاء فی فضل التزویج والحث علیہ، صفحہ نمبر 1080)

11: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک کرنے کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ مسواک کرنا طریق انبیاء علیہم السلام کی پیروی ہے اور ان کی ہدایت کا گویا طالب ہونا ہے۔ مسواک کرنے والے سے فرشتے مصافحہ کرتے ہیں اور عظمت و نور کی وجہ سے اس کے آگے پیچھے رہتے ہیں۔ مسواک سے دانت صاف و چمکدار رہتے ہیں۔ مسواک کرنے والے کے گھر سے مسجد تک فرشتے اس کے ساتھ ساتھ جاتے ہیں۔ تمام فرشتے اور حاملانِ عرش مسواک کرنے والے کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ مسواک کرنے والے کے لیے بہشت کے آٹھوں دروازے کھل جاتے ہیں تا کہ وہ جس دروازے سے چاہے بغیر حساب و کتاب کے داخل ہو جائے۔ قیامت تک جس قدر لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوں گے مسواک کرنے والے کو ان کی تعداد کے موافق قیامت کے دن نیکیاں ملیں گی۔ مسواک کرنے والے پر دوزخ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ تمام انبیاء و مرسلین علیہم السلام مسواک کرنے والے کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ مسواک کرنے والی کی قوت حافظہ بڑھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مسواک کرنے والے کے دل میں حکمت و دانائی کی باتیں القا فرما دیتا ہے۔ مسواک کرنے والے پر کھانے کے وقت سخت سے سخت گوشت بھی نرم ہو جاتا ہے۔ مسواک کرنے سے دانتوں کے درد کی شکایت جاتی رہے گی۔ مسواک کرنے والے کی قبر مسواک کی برکت سے وسیع کر دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت مسواک کرنے والے کے گھر میں نازل ہوتی ہے۔ مسواک کرنے والے کی ہر حاجت پوری ہوگی۔ ہر ایک دانت اور انگلیوں کے پوروں کے عدد پر پانچ پانچ نیکیاں مسواک کرنے والے کے اعمال نامہ میں مسواک کو مس کرنے کی وجہ سے لکھی جاتی ہیں۔ مرنے کے وقت موت کا فرشتہ روح قبض کرنے کے لیے مسواک کرنے والے کے پاس نہایت اچھی صورت میں آتا ہے جس طرح انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے پاس

آتا ہے۔ ملک الموت مسواک کرنے والے کی روح کو ایسی حالت میں لے جائے گا کہ وہ پاک وصاف ہوگی۔ دنیا سے اُٹھنے سے پہلے اللہ تعالیٰ مسواک کرنے والے کو جنت کی سربمہر شراب طہور سے سیراب فرمائے گا۔ مرنے کے بعد مسواک کرنے والے کی قبر میں دنیا کے برابر وسعت پیدا کردی جائے گی۔ زمین کے کیڑے مکوڑے اور موذی جانور مسواک کرنے والے کو تکلیف نہ دیں گے۔ قیامت کے دن مسواک کرنے والے کو انبیاء علیہم السلام کی طرح لباس پہنایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مسواک کرنے والے کی انبیاء علیہم السلام کی طرح عزت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مسواک کرنے والے کو نبیوں اور شہیدوں کے ساتھ جنت میں داخل فرمائے گا۔ میزانِ عمل میں مسواک کرنے والے کی نیکیوں کا پلہ بھاری رہے گا۔ مسواک کرنے والے کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ہمسائیگی میں جنت کا محل عطا ہوگا۔ مسواک کرنے والا میری (رسول اللہ) کی شفاعت سے بہرہ یاب ہوگا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسواک کرنے والا دیدارِ الٰہی سے مشرف ہوگا۔

12: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء کرام کی دس سنتوں کو بیان فرمایا اور ان میں سے ایک سنت مسواک کرنا بھی ہے۔

(الصحیح المسلم، باب خصال الفطرۃ، صفحہ نمبر 604)

13: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مسواک منہ کو صاف کرنے والی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ذریعہ ہے۔"

(سنن نسائی، باب الترغیب فی السواک، صفحہ نمبر 5)

14: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دن یا رات کو جب بھی سوکر اٹھتے تو وضو کرنے سے پہلے مسواک ضرور فرماتے۔

(سنن ابوداؤد، باب السواک لمن قام اللیل، صفحہ نمبر 57)

15: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب بندہ مسواک کرکے نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو فرشتہ اس کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کی تلاوت خوب دھیان سے سنتا ہے۔ پھر اس کے

بہت قریب آجاتا ہے یہاں تک کہ اس کے منہ پر اپنا منہ رکھ دیتا ہے۔ قرآن مجید کا جو بھی لفظ اس نمازی کے منہ سے نکلتا ہے سیدھا فرشتہ کے پیٹ میں جاتا ہے۔ اس لیے تم اپنے منہ قرآن کی تلاوت کے لیے صاف ستھرے رکھو۔"

(مجمع الزوائد، جلد 2، صفحہ نمبر 26)

16: ام المومنین حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مسواک کر کے دو رکعت نماز پڑھنا بغیر مسواک کیے ستر رکعتیں پڑھنے سے افضل ہے۔"

(مجمع الزوائد، جلد 2، صفحہ نمبر 263)

17: حضرت شریح رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی بارگاہ میں عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر تشریف لاتے تو سب سے پہلے کون سا کام کرتے۔؟ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے مسواک کیا کرتے تھے۔"

(الصحیح لمسلم، باس السواک، صفحہ نمبر 590)

18: حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے کسی نماز کے لیے اس وقت تک نہیں نکلتے تھے جب تک مسواک نہ فرما لیتے۔

(مجمع الزوائد، جلد 2، صفحہ 266)

پیغمبر اسلام علیہ السلام دنیا میں بے مثل و بے مثال راہنما کی حیثیت سے تشریف فرما ہوئے۔ تاریخ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال دینے سے قاصر تھی، قاصر ہے اور قاصر رہے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے جو اصول عطا فرمائے ہیں وہ بھی بے مثل و بے مثال ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کا کوئی بھی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔ نیز یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف زبانی ہی ہدایات نہیں فرمائیں بلکہ خود عملی طور پر ان کی افادیت سے بھی آگاہ فرمایا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود عمل

کر کے تمام لوگوں کے لیے اپنے عمل کو سنت قرار دیا اور پھر اپنی سنت پر عمل کرنے والوں کو بڑے اجر وثواب کی بشارت بھی دی۔

مسواک سے متعلق مندرجہ ذیل ارشادات پر آپ نے خوب غور کیا ہوگا کہ کس قدر ترغیب وتاکید کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک کا ذکر فرمایا اور اس کے استعمال پر کس قدر پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

آج کل برش اور پیسٹ کا استعمال نئی تہذیب کی اختراع ہے۔ یہ پیسٹ اور برش سادہ مسواک جیسے فوائد سے عاری ہے بلکہ نقصانات کی حامل ہے۔ اسی نئی تہذیب کی چمک دمک سے مرعوب لوگ سستی، آسان، مفید اور فطری چیز مسواک کو ترک کر کے متعدد امراض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ لوگ دانتوں، مسوڑھوں اور گلے کی بیماریوں کا شکار ہو کر جسم کے دیگر حصوں میں مختلف امراض کا سبب خود اپنے عمل سے بنتے ہیں۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی کما حقہ پیروی کی جاتی تو دنیا میں دانتوں کی بیماریاں اور ڈینٹل سرجنز وجود میں ہی نہ آتے اور نہ ہی لوگ ان امراض کا شکار ہو کر تکلیف اٹھاتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک کے استعمال پر اتنی تاکید اس لیے فرمائی کیونکہ اس میں کئی طبی اور سائنسی فوائد موجود ہیں۔ اب قارئین مسواک کے طبی اور سائنسی فوائد ملاحظہ فرمائیں۔

مسواک قاتلِ جراثیم ہے۔ یہ منہ سے تعفن کو دور کرتی ہے۔ اس کے استعمال سے منہ کے اندر کے جراثیم مر کر ختم ہو جاتے ہیں اور اس طرح مسواک کرنے والا شخص منہ کی بیماریوں سے بچا رہتا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق کچھ ایسے جراثیم بھی ہوتے ہیں جو مروجہ برش اور پیسٹ سے دور نہیں ہوتے بلکہ ان کو صرف مسواک ہی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔

طب اور میڈیکل سائنس نے ثابت کر دکھایا ہے کہ مسواک سے دماغ کو قوت حاصل ہوتی ہے اور اس سے دماغ کی صحت برقرار رہتی ہے۔ دماغ مسواک کرنے سے تیز ہوتا ہے اور طویل عرصہ تک تندرست رہ سکتا ہے۔

اگر مسواک سے دانتوں کو صاف نہ کیا جائے تو دانت گندے ہو جاتے ہیں۔ جس کی

وجہ سے جبڑوں اور مسوڑھوں میں پیپ بن جاتی ہے جو دماغی امراض کا سبب بنتی ہے۔نفسیاتی بیماریاں بھی اسی سے لاحق ہوتی ہیں۔

انسان کھانا کھاتا ہے، پانی پیتا ہے اور کئی ایک دیگر اشیاء بھی کھاتا رہتا ہے۔جس سے کھانے کے چھوٹے چھوٹے ذرے دانتوں کے درمیان پھنستے رہتے ہیں جو معمول کے مطابق صرف کلی کرنے سے خارج نہیں ہوتے جس کی وجہ سے دانتوں میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے جو کئی بیماریوں کا موجب بنتا ہے۔

ظاہراً بھی اگر آدمی کے دانت گندے ہوں تو بو آنے لگ جاتی ہے۔قریب بیٹھنے والے لوگ بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ ان تعفن زدہ دانتوں کی وجہ سے مسوڑھے بھی متعفن ہو جاتے ہیں۔مسوڑھوں میں پیپ پڑ جاتی ہے جس کی وجہ سے ناقابلِ برداشت درد شروع ہو جاتا ہے۔اس کا اثر فقط دانتوں پر ہی نہیں پڑتا بلکہ یہ تعفن اور پیپ مزید بڑھ کر گلے پر بھی اثر ڈالتی ہے۔اس کے اثر سے گلا خراب ہونے لگتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ کھانسی، نزلہ، زکام اور بخار وغیرہ کی آمد ہو جاتی ہے۔چھاتی پر بلغم بننا شروع ہو جاتی ہے جس سے دماغ متاثر ہو جاتا ہے اور اس کے اثر سے بینائی بھی کمزور ہو جاتی ہے۔جب آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں تو اس پیپ اور تعفن کی وجہ سے کان اور معدہ بھی متاثر ہو جاتے ہیں بلکہ یہ جراثیم سارے بدن پر نقصان دہ اثر ڈالتے ہیں۔

یوں دانت مسواک سے صاف نہ کرنے کے باعث انسانی زندگی برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔زندگی تو صحت اور تندرستی سے ہے اگر آدمی تندرست ہی نہ رہے تو کیا زندگی۔؟پس مسواک کے بغیر چارہ نہیں اور بغیر مسواک کسی بھی صورت پیپ، تعفن اور غیر مرئی جراثیم کو دور نہیں کیا جا سکتا۔

جن مریضوں کا گلا خراب ہوتا ہے وہ ٹانسلو کے مریض ہوتے ہیں۔ایسے مریض باقاعدہ مسواک کے استعمال سے تندرست ہو سکتے ہیں۔اسی طرح اگر کسی مریض کے گلے کے غدود بڑھ گئے ہوں تو وہ شربتِ شہتوت اور باقاعدہ مسواک کر کے آرام حاصل کر سکتا ہے۔

بعض مرتبہ منہ کے اندر گرمی، تعفن، تیزابیت اور غیر مرئی جراثیم کی وجہ سے چھالے

ہو جاتے ہیں۔ ان چھالوں میں سے ایسی قسم کے چھالے بھی ہوتے ہیں جو کبھی نکل آتے ہیں اور کبھی چھپ جاتے ہیں۔ یہ نہایت تکلیف اور نقصان دہ ہوتے ہیں۔ ان کے جراثیم پورے منہ میں پھیل کر پورے منہ کو اپنے لپیٹ میں لے لیتے ہیں، جس کی وجہ سے کھانا تناول کرنا مشکل و ناممکن ہو جاتا ہے اور مریض بھوک کی وجہ سے کمزور پڑ جاتا ہے۔ اگر روزانہ بلاناغہ تازہ مسواک کی جائے، اس کے لعاب کو اچھی طرح منہ میں ملا جائے تو یہ مرض پیدا ہی نہ ہوگا اور اگر کبھی سستی کی وجہ سے ہو گیا تو مسواک کے باقاعدہ استعمال سے مریض تندرست ہو جائے گا۔

آنکھوں کی بیماریوں اور نظر کے امراض میں دانتوں کی عدمِ صفائی کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ دانتوں کے خلاؤں میں پھنسے ہوئے خوراک کے ذرّات کی وجہ سے تعفن پیدا ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں آنکھوں کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں، نظر کمزور ہونے لگتی ہے اور اگر اسی طرح یہ تعفن باقی رہے تو آدمی آنکھوں کی روشنی سے بالکل محروم ہو جاتا ہے۔ کمزور بینائی کے مریضوں میں متعدد مریض ایسے ہوتے ہیں جن کے مرض کے دیگر اسباب کے علاوہ دانتوں کے بارے میں ان کی غفلت سب سے بڑا سبب ہوتی ہے۔

بعض ایسے مریض ہوتے ہیں جو کانوں کے ورم، پیپ اور درد میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مہنگے سے مہنگا علاج کرانے کے باوجود انہیں اس تکلیف سے نجات نہیں ملتی۔ جب اچھی طرح ایسے مریضوں کی تشخیص کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مسوڑھوں میں پیپ پڑ گئی ہے اور سارا منہ تعفن سے بھرپور ہے۔ جب مسوڑھوں کا علاج کیا جاتا ہے اور باقاعدہ تازہ مسواک کی جاتی ہے تو ساتھ ہی کان بھی بالکل صحتمند ہو جاتے ہیں۔

ماہرینِ کے تجربات سے یہ بات تحقیق شدہ ہے کہ تقریباً اسی فیصد امراض کی وجہ معدہ اور دانتوں کے نقائص اور بیماریاں ہوتی ہیں۔ بالخصوص آج کل ہر تیسرا شخص معدے کے امراض میں مبتلا ہے۔

مسواک نہ کرنے کی وجہ سے منہ میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے جس کے ساتھ ہی مسوڑھوں میں پیپ پڑ جاتی ہے اور کچھ غیر مرئی جراثیم بھی منہ میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب کھانا کھایا جاتا ہے تو غذا کے ساتھ مسوڑھوں کی پیپ بھی معدے میں جاتی

ہے، جس کی وجہ سے معدہ ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ مسوڑھوں کی پیپ کی وجہ سے کھائی جانے والی غذا غلیظ اور متعفن ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے معدہ اور جگر کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں جن سے جان چھوڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر جگر اور معدہ کے امراض کا علاج کرنے سے قبل دانتوں کی صحت کی طرف توجہ دی جائے یعنی مسواک بلاناغہ کی جائے تو امراض کا فوری اور مستقل علاج ہو سکتا ہے۔

دائمی نزلہ اور زکام کے ایسے مریض جن کی بلغم رُک چکی ہو جب وہ مسواک کرتے ہیں تو وہ بلغم اندر سے خارج ہونا شروع ہو جاتی ہے اور یوں مریض کا دماغ ہلکا ہو جاتا ہے۔

پیتھالوجسٹ حضرات کے تجربے اور تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دائمی نزلہ کے لیے مسواک تریاق سے کم نہیں۔ یہاں تک کہ مسواک کے مستقل اور باقاعدہ استعمال سے ناک کے آپریشن اور گلے کے آپریشن کے مواقع بہت کم ہو جاتے ہیں۔

ایک شخص کے منہ سے بو آیا کرتی تھی۔ اس بیچارے نے متعدد اچھی اچھی قسم کی ٹوتھ پیسٹ اور منجن استعمال کئے، اس کے علاوہ متعدد ڈاکٹروں سے مختلف ادویات بھی استعمال کیں مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔

کسی ڈینٹل سپشلسٹ کے مشورے سے اس نے پیلو کے پودے کی مسواک استعمال کی۔ وہ باقاعدہ مسواک استعمال کرتا اور پرانے ریشوں کو کاٹ کر روزانہ نئے سرے سے مسواک کرتا رہا تو تھوڑا عرصہ گزرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اسے تندرستی عطا فرما دی۔

گورونانک کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے ہاتھ میں مسواک رکھا کرتا تھا، دانتوں کو اس سے صاف کرتا اور نیز کہا کرتا تھا:

"یا یہ لکڑی لے لو اور یا پھر بیماری لے لو۔!"

بڑی معتبر بات ہے کہ اگر مسواک لے کر استعمال کرو گے تو مرض جاتا رہے گا اور اگر اس سے غفلت کرو گے تو بیمار ہو جاؤ گے۔

ایک شخص کے گلے، گردن میں درد ہوتا تھا اور ساتھ ہی گردن میں سوجن بھی تھی۔ اس کے ساتھ آواز میں بھی کمی آ گئی اور ذہنی یادداشت میں بھی کمی واقع ہوئی۔ نیز سر چکرانے لگا۔

یہ آدمی برین اسپیشلسٹ اور جنرل فزیشن اسپیشلسٹ وغیرہ کے زیرِ علاج رہا مگر سب بے سود ثابت ہوئے۔ کسی کے مشورے سے وہ باقاعدہ مسواک کرنے لگا۔ اس طرح کہ مسواک کے دو ٹکڑے کر کے پانی میں اُبالتا اور اس پانی سے غرارے کرتا۔ علاوہ ازیں جہاں سوجن تھی وہاں کچھ دوائی بھی لیپ کی گئی۔ یہ علاج بڑا مفید ثابت ہوا۔ اس کی تحقیق کی گئی تو اس کے تھائی رائیڈ گلینڈ متاثر تھے جس کا اثر سارے جسم پر واقع ہوا تھا۔ اس مسواک والے علاج سے اس کی یہ بیماری دور ہو گئی اور وہ شفائے کاملہ سے ہمکنار ہو گیا۔

حکیم ''ایس ایم اقبال'' لکھتے ہیں:

''ایک مریض کے دل کی جھلیوں میں پیپ تھی۔ وہ علاج کراتا رہا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بالآخر دل کا آپریشن کیا گیا اور پیپ نکال دی گئی۔ بدقسمتی سے پیپ پھر بھر گئی۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر وہ مریض میرے پاس آیا تو میں نے اس کا معائینہ کرتے ہوئے معلوم کیا کہ اس کے مسوڑھے خراب ہیں اور ان میں بھی پیپ ہے اور یہی پیپ دل کو بھی متاثر کرتی ہے۔ یہ تشخص ڈاکٹروں نے بھی تسلیم کر لیا۔ دل کا آپریشن کرنے کی بجائے اس کے دانتوں اور مسوڑھوں کا علاج کیا گیا اور اسے پیلو کی مسواک استعمال کرنے کو کہا گیا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسے شفا عطا فرما دی۔''

تحقیق و تجربات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جو ٹوتھ برش ایک مرتبہ استعمال ہو جائے اس میں جراثیم کی تہہ جم جانے کے باعث دوبارہ استعمال کرنے سے صحت کو نقصان پہنچتا ہے۔ پانی سے صاف کرنے سے بھی وہ جراثیم صاف نہیں ہوتے اور اپنی نشوونما برقرار رکھتے ہیں۔ مزید برآں کہ برش کے استعمال سے دانتوں کے اوپر والی چمکیلی اور سفید تہہ اتر جاتی ہے۔ بایں سبب دانتوں کے درمیان خلا ہو جاتا ہے اور دانت مسوڑھوں کی جگہ چھوڑتے جاتے ہیں۔ لہذا غذا کے جو ذرات دانتوں کے خلا میں اڑے رہتے ہیں وہ دانتوں کے لیے نہایت نقصان دہ ہوتے ہیں اور بالآخر سارے جسم میں بیماریوں کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس لیے ان مصیبتوں سے بچنے کے لیے سنت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کیجئے یعنی مسواک صبح و شام متواتر استعمال کیجئے اور تندرستی قائم

رکھیئے۔

مسواک کے لیے ہر اس درخت کی شاخ مناسب ہوتی ہے جس کے ریشے نرم ہوں کہ دانتوں میں خلا نہ بنائیں اور مسوڑھوں کو نقصان نہ پہنچائیں۔ بہترین اور اعلیٰ مسواک درج ذیل پودوں کے ہوتے ہیں۔

(1): پیلو۔ (2): نیم۔

(3): کیکر۔ (4): کنیر۔

پیلو کا مسواک تحفہ کے طور پر دینا سنت رسول اکرم علیہ السلام ہے۔ چنانچہ حضرت ابوخیرہ صباحی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اس وفد میں شامل تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ علیہ السلام نے ہمیں پیلو کے درخت کی لکڑیاں مسواک کرنے کے لیے توشہ میں دیں۔

(مجمع الزوائد، جلد 2، صفحہ 268)

پیلو کا مسواک نرم ریشوں والا ہوتا ہے۔ اس میں کیلشیم اور فاسفورس ہوتی ہے۔ اکثر کلر زدہ، شور اور ویران و بیابان مقامات پر ہوتا ہے۔ جدید سائنسی اور طبی تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ مختلف اشیاء جو دماغ کی خوراک و معاون ہیں ان میں سے ایک فاسفورس بھی ہے۔ پیلو کی مسواک میں موجود فاسفورس لعاب اور مساموں کے ذریعے دماغ تک پہنچتا ہے جس کے ذریعے دماغ کو قوت حاصل ہوتی ہے۔

نیم کے درخت کا مسواک بھی نہایت مفید ہے۔ اس میں دانتوں کی مجموعی بیماریوں کا علاج ہے۔ یہ درخت میں عام پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر کیکر کے مسواک کا درجہ ہے۔ اس سے دانت بڑی اچھی طرح صاف کیے جاسکتے ہیں اور یہ دانتوں کو تعفن اور پیپ سے بچائے رکھتا ہے۔

یاد رہے کہ ممکن حد تک مسواک تازہ ہونی چاہیے اگر پہلے استعمال شدہ مسواک استعمال کرنا ہو تو اس کے پہلے استعمال شدہ ریشے کاٹ دیں اور دانتوں سے نئے سرے سے چبا کر ریشے بنائیں۔

کنیر دو قسم کا ہوتا ہے۔ سفید پھولوں والا اور سرخ پھولوں والا۔ یہ پودا اکثر پارکوں اور

باغات وغیرہ میں ہوتا ہے۔ اس کی مسواک استعمال کرنے سے دانتوں کی تمام تکالیف پائیوریا وغیرہ ختم ہو جاتی ہیں اور لاعلاج مریض بھی تندرست ہو جاتے ہیں۔ یہ مسواک کڑوی ہوتی ہے مگر اس کی یہی کڑواہٹ دانتوں کے لیے ازحد مفید ہے۔ اطباء نے اس میں موجود اجزاء کے باعث دانتوں کی چمک، مضبوطی اور پائیوریا جیسے امراض کے لیے اسے اکسیر اعظم قرار دیا۔

خالق کائنات نے انسان کو پیدا فرمایا تو ساتھ اس کے استعمال کے لیے وہ اشیاء بھی پیدا فرمائیں جو اس کی صحت و تندرستی کو قائم رکھنے کا باعث ہیں اور اپنے خاص بندوں یعنی انبیاء و رسل علیہم السلام کو بھیج کر بنی نوع انسان کو ایسی اشیاء کا استعمال بھی بتا دیا۔ انہی اشیاء میں مسواک بھی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعے بنی نوع انسان تک پہنچائی، اس کے فوائد بیان فرمائے اور اس کو تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت اور کثیر بیماریوں کی شفاء کا درجہ دیا۔

وضو...... اسلام اور انسانی صحت:

اسلام جہاں مسلمانوں کو روحانی پاکیزگی کا حکم دیتا ہے، وہاں اس کی تعلیمات مسلمانوں کو جسم و لباس کی تطہیر کا بھی درس دیتی ہیں۔ اگر اسلامی طہارت کے طریقوں پر غور کیا جائے تو اس کا معیار سائنس کے طریقوں سے بھی اعلیٰ وارفع نظر آئے۔ نماز سے پہلے وضو کا حکم دیا گیا۔ یہ روحانی و جسمانی دونوں فوائد پر حاوی ہے، اسی وجہ سے خود وضو کو روحانی عبادت کا درجہ دیا گیا ہے۔

ایک موقعہ پر ایک غیر مسلم سائنسدان نے ایک مسلمان کو وضو کرتے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ کلائی سے کہنی تک حصہ دھوتے وقت مستعمل پانی کو ڈھلے ہوئے پنجوں کی طرف سے نہیں بلکہ کہنی کی طرف سے (پنجوں کی طرف) بہایا جاتا ہے۔ وہ اس طریقہ سے بہت متاثر ہوا۔ پھر اس نے سر اور گردن پر مسح کی سائنٹیفک ترکیب کو دیکھا۔ اس نے غور کیا کہ سر اور گردن کو دھویا نہیں جاتا جس سے گرم گرم حالت میں نقصان پہنچ جانے کا امکان ہے بلکہ (سر اور گردن کو دھونے کی بجائے) ہاتھ پھیرا (مسح کیا) جاتا ہے جس سے تسکین کے علاوہ اعصاب میں ارتعاشی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو دھونے سے نہیں ہو سکتی۔

چونکہ پشت اور گردن کا تعلق مبدءُ النخاع سے ہے اور دماغی و عصبی اعمال میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس طریقہ کو دیکھ کر (وہ غیر مسلم سائنسدان) اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اسلام کے سامنے اپنی گردن جھکا دی۔ اس نے سوچا کہ تیرا سو برس پہلے جس شخصیت نے نماز سے پہلے طہارت اور تفریحِ اعضائے بدن کا یہ طریقہ سکھایا وہ نبی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد عالمگیر خاں، ایف۔ آر۔ سی۔ پی، جراثیم سے بچاؤ کے لیے وضو کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "وضو حفظانِ صحت کے زریں اصولوں میں سے ہے۔ یہ جراثیم کے خلاف ایک بہت بڑی ڈھال ہے۔ بہت سی بیماریاں جراثیم کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ جراثیم ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ ہوا، زمین اور ہمارے استعمال کی ہر چیز پر یہ موذی (جراثیم) مسلط ہیں۔ جسمِ انسانی کی حیثیت ایک قلعے کی سی ہے۔ کوئی دشمن اس میں داخل نہیں ہو سکتا ماسوائے سوراخوں یا زخموں کے راستوں سے۔ منہ اور ناک کے سوراخ ہر وقت جراثیم کی زد میں ہیں اور ہمارے ہاتھ ان (جراثیم) کو اندر لے جانے میں مدد کرتے ہیں۔ وضو کے ذریعے ہم صرف ان سوراخوں کو ہی نہیں بلکہ اپنے جسم کے ہر حصے کو جو کپڑے سے ڈھکا ہوا نہیں ہے اور آسانی سے جراثیم کی آماجگاہ بن سکتا ہے، دن میں کئی بار دھوتے ہیں لہٰذا وضو ہمیں بہت سی بیماریوں سے محفوظ رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔"

حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی (جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ طب و جراحت کے صدر ہیں اور اسی یونیورسٹی سے شعبۂ دینیات میں ڈاکٹریٹ بھی کر چکے ہیں) وضو کے جسمانی فوائد کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "وضو کے ذریعہ انسان کے وہ اعضاء جو کھلے رہتے ہیں۔ مثلاً ہاتھ، منہ، ناک، آنکھیں اور چہرہ دھل کر صاف ہو جاتے ہیں۔ یہ اعضاء ہمہ وقت کھلے رہنے اور اِن دنیوی اُمور میں مشغول رہنے کی وجہ سے مختلف قسم کی

گندگیوں اور اجرامِ خبیثہ سے ملوث ہو جاتے ہیں اور اکثر متعدی امراض پیدا کرنے کا سبب بن سکتے ہیں۔ وضو کے ذریعہ یہ سب کثافتیں دھل کر صاف ہو جاتی ہیں۔ وضو کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ تھکان یا خواب کے باعث جو گرانی اور اضمحلال طبیعتِ انسانی میں پیدا ہوتا ہے وہ وضو کے بعد دفع ہو جاتا ہے۔ انسان کے دل و دماغ میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ وضو عصبی مراکز میں تحریک پیدا کرتا ہے۔

(اسلامی اصول صحت، صفحہ 31، از ڈاکٹر سید حکیم محمد کمال الدین حسین ہمدانی، ناشر حی الفلاح سوسائٹی علی گڑھ بھارت)

ترک ڈاکٹر "ہلوک نور باقی" نے "وضو اچھی صحت کا بہترین نسخہ" کے تحت وضو کی طبی افادیت بالتفصیل بیان کی ہے۔ پہلے انہوں نے نظامِ دورانِ خون پر وضو کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ پھر لمفیٹک سسٹم پر وضو کے ذریعے مرتب ہونے والے اثر پر بحث کی ہے جو متعدی بیماریوں سے محفوظ رکھنے کا نظام ہے اور آخر میں وضو اور جسمانی برق سکونی پر سائنسی نقطۂ نظر سے گفتگو کی ہے۔

"ڈاکٹر نور باقی" کے مطابق جس طرح وضو کیا جاتا ہے اس کا مقصد جسم میں تحفظ دینے والے نظام کو تقویت پہنچانا ہے۔

اس کی وجوہ یہ ہیں:

(1): جسم کو تحفظ دینے والے "لمفی نظام" کے صحیح طور پر عمل پیرا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ جسم کے کسی چھوٹے سے حصہ کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ وضو اس امر کی ضمانت مہیا کرتا ہے۔

(2): جسم میں تحفظ دینے والے نظام کو تحریک دینے کے لیے مرکزی مقام وہ جگہ ہے جو ناک کے پیچھے اور نتھنوں میں ہوتی ہے اور ان مقامات کو دھونا وضو میں بطورِ خاص شامل ہے۔

(3): گردن کے دونوں طرف وضو کے ذریعے تحریک پیدا کرنا تحفظ دینے والے "لمفی نظام" کو بروئے کار لانے میں بے حد اہم ہے۔

ایک نامور جرمن فاضل اور مستشرق ''جوا کیم دی یولف'' حفظانِ صحت کے متعلق قرآنِ مجید فرقانِ حمید کی تعلیمات پر غور و خوض کرنے کے بعد ایک حقیقت کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''غسل میں تمام جسم اور وضو میں ان اعضاء کا پاک کرنا ضروری ہے جو عام کاروبار یا چلنے پھرنے میں کھلے رہتے ہیں۔ منہ صاف کرنا، مسواک کرنا اور ناک کے اندورنی گرد و غبار وغیرہ کو دور کرنا یہ تمام حفظِ صحت کے لوازم ہیں اور ان واجبات کی بڑی شرط آبِ رواں کا استعمال ہے جو فی الواقع جراثیم کے وجود سے پاک ہوتا ہے۔''

اسلام میں جسمانی طہارت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ پانچوں نمازوں سے قبل وضو فرض ولازم ٹھہرایا گیا۔ اسی طرح وظیفۂ زوجیت کی ادائیگی کے بعد زوجین کو غسل کرنا یا حیض ونفاس کے بعد عورت کو غسل کرنا ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادۂ منویہ اور حیض ونفاس کا گندا خون جراثیموں کی آماجگاہ ہے، اسی لیے ضروری ہے کہ ان نجاستوں کو مکمل طور پر جسم سے دور کیا جائے تا کہ مختلف خوردبینی موجودات وہاں پر پرورش پا کر اپنی تعداد میں تیزی سے اضافہ کر کے جسم کو کسی بیماری میں مبتلا نہ کر سکیں۔

اس کے علاوہ بدن کو پانی سے دھونے کی وجہ سے جس فرحت کا اثر روح تک پہنچتا ہے وہ بھی مخفی نہیں لیکن یہاں صرف جسم پر جراثیمی حملے سے حفاظت کا ذکر کرنا مطلوب ہے۔

اگر نمازِ عشاء ادا کرنے کے بعد انسان گھریلو اُمور میں مصروف ہو جائے یا ویسے ہی بیکار بیٹھا رہے اور اس کا وضو ختم ہو جائے تو بہتر ہے کہ وہ وضو کر کے سوئے کیونکہ وضو کر کے سونے سے پر سکون اور گہری نیند آتی ہے اور جسم بھی مکمل طور پر جراثیم سے پاک ہوتا ہے۔

اگر ہاتھوں پر جراثیم وغیرہ موجود ہوں تو نیند کے دوران وہ باآسانی منہ یا ناک کے راستے جسم میں پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کھانے کے بعد بغیر ہاتھ دھوئے سویا جائے تو فضا میں موجود جراثیم اور دیگر کیڑے، چکنائی اور کھانے کے ذرات پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص رات کو اس حال میں سویا کہ اس کے ہاتھوں میں چکنائی کی باس تھی

اور پھر اسے کوئی تکلیف پہنچ جائے تو وہ اپنے نفس ہی کو برا کہے کہ اسی کی غفلت سے ایسا ہوا ہے۔"

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سونے سے پہلے خود بھی باقاعدہ وضو فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:

"جب تم بستر پر جانے کا ارادہ کرو تو وضو کرو جس طرح نماز کے لیے وضو کرتے ہو۔"

(الصحیح البخاری، کتاب الوضوء، باب فضل من مات علی الوضوء، حدیث نمبر 242)

ڈاکٹر امتیاز رسول کہتے ہیں:

"سونے سے پہلے ہاتھ، منہ اور دوسرے حصوں کو دھونا ضروری ہے کیونکہ دن بھر مٹی، گرد و غبار اور جراثیم مساموں میں جمع ہو کر جلد کو خراب کر سکتے ہیں۔ منہ دھونے سے آنکھوں میں جمع گرد و غبار بھی صاف ہو جائے گا۔"

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جسمانی طہارت کی بہت تاکید فرمائی ہے۔ جیسا کہ بخاری شریف میں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:

"ہر مسلمان پر خدا کا یہ حق ہے کہ وہ ہفتہ میں ایک دن غسل کرے اور اپنے سر اور بدن کو دھویا کرے۔"

ایک موقعہ پر سرور کائنات نے ارشاد فرمایا:

"ہر شخص روزانہ صبح اٹھ کر کسی کھانے پینے کی چیز کو ہاتھ لگانے سے پہلے کم از کم تین مرتبہ اپنے ہاتھوں کو دھوئے۔"

جسم کو ہر وقت صاف ستھرا رکھنا، صاف کپڑے پہننا اور نہانا صفائی کا حصہ ہیں۔ یہ اقدامات جسم کی جلد پر ہر وقت موجود جراثیم اور بہت سے دوسرے جراثیم کو دھو کر بہا دیتے ہیں اور جلد صاف ہو جاتی ہے۔ جونہی صفائی ستھرائی میں کمی آئے یہ جراثیم اپنا ہاتھ دکھاتے ہیں، قسم قسم کی جلدی بیماریاں آلیتی ہیں اور جلد کے ذریعے جسم کے باقی اعضاء مثلاً ہڈی، پٹھے اور جوڑ وغیرہ کو متاثر کرتی ہیں۔ ان بیماریوں سے بچنے کے لیے آج کل کی میڈیکل

سائنس کا اصول ہے کہ بار بار نہایا جائے اور جسم کو صاف ستھرا رکھا جائے، جس سے جلد پر موجود جراثیم دھلتے رہیں گے اور انسانی جلد و جسم ان جراثیم کے نقصان سے محفوظ رہے گا۔

مسلمان مردوں اور عورتوں پر بعض صورتوں میں غسل فرض ہو جاتا ہے۔ (کن کن اسباب سے غسل فرض ہوتا ہے اس کی تفصیل کتب فقہ میں دیکھیے۔) حالت جنابت میں غسل کرنے میں بھی حکمتیں موجود ہیں۔

طب شاہد ہے کہ جنابت کی حالت میں پسینہ بھی کثیف ہو جاتا ہے اور پسینہ سے جو میل کچیل جسم پر جم جاتا ہے اس کو اگر مَل مَل کر صاف نہ کیا جائے تو وہ موجب خارش وغیرہ ہوتا ہے۔ غسل کی پابندی کرنے والے مذکورہ جلدی امراض سے محفوظ و مامون رہتے ہیں۔ امراض کے دفعیہ کے علاوہ غسل کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ غسل سے جسم میں تازگی اور توانائی پیدا ہوتی ہے، افکارِ فاسدہ سے دل و دماغ آزاد ہو جاتے ہیں اور قلب میں فرحت و انبساط اور فرائض کی ادائیگی کے لیے ایک جوش و خروش انسان محسوس کرتا ہے جس سے صحت بہتر رہتی ہے۔

نامور جرمن مستشرق ''جوا کیم دی یولف'' لکھتا ہے:

''غسل اور وضو کے واجبات نہایت دور اندیشی اور مصلحت پر مبنی ہیں۔''

(الصالح العقلیہ لاحکام النقلیہ، صفحہ 406)

''اللہ تعالیٰ نے نماز فرض کی اور اس کے لیے وضو بھی فرض کیا۔ بغیر وضو کے نماز نہیں ہوتی۔ اگر وضو کے عمل پر غور کریں تو اس میں بھی یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ بار بار منہ، ہاتھ اور پاؤں دھونے سے، کلی کرنے سے، ناک میں پانی ڈالنے سے ہر حصے پر موجود جراثیم دھل جاتے ہیں اور اس طرح نمازی ان حصوں کی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔''

اوپر دیئے گئے حقائق کی وجہ سے کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وضو اور غسل کا مقصد انسانی جسم میں تحفظ مہیا کرنے والے نظام کو تقویت دینا نہیں ہے۔

ترک ڈاکٹر ''ہلوک نور باقی'' نے ''وضو اچھی صحت کا بہترین نسخہ'' میں یہ بات ظاہر کی ہے کہ ان کے نزدیک چہرے کی خوبصورتی اور جلد کے نقائص سے بچنے کے لیے وضو ایک

ڈھال ہے۔ان کے نزدیک "سکونی برق" کا سب سے زیادہ نقصان وہ اثر جلد کے نیچے نزدیک ترین چھوٹے چھوٹے پٹھوں پر اس تسلسل سے پڑتا ہے کہ بالآخر یہ کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وقت سے پہلے جھریاں پڑنا شروع ہو جاتی ہیں اور یہ چہرے ہی سے شروع ہوتی ہیں۔یہ عمل تمام جسم پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

بہت سے لوگوں نے ان لوگوں کے چمکتے ہوئے چہرے کا راز پالیا جو ساری زندگی وضو کرنے کے عادی رہے۔جو کوئی بھی وضو کی عادت رکھتا ہے وہ یقیناً صحت مند اور نتیجتاً زیادہ خوبصورت جلد کا مالک ہوتا ہے۔ہمارے زمانے میں یہ ایک معجزہ ہی ہے کہ جب اس خوبصورتی کے لیے کروڑوں کے اخراجات کیے جا رہے ہوں مگر اس سے دس گنا زیادہ خرچ بھی وضو کی برکات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

محمد فاروق کمال ایم فارمیسی (لندن یونیورسٹی) مختلف انسانی اعضاء پر وضو کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انسان جب منہ دھوتا ہے تو اس سے آنکھیں دھلتی ہیں، ناک صاف ہوتا ہے، چہرے کی جلد دھلتی ہے جس کی وجہ سے جلد میں ایک تازگی اور حسن پیدا ہوتا ہے اور جلد کی جھریوں سے انسان کو حفاظت ملتی ہے۔کہنیوں تک ہاتھ اور پاؤں اچھی طرح دھونے سے انسان جلدی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے اور اس عمل سے دورانِ خون کا عمل ہر اس جگہ تیز ہو جاتا ہے جہاں جہاں پانی پہنچتا ہے۔میل کچیل نکلنے سے جلد کی رنگت میں نکھار پیدا ہوتا ہے اور مخصوص چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ہر نماز کے ساتھ مسواک کا بھی حکم ہے۔اس کے بیش بہا فوائد ہیں۔(جیسا کہ پچھلے صفحات میں ذکر کیا گیا) سر اور گردن کا مسح انسان کے سر سے ہلکی پھلکی لگی ہوئی گرد و غبار جھاڑ دیتا ہے۔یوں بالوں کا حسن قائم رہتا ہے۔وضو کے جسمانی فوائد کے ساتھ ساتھ نفسیاتی طور پر بھی انسان بہت سکون محسوس کرتا ہے، سمارٹ نظر آتا ہے اور ذہنی طور پر پاکی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔"

وضو کے دوران عموماً جسم کے ان حصوں کو دھونا لازم قرار دیا گیا ہے جو کھلے ہوتے ہیں

اور براہِ راست جراثیموں کی زد میں ہوتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کہ میں نے اپنے حبیب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

"مومن کا زیور قیامت کے دن وہاں تک پہنچے گا جہاں تک وضو کا پانی پہنچتا ہے۔"

(الصحیح المسلم، باب تبلیغ الحلیۃ، صفحہ نمبر 585)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ان امتی یدعون یوم القیامۃ غرا محجلین من آثار الوضوء فمن استطاع منکم ان یطیل غرتہ فلیفعل"

(الصحیح البخاری، باب فضل الوضوء والغر المحجلون، صفحہ نمبر 136)

"بیشک میری امت قیامت کے دن اس حال میں بلائی جائے گی کہ ان کے وضو والے اعضاء چمکدار ہوں گے، لہٰذا جو شخص اپنی روشنی کو بڑھانا چاہے تو اسے چاہیے کہ اسے بڑھائے۔"

امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"من توضا فاحسن الوضوء خرجت خطایاہ من جسدہ حتّٰی تخرج من تحت اظفارہ"

(الصحیح المسلم، باب خروج الخطایا، صفحہ نمبر 578)

"جس نے وضو کیا اور اچھی طرح وضو کیا تو اس کے گناہ جسم سے نکل جاتے ہیں یہاں تک کہ گناہ وضو کرنے والے کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں۔"

امیر المومنین وخلیفۃ المسلمین سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لایسبغ عبد الوضوء الا غفر اللہ ماتقدم من ذنبہ وماتاخر"

(مجمع الزوائد، جلد نمبر 1، عربی صفحہ 542)

"جو کوئی کامل وضو کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اگلے اور پچھلے سب گناہ معاف فرما دیتا ہے۔"

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"من توضا واحدة فتلك وظيفة الوجوء التی لابد منها ومن توضا اثنتين فله كفلان ومن توضا ثلاثا فذلك وضوئی ووضوع الانبياء قبلی"

(مسند احمد، جلد 2، عربی صفحہ 98)

"جو وضو کرتے ہوئے ہر عضو کو ایک مرتبہ دھوتا ہے تو یہ فرض کے درجہ میں ہے کہ اس کے بغیر وضو ہی نہیں ہوتا اور جو وضو میں ہر عضو دو دو مرتبہ دھوتا ہے تو اسے دُگنا اجر ملتا ہے اور جو وضو میں اعضاء کو تین تین مرتبہ دھوئے تو یہ میرا اور مجھ سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام کا وضو ہوگا۔"

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو آدمی نماز کے ارادے سے وضو کرنے کے لیے اٹھتا ہے پھر اپنے دونوں ہاتھ گٹوں تک دھوتا ہے تو اس کے ہاتھوں کے گناہ پانی کے پہلے قطرے کے ساتھ ہی جھڑ جاتے ہیں۔ پھر جب کلی کرتا ہے، ناک میں پانی ڈالتا ہے اور ناک صاف کرتا ہے تو اس کی زبان اور ہونٹوں کے گناہ پانی کے پہلے قطرے کے ساتھ ہی جھڑ جاتے ہیں۔ پھر جب اپنے چہرے کو دھوتا ہے تو اپنے گناہوں سے ایسے پاک ہو جاتا ہے جیسے آج ہی اس کی ماں نے اس کو جنا ہو۔ پھر جب نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس نماز کی وجہ سے اس کا درجہ بلند کر دیتا ہے اور اگر بیٹھا رہتا ہے (یعنی نماز میں مشغول نہیں ہوتا) تب بھی گناہوں سے پاک صاف بیٹھا رہتا ہے۔"

(مسند احمد، جلد نمبر 5، عربی صفحہ نمبر 263)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا:

”تم میں سے جو شخص اچھی طرح وضو کرے پھر ”اشهدان لااله الاالله وانّ محمداعبده ورسوله“ پڑھے تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھل جاتے ہیں کہ جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہو جائے۔“

(الصحیح المسلم، باب الذکر المستحب عقب الوضوء، صفحہ نمبر 553)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”ومن توضا ثم قال سبحانك اللهم وبحمدك لااله الا انت استغفرك واتوب اليك كتب فى رق ثم طبع بطابع فلم يكسر الى يوم القيامة“

(والفقہ الذہبی، جلد 1، عربی صفحہ نمبر 563)

”جو شخص وضو کرنے کے بعد ”سبحانك اللهم وبحمدك لااله الاانت استغفرك واتوب اليك“ پڑھتا ہے تو ان کلمات کو ایک کاغذ پر لکھ کر مہر لگا دی جاتی ہے جو قیامت تک نہیں توڑی جاتی۔“

طریقۂ وضو: اللہ تبارک وتعالیٰ وضو کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب مبین قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

”یایها الذین امنوا اذاقمتم الى الصلوة فاغسلوا وجوهكم وايديكم الى المرافق وامسحوا برؤسكم وارجلكم الى الكعبين“

(القرآن المجید، سورت مائدہ، آیت نمبر 6)

”اے ایمان والو! جب تم نماز کا ارادہ کرو تو اپنے چہروں اور ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک دھو لو۔“

وضو کے فرائض چار ہیں جیسا کہ مذکورہ آیت مقدسہ سے ثابت ہوتا ہے:

پہلا فرض: چہرے کو پیشانی سے ٹھوڑی کے نیچے تک اور ایک کان کی لو سے دوسرے کان کی لو تک اس طرح دھونا کہ بال برابر جگہ بھی خشک نہ رہے۔

دوسرا فرض: بازوؤں کو کہنیوں سمیت اس طرح دھونا کہ کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے۔

تیسرا فرض: چوتھائی سر کا مسح کرنا۔

چوتھا فرض: ٹخنوں سمیت پاؤں دھونا کہ کوئی جگہ پانی بہنے سے خالی نہ رہے۔

وضو کرتے وقت ان چار فرائض کا اہتمام ضروری و لازمی ہے ورنہ بالاتفاق وضو درست نہ ہوگا۔

سنن وضو درج ذیل ہیں:

1: وضو کی نیت کرنا۔ 2: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا۔

3: مسواک کرنا۔ 4: تین بار ہاتھوں کو گٹھوں تک دھونا۔

5: تین دفعہ کلی کرنا اور دانتوں پر انگلی کو ملنا۔

6: تین دفعہ ناک میں پانی ڈال کر صاف کرنا۔

7: تین بار چہرے کو دھونا۔

8: تین بار ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھونا۔

9: پہلے داہنے ہاتھ کو دھونا اور پھر بائیں کو۔

10: پورے سر کا مسح کرنا۔ 11: کانوں کا مسح کرنا۔

12: گردن کا مسح کرنا۔ (مستحب ہے)

13: دونوں پاؤں کو تین تین بار دھونا۔

14: پہلے دائیں پاؤں کو دھونا اور پھر بائیں کو۔

15: داڑھی کا خلال کرنا۔

16: پاؤں اور ہاتھ کی انگلیوں کا خلال کرنا۔

17: اعضاء کو مل مل کر اہتمام سے دھونا۔

18: ترتیب اور پے در پے دھونا۔

امیر المومنین خلیفۃ المسلمین سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے وضو کا پانی منگوایا اور وضو کیا تو تین مرتبہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑوں تک دھوئے، پھر تین بار کلی کی، تین بار ناک میں پانی ڈال کر صاف کیا، پھر تین مرتبہ اپنا چہرہ دھویا، پھر تین مرتبہ کہنی سمیت اپنا دایاں بازو دھویا، پھر تین مرتبہ کہنی سمیت اپنا بایاں بازو دھویا، پھر اپنے سر کا مسح کیا، پھر تین مرتبہ ٹخنوں سمیت اپنا دایاں پاؤں دھویا، پھر تین مرتبہ ٹخنوں سمیت اپنا بایاں پاؤں دھویا، پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا وضو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔"

(الصحیح المسلم، باب صفۃ الصلوۃ، جلد 1، عربی صفحہ نمبر 120)

وضو کے طبی فوائد: وضو کی ترتیب کے لحاظ سے وضو کے طبی و سائنسی فوائد ملاحظہ فرمائیں۔

جب وضو شروع کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے دونوں ہاتھ تین بار دھوئے جاتے ہیں۔ ایسا کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ حدیث شریف میں اسے گناہوں سے پاک کرنے والا عمل قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"فاذا غسل یدیه خرجت الخطایا من یدیه حتّٰی تخرج من تحت اظفار یدیه"

(سنن نسائی، باب مسح الاذنین مع الراس، رقم 103)

"وضو کرنے والا جب ہاتھوں کو دھوتا ہے تو ہاتھوں کے گناہ دھل جاتے ہیں یہاں تک کہ ہاتھوں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں۔"

چنانچہ ہاتھ دھونے سے جسمِ انسانی کو بہت سارے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ چند ایک ملاحظہ فرمائیں:

ہم مختلف اشیاء کو ہاتھوں سے ہی پکڑتے ہیں، نیز ہاتھ ننگے رہتے ہیں اس طرح ہاتھوں پر مختلف بیماریوں کے جراثیم یا مختلف کیمیکلز موجود رہتے ہیں جو ہمارے

ہاتھوں کو آلودہ کر دیتے ہیں، اگر ہاتھ دھوئے بغیر کلی کر لی جائے یا ناک میں پانی ڈال لیا جائے تو یہ جراثیم بآسانی ہمارے منہ یا ناک کے ذریعے جسم کے اندر جا سکتے ہیں اور جسم کو مختلف بیماریوں میں مبتلا کر سکتے ہیں۔اسی لیے دنیا بھر میں ہاتھ دھونے پر بہت زور دیا جا رہا ہے تا کہ مختلف آلائشیں ہمارے جسم کے اندر منتقل نہ ہو سکیں۔

اس سلسلے میں امریکی پروفیسر "ڈاکٹر شاہد اطہر" ایم ڈی نے بجا لکھا ہے۔!

جب ہم وضو کرتے ہیں تو انگلیوں کے پوروں میں سے نکلنے والی شعاعیں ایک ایسا حلقہ بنا لیتی ہیں جس کے نتیجے میں ہمارے اندر دور کرنے والا برقی نظام تیز ہو جاتا ہے اور برقی رو ایک حد تک ہاتھوں میں سمٹ آتی ہے۔اس عمل سے ہاتھ خوبصورت ہو جاتے ہیں۔صحیح طریقہ پر وضو کرنے سے انگلیوں میں ایسی لچک پیدا ہو جاتی ہے جس سے آدمی کے اندر تخلیقی صلاحیتوں کو کاغذ یا کینوس پر منتقل کرنے کی خفتہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔

دورانِ وضو تین بار کلی کرنا سنت ہے۔اس سے گناہ بھی دھل جاتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اذا توضا العبد المومن فتمضمض خرجت الخطایا من فیہ"

(مسند احمد، جلد نمبر 5، عربی صفحہ نمبر 263) (سنن نسائی، باب مسح الاذنین مع الراس، رقم 103)

"جب مومن وضو کرتے ہوئے کلی کرتا ہے تو اس کے منہ کے تمام گناہ دھل جاتے ہیں۔"

کلی کے ذریعے دانتوں میں کھانے کے پھنسے ہوئے ذرات منہ سے خارج ہو جاتے ہیں۔اگر دانتوں سے ان ذرات کو نہ نکالا جائے تو یہ دانتوں، دہن اور گلے کے مختلف امراض کا باعث بنتے ہیں۔

کلی کرنے سے جہاں منہ کی صفائی ہوتی ہے، وہاں دانتوں کی بیماریوں سے بھی نجات ملتی ہے، جبڑے مضبوط ہو جاتے ہیں اور دانتوں میں چمک دمک پیدا ہو جاتی ہے، قوتِ ذائقہ بڑھ جاتی ہے اور آدمی ٹونسلز کی بیماری سے محفوظ رہتا ہے۔

ناک میں پانی ڈالنا بھی نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مبارکہ ہے۔

دائیں ہاتھ سے ناک میں تین بار پانی ڈالیں اور بائیں ہاتھ سے صاف کریں۔ چنانچہ حدیث شریف میں ناک کی صفائی کو بھی کفارِ سیئات فرمایا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جب مومن وضو کرتے ہوئے ناک میں پانی ڈالتا ہے اور ناک صاف کرتا ہے تو ناک کے گناہ پانی کے پہلے قطرے سے ہی جھڑ جاتے ہیں۔“

(مسند احمد، جلد نمبر 5، عربی صفحہ نمبر 263)

سنن نسائی اور مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”فاذا استنشر خرجت الخطایا من انفه“

(سنن نسائی، باب مسح الاذنین مع الراس، رقم 103)

”بندہ مومن وضو کرتے ہوئے ناک دھوتا ہے تو ناک کے تمام گناہ دھل جاتے ہیں۔“

ناک کو دھونے اور صاف کرنے میں جہاں پاکیزگی حاصل ہوتی ہے وہاں طبی فوائد کا بھی حصول ہوتا ہے۔

کلی کرنے کے بعد ناک میں پانی ڈالا جاتا ہے۔ ناک انسانی جسم میں ایک نہایت اہم اور قابلِ توجہ عضو ہے۔ ناک کی زبردست صلاحیت یہ ہے کہ آواز میں گہرائی اور سہانا پن پیدا کرتا ہے۔ ذرا انگلیوں سے ناک کے نتھنوں کو دبا کر بات کرنے کی کوشش کیجئے آپ کو فرق معلوم ہو جائے گا۔ ناک کے اندر پردے آواز کی خوبصورتی میں ایک مخصوص کردار ادا کرتے ہیں۔ کاسۂ سر کو روشنی فراہم کرتے ہیں۔ ناک کے خاص فرائض میں صفائی کے کام کو بڑا دخل ہے۔ ناک پھیپھڑوں کے لیے ہوا کو صاف، گرم اور موزوں بناتی ہے۔ ہر آدمی کے اندر روزانہ تقریباً پانچ سو مکعب فٹ ہوا ناک کے ذریعے داخل ہوتی ہے۔ ہوا کی اتنی بڑی مقدار سے ایک بڑا کمرہ بھرا جا سکتا ہے۔ برف باری کے موسم میں منجمد اور خشک دن آپ برف پوش میدان میں اسکیٹنگ شروع کر دیں لیکن آپ کے پھیپھڑے خشک ہوا سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ وہ اس کی ایک رمق قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ انہیں اس وقت بھی ایسی ہوا کی ضرورت ہوتی ہے جو گرم اور مرطوب فضا میں ملتی ہے یعنی وہ ہوا جس میں

80 فیصد رطوبت ہو اور جس کا درجۂ حرارت 90 فارن ہائیٹ سے زیادہ ہو۔ پھپھوڑے جراثیم سے پاک دھوئیں یا گردو غبار اور آلودگیوں سے مصفا ہوا طلب کرتے ہیں۔ ایسی ہوا فراہم کرنے والا معمولی ائر کنڈیشنر ایک چھوٹے ٹرنک کے برابر ہوتا ہے لیکن ناک کے اندر نظام قدرت نے اس کو اتنا مختصر اور مجتمع کر دیا ہے کہ وہ صرف چند انچ لمبا ہے۔

ناک ہوا کو مرطوب بنانے کے لیے تقریباً چوتھائی گیلن نمی روزانہ پیدا کرتا ہے۔ صفائی اور دوسرے سخت کام نتھنوں کے بال انجام دیتے ہیں۔ ناک کے اندر ایک خوردبینی جھاڑو ہے۔ اس جھاڑو کے اندر غیر مرئی روئیں ہوتے ہیں جو ہوا کے ذریعے معدہ کے اندر پہنچنے والے مضر جراثیم کو ہلاک کر دیتی ہیں۔ جراثیم کو اپنے مشینی انداز میں پکڑنے کے علاوہ غیر مرئی رؤوں کے پاس ایک اور دفاعی ذریعہ ہے جسے انگریزی میں "Lysozinum" کہتے ہیں۔ اس دفاعی ذریعہ سے ناک آنکھوں کو "Infection" سے بچاتی ہے۔

جب کوئی نمازی وضو کرتے وقت ناک کے اندر پانی ڈالتا ہے تو پانی کے اندر کام کرنے والی برقی رَو ان غیر مرئی رؤوں کی کارکردگی کو تقویت پہنچاتی ہے جس کے نتیجے میں انسان بے شمار پیچیدہ بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔

وضو کرتے ہوئے ایک مرتبہ چہرہ دھونا فرض اور تین بار دھونا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ ہے۔ چہرہ کی حد سر کے بالوں سے لے کر ٹھوڑی کے نیچے تک اور ایک کان کی لو سے دوسرے کان کی لو تک ہے۔ حدیث شریف میں چہرہ دھونے کو بھی باعث رحمت فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"فاذا غسل وجهه خرجت الخطايا من وجهه حتّٰى تخرج من تحت اشفار عينيه"

(سنن نسائی، باب المسح الاذنین مع الراس، رقم 103)

"وضو کرنے والا جب اپنے چہرے کو دھوتا ہے تو اس کے چہرے کے گناہ جھڑ جاتے ہیں حتیٰ کہ گناہ پلکوں کی جڑوں سے نکل جاتے ہیں۔"

مزید برآں آپ علیہ السلام نے فرمایا:

"وضو کرنے والا جب چہرہ دھوتا ہے تو اپنے ہر گناہ اور غلطی سے اس طرح
پاک ہو جاتا ہے جیسے آج ہی اس کی ماں نے اس کو جنا ہو۔"
(مسند احمد، جلد نمبر 5، عربی صفحہ نمبر 263)

چہرہ دھونے کے بہت زیادہ طبی، طبعی اور سائنسی فوائد ہیں۔ چند ایک ملاحظہ فرمائیں۔

چہرہ دھونے میں بڑی حکمتیں پوشیدہ ہیں کہ اس سے عضلات میں نرمی اور لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ گرد وغبار سے بند مسامات کھل جاتے ہیں۔ چہرہ بارونق، پرکشش اور بارُعب ہو جاتا ہے۔ منہ دھوتے وقت جب پانی آنکھوں میں جاتا ہے تو اس سے آنکھوں کے عضلات کو تقویت پہنچتی ہے۔ ڈھیلے میں سفیدی اور پتلی میں چمک غالب آجاتی ہے۔ وضو کرنے والے بندے کی آنکھیں پرکشش، خوبصورت اور پرخمار ہو جاتی ہیں۔ چہرہ پر تین بار ہاتھ پھرنے سے دماغ پرسکون ہو جاتا ہے۔

آج کل جب ہم گھر سے باہر نکلتے ہیں اور ہمارا گزر ایسے مقامات سے بھی ہوتا ہے جہاں جراثیم بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مثلاً بعض مقامات پر کوڑے کے ڈھیر پڑے ہوتے ہیں یا جانوروں اور انسانوں کا فضلہ کھلا پڑا ہوتا ہے۔ کہیں کہیں تو مختلف حیوانات کے اجسام کے ناکارہ حصے جیسے آنتیں اور خون وغیرہ پھینک دیئے جاتے ہیں۔ یہ تمام مقامات جراثیموں کی آماجگاہ ہیں اور جب یہ کھلے پڑے ہوتے ہیں تو ان سے جراثیم فضا کو آلودہ کرتے رہتے ہیں اور جب انسان ایسی جگہ سے گزرتا ہے تو یہ جراثیم انسان کے چہرے اور ہاتھوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم دن میں کم از کم پانچ مرتبہ اپنا چہرہ دھوئیں تو ہم ان جراثیموں سے بچ سکتے ہیں جو چہرے پر پہنچنے کے بعد منہ اور ناک کے ذریعے انسانی جسم میں داخل ہو کر مختلف بیماریوں کا سبب بنتے ہیں۔

عصرِ حاضر کا سب سے بڑا مسئلہ آلودگی ہے۔ صنعتی ترقی نے ہمیں اس گھمبیر مسئلہ سے دوچار کر دیا ہے۔ فیکٹریوں کی چمنیوں سے نکلنے والی گیسیں اور گاڑیوں کے سائلینسرز سے خارج ہونے والے دھوئیں سے فضا آلودہ ہو رہی ہے۔ اس فضا کے اندر کاربن ڈائی آکسائیڈ اور کاربن مونو آکسائیڈ کے علاوہ سلفر ڈائی آکسائیڈ شامل ہوتی ہیں۔ اگر یہ گیسیں بکثرت فضا میں موجود ہوں اور ایک انسان پسینے سے شرابور ہو تو چہرے

پر موجود پسینہ کے قطرے ان گیسوں کے ساتھ عمل کر کے مختلف تیزابوں (کاربانک ایسڈ، سلفیورک ایسڈ) میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور یہ پسینہ سے بننے والے تیزاب انسانی جلد کو خراب کر دیتے ہیں۔ اس لیے چہرہ دھونے سے پسینہ اور زہریلے کیمیکلز وغیرہ کی تہہ ڈھل جاتی ہے اور انسان جلدی امراض اور چہرے کی الرجی سے محفوظ و مامون رہ سکتا ہے۔

چہرے کو وضو کے دوران دھونے سے انسان متعدد بیماریوں سے بچ سکتا ہے۔ آنکھوں کی بیماریوں کے دوران ڈاکٹر حضرات بار بار آنکھیں دھونے کا مشورہ دیتے ہیں۔"

حکیم محمد طارق محمود چغتائی کے مطابق وضو کرنے کے بعد بھنوئیں پانی سے تر ہو جاتی ہیں۔ میڈیکل سائنس کے اصول کے مطابق اگر بھنوؤں میں نمی رہے تو آنکھوں کے ایسے خطرناک امراض سے انسان بچ سکتا ہے جن میں آنکھ کے اندر رطوبت زجاجیہ کم ہو جاتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے اور مریض آہستہ آہستہ بصارت سے محروم ہو جاتا ہے۔

دن میں متعدد بار وضو کے لیے چہرہ دھونے سے اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ امریکن کونسل فار بیوٹی کی سرکردہ ممبر "لیڈی ہیچر" نے عجیب و غریب انکشاف کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کو کسی قسم کے کیمیاوی لوشن کی ضرورت نہیں۔ ان کے اسلامی وضو سے چہرہ دھلتا رہتا ہے اور مسلمان چہرے کے کئی امراض سے محفوظ رہتے ہیں۔"

وضو کرتے ہوئے ہلکی داڑھی کے بالوں کو دھویا جاتا ہے اور گھنی داڑھی میں انگلیوں سے خلال کر کے تمام بالوں کو تر کیا جاتا ہے، یہ سنت مصطفی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

داڑھی دھونے یا خلال کرنے سے بالوں کی جڑیں تر ہو جاتی ہیں اور انہیں مضبوطی وصفائی حاصل ہوتی ہے۔ داڑھی کے خلال کی وجہ سے بالوں میں موجود ہر قسم کے جراثیم دور ہو جاتے ہیں۔ داڑھی کے بالوں پر رُکا ہوا پانی گردن کے پٹھوں کو تقویت دیتا ہے۔ نیز تھائی رائیڈ گلینڈ اور گلے کی دیگر بیماریوں سے بچاتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات میں حکمت اور بہتری ہے۔ وضو اور نماز کے احکامات کو بجا لا کر جہاں رضائے الٰہی اور روحانی ترقی و بہتری میسر آتی ہے، وہاں انسان جسمانی اور دنیوی زندگی کے کئی مسائل سے بچ جاتا ہے۔

آج دنیا میں انسانی دنیوی اور اخروی زندگی کی بھلائی و بہتری اور کامیابی کی ضمانت صرف اور صرف اسلامی احکامات پر عمل ہی ہے۔ کوئی دوسرا مذہب ایسے خصائص کا حامل نہیں ہے، اسی لیے دیگر تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فقط اسلام کو قیامت تک کے لیے باقی رکھا ہے۔

وضو کرتے وقت کہنیوں سمیت دونوں ہاتھ ایک بار دھونا فرض اور تین بار دھونا سنت ہے۔ بندۂ مومن کے اس عمل کو بھی بخشش کا سبب بنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"فاذا غسل يديه خرجت الخطايا من يديه حتّٰى تخرج من تحت اظفار يديه"

(سنن نسائی، باب مسح الاذنین مع الراس، رقم 103)

"وضو کرنے والا جب اپنے ہاتھوں کو دھوتا ہے تو ہاتھوں کے گناہ جھڑ جاتے ہیں حتیٰ کہ ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں۔"

بازوؤں والے اس حصے میں خون کی متعدد نالیاں ہوتی ہیں۔ ان میں شریانیں اور وریدیں دونوں شامل ہیں۔ جسم کا یہ حصہ مختلف امراض کی تشخیص کے لیے بڑا ممد و معاون ہے۔ یہیں سے نبض کی رفتار اور بلند فشار خون وغیرہ معلوم کیا جاتا ہے۔ اس حصے کو دھونے اور مساج کرنے سے انسانی جسم پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ پانی خون کی حدت کو کم کر کے بلند فشار خون کو کم کرتا ہے۔

چوتھائی سر کا مسح کرنا فرض ہے اور ایک بار تمام سر کا مسح کرنا سنت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ مسلمان کے اس عمل کو بھی کفارۂ سیئات قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"فاذا مسح براسه خرجت الخطايا من راسه حتّٰى تخرج من تحت اذنيه"

(سنن نسائی، باب مسح الاذنین مع الراس، رقم 103)

"مسلمان جب وضو کرتے ہوئے اپنے سر کا مسح کرتا ہے تو سر کے گناہ

جڑ جاتے ہیں حتیٰ کہ کانوں سے نکل جاتے ہیں۔"

سر کا مسح کرنے میں بھی بہت زیادہ سائنسی حکمتیں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ اہل علم جانتے ہیں کہ کاسۂ سر کے اوپر بال آدمی کے اندر انٹینا کا کام کرتے ہیں۔ یہ بات ہر باشعور شخص جانتا ہے کہ آدمی اطلاعات کے ذخیرے کا نام ہے۔ جب تک اسے کسی عمل کے بارے میں اطلاع نہ ملے وہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔

مثلاً: کھانا ہم اس وقت کھاتے ہیں جب ہمیں بھوک لگتی ہے۔ پانی اس وقت پیتے ہیں جب ہمارے اندر پیاس کا تقاضا ہوتا ہے۔ سونے کے لیے بستر پر اس وقت لیٹتے ہیں جب ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ اب ہمارے اعصاب کو آرام کی ضرورت ہے۔ خوشی کے جذبات و احساسات ہمارے اوپر اس وقت مظہر بنتے ہیں جب ہمیں خوشی سے متعلق کوئی اطلاع فراہم ہوتی ہے۔ اسی طرح غیظ و غضب کی حالت کا انحصار بھی اطلاع پر ہے۔

وضو کرنے کی نیت دراصل ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کر دیتی ہے کہ ہم یہ کام اللہ کے لیے کر رہے ہیں۔ وضو کے ارکان پورے کرنے کے بعد جب ہم سر کے مسح تک پہنچتے ہیں تو ہمارا ذہن غیر اللہ سے ہٹ کر اللہ کی ذات میں مرکوز ہو چکا ہوتا ہے۔ مسح کرتے وقت جب ہم سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں تو سر کے بال ان اطلاعات کو قبول کرتے ہیں جو ہر قسم کی کثافت، محرومی اور اللہ تعالیٰ سے دوری کے متضاد ہیں، یعنی بندہ کا ذہن اس اطلاع کو قبول کرتا ہے جو مصدر اطلاعات (اللہ تبارک وتعالیٰ جل مجدہ الکریم) سے براہ راست ہم رشتہ ہے۔

کانوں کا مسح کرنا سنتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ کان کے اندر پانی سے تر کی ہوئی شہادت کی انگلی اور باہر کی طرف سے انگوٹھے سے مسح کرنے سے کانوں کی ہر قسم کی آلودگی دور ہو جاتی ہے اور اس سے سماعت پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ جب کانوں کا مسح کیا جاتا ہے تو دل کو عجیب و غریب مسرت میسر آتی ہے۔

وضو میں گردن کا مسح کرنا مستحب عمل ہے، لیکن کامل وضو ہی ہوتا ہے جس میں فرض، سنت اور مستحب تمام کو بجا لایا جائے۔ مومن کا گردن کا مسح کرنا بھی فضیلت سے خالی نہیں۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"من توضأ ومسح بیدیه علیٰ عنقه وقی الغل یوم القیامة وقال انشاء الله"

(نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار، جلد نمبر 1، صفحہ نمبر 180) (التلخیص الحبیر، جلد 1، عربی صفحہ 92)

"جس نے وضو کیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن کا مسح کیا تو انشاء اللہ! قیامت کے دن وہ گردن میں زنجیر سے بچ گیا۔"

گردن کے مسح کی بڑی طبی افادیت ہے۔ ایک فرانسیسی دماغی امراض کے سرجن کا کہنا ہے:

"میں نے جو ریسرچ کی ہے اس کے مطابق اگر بال بہت بڑھا دیئے جائیں اور گردن کی پشت کو خشک رکھا جائے تو ان لوگوں کے اندر کئی دفعہ خشکی پیدا ہو جاتی ہے اور انسان کے جسم پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کا دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ اس لیے ڈاکٹرز نے سوچا کہ گردن کو دن میں دو چار مرتبہ ضرور تر رکھا جائے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ گردن کا مسح کرنے سے انسان کئی قسم کے دماغی امراض سے محفوظ و مامون رہ سکتا ہے۔ ماہرین روحانیات نے انسانی جسم کو چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حصہ "حبل الورید" (رگِ جان) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"میں رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہوں۔"

یہ رگِ جان سر اور گردن کے درمیان واقع ہے۔ گردن کا مسح کرنے سے انسانی جسم کو ایک خاص توانائی حاصل ہوتی ہے جس کا تعلق ریڑھ کے اندر، حرام مغز اور تمام جسمانی جوڑوں سے ہے۔ جب کوئی نمازی گردن کا مسح کرتا ہے تو ہاتھوں کے ذریعے برقی رو نکل کر رگِ جان میں ذخیرہ ہو جاتی ہے اور ریڑھ کی ہڈی کو اپنی گزرگاہ بناتے ہوئے جسم کے پورے اعصابی نظام میں پھیل جاتی ہے جس کے ذریعے اعصابی نظام کو توانائی ملتی ہے۔

"دونوں پاؤں ٹخنے سمیت ایک مرتبہ دھونا فرض اور تین تین بار دھونا سنتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ حدیث شریف میں پاؤں دھونے کو بھی کفارۂ سیئات فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"فاذا غسل رجليه خرجت الخطايا من رجليه حتى تخرج من تحت اظفار رجليه"

(سنن نسائی، باب مسح الاذنين مع الراس، رقم 103)

"وضو کرنے والا جب پاؤں دھوتا ہے تو پاؤں کے گناہ دھل جاتے ہیں یہاں تک کہ پاؤں کے ناخنوں کے نیچے سے نکل جاتے ہیں۔"

پاؤں جسم کا وہ حصہ ہے جو چلتے وقت سب سے زیادہ گرد و غبار، آلودگی، جراثیم اور جنجائی کی زد میں ہوتا ہے۔ اس لیے دونوں پاؤں کو دن میں ایک سے زیادہ بار دھونا ضروری ہے اور شوگر کے مریضوں کے لیے تو پاؤں کی حفاظت نہایت ضروری ہے کیونکہ ذیابیطس کے مریضوں کو پاؤں کی انفیکشن زیادہ ہوتی ہے۔

دماغ اطلاعات قبول کرتا ہے اور یہ اطلاعات لہروں کے ذریعے منتقل ہوتی ہیں۔ اطلاع کی ہر لہر ایک وجود رکھتی ہے۔ وجود کا مطلب متحرک رہنا ہے۔ قانون یہ ہے کہ روشنی ہو یا پانی اس کے لیے بہاؤ ضروری ہے اور بہاؤ کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مظہر بنے اور وہ خرچ ہو۔ جب کوئی بندہ پاؤں دھوتا ہے تو زائد روشنیوں کا ہجوم پیروں کے ذریعے ارتھ ہو جاتا ہے اور جسمِ انسانی زہریلے مادوں سے محفوظ رہتا ہے۔

مشاہدہ کیا گیا ہے کہ انسانی بدن سے ہر وقت زہریلے مواد پسینہ کی شکل میں خارج ہوتے رہتے ہیں' بسا اوقات انہی بخارات کے چند زہریلے اثرات مسامات بدن میں جمع ہو جاتے اور خطرناک امراض کا پیش خیمہ ثابت ہوتے اور صحت و تندرستی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ اگر ان کی صفائی کا خیال رکھا جائے' بالخصوص کھلے ہوئے اعضاء کو دھویا جائے تو یہ خطرہ دور ہو جاتا ہے' چنانچہ وضو اس کے لیے بہترین ذریعہ ہے۔

وضو سے اعضاء کی نہ صرف ظاہری بلکہ باطنی صفائی بھی مقصود ہے' اس سے اکثر و بیشتر ادنیٰ درجہ کے روحانی امراض کا ازالہ بخوبی ہو سکتا ہے' کیونکہ ہاتھ، زبان' ناک' کان وغیرہ سے جس قدر چھوٹے چھوٹے گناہ سرزد ہوا کرتے ہیں' وہ سب وضو کے ذریعے ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے۔

پہلے چہرہ دھویا جاتا ہے جس کے اندر زبان ہے ظاہر ہے کہ بہ نسبت دیگر اعضاء کے

زبان سے بہت زیادہ گناہوں کا صدور ہوتا ہے ناک اور آنکھ کے گناہ اس کے لگ بھگ ہیں' ان کے بعد ہاتھوں کے دھونے کا درجہ ہے کیونکہ زبان سے گفتگو کرنے اور آنکھوں سے دیکھنے کے بعد ہی ہاتھ کو چھونے کا موقع ملتا ہے' سر چونکہ چہرہ کے قریب ہے اور چہرہ سے زیادہ گناہگار سرزد ہوتے ہیں اس لئے صرف مسح کر لینا سر کی صفائی کے لیے کافی ہے' کیونکہ ایک گناہ کے قریب رہنے والے سے خفیف گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہے' اگر اس کو بھی دھونے کا حکم دیا جاتا تو ایک قسم کی تکلیف ہوتی۔

ابن عباس نے اعضاء وضو کے اسرار پر کس قدر عارفانہ نکات میں روشنی ڈالی ہے۔

ہاتھوں کا دھونا جنت کے دسترخوانوں سے لذت اندوز ہونے' کلی کرنا پروردگار عالم سے شرف ہم کلامی حاصل کرنے' ناک میں پانی لینا جنت کی روح پرور خوشبو سونگھنے' چہرہ کا دھونا روئے جلال وجبروت کی طرف نظر کرنے' ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونا کنگن پہننے' سر کا مسح تاج زرنگار زیب سر کرنے' کانوں کا مسح مقدس کلام الٰہی کو سننے اور پاؤں کا دھونا جنت میں داخل ہونے اور (فرش مخملین) پر چلنے کے لیے ہے۔

افراد کو عام ظاہری نفاست وصفائی کا خیال رکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے تاکہ میل کچیل' بدن کی بدبو اور گندگی کی وجہ سے نمازیوں اور رفقاء کو تکلیف نہ ہو' نیز اس کا لحاظ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اکثر دوست احباب سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوتا ہے' مجلسوں اور تقریبوں میں شرکت کے مواقع پیش آتے ہیں' اگر ظاہری نفاست ونظافت کا خیال نہ رکھا گیا تو دوستوں اور اہل محفل کو تکلیف پہنچنے اور ان کے دلوں میں نفرت وحقارت کے جذبات پیدا ہونے کا باعث ہے' حالانکہ انسانی اور اخلاقی فریضہ یہ ہے کہ ہر دم مخلوق کی خیر خواہی اور ابنائے جنس سے ربط وضبط پیدا کرنے بالخصوص مقدس محفلوں میں شریک ہونے کا خیال رکھا جائے' نفس کے نشاط وسرور کا راز نفاست وپاکیزگی میں مضمر ہے کیونکہ انسانی نفس کو جسم سے گہرا تعلق ہے' جسم جن آثار وکیفیات سے متاثر ہوتا ہے' نفس پر بھی ضروران کا اثر پڑتا ہے جسم میں اگر نظافت ونفاست ہے تو نفس میں نشاط وسرور پیدا ہوتا اور اس سے تمام کسل مندی ودرماندگی دور ہو جاتی ہے' اس صورت میں اس کے لیے عبادت کا فریضہ ادا کرنا سہل

ہو جاتا ہے اور وہ اپنی رضامندی اور شوق و وجدان سے یہ فرض ادا کرنے میں محفوظ ہوتا ہے' جب وہ اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے تو اس پر اسرار ربانی کا انکشاف ہوتا ہے اور اس مقام عرفان تک رسائی حاصل کر لیتا ہے' جہاں سے انوار و تجلیات ربانی کی بارش اس کے دل کی فضاؤں پر ہوتی رہتی ہے' اس کے بعد اس کو دنیوی امور انجام دینے کے ساتھ ساتھ اس فریضہ' عبادت میں وجدانی و ذوقی کیفیت سے محفوظ ہوتے رہنے کی قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اب اس کے اس فرض کی ادائیگی اور ''توجہ ذکر'' کی راہ میں کوئی دنیوی طاقت اور انہماک حائل نہیں ہو سکتا۔

پانی سے ظاہری صفائی و نظافت حاصل کرنے میں اس طرف بھی لطیف اشارہ ہے کہ باطن کی صفائی و نفاست کی طرف توجہ کی جائے اور نفس کو فاسد عقائد اور ردی اخلاق کی گندگیوں سے پاک صاف رکھا جائے' اس کی طرف حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے:

''الطھور شطر الایمان''

''صفائی و شائستگی نصف ایمان ہے۔''

اس لئے شارع نے ظاہری پاکی کی طرف شدت سے توجہ دلائی تاکہ وہ فاسد اخلاق کی تاریک سرحدوں کو پھاند کر تہذیب و شائستگی اور اخلاق و محاسن کی مقدس سرزمین میں قدم دھریں اور باطل عقائد کو دل و دماغ سے دور کر کے پاکیزہ جذبات کی پرورش کریں۔

نماز، جدید سائنس اور انسانی صحت:

انسان کی تخلیق جن عناصر سے ہوئی ہے وہ فنا پذیر ہیں' ان میں ہر وقت تغیر و انحطاط کے آثار رونما ہوتے رہتے ہیں۔ آخر کار پندار و غرور کی رعنائیوں کا یہ بدمست پیکر فنا کا تلخ گھونٹ پی لیتا ہے' اس کے حسن و جمال کا آفتاب قبر کے تیرہ و تاریک گوشوں میں دفن ہو جاتا ہے اور اس کے اجزائے بدن خاک میں مل کر ذرات کی شکل و صورت اختیار کر کے فضاؤں میں بھٹکتے پھرتے ہیں' اب ابدیت اور فضیلت و برتری اس جسم خاکی کو کیسے نصیب ہو سکتی ہے' جو کہ فنا کی منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے؟ پھر وہ کون سی لازوال شے ہے جو سرمدی بقاو حیات کا مظہر اور روحانی لطافتوں اور ربانی تجلیات کا سرچشمہ ہے۔؟

گویا ایک بجلی ہے جو قالب انسان کے رگ و ریشہ میں پوری آب و تاب کوندتی پھرتی

ہے۔ جس سے کارزارِ حیات سرگرم ہے اور وہ روح ہے جو اس انسانی جسم میں جاری وساری ہے جو زندگی کا مبداء اور شعور وادراک کا منبع ہے۔ یہی وہ روح ہے جو ہر دم مبداء فیاض سے فیوض وبرکات حاصل کرنے کی آرزو مند رہتی ہے۔ یہی وہ بجلی ہے جو مظہر جلال وجبروت سے ہر لحہ تڑپ اور چمک پیدا کر کے جسمانی خواہشوں کے خرمن پر گرنے کے لیے بے قرار رہتی ہے اور یہی وہ جوہر فردانی ہے جو خالق حقیقی سے کمال اتصال پیدا کرنے کا مشتاق رہا کرتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ وہ انسان کس طرح اپنے خدا سے اتصال پیدا کر سکتا ہے جو زندگی کے طوفانوں میں گھرا ہوا' دن بھر دنیوی ہنگاموں اور کاروبار میں مصروف رہتا ہے' جب رات کو اپنے گھر لوٹتا ہے' کچھ کھا پی لیتا ہے' اس پر مدہوشی اور بدمستی کا عالم طاری ہو جاتا ہے تو آرام سے بستر پر دراز ہو جاتا ہے ورنہ اپنے ابنائے جنس کی صحبتوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے چلا جاتا ہے۔ جہاں کچھ ایسی ہنسی مذاق کی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس سے چند لحات کے لیے اس کے بشرہ پر اور رگ رگ میں سرور ونشاط کی لہریں دوڑ جاتی ہیں' مگر اندرونی قوتوں پر مردنی چھا جاتی ہے؟ اس کی روح مبداء فیاض سے کیوں کر فیض یاب ہو سکتی ہے جب کہ وہ زندان خاکی میں مقید اور قالب انسانی کی رگ وریشہ کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے؟ دوستوں کی محفلوں میں شریک ہونے اور دنیوی کاروبار اور مشاغل میں سرگرم رہنے کی وجہ سے دن یا رات کے کسی لحہ میں اسے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ اپنے وجود ازلی کی طرف متوجہ ہو سکے۔

غرض یہ انسان اپنی زندگی کی منازل بسرعت وتدریج اسی طرح طے کرتا رہتا ہے' یہاں تک کہ اس کی عمر کے تقریباً سو مرحلے گزر جاتے ہیں اور وہ اس بے بسی وبے سروسامانی کے عالم میں اس دنیائے فانی سے کوچ کر جاتا ہے کہ اس کی روح کو اپنے خالق حقیقی سے باریاب ہونے کا موقع نہیں ملتا۔

روح کا اپنے منبع فیوض سے اتصال پیدا کرنا زندگی کی سب ضرورتوں سے اہم ہے۔ بقائے دوام کی بنیادوں کو استوار کرنا ہے تو سب سے پہلے اپنی توجہ روح کی طرف مرکوز کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ روح جب تک انسانی جسم کے اندر جاری وساری ہے تمام

کمالات و مقامات حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ روحانی اصلاح و ترقی کی طرف توجہ کرنا خود انسانی زندگی کی تکمیل اور بقائے احسن کی دلیل ہے۔ جب انسان ہی اپنی روح سے بیگانہ رہا' اس کی حفاظت نہ کر سکا اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں کوتاہی سے کام لیا تو اس سے اس کی اس روح کا تعلق منقطع ہوگیا جو فیضانی تجلیوں کا مظہر تھا اور اس کی وہ روح مردہ ہوچکی' جو کسی وقت بجلیاں بن کر پندار ہستی کے خرمن پر گرا کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کے اثرات جسم انسانی میں یا خود انسان پر جو روح کا مظہر ہے کیا انقلابات و تغیرات رونما کرتے ہیں؟ انسانی عقل و شعور کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے' اس کے فکر و نظر کا توازن بگڑ جاتا ہے' اس پر انقباض و تکدر کی مختلف کیفیات طاری ہونے لگتی ہیں' اس کو کسی چیز میں قناعت نہیں ہوتی' ذہن و دماغ کے گوشوں میں وحشت و حیرت کے بیابان سرگرداں نظر آنے لگتے ہیں' وہ وحشت و حیرت کے ان بنیادی اسباب پر بے بنیاد خیال آرائیاں کرتا ہے' ان کو دور کرنے کی بے سود تدابیر سوچتا ہے' کبھی وہ خیال کرتا ہے کہ اسے دنیوی ضرورتیں فراہم نہیں ہوئیں' اس نظریہ سے وہ عزت اور شہرت کی چوٹیوں پر چڑھنے کے لیے قدم آگے بڑھاتا اور بڑھاتا چلا جاتا ہے' حالاں کہ وہ درحقیقت ذلت اور مصیبت کے خطرناک تاریک غاروں میں گرتا جارہا ہے' کبھی اس کے دل میں یہ گمان ہوتا ہے کہ اس نے دنیوی کاروبار میں زیادہ حصہ نہیں لیا اور دولت کے خزانے جمع نہیں کیے۔ حرص و ہوس کی چنگاریاں اس کے دل میں بھڑک اٹھتی ہیں۔ وہ دنیا کمانے اور دھن دولت جمع کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ عزت و شہرت کے دیوتا اس کے قبضہ میں آجاتے اور دولت و ثروت کے بھوت اس کے سامنے ناچتے ہیں جو اس کو تباہی و بربادی کی وادیوں میں لے جانے کے سامان فراہم کر رہے ہوتے ہیں۔

دولت و عزت حاصل ہونے کے باوجود اس کی سرگردانی نہیں جاتی۔ وہ سکون تلاش کرنا چاہتا ہے لیکن کہیں نہیں ملتا' وہ اطمینان اور اصل خوشی کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ مگر ہر قدم پر پریشانی اور مصیبت اس کا استقبال کرتی ہے' یہاں تک کہ وہ اسی کشمکش کی حالت میں اس ہنگامہ زار دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اس بیچارے کو اتنا پتہ تک نہ چلا کہ اگر اس کے ہاتھ میں ساری کائنات بھی سمٹ آتی اور دنیا بھر کی عزت اس کو حاصل ہو جاتی' تب بھی اس

کی آرزوؤں اور تمناؤں میں کمی واقع نہ ہوتی۔ اس کی حرص و آرزو کے طوفانی شعلے کسی طرح نہ بجھتے' بلکہ ہوس کے تندوتیز جھونکوں سے بھڑک اٹھتے اور اس کی ہستی کو جلا کر خاکستر کر دیتے۔

غرضیکہ ان مشاہداتی کیفیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرکز وجود سے روح کا تعلق بہرصورت ضروری ولابدی ہے' خواہ اس کے لیے دن کے چند ہی لمحات کیوں نہ میسر آجائیں' اسی اہم مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف مذاہب نے روحانی قوتوں کو مادی طاقتوں کے تسلط سے رہائی دلانے کے لیے مختلف عبادات کے مختلف طریقے اور توجہ الی اللہ کے متعدد راستے ایجاد کیے' لیکن ان تمام میں زیادہ آسان اور زیادہ بلیغ و جامع طریقہ وہ ہے جس کو اسلام نے پیش کیا ہے جو "روحانی شاہرہ" کہلائے جانے کا مستحق ہے اور جس پر سے روح انسانی گزر کر اپنے خالق حقیقی سے اتصال اور راہ ورسم پیدا کر سکتی ہے۔

ایک سچا مسلم ومومن وضو کر کے قبلہ رو ہو کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر دل کی گہرائیوں سے "اللہ اکبر" کہتا ہے تو نہیں معلوم اس کی آنکھوں میں کتنے جلوے سماتے ہوں گے اور اس کی روح میں جلال و کبریائی کی کتنی بجلیاں رقص کرتی ہوں گی۔؟

خصوصاً اس وقت جب کہ کوئی شخص کسی ہولناک مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہو جس میں اس کی زندگی اور موت کا سوال درپیش ہو' بارگاہ خداوندی میں حاضر ہو کر صدق دل سے اللہ اکبر کہتا ہے اور ماسوا اللہ کی تمام مرعوط کن طاقتوں کو دل سے نکال دیتا ہے تو اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام قوتوں کا مظہر ہے' وہی کارساز حقیقی ہے' میری پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے والا بھی وہی ہے' اس کے سوا میں کسی طاقت کے روبرو سر نہ جھکاؤں گا' میں اسی ذات واحد کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔

جب اس طرح سے کوئی شخص ذوقی و وجدانی کیفیات کے ساتھ والہانہ طور پر عزم خالص کے ساتھ قدم بڑھاتا ہے تو اس کا دل شکوک وشبہات سے پاک ہو جاتا ہے اور ربانی تجلیات اس کے دل پر جلوہ گر ہوتی ہیں۔ انسان اپنے دل کے اندر سکون وطمانیت کے وہ تمام سامان پیدا ہوتے دیکھ لیتا ہے جو اس کی خوش گوار زندگی کی بنیاد ہیں' پھر جب اس کے بعد سورۂ فاتحہ اور چند آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور ان کے معانی ومظاہرہ کا مشاہدہ کرتا ہے تو

اس کے واسطۂ اتحاد و اتصال میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو حقیقی معنوں میں بارگاہ خالق سے قریب تر اور روحانیت کے مقام بلند پر پہنچتا ہوا پاتا ہے۔

انسان نیرنگیوں کا مجموعہ ہے۔ اس پر تغیرات و انقلابات کے مختلف آثار طاری ہوتے رہتے ہیں۔ جب کبھی عزت و دولت ہاتھ آتی ہے تو گھمنڈ اور غرور میں ڈوب جاتا ہے' اپنے جامہ سے باہر نکل کر سرکشی کرنے لگتا ہے اور دوسروں کے حقوق کو پامال کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر تنگی و مصیبت میں مبتلا ہو تو مضطرب و پریشان ہو جاتا ہے' اس کے دل پر حسرت و مایوسی کے جذبات مسلط ہو جاتے ہیں' دنیا اس کو تاریک نظر آنے لگتی ہے' اس وقت وہ اپنے خالق کو یاد کرتا اور اس کی بارگاہ میں حاضر ہو کر گریہ وزاری کرتا ہے اور پنج وقت نمازوں کو پابندی سے ادا کرتا ہے تو اس کی پریشانی زائل ہو جاتی ہے' نفس میں طمانیت اور سکون کی حالت پیدا ہو جاتی ہے' وہ تنگی و مصیبت، کشائش و خوش حالی غرضیکہ ہر خیر و شر پر رضا مندر ہتا اور ہر امر میں پروردگار عالم کی مشیت و ارادہ کو مقدم سمجھتا ہے۔

اس احساس عبودیت سے حرص و آرزو کے برے جذبات دل سے دور ہو جاتے ہیں اور وہ تزلزل اور اضطرابی کیفیت جو بندے کے دل میں خوف و ہراس کا باعث ہوتی ہے' جاتی رہتی ہے کیونکہ نماز میں گریہ وزاری اور مناجات کی وجہ سے رقت قلبی اور خشوع و خضوع کی لطیف کیفیات پیدا ہوتی ہیں' جس سے انسان کے اندر آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے اور اپنی جان عزیز اور متاع گراں مایہ کو ایثار و قربان کرنے کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے' جو دنیوی خواہشات اور حرص و آز کے جذبات کو فنا کر دیتا ہے۔

نماز ہر قسم کی کدورتوں اور بری خواہشوں کا قلع قمع کرتی ہے، کیونکہ نماز میں چند ایسے جلالی و جمالی مناظر مثلاً تلاوت قرآن' رکوع' سجود' تسبیح و تہلیل اور مناجات و دعا وغیرہ جمع ہیں جو ایک نمازی کو دنیوی افکار و مشاغل سے علیحدہ کر کے حضور الٰہی میں پیش کر دیتے ہیں' نگاہوں میں خشیت ایزدی اور جلال و جبروت کے جلوے سمائے ہوئے رہتے ہیں۔ جن سے نفسانی خواہشات اور برے جذبات قریب آنے نہیں پاتے۔ گناہ کی رغبت خود بخود زائل ہو جاتی ہے' اسی کی طرف قرآن عزیز نے اشارہ کیا ہے؟:

"ان الصلوٰة تنھی عن الفحشاء و المنکر"

(سورۂ عنکبوت)

"بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔"

انسانی زندگی کی تکمیل کا راز تہذیب، اخلاق اور شائستگی نفوس میں مضمر ہے۔ اخلاق ہی وہ آئینہ ہے جس میں شخصیات کا عکس نمایا ہوتا ہے۔ نماز کے ذریعے سے جو کیفیات و تاثرات نفس پر مرتب ہوتے ہیں وہ تمام اخلاقیاتی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

بارگاہ خداوندی میں حاضر ہونے کا طریقہ' قیام و جلوس کی ہیئت' تلاوت و مناجات کے دوران میں کلام نہ کرنا' امام کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرنا' دل و دماغ کو اس کی قرأت کی طرف متوجہ کرنا' اس کے حرکات و سکنات کی پیروی کرنا' یہ اور اس قسم کے آداب ہیں جو انسانی نفس کے اندر ادبی کیفیات کا رنگ پیدا کرتے ہیں۔

چہرہ انسان کے جسم میں حسن و جمال کا آئینہ اور شرافت و عظمت کا آبگینہ ہے جس کو نماز میں زمین پر رکھنا پڑتا ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کا انسان کیوں نہ ہو اس کے ساتھ شانہ کو شانہ لگائے کھڑا رہنا اور امام کی ہر حالت میں اتباع کرنی پڑتی ہے' خواہ وہ مقتدی سے کتنا ہی کم مرتبہ کیوں نہ ہو۔ یہ وہ امور ہیں جو تواضع و انکسار اور اطاعت و انقیاد کی صفت پیدا کرتے ہیں۔

اپنی قوت و اقتدار کے جذبہ کو امام کے بالکل تابع کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً: اگر امام قرأت یا رکوع و سجود کو طویل کردے تو اس کی اطاعت کے بغیر چارہ نہیں' یہ ممکن نہیں کہ کوئی نماز کو چھوڑ کر امام کے دائرہ اطاعت سے باہر ہو جائے' ہر حالت میں صبر و تحمل سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہ چیز نہ صرف نماز میں کام آسکتی ہے بلکہ اس سے زندگی کے آلام و مصائب کو برداشت کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔

نماز کی دیگر شروط کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ کپڑے صاف ستھرے ہوں' جسم میل کچیل سے پاک اور ظاہری نفاست سے آراستہ ہو۔ یہ دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ کوئی پوشیدہ عضو کھلا تو نہیں ہے' کسی قسم کی لغزش پیدا ہونے کا خطرہ تو نہیں' غرضیکہ یہ وہ احتیاطی تدابیر ہیں جو انسان کو حیادار بنانے کا ذریعہ ہیں اور اس کے اندر حزم و احتیاط پیدا کرنے کی

کفیل۔ یہاں تک نماز کی جمالیاتی تصویر کا ایک دوسرا اجتماعی رخ نماز با جماعت میں پیش کیا جاتا ہے جو مجموعی طور پر جماعتی تشکیل و تنظیم اور ربط و اتحاد کے روح پرور مناظر پر روشنی ڈالتا ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

یہ امر مسلمہ ہے کہ انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ ہر شہر والے اپنی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دوسرے شہر والوں کے محتاج رہتے ہیں۔ ہر ملک میں مختلف انسانی گروہ پائے جاتے ہیں۔ سوسائٹی فقیر و تونگر' قوی و کمزور' تندرست و بیمار' عالم و جاہل بھی قسم کے افراد سے عبارت ہے۔ جب مسلمانوں کی مختلف جماعتیں ایک جگہ مجتمع ہو کر نماز ادا کرتی ہیں تو ان کے آپس میں ربط وضبط اور اتحاد و محبت کا نظام قائم رہتا ہے' غم خواری' ہمدردی اور انسانی فرائض کو بجالانے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ کسی کی آفت و مصیبت آ پہنچی ہے تو دوسرا اس کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دینی امور کے ساتھ ساتھ دنیوی کاروبار میں صلاح و مشورہ کیا جاسکتا ہے۔ معاشی و اقتصادی مسائل کو جانچنے کا موقع ملتا ہے۔ نمازیوں کی صورت حالات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے تو احساسات ابھرتے ہیں۔ مالدار غریبوں کی پرورش کرنے' قوی کمزوروں کی دستگیری اور تندرست بیماروں کی غم خواری و ہمدردی کی طرف بالطبع مائل ہوتے ہیں۔ یہ وہ احساسات ہیں جو نماز با جماعت کے ذریعے پیدا کرائے جاسکتے ہیں۔ اس کے مظاہر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں کس درجہ پائے جاتے تھے اس کا اندازہ آپ کے اس ارشاد سے ہوسکتا ہے:

”تم ہمیشہ نماز میں اپنے بھائیوں پر نظر رکھو' شاید کوئی بیمار نہ آسکے اگر وہ بیمار ہیں تو ان کی تیمارداری کرو اور اگر کوئی صحیح و تندرست نہ آئیں تو ان کو تنبیہ کرو“

نماز با جماعت کا اہم مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے اندر حریت و مساوات کا احساس پیدا کرایا جائے۔ ہم روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے تمام گروہ بلا امتیاز رنگ و بو' امیر و غریب' تونگر و محتاج' خادم و مخدوم تمام کے تمام بارگاہ خداوندی میں شانہ سے شانہ لگائے' آستانہ جمال قدس پر عجز و نیاز سے اپنی پیشانی جھکاتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک وہ شخص جو دنیوی فضل و کمال اور مرتبہ و جاہ میں بڑھ چڑھ کر ہے اپنے سے کم مرتبہ شخص کو جب دیکھتا ہے کہ وہ برابر عبادت الٰہی کے فرائض کی انجام دہی میں

مصروف ہے تو وہ اپنے آپ شرمندہ ہوتا اور اپنی سرداری اور جاہ و مرتبہ کو بھول جاتا ہے۔

نماز با جماعت میں آداب و آئین کی پابندی اور امام کی اتباع کرنی پڑتی ہے، جس سے جہاد کا جذبہ اور اولی الامر اور خلیفہ کی اطاعت و فرمانبرداری کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح سے کہ ایک فوجی سردار جب وہ اپنے لشکر کو فوجی تعلیم دیتا ہے اور قواعد سکھاتا ہے تو فوج پر اس کے ہر اشارہ اور ہر حکم کی تعمیل ضروری ہے، اسی طرح مقتدیوں کو امام کی اتباع میں اس کے ہر اشارہ و فعل پر سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔

انصاف، حریت و مساوات اور ارشاد و تعلیم جو قوموں کی زندگی کی اساس ہے، جس پر قوموں کے نظام عمل، معاملات، تجارت، زراعت، تہذیب و عمران غرض کہ تکمیل پوشیدہ ہے، یہ سب چیزیں با جماعت سے حاصل ہوتی ہیں۔ ایک امیر جس کے پاس نوکر چاکر، مال و دولت، جاہ و حشمت غرض کہ دنیوی شان و شوکت کے سب سامان فراہم ہیں، ایک غریب و مفلس کے ساتھ جو بالکل نادار اور فلاکت زدہ ہے شانہ سے شانہ ملائے، پاؤں سے پاؤں جمائے بارگاہ خداوندی میں عجز و نیاز کا مظاہرہ کرتا ہے اور اس میں اپنی کسر شان اور کسی قسم کا ننگ و عار نہیں سمجھتا۔ قطع نظر اس کے کہ اس سے بھی اعلیٰ مرتبہ والا جو سلطان یا حاکم کہلاتا ہے، جب مسجد میں غریبوں اور ادنیٰ مرتب انسانوں کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑا ہو کر امام کی اتباع کرتا ہے تو اس وقت تمام نفوس میں خشوع و خضوع اور جلال و جبروت کی عظمت و ہیبت کے جذبات مسلط ہو جاتے ہیں۔ رعایا میں عدل و انصاف اور محبت و اتحاد کا نظام قائم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دن میں پانچ مرتبہ مظاہرہ کیا جاتا ہے تو پروردگار عالم کی ربوبیت اور اس کی شان و عظمت کے مناظر نگاہوں میں سما جاتے ہیں۔ کسی کو ظلم و استبداد روا رکھنے کی جرأت نہیں ہوتی اور کسی کی حق تلفی کا خیال تک دل میں نہیں گزرنے پاتا۔

صفوں کی درستگی اور استقامت کی طرف شریعت نے جو توجہ صرف کی اور اس کی نگہداشت پر جو زور دیا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہر کام میں راستی اور تمام حرکات و سکنات میں توازن و یگانگت ہو۔ ان کا مقصد و مدعا ایک، راہ عمل ایک اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تنظیم و اتحاد کی مضبوط زنجیر بن جائیں جس کو دنیا کی کوئی استبدادی قوت و طاقت درہم برہم نہ کر سکے۔ یہی نظام مسلمانوں کی فلاح بہبود کا ایک اہم راز ہے۔ یہی وہ

انسانی زندگی کی شاہراہ ہے جس پر گامزن ہو کر انسانیت کا مقام اور نصب العین حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح ایک مسلمان کی نظر نماز میں ایک ہی مرکز کی طرف لگی رہتی ہے' تمام حرکات وسکنات کا توازن ایک ہی اعتدال پر برقرار رہتا ہے' نظر نہ دائیں جانب مڑ سکتی ہے اور نہ بائیں طرف' اسی طرح اس کا ہر کام' خواہ دینی ہو یا دنیوی' راست اور مستقیم ہونا چاہیے۔ فکر ونظر کا مرکز اور مقصد ومدعا کا زاویہ صرف ایک ہی ہوا ور وہ راہ حق میں استقامت وثبات سے' اس کا جینا مرنا سب اسی کے لیے وقف ہو' جب اس طرح سے ایک نمازی پابندی کرنے لگتا ہے تو اس کے دل میں سکون ووقار اور طمانیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کی ہر سانس اور قول وفعل میں توازن اور یک سوئی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس کا قدم جادۂ حق سے کبھی نہیں ڈگمگاتا اور اس سے جان بوجھ کر کوئی لغزش سرزد نہیں ہوتی۔ پھر تمام تر کامیابی اور فلاح وفوز کا سہرا اس کے سر ہوتا ہے۔ اصلاح نفس' حیا' صبر وتحمل' عزیمت واستقلال' انقیاد وادب' مساوات' محبت واتحاد وغیرہ یہ وہ اخلاق فاضلہ اور مہتم بالشان امور ہیں جو انسان کو نماز کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی میں اصلاح نفس اور توجہ الی اللہ کے لیے عبادت کا یہ طریقہ مشروع نہ ہوتا تو تمام اخلاق وفضائل کا خاتمہ ہو جاتا۔ حرص وہوس اور اوہام ومفاسد کے جذبات اذہان ونفوس میں جاگزیں ہو جاتے' طبائع میں باہم تنفر' حسد وبغض اور انسانیت سوز خواہشات پیدا ہو کر زندگی کو تباہ وبرباد کر دیتیں۔

یہ صحیح ہو سکتا ہے کہ نماز تمام برائیوں کو روکنے والی ہے' اس سے وہ تمام اخلاق وفضائل حاصل ہوتے ہیں جن کا ذکر ابھی اوپر ہوا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ تمام چیزیں مشاہدات کی دنیا میں آرہی ہیں' حالانکہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ کتنے ایسے نفوس ہیں جو نمازیں پڑھتے ہیں اس کے باوجود وہ فسق وشر میں مبتلا ہیں۔ ان کی حالتوں میں ذرا بھر تغیر وتبدل نہیں ہوتا' ان کے نفوس واذہان میں اصلاح وتزکیہ کے بجائے فتنہ وفساد اور بغض وحسد کے جذبات پرورش پاتے ہیں۔

اس شبہ کا ازالہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ اوپر نماز کے جتنے محاسن وفضائل بیان کیے گئے اور جن مہتم بالشان مقاصد پر روشنی ڈالی گئی' یہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے' جب تک کہ نماز کی تمام شروط اور اس جملہ آئین وآداب کی پابندی نہ کی جائے۔ نماز کے مقاصد'

اس کے ثمرات اور فوائد مرتب ہونے کے لیے حسب ذیل اصولوں پر کار بند ہونا ضروری ہے۔

انسان اپنے پروردگار عالم کی عبادت خلوص دل اور صدق نیت سے ادا کرے؛ جس کے اندر کسی دینی اور دنیوی غرض ملحوظ نہ ہو عبادت کسی ثواب کی امید اور عذاب کے خوب سے نہ کی گئی ہو۔ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی دخل ہو تو وہ اخلاص کے منافی ہے اس کی روشن مثال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سے دی ہے:

"لا یکون احدکم کالعبد السوء ان خاف عمل و لا کالا جیر السوء ان لم یعط اجرالم یعمل"

"تم اس غلام بد باطن کی طرح سے نہ ہو جاؤ جو کسی دباؤ اور خوف کی وجہ سے کام کرتا ہے اور نہ اس برے مزدور کی مانند جس کو اگر اجرت نہ ملے تو کام کرنا چھوڑ دے۔"

ایک مجمع میں ایک دیہاتی خاتون نے آ کر پوچھا:

"بخشش کسے کہتے ہیں۔؟"

لوگوں نے جواب دیا:

"اچھی چیز کو خرچ کرنا بخشش ہے۔"

یہ سن کر خاتون نے کہا:

"یہ تو دنیا میں ہوا، لیکن دین میں کیا چیز بخشش ہے۔؟"

جماعت نے جواب دیا:

"اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی بندگی بجالانا اور اس کی حرام کی ہوئی چیزوں سے احتراز کرنا یہی دینی جود و کرم ہے۔"

خاتون نے پوچھا:

"کیا تم ان چیزوں سے کسی معاوضہ کی امید رکھتے ہو۔؟"

لوگوں نے کہا:

"بے شک! کیوں نہیں۔؟"

خاتون بولی:

"کس لئے۔؟"

لوگوں نے کہا:

"اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ایک نیکی کے بدلے دس نیکیاں ملیں گی۔"

خاتون نے کہا:

"سبحان اللہ! تم تو ایک نیکی اس وجہ سے کرتے ہو کہ تم کو اس کے بدلہ میں دس نیکیاں ملیں گی' بھلا اسی کا نام بخشش ہے۔؟"

جماعت نے پوچھا:

"یہ نہیں تو پھر کیا ہے۔؟"

خاتون نے کہا:

"سنو! بخشش یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح سے کی جائے کہ اس سے کسی معاوضہ جزا یا سزا کا خیال نہ ہو۔ یہ کس قدر شرم کی بات ہے کہ تم دل میں کچھ اور نیت کر کے عبادت کرو اور اللہ تمہاری دل کی مراد کو جانتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کسی اور کو شریک کرنے کا نام ریا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"ولا یشرك بعبادة ربه احد"

(سورۃ کہف)

"اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کر۔"

عبادت میں کمال توجہ سے مراد یہ ہے کہ دل میں اس امر کا یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ ہماری نظروں کے روبرو ہے' ہماری ہر حرکت و سکون سے واقف ہے' ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز اس کی نگاہوں پر آشکار ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ہر جگہ موجود ہے' جب اس کا اعتقاد جازم نفس کے اندر جاگزیں ہو جائے تو دل عظمت الٰہی اور اس کے خشوع سے لبریز ہو جاتا اور دنیوی تفکرات و مشاغل سے ایک دم منقطع ہو کر ربانی تجلیات کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔

عبادت کے اندر ذوق و وجدان کو پورا دخل ہونا چاہیے۔ عبادت کے ادا کرنے کا ولولہ اور جذبہ ہر وقت دل کی گہرائیوں میں امنڈتا رہے۔ جب اس کا تصور آئے تو دل میں نشاط و سرور کی کیفیت پیدا ہو۔ روحانی لذت حاصل کرنے کے لیے بارگاہِ ایزدی اور مرکزِ معبودیت کی جانب ذوقی و وجدانی جذب و کشش موجود رہے اور ایسا نہ ہو کہ اس کو جبری فریضہ سمجھ کر ادا کیا جائے اور اس میں بے پروائی و بے توجہی سے کام لیا جائے۔

جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر تعلیمات روحانیت کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت کو بھی خوب سے خوب تر رکھنے میں مدد دیتی ہیں، اسی طرح نماز بھی روحانی صحت کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت کو قائم رکھنے میں اہم اور موثر کردار ادا کرتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار میرے پیٹ میں درد ہو رہا تھا تو رسول اللہ نے میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

"کیا تمہارے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔؟"

میں نے عرض کیا:

"ہاں! اے اللہ کے رسول!"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کھڑے ہو جاؤ اور نماز ادا کرو کیونکہ نماز میں شفا ہے۔"

(سنن ابن ماجہ، کتاب الطب، جلد 2، حدیث نمبر 3458)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی اس حقیقت کو عیاں کرتا ہے کہ اقامتِ صلوۃ جسمانی امراض کے لیے بھی شفاء ہے، بشرطیکہ اسے پورے آداب کے ساتھ سنتِ نبوی ﷺ کے مطابق ادا کیا جائے۔

نماز، بدن اور دل دونوں کی صحت کی نگرانی و حفاظت کی عجیب و غریب تاثیر رکھتی ہے اور ان دونوں سے موادِ رَدّیہ نکال دیتی ہے۔ دنیا میں جتنے بھی لوگ کسی مشکل، بیماری، آفت یا بلا کا شکار ہوتے ہیں ان میں نماز پڑھنے والوں کا تناسب کم سے کمتر ہوتا ہے اور اس کی عاقبت ہر طرح سے محفوظ و مامون رہتی ہے۔

ڈاکٹر محمد عالمگیر خاں کے نزدیک نماز سے جہاں روحانی فرحت اور اطمینانِ قلب

حاصل ہوتا ہے، وہاں اس میں جسمانی صحت کے راز بھی مضمر ہیں۔ اس کے تمام ارکان اگر اچھی طرح اور باقاعدگی کے ساتھ ادا کیے جائیں تو اس سے کئی جسمانی بیماریوں سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پانچ وقت کی نماز فرض کر کے ہم پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے۔ نماز جہاں ہمیں روحانی عروج اور طمانیتِ قلب عطا کرتی ہے اور برائیوں سے نکال کر پاکیزگی کے دائرے میں داخل کرتی ہے، وہاں جسمانی صحت کے لیے بھی ممد و معاون ہے۔ جسم کو چاک و چوبند رکھنے، اعصابی تکلیفوں اور جوڑوں کی بیماریوں سے بچانے اور غذا ہضم کرنے میں نماز بہت مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں صحتِ انسانی کے لیے نماز کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ ہمارے خون میں کولیسٹرول یعنی چربی کو کم کرنے کا کسی حد تک باعث بنتی ہے۔"

ڈاکٹر و حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی (پی، ایچ، ڈی۔ صدر شعبۂ طب و جراحت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اپنی تصنیف "اسلامی اصولِ صحت" میں لکھتے ہیں:

"اگر انسان پابندِ نماز بن جائے تو اس کے جسم کے لیے یہ ایک ورزش ثابت ہوگی جس سے جملہ اعضاءِ انسانی کی نشوونما بہتر ہوگی اور اس کی قوت بڑھے گی۔ نیز مفاصل کی ساختیں بھی درست رہیں گی اور مفاصل اپنے افعال صحیح طریقہ سے انجام دیتے رہیں گے اور مفاصل مختلف قسم کے امراض مثلاً تحجرِ مفاصل وغیرہ سے محفوظ رہیں گے۔ اس کے علاوہ نظامِ تنفس، نظامِ دورانِ خون اور نظامِ ہضم پر بھی بہتر اثرات مرتب ہوں گے اور انسان مدت العمر امراض و آفاتِ جسمانی سے محفوظ رہے گا اور اپنے فرائضِ زندگی کو صحیح اور بہتر طریقہ پر انجام دیتا رہے گا۔"

(اسلامی اصولِ صحت، صفحہ 35-36، از ڈاکٹر و حکیم سید محمد کمال الدین ہمدانی، ناشر الفلاح سوسائٹی علی گڑھ، بھارت)

"نماز ایک بہترین اسلامی ورزش ہے جو انسان کو ہر وقت تازہ دم رکھتی ہے، سستی اور اضمحلال کو جسم میں بڑھنے نہیں دیتی۔ دیگر مذاہب میں کوئی ایسی

جامع عبادت نہیں ہے جس کی ادائیگی کی صورت میں جملہ اعضاءِ انسان کی تحریک وطاقت بڑھے۔ یہ امتیاز نماز ہی کو حاصل ہے کہ یہ ایک نہایت جامع ورزش بھی ہے جس کا اثر جملہ اعضاءِ انسانی پر مساوی ہوتا ہے اور جملہ اعضاء جسم میں تحریک وطاقت پیدا ہوتی ہے اور صحت برقرار رہتی ہے۔"

(اسلامی اصولِ صحت، صفحہ 36، از ڈاکٹر وحکیم سید محمد کمال الدین ہمدانی، ناشر حی الفلاح سوسائٹی علی گڑھ، بھارت)

ترکی کے ڈاکٹر "ہلوک نورباقی" کا خیال ہے کہ کوئی جدید علم یا سائنس بھی نماز کے اسرار کا مکمل فہم رکھنے سے قاصر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"کوئی سائنس اس قابل نہیں ہے کہ وہ صلوۃ (نماز) کے رازوں کو پا سکے یا ان کا احاطہ کر سکے۔ نماز میں ورزش بھی ہے لیکن خاص طور پر اگر صلوۃ (نماز) کو محض ایک جسمانی ورزش سے تعبیر کیا جائے تو یہ اس قدر احمقانہ بات ہوگی جیسے یہ تصور کر لینا کہ کائنات میں اس ہوا کے سوا جس میں ہم سانس لیتے ہیں اور کچھ نہیں۔"

ڈاکٹر ہلوک نورباقی نے نماز کے روحانی پہلوؤں پر بہت زور دیا لیکن وہ بھی اس کے جسمانی فوائد کو نظر انداز نہیں کرتے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"آج کے دور میں مادہ پرست لوگ بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ جوڑوں (کے درد) کے آرام کے لیے نماز سے بہتر نسخہ کوئی اور نہیں۔"

نماز کی ورزشیں جہاں بیرونی اعضا کی خوشنمائی وخوبصورتی کا ذریعہ ہیں، وہاں اندرونی اعضاء مثلاً دل، گردے، جگر، پھیپھڑے، دماغ، آنتیں، معدہ، ریڑھ کی ہڈی، گردن، سینہ اور تمام قسم کے گلینڈز کی نشوونما بھی کرتی ہیں بلکہ جسم کو سڈول اور خوبصورت بھی بناتی ہیں۔"

کچھ امراض ایسے ہیں جن سے صرف نماز قائم کر کے محفوظ رہا جا سکتا ہے کیونکہ نماز کی ادائیگی سے جسم میں ان امراض کے خلاف قوتِ مدافعت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر حسن غزنوی کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اہل مغرب آج مختلف قسم کی ورزشیں کرتے ہیں تا کہ اُن کے اجسام میں کولیسٹرول کی مقدار حد سے نہ بڑھے۔ اس کے علاوہ ان کے جسم کے تمام نظام موثر طریقے سے کام کریں۔ انہوں نے اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا ہے کہ اسلامی نماز جیسی کوئی ورزش نہ کرنے کی وجہ سے انہیں مختلف ورزشوں کا سہارا لینا پڑتا ہے تا کہ وہ صحت مندرہ سکیں۔ جیسا کہ جرمنی کے مشہور رسالے ''دی ہائف'' میں نامور جرمن فاضل اور مستشرق ''جوا کیم دی یولف'' نے اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: ''اگر اہل یورپ میں اسلامی نماز کا رواج ہوتا تو ہمیں جسمانی ورزش کے لیے نئی نئی ورزشی حرکتیں ایجاد نہ کرنا پڑتیں۔''

(Islamic Medicine op. Cit. p.68)

ڈاکٹر ''ماجد زمان عثمانی'' یورپ میں ''فزیوتھراپی'' کی اعلیٰ ڈگری کے لیے گئے۔ جب وہاں ان کو بالکل نماز کی طرح ورزش پڑھائی اور سمجھائی گئی تو یہ اس ورزش کو دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ہم نے آج تک نماز کو ایک دینی فریضہ سمجھا اور پڑھتے رہے لیکن یہاں تو عجیب وغریب انکشافات ہوتے ہیں کہ نماز جیسی ورزش کے ذریعے تو بڑے بڑے امراض ختم ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کی فہرست دی کہ جو بیماریاں نماز کے ذریعے از خود سرانجام پانے والی ورزش سے درست ہو سکتی ہیں:

1: دماغی امراض۔ 2: اعصابی امراض۔

3: نفسیاتی امراض۔

4: بے سکونی، ڈیپریشن اور بے چینی کے امراض۔

5: دل کے امراض۔ 6: جوڑوں کے امراض۔

7: یورک ایسڈ سے پیدا ہونے والے امراض۔

8: معدے کا السر۔ 9: شوگر۔

10: آنکھوں اور گلے وغیرہ کے امراض

نماز میں نفسیاتی عوارض مثلاً: گناہ کا، خوف کا، احساس کمتری کا، مایوسی، بے چینی اور پریشانی وغیرہ کا بھی علاج ہے۔ جن کی تفصیل کو کتاب کی طوالت کے ڈر سے چھوڑا جا رہا ہے۔

بہر حال نماز سے انسان کو اَن گنت فوائد کے علاوہ جسمانی اور ذہنی فوائد بھی ہوتے ہیں۔ آج اسلامی عبادات کی سائنسی توجیہات سامنے آ رہی ہیں۔ نماز کا ہر رکن کسی نہ کسی طبی ونفسیاتی افادیت کا حامل ہے۔

ارکانِ نماز کو فرداً فرداً تشریحی روشنی میں دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ ہر رکن نماز کی ادائیگی میں مخصوص عضلات ومفاصل میں تحریک پیدا ہوتی ہے اور مخصوص عضلات کی ورزش ہوتی ہے۔ علمِ تشریح کا یہ ایک کلیہ ہے کہ جب انسان کسی حرکت کا ارادہ کرتا ہے تو متعلقہ مراکز دماغ سے تحریک مخصوص اعصاب کے ذریعہ متعلقہ عضلات میں پہنچتی ہے اور عضلات حسب محل منقبض یا منبسط ہو کر افعالِ مطلوبہ سر انجام دیتے ہیں اور جب نمازوں کی ادائیگی کی صورت میں بار بار ارکانِ نماز کا اعادہ کیا جاتا ہے تو یہ صورت ایک ورزش بن جاتی ہے۔ جس سے عضلات ومفاصل کی نشوونما اور طاقت بہتر ہوتی ہے۔ نیز جملہ ارکانِ نماز کی ادائیگی کی صورت میں جملہ اعضاءِ انسانی کی ورزش بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ہو جاتی ہے۔ جس سے جسمِ انسانی کی تازگی اور طاقت بحال رہتی ہے اور جسمانی افعال طبعی معیار پر جاری رہتے ہیں۔

نماز ایک بہترین اسلامی ورزش ہے، جو انسان کو ہر دم تازہ رکھتی ہے۔ سستی اور اضمحلال کو جسم میں بڑھنے نہیں دیتی مگر دوسرے مذاہب میں کوئی ایسی جامع عبادت نہیں ہے جس کی ادائیگی کی صورت میں جملہ اعضاءِ انسانی کی تحریک وطاقت بڑھے۔ یہ امتیاز نماز ہی کو حاصل ہے کہ یہ ایک نہایت جامع اسلامی ورزش بھی ہے۔ جس کا اثر جملہ اعضاءِ انسانی پر مساوی ہوتا ہے اور جملہ اعضاءِ جسم میں تحریک وطاقت پیدا ہوتی ہے اور صحت برقرار رہتی ہے۔

(اسلامی اصولِ صحت، صفحہ 36، از محمد کمال الدین ہمدانی)

نماز...... نفس اور بدن دونوں کے لیے ریاضت ہے، اس لیے اس میں قیام وقعود،

سجدہ ورکوع اور قعدہ کی مختلف حرکتیں ہوتی ہیں اور آدمی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے، اس کی وضع بدلتی رہتی ہے اور نماز میں جسم کے اکثر جوڑ جنبش کرتے رہتے ہیں اور اسی کے ساتھ اکثر باطنی اعضاء، معدہ، آنتیں، آلات تنفس اور قناۃ غذاء، ان سب کی وضع حرکات میں تغیر آجاتا ہے پھر اس صورت میں کون سی بات مانع ہے کہ ان حرکات سے بعض اعضاء توانا اور بعض مواد غیر ضرور یہ تحلیل نہ ہو جائیں۔

(طب نبوی، صفحہ 399، از ابن قیم الجوزیہ)

نماز کے طبی وسائنسی فوائد: اب ترتیب کے ساتھ نماز کے بعض ارکان کے طبی وسائنسی فوائد بیان کیے جاتے ہیں:

جب ہم ہاتھوں کو کانوں تک اٹھاتے ہیں تو بازوؤں، گردن کے پٹھوں اور شانے کے پٹھوں کی ورزش ہو جاتی ہے۔ دل کے مریض کے لیے ایسی ورزش بہت مفید ہے جبکہ یہ ورزش نمازی سے نماز پڑھتے ہوئے خود بخود ہو جاتی ہے اور یہ ورزش فالج کے خطرات سے محفوظ رکھتی ہے۔

نیت باندھتے وقت کہنی کے سامنے کے عضلات اور کندھے کے جوڑ کے عضلات استعمال ہوتے ہیں اور ان کی وزش ہو جاتی ہے۔

دماغ میں کھربوں خلیے کام کرتے ہیں اور خلیوں میں برقی رو دوڑتی رہتی ہے۔ اس برقی رو کے ذریعے خیالات شعور اور تحت الشعور سے گزرتے رہتے ہیں۔ دماغ میں کھربوں خلیوں کی طرح خانے بھی ہوتے ہیں۔ دماغ کا ایک خانہ وہ ہے جس میں برقی رو فوٹو لیتی رہتی ہے اور تقسیم کرتی رہتی ہے۔ یہ فوٹو بہت ہی زیادہ تاریک ہوتا ہے یا بہت زیادہ چمک دار۔ اک خانہ ہے جس میں کچھ اہم باتیں ہوتی ہیں اور ان اہم باتوں میں وہ باتیں بھی ہوتی ہیں جنہیں شعور نے نظر انداز کر دیا ہوتا ہے اور جن کو ہم روحانی صلاحیت کا نام دے سکتے ہیں۔ نمازی جب ہاتھ اٹھا کر دونوں کانوں کی لو کے قریب لے جاتا ہے تو ایک مخصوص برقی رو نہایت باریک آگ اپنا کنڈنسر بنا کر دماغ میں جاتی ہے اور دماغ کے اندر اس خانے کے خلیوں کو چارج کر دیتی ہے، جس کو شعور نے نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ خلیے چارج ہوتے ہیں تو دماغ میں روشنی کا ایک جھماکا ہوتا ہے اور اس جھماکے سے تمام

اعصاب متاثر ہو کر اس خانے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جس میں روحانی صلاحیتیں مخفی ہیں۔ساتھ ہی ساتھ ہاتھ کے اندر ایک تیز رَو دماغ میں سے منتقل ہو جاتی ہے۔

قیام میں جسم بالکل بے حرکت اور ساکن ہو جاتا ہے۔اس حالت سے بھی جسم انسانی پر بہت سارے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔چند ایک یہ ہیں:

جب نمازی قرأت شروع کرتا ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اتنی بلند آواز سے قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے کہ جس کو اس کے اپنے کان سن سکیں تو ان الفاظِ قرآن کے انوارات پورے جسم میں سرایت کر جاتے ہیں جو کہ امراض کے دفعیے کے لیے اکسیرِ اعظم ہیں۔قیام سے جسم کو سکون کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔

نمازی چونکہ قیام کے دوران قرآن پاک کی تلاوت کر رہا ہوتا ہے اس لیے اس کا جسم ایک نور کے حلقے میں مسلسل لپٹا رہتا ہے اور وہ جب تک اس حالت میں رہتا ہے تو اس وقت تک وہ نور جسے سائنسی زبان میں ''غیر مرئی شعاعیں'' کہتے ہیں اس کا احاطہ کیے ہوتی ہیں۔

قیام میں نمازی جس حالت میں ہوتا ہے اگر ہم روزانہ پینتالیس منٹ تک اس حالت میں کھڑے رہیں تو دماغ اور اعصاب میں زبردست قوت اور طاقت پیدا ہوتی ہے۔

قیام سے مؤخر دماغ جس کا کام چال ،ڈھال اور جسمِ انسانی کی رفتار کو کنٹرول کرنا ہوتا ہے،قوی ہو جاتا ہے اور انسان ایک ایسے خطرناک مرض سے بچا رہتا ہے۔جس سے آدمی اپنا توازن درست نہیں رکھ سکتا۔

ہاتھ باندھتے وقت کہنی کے آگے اور پیچھے والے پٹھے اور کلائی کے آگے اور پیچھے کھینچے والے پٹھے حصہ لیتے ہیں اور ان کی ورزش ہو جاتی ہے۔

نماز میں بایاں ہاتھ نیچے باندھا جاتا ہے اور دائیں ہاتھ سے اسے گرفت میں لیا جاتا ہے۔ دراصل انسانی اعضاء کے دائیں اور بائیں اطراف کی کیفیات الگ الگ ہیں۔دائیں حصے سے خاص طور پر دائیں ہاتھ سے غیر مرئی شعاعیں نکلتی ہیں جو کہ مثبت ہوتی ہیں اور بائیں ہاتھ سے جو شعاعیں نکلتی ہیں وہ منفی ہوتی ہیں۔بہر حال دائیں ہاتھ کی مثبت شعاعیں بائیں ہاتھ سے منتقل ہو کر طاقت،قوت اور تحریک کا باعث بنتی ہیں۔جس کی وجہ سے انسان معمولاتِ زندگی میں متوازن رہتا ہے اور پریشان نہیں ہوتا۔

نماز میں عورت اور مرد ایک مقام پر ہاتھ نہیں باندھتے بلکہ مرد ناف کے نیچے اور عورت سینہ پر ہاتھ باندھتی ہے۔اس سے بھی جسم انسانی کو بہت فوائد ملتے ہیں۔

مرد جب ناف یا اس کے نیچے ہاتھ باندھتا ہے تو دونوں ہاتھوں سے لہریں نکلتی ہیں جو کہ مثبت اور منفی ہوتی ہیں۔اب ان لہروں کے امتزاج سے ایک خاص اثر پیدا ہوتا ہے جو ناف کے ذریعے نظامِ اعصاب تک پہنچتا ہے جس سے گردے اور غدہ فوق الکلیہ قوی ہوتے ہیں جس سے جنسی قوت قوی اور متحرک ہوتی ہے۔

عورتیں نیت کے بعد جب سینہ پر ہاتھ باندھتی ہیں تو ان کے دل میں صحت بخش حرارت منتقل ہوتی ہے اور وہ غدود نشوونما پاتے ہیں جن پر بچوں کی غذا کا انحصار ہوتا ہے ۔نماز قائم کرنے والی ماؤں کے دودھ میں ایک خاص تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔جدید سائنس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عورتیں جب سینے پر ہاتھ رکھ کر ایک خاص مراقبہ کرتی ہیں جس میں دنیا سے کٹ کر کسی پرسکون خیال میں کھو جاتی ہیں (جیسا کہ نماز میں ہوتا ہے) تو ایسی حالت میں ایک خاص قسم کی ریز پیدا ہوتی ہیں جو بقول ڈاکٹر ڈارون ہلکے نیلے یا سفید رنگ کی ہوتی ہیں جو اس کے جسم میں داخل اور خارج ہوتی رہتی ہیں اور اس کے جسم میں قوتِ مدافعت کے بڑھنے سے وہ جسم کبھی بھی خلیات کے سرطان میں مبتلا نہیں ہوتا۔

گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر کمر کو جھکانے کی حالت کو رکوع کہتے ہیں۔اس حرکت میں جسم کے تمام پٹھوں کی ورزش ہوتی ہے۔اس میں کولہے کے جوڑ جھکاؤ میں ہوتے ہیں، کہنیاں سیدھی کھنچی ہوئی ہوتی ہیں اور کلائی بھی سیدھی ہوتی ہے اور ان تمام کے پٹھے چست حالت میں رہتے ہیں جبکہ پیٹ اور کمر کے پٹھے جھکتے اور سیدھے ہوتے وقت کام کرتے ہیں،اس طرح رکوع سے جسم کے متعدد اعضاء کی ورزش ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر حضرات رکوع اور سجدہ کو گھٹنوں اور کمر درد کے مریضوں کا علاج قرار دیتے ہیں۔رکوع سے حرام مغز کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ مریض جن کے اعضا سُن ہو جاتے ہیں وہ اس مرض سے بہت جلد افاقہ حاصل کر لیتے ہیں۔

"رکوع سے کمر درد کے مریض یا ایسے مریض جن کے حرام مغز میں ورم ہو گیا ہو وہ

بہت جلد صحت یاب ہو جاتے ہیں۔

رکوع سے گردوں میں پتھری بننے کا عمل سست پڑ جاتا ہے اور اس سے ٹانگوں کے فالج زدہ مریض چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

رکوع سے دماغ اور آنکھوں کی طرف دورانِ خون کے بہاؤ کی وجہ سے دماغ اور آنکھوں کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے۔

سجدہ میں کولہے، گھٹنے، ٹخنے اور کہنیوں پر جھکاؤ ہوتا ہے، جبکہ ٹانگوں اور رانوں کے پیچھے کے پٹھے اور کمر وشکم کے پٹھے کھنچے ہوئے ہوتے ہیں اور کندھے کے جوڑ کے پٹھے اس کو باہر کی طرف کھینچتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کلائی کے پیچھے کے عضلات بھی کھنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ سجدے میں عورتوں کے لیے گھٹنوں کو چھاتی سے لگانا احسن ہے، یہ بچہ دانی کے پیچھے گرنے کا بہترین علاج ہے۔

سجدے میں اور بھی بہت سے جسمانی فوائد مضمر ہیں، دماغ کو خون کی بہت ضرورت ہوتی ہے کیونکہ رئیس الاعضاء ہے مگر اس کا محلِ وقوع ایسا ہے کہ اس تک خون پہنچنا ذرا مشکل ہوتا ہے بالخصوص اس وقت جب شریانیں بھی تنگ ہوں۔ سجدہ دماغ کو خون کی فراہمی کے لیے نہایت ہی موزوں عمل ہے۔

دماغ عام حالت میں بیشتر وقت دل کے پمپ سے اونچا رہتا ہے اس لیے دماغ میں خون کی سرایت قدرے مشکل ہوتی ہے مگر سجدے میں دماغ دل سے نیچے ہوتا ہے اس لیے اس حالت میں اس کو خون با آسانی اور با افراط پہنچتا ہے۔ جتنا لمبا سجدہ ہوگا اتنا ہی زیادہ خون دماغ کو پہنچے گا۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طویل سجدوں کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ بنا برایں جو لوگ نماز کے عادی ہوتے ہیں ان کی عقل وفہم، یادداشت اور نفسیاتی صحت لمبی عمر تک درست رہتی ہے۔ کسی عمر میں بھی خداوند کریم کے حضور میں خلوصِ دل سے کیے ہوئے لمبے سجدے روحانی، دماغی اور نفسیاتی صحت کے لیے مدد ومعاون ہیں۔

جرمن مستشرق ''جوا کیم دی یولف'' کے مطابق سجدہ میں دونوں ہاتھوں اور دیگر اعضاء کو ایک کشش کے ساتھ پھیلانا اور سیٹنا فربھی کی مضرتوں کو دور کرتا ہے۔

(المصالح العقلیہ للاحکام النقلیہ، صفحہ 406)

نمازی آدمی کے چہرے پر تازگی رہتی ہے کیونکہ نماز اور سجدہ کی وجہ سے اس کی تمام شریانوں میں خون پہنچتا رہتا ہے۔ جو نماز نہیں پڑھتے ان کے چہرے پر ایک افسردگی سی پھیلی رہتی ہے۔

دو یا چار رکعت کے بعد جب ہم التحیات پڑھنے کے لیے بیٹھتے ہیں تو اس کو قعدہ کہتے ہیں۔ التحیات پڑھتے وقت جب کہ جسم بیٹھنے کی حالت میں ہوتا ہے، گھٹنے اور کولہے پر جھکاؤ ہوتا ہے، ٹخنے اور پاؤں کے عضلات پیچھے کھینچے ہوئے ہوتے ہیں، کمر اور گردن کے پٹھے کھنچے ہوئے ہوتے ہیں، اس سے ان عضلات کی ہلکی پھلکی ورزش ہو جاتی ہے۔

ورزش کا یہ اصول ہے کہ سخت ورزش کے بعد کچھ دیر توقف کیا جاتا ہے اور لمبے لمبے سانس لیے جاتے ہیں یا نسبتاً ہلکی پھلکی ورزش کی جاتی ہے۔ نماز میں بھی رکوع اور سجدوں کے بعد قعدہ میں بیٹھنا اسی اصول کا بہترین مظہر ہے۔

ڈاکٹر قاضی عبدالواحد کے مطابق نمازی کو سلام پھیرنے کے لیے سر دائیں بائیں کرنا پڑتا ہے اور ایسا کئی بار ایک نماز میں کرنا پڑتا ہے۔ ایسا کرنے والا امراضِ قلب اور اس کی اندرونی پیچیدگیوں سے ہمیشہ بچا رہتا ہے اور بہت کم ان امراض میں مبتلا ہوتا ہے۔

سلام پھیرتے وقت گردن کے دائیں اور بائیں طرف کے پٹھے کام کرتے ہیں۔ یہ گردن کی بہترین ورزش ہے جو نماز کی ادائیگی کے باعث خود بخود ہو جاتی ہے۔

اوقات نماز اور جدید سائنس: اللہ تعالیٰ نے انسان کو حرکت کرنے والا جسم عطا فرمایا۔ لہٰذا اس کی صحت جسم کے متحرک رہنے (ورزش وغیرہ) سے قائم رہ سکتی ہے۔ پنجگانہ نماز انسان کو متحرک رکھتی ہے۔ وقفے وقفے سے نماز باجماعت کے لیے مسجد جانا پڑتا ہے یہ ایک اعلیٰ قسم کی ورزش مانی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے صحت مندانہ تحریک کے طور پر پانچ وقت نماز کے لیے جانا لازم ٹھہرایا۔ تاکہ انسان وقفے وقفے سے مختلف اوقات میں نماز کی ادائیگی کے لیے حرکت کرتا رہے اور اپنے خالق و مالک کے حضور اپنی عبدیت و بندگی پیش کرتا رہے۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ وقت نماز کے لیے مسجد جانا اور نماز باجماعت ادا کرنا ضروری ٹھہرایا۔ ان اوقات کے مختلف ہونے میں بھی کئی سائنسی

اورطبی فائدے پائے جاتے ہیں۔ایک مسلمان نمازی پانچ اوقات میں یہ نمازیں ادا کرتا ہے اوراس کے علاوہ نمازِ تہجد بھی سنتِ رسول ہے، جس کا وقت طلوع فجر سے پہلے ہے۔اب ان نمازوں کے مختلف الاوقات ہونے کے سائنسی اور طبی فوائد بیان کیے جاتے ہیں۔ان کی ترتیب کچھ یوں ہے:

1: تہجد 2: فجر

3: ظہر 4: عصر

5: مغرب 6: عشاء

ماہرین کی طویل تحقیقات سے تہجد کی نماز کے ذریعے درج ذیل فوائد کا حصول ثابت ہے:

(1) وقتِ تہجد میں نماز پڑھنا بے سکونی اور نیند کی کمی کا علاج ہے۔

(2): نمازِ تہجد دل کے امراض کے لیے تریاقِ اعظم ہے۔

(3): وقتِ تہجد میں نماز ادا کرنا اعصابی کھچاؤ اور جکڑاؤ کے لیے مفید ہے۔

(4): دماغی امراض خاص طور پر پاگل پن کی خطرناک کیفیت کے لیے نماز تہجد آخری علاج ہے۔

(5): وقتِ تہجد میں نماز پڑھنا نظر کی بیماریوں کا مکمل علاج ہے۔نمازِ تہجد خاص طور پر ان لوگوں کا علاج ہے، جن کو دو دو چیزیں نظر آتی ہوں۔

(6): نمازِ تہجد انسانی جسم میں نشاط، فرحت اور غیر معمولی طاقت پیدا کرتی ہے ، جو نمازی کو سارا دن ہشاش بشاش رکھتی ہے۔

علاوہ ازیں یہ کہ تہجد کی نماز میں انسان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ انتہائی قرب نصیب ہوتا ہے۔رات کو کچھ وقفہ نیند لینے کے بعد یا یوں سمجھیں کہ آدھی رات کے بعد صبح صادق سے پہلے پہلے تک نمازِ تہجد کا وقت ہوتا ہے۔نمازی جب نمازِ تہجد کے لیے نیند سے بیدار ہوتا ہے تو اس وقت اس میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ اس کا شعور غیبی تحریکات اور غیر مرئی شعاعوں کو آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔

اسی لیے صوفیاءِ کرام رحمۃ اللہ علیہم کہتے ہیں:

"جس ولی اللہ نے جو کچھ بھی حاصل کیا ہے وہ نمازِ تہجد کو پڑھ کر ہی حاصل کیا ہے۔ تہجد گزار کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص خلوت نصیب ہوتی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ سے حصولِ قرب و معرفت کی آخری سیڑھی نمازِ تہجد ہی ہے۔"

رات ختم ہوتی ہے تو طلوعِ فجر کے ساتھ ہی فجر کی نماز فرض کی گئی ہے۔ جو ہلکی سی ہے۔ طبیعت پر گراں بھی نہیں۔ رات بھر آرام کرنے کے بعد جبکہ معدہ بھی خالی ہوتا ہے، سخت محنت وورزش نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے اور اس کو کرنے سے آدمی کی صحت خراب ہو سکتی ہے۔ لہذا ہلکی اور مختصر نماز مقرر فرمائی گئی تا کہ انسان کو گراں بھی نہ گزرے اور اس کو نقصان بھی نہ ہو بلکہ ایک نمازی یہ چار رکعت کی نماز پڑھ کر فوائد سے مالا مال ہو سکے۔ فجر کی نماز کو پڑھ کر آدمی اپنے سست جسم کو پھر متحرک و فعال کر سکے، اس کے بعد دن کے دوران اپنے رزق و معاش کے حصول کے لیے کام کاج میں مصروف ہو سکے اور دماغ پھر سے سوچنے سمجھنے کے لیے تیار ہو سکے۔

صبح سویرے تازہ موسم اور روشنی میں انسان نماز کے لیے باہر نکلتا ہے اور پیدل چلتا ہوا مسجد جاتا ہے تو تازہ، مصفّٰی اور پر سکون ماحول سے لطف اندوز ہوتا ہے جو صحت کے لیے بہت مفید ہے۔

فجر کی نماز کے لیے نمازی کو اپنے جسم کی صفائی کرنی پڑتی ہے۔ وہ وضو کرتے ہوئے اپنے جسم کے اعضاء کو دھوتا ہے، دانت صاف کرتے ہوئے مسواک کرتا ہے جو صحت کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اگر یہ نہ کرے تو منہ اور جسم پر جراثیم پلنے لگیں اور مختلف امراض کا سبب بن کر آدمی کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔ لہذا فجر کی نماز فرض ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ صحت و صفائی کا کام باقاعدہ ہوتا رہے۔

دن شروع ہونے کے ساتھ ہی انسان کسبِ معاش میں لگ جاتا ہے۔ گرد و غبار اس کے جسم پر لگتے ہیں۔ بعض کیمیکلز ہاتھ پاؤں کو لگنے کا بھی امکان ہوتا ہے۔ غرضیکہ آدمی جراثیم سے آلودہ ہوا میں رہتا ہے تو اس کے جسم پر جراثیم حملہ کر دیتے ہیں؛ نیز دوپہر تک کام کرتے کرتے تھکاوٹ بھی محسوس ہونے لگتی ہے، لہذا ایک نمازی ظہر کی نماز کے لیے وضو کرتے ہوئے پھر سے اپنے ہاتھ، منہ اور پاؤں وغیرہ کو دھوتا ہے جس سے امراض کا خدشہ

باقی نہیں رہتا۔

تھکے ہوئے اجسام ظہر کی نماز پڑھتے ہوئے آرام اور سکون بھی محسوس کرتے ہیں اور پھر سے تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ جس سے تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ یہ فوائد ایک نمازی کو ظہر کی نماز کے وقت حاصل ہوتے ہیں۔

دوپہر تک سخت گرمی پڑنے کی وجہ سے جب سورج ڈھلنے لگتا ہے تو زمین سے زہریلی گیس خارج ہونے لگتی ہے۔ اگر وہ زہریلی گیسیں انسان کے جسم کو متاثر کر دیں تو وہ مختلف امراض کا شکار ہو جاتا ہے، اس کا دماغ متاثر ہو جاتا ہے اور وہ پاگل پن کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ دوپہر کے وقت نماز ظہر پڑھنے کے لیے وضو کرتے ہوئے اپنے جسم کو پھر سے نئی تازگی اور سکون فراہم کرتا ہے۔ وضو کے ذریعے وہ زہریلی گیسوں سے اپنے جسم کو بچا لیتا ہے اور کئی قسم کے جراثیموں کو اپنے جسم سے نکال باہر کرتا ہے۔ اس لیے عین ان گیسوں کے اٹھنے کے وقت کو یعنی سورج ڈھلنے کے وقت کو ظہر کا وقت قرار دیا گیا۔

اصحاب علم و فکر اور اہلِ دانش جانتے ہیں کہ زمین دو طرح کی گردش کرتی ہے۔ وہ گردشیں درج ذیل ہیں:

1: طولانی۔ 2: محوری۔

جب سورج ڈھلنے لگتا ہے تو زمین کی گردش میں کمی ہونے لگتی ہے حتیٰ کہ عصر کے وقت گردش میں بہت زیادہ کمی آجاتی ہے۔ اس وجہ سے انسان کے دن کے حواس پر رات کے حواس کا غلبہ ہونے لگتا ہے، طبیعت میں تھکان اور اضمحلال واقع ہونے لگتا ہے۔ اسی نمازِ عصر کے وقت میں انسان کے شعوری حواس پر لاشعوری حواس کی گرفت ہونے لگتی ہے۔ جس کی وجہ سے آدمی خود کو نڈھال سا محسوس کرنے لگتا ہے۔

ایک نمازی عصر کی نماز کے لیے وضو کر کے اپنے آپ کو ان آفات کی گرفت سے محفوظ کر لیتا ہے اور اپنے خالق و مالک کی عبادت میں لگ جاتا ہے، جس سے طبیعت زیادہ مضمحل نہیں ہوتی اور لاشعوری حواس کی گرفت کو برداشت کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔

نماز میں نورانی شعاعیں نمازی کو سکون بخشتی ہیں جس کی وجہ سے وہ روح کے قریب ہو جاتا ہے اور نمازِ عصر ادا کر کے روحانی تحریکات کو قبول کرنے لگتا ہے۔

انسان سارا دن محنت ومشقت میں گزارتا ہے اور اپنے لیے اور اہل وعیال کے لیے روزی کما کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے اس کو کسبِ معاش میں قوت عطا فرمائی ۔وہ کیف وسرور میں ہوتا ہے۔جس سے دل بھی ایک خاص قسم کا سرور محسوس کرتا ہے۔

وقتِ مغرب میں وہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر اپنی عبدیت کا اظہار کرتا ہے،اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے اور نورانی لہروں سے بہرہ مند ہوتا ہے جو اس کی روح کو تسکین دیتی ہیں۔ان نورانی غیر مرئی لہروں کا اثر اس کے بچوں پر بھی ہوتا ہے کہ وہ مؤدب وسعادت مند بنتے ہیں۔جو مسلمان نمازِ مغرب درست طور پر باقاعدہ ادا کرتے ہیں ان کی اولاد اپنے والدین کی مؤدب ہوتی ہے،ایسے نمازیوں کے بچے سعادت مند ہوتے ہیں اور ان کے گھر کا ماحول بھی شائستہ وخوشگوار ہوتا ہے۔

انسان طبعی طور پر لالچی ہے ۔جب وہ کاروبار سے فارغ ہو کر گھر آتا ہے تو کھانا کھاتا ہے اور لذت وحرص میں کھانا زیادہ کھالیتا ہے ۔اگر وہ کھانے کے بعد لیٹ جائے تو وہ مہلک بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

انسان اگر سارے دن کی تھکاوٹ اور زیادہ کھا لینے کے بعد فوراً ہی لیٹ جائے تو وہ بے سکون ہی رہے گا۔سونے سے پہلے اور زیادہ کھانا کھانے کے بعد تھوڑی بہت ورزش کر لینا صحت کے لیے اچھی ہے۔

بس دن کے تھکے ماندے اور زیادہ کھا لینے والے حریص انسان کے لیے عشاء کی نماز کسی ورزش سے کم نہیں ۔نمازِ عشاء سے کیف وسرور اور سکون میسر ہوگا اور ساتھ ہی نظامِ نماز کے ذریعے کھانا بھی ہضم کے مراحل میں داخل ہو جائے گا۔

اس طرح نماز عشاء کی طویل نماز کو پڑھ کر سونے والا آدمی ساری رات سکون اور آرام کی نیند سوئے گا اور اس کا کھانا بھی ہضم ہو جائے گا۔اب تو ماہرینِ طب بھی سونے سے پہلے ہلکی پھلکی ورزش پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ورزش کئی اقسام کی مضر بیماریوں سے بچاتی ہے۔محققین کا یہ بھی کہنا ہے کہ سونے سے پہلے نماز سے بہتر کوئی ورزش نہیں۔

روزہ:

انسان جسم وروح کے مجموعہ کا نام ہے۔ قدرت نے ان دونوں کے درمیان مدت مقررہ تک رشتہ قائم رکھا ہے۔ بعض انسانی طبقوں پر مادیت کا غلبہ ہوتا ہے جس سے وہ رات دن جسمانی لذتوں اور رغبتوں کے نشہ میں ہمیشہ مدہوش رہا کرتے ہیں۔ ان کی انسانیت پر بہیمیت کے تاریک پردے پڑ جاتے ہیں۔ کھانے پینے اور عیش وعشرت کی خواہش ان کو اس قدر اندھا بنا دیتی ہے کہ اس کے سوا اور کوئی چیز ان کی بے نور آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتی۔ چند سال یونہی گزر جاتے ہیں اور انسان دنیاوی چیزوں کے نشہ میں چور رہتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شباب کا رنگین زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ بڑھاپا خزاں بن کر چھا جاتا ہے' قویٰ میں ضعف وانحطاط پیدا ہو جاتا ہے اور یہ مدہوش انسان بہت جلد جانوروں کی سی موت مر جاتا ہے۔ اس کو اپنی زندگی بھر میں کوئی ایسا نور نہیں ملتا جو اسے دوسرے عالم میں جب کہ وہ سراسر تاریکیوں میں گھرا ہوگا کچھ روشنی دے سکے۔

جس طرح انسانی اجسام بسا اوقات مادی بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں' اس صورت میں وہ طبیبوں کے علاج کے محتاج ہوتے ہیں۔ جو انسان کی مادی بیماریوں کا علاج مختلف مفرد اور مرکب دواؤں سے کرتے ہیں' اسی طرح جب انسان روحانی امراض میں مبتلا ہو جائے' روح کی جلا اور صفائی جاتی رہے' دنیا فسق وفجور کے سیلاب میں غوطے کھانے لگے' شر وفساد کے جراثیم فضائے انسانیت میں پھیل کر مختلف مہلک اور خطرناک امراض پیدا کر کے زندگی خطرہ میں ڈال دیں اور مادیت پرستی کی زہر آلود وبائیں روحانیت کا خاتمہ کر ڈالیں تو اس وقت انبیاء اطبائے روحانی بن کر دنیا میں تشریف لاتے ہیں۔ مختلف روحانی نسخوں اور مفرد ومرکب ادویہ سے نفس کی بیماریوں کا علاج کرتے اور اس مزاج کو اعتدال پر قائم رکھتے ہیں جس سے ہستی کا کون وفساد اور عالم کا نظام وابستہ ہے۔

دنیا میں جس قدر مذاہب وادیان آئے تقریباً ان تمام میں یہی مقصد وحید کارفرما تھا کہ نفوس انسانی کی اصلاح اور ان کے اذہان کا تزکیہ کیا جائے۔ آخری شریعت آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے بھیجی گئی۔ اس میں ہر قسم کی بیماریوں کا مکمل علاج موجود ہے۔ اسلامی احکام انسانی روح وجسم کی صحت وصفائی کو بحال رکھنے اور تزکیہ نفس کے لئے

تیر بہدف ادویہ ہیں اور اسلام ان تمام مفردات کا ایک معجون مرکب ہے۔ روزہ اور نماز بھی اسی معجون کے دو اہم جزاء ہیں اُن میں سے نماز اور اس کے مقاصد کا تذکرہ پہلے ہو چکا اب روزہ اور اس کے اہم مقاصد پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

روزہ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایک روزہ دار طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب تک محض کھانے پینے سے اپنے نفس کو روکے رکھے بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہر قسم کے شہوانی جذبات اور نفسانی خواہشات سے باز رہے۔ حدیث بھی اس مقصد کی صراحت اس طرح سے کرتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے آنحضرت رضی اللہ عنہ کا قول مروی ہے:

"روزہ صرف کھانے پینے سے علیحدہ رہنے کا نام نہیں بلکہ روزہ لغو اور بیہودہ امور سے بھی باز رہنے کا نام ہے۔ لہٰذا اگر کوئی برا کہے یا تم سے جہالت کی بات کرے تو اس کو کہہ دو کہ میں روزہ سے ہوں۔"

ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے:

"جس نے جھوٹ بولنے اور جھوٹ کے مطابق عمل کرنے کو نہ چھوڑا خدا کو اس کے نہ کھانے پینے سے کچھ سروکار نہیں۔"

ہم کو یہ حکم ہوا ہے کہ صبر و تقویٰ کے ذریعے نفس کا مجاہدہ کریں۔ یہی ایک چیز روح کی حفاظت کر سکتی ہے اور یہ محض اسی صورت میں ممکن ہے کہ زبان کو لغو اور فحش باتوں سے چغلی، جھوٹ، ریا اور مکر و فریب سے محفوظ رکھیں۔ کانوں کو مکروہ باتوں کے سننے سے اور آنکھوں کو ایسی چیزوں کی طرف دیکھنے سے بچائے رکھیں جو سراسر نفسانی خواہشوں کو ابھارنے کا باعث ہیں۔ نظر کو ابلیس کے زہر آلود تیروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"النظر سھم مسموم من سھام ابلیس لعنہ اللہ فمن ترکھا خوفا من اللہ اتاہ اللہ عزو جل ایمانا تجد حلاوتہ فی قلبہ"

"نظر ابلیس (اللہ کی اس پر لعنت ہو) کے تیروں میں سے ایک زہر آلود تیر ہے۔ جو کوئی اللہ سے ڈر کر اس سے باز رہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسا ایمان عطا کرے گا جس کی حلاوت وہ اپنے دل میں محسوس کرے گا۔"

اسی مقصد کی طرف اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا ہے:

یاایھاالذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون

(سورۃ البقرۃ)

"ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح سے کہ تم سے پیشتر لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تا کہ تم متقی ہو جاؤ۔"

اگلی حدیث مقدس نے اس آیت جلیلہ کی مزید توضیح یوں فرمائی ہے:

"انما الصوم جنة فاذا کان احدکم صائما فلا یرفث ولا یجھل وان امراء قاتله او شاتمه فلیقل انی صائم"

"روزہ ڈھال ہے، جب تم میں سے کوئی روزہ سے ہو تو لغویات زبان سے نہ نکالے اور نہ جہالت برتے۔ اگر اس سے کوئی جھگڑا کرے یا گالی دے تو وہ اس سے یہی کہے کہ میں روزہ سے ہوں۔"

روزہ انسان کے نفس اور روح کا محافظ ہے جس سے بُری خواہشیں دب جاتی ہیں اور سرکش نفس سرنگوں ہو جاتا ہے۔

انسان کا نفس جو برائیوں کی طرف آمادہ کرتا رہتا ہے بجائے خود ایک شیطان ہے جو قدم قدم پر اکساتا رہتا ہے، روزہ اس کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس لطیف انداز میں اس کی تشریح فرمائی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"اذاجاء شهر رمضان فتحت ابواب الجنة وغلقت ابواب النار وصفدت الشياطين"

"جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو بہشت کے دروازے کھل جاتے اور دوزخ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور سب شیاطین جکڑ دیے جاتے ہیں۔"

اس اجمال کی مزید تفصیل یہ ہے کہ یہ امر واضح ہے کہ دنیا میں عام برائیاں اکثر

اوقات جسمانی قوتوں کے چڑھاؤ سے سرزد ہوا کرتی ہیں۔ جو لوگ خوش حالی اور فراغت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اچھی اچھی غذائیں کھاتے رہتے ہیں' ان کے اندر بدمستی کی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کا نفس حد اعتدال سے تجاوز کر کے اپنی من مانی خواہشات کو پورا کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اندر ہی اندر برے جذبات کی پرورش کرتا اور ان کو بروئے کار لانے پر انسان کو برانگیختہ کرتا ہے۔ جب ایسے لوگ روزہ رکھتے ہیں تو جسمانی قوت میں کمی واقع ہونے کی وجہ سے نفس کو قابو میں رکھنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے' پس جب انسان محض پروردگار عالم کے لیے بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کرتے اور گناہوں کو ترک کرتے ہیں اور نفس کو اپنی آرزو پوری کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تو ان کے لئے رحمت الٰہی جوش میں آتی ہے' بہشت کے دروازے ان کے لیے کھل جاتے ہیں' دوزخ کے دروازوں کا بند ہونا بھی ظاہر ہے کہ جب گناہوں کے دروازہ کو کھولنے والی چیز ہی باقی نہ رہے جو غضب الٰہی کی آگ کو بھڑکانے کا موجب ہے تو دوزخ کے دروازے کس طرح کھلے رہ سکتے ہیں۔؟

شیاطین کے جکڑے جانے سے مراد یہ ہو سکتی ہے کہ جب بنی آدم کے جسم میں توانائی وقوت اپنے شباب پر ہو' شکم سیری اور فارغ البالی کے تمام سامان فراہم ہوں تو گناہوں کی جانب رغبت پیدا ہو جاتی ہے اور رگوں' پٹھوں اور نس نس سے شیطانی تحریکات شروع ہوتی ہیں' مگر جب سارے جسم میں بھوک اور پیاس کا اثر ہو اور روزہ کی وجہ سے تمام شہوانی وحیوانی جذبات کا بازار سرد پڑ جائے تو شیطان کو برائیوں پر آمادہ کرنے کا موقع ہی کب ملتا ہے' گویا روزہ نے ان جذبات وتحریکات کو جو اپنے اندر شیطانی غلبہ وجوش رکھتی ہیں' قید وبند میں کر دیا' انہیں ہتھکڑیاں پہنا دیں' جس سے وہ اب ہر طرح مجبور ہو گئے۔

اسی چیز کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

"ان الشیطان یجری من بنی آدم کمجری الدم من العروق فضیقوا مجاریہ بالجوع"

"بے شک شیطان بنی آدم کے رگ وریشہ میں خون کی طرح دورہ کرتا رہتا ہے پس اس کی گزرگاہوں کو بھوک سے بند کر دو۔"

اسی قوت شہوانی کے سیلاب کو روکنے کے لیے اسلام نے نکاح کے باب میں یہ حکم دیا ہے کہ جس شخص میں نکاح کرنے کی استطاعت نہیں ہے تو اس کو روزہ رکھ لینا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ روزہ شہوتوں کو دبانے کا ایک بہترین ذریعۂ تقویٰ و پرہیزگاری کا وسیلہ اور روح و نفس کا بے نظیر محافظ ہے۔

انسان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا سمندر ہمیشہ جوش زن رہا کرتا ہے۔ اس کے مطالب و مقاصد کا سلسلہ غیر محدود ہے' اگر دنیا جہان کی بادشاہت بھی اس کو مل جائے پھر بھی اس کی حرص و طمع کی آگ نہ بجھنے پائے گی۔ دنیا میں اس کے ارادہ و اقتدار کی باگ اس کے قبضہ میں دے دی گئی ہے۔ اس کے زندگی کھانے، پینے اوڑھنے اور دیگر جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ دوسروں پر غلبہ حاصل کرنا' حاکم مطلق بن کر رہنا' اپنا رعب و اقتدار قائم رکھنا بھی انسانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ اس لحاظ سے ایک قوم کے افراد کے جذبات و مرغوبات مختلف ہوا کرتے ہیں۔ انسانی سوسائٹی محبت و اتحاد' مدافعت' اتفاق' ہمدردی اور ایثار وغیرہ کی محتاج رہتی ہے۔ اس اثناء میں مختلف مذاہب و مسالک رونما ہو جاتے ہیں' جن کے اغراض و مقاصد بھی مختلف اور متعدد ہوتے ہیں۔ اجتماعیت میں خلل اور فتنہ و فساد واقع ہو جاتا اور صفحۂ دنیا سے امن و سلامتی کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔

اسلام نے نفس کی ریاضت کے لیے روزہ کو فرض کیا ہے تاکہ نفس اپنی ان تمام قوتوں کو جادۂ اعتدال پر برقرار رکھے' جن پر نفسانی خواہشوں کی وجہ سے زوال رونما ہو گیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ روزہ سے نفس کی ریاضت کیوں کر عمل میں لائی جا سکتی ہے؟ اس کا آسان حل یہ ہے کہ تجربات و مشاہدات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کم کھانے پینے سے روحانی صفات و کمالات میں ترقی ہوتی ہے' جسمانی خواہشات خود بخود گھٹتی جاتی ہیں' جسم پر روح کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں اور روح کا آئینہ جو مادیت کے مکدر ہاتھوں سے زنگ آلود ہو چکا تھا' ازسرنو ریاضت کی وجہ سے روشن و چمکدار ہو جاتا ہے۔ نفس' عقل اور ارادہ میں حیرت انگیز روحانی جلوے سما جاتے ہیں۔ چنانچہ مسیحی گروہ اپنے مبلغین کو اس وقت تک دور دراز ملکوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لیے نہیں بھیجتا' جب تک کہ ان کے نفوس بھوک کی ریاضت و مشقت برداشت کر کے صبر و تحمل اور ثبات و استقلال کا پیکر نہ بن

جائیں۔ جب وہ اس منزل تک پہنچ جاتے ہیں اور عزیمت واستقامت جیسی شاندار صفات سے آراستہ ہوتے اور اپنی قوت ارادی کو قابو میں کر لیتے ہیں' اس وقت ان وحشی قبیلوں میں تبلیغ واشاعت کے لیے بھیجے جاتے ہیں' جہاں ان کو ان کی ہیبت وسختی اور ان کی استبدادی وقہرمانی قوتوں کا کچھ خوف نہیں رہتا۔

اسلام نے بھی اسی مقصد کو ملحوظ رکھ کر روزہ کو مشروع کیا۔ گزشتہ اسلامی تاریخ بتا رہی ہے کہ صحابہ کرام نے مصیبتوں اور شدتوں کو جھیلتے ہوئے جن ممالک پر فتح وکامرانی حاصل کی' وہ سب ان کی نفسانی ریاضتوں کا نتیجہ تھا۔

وہ کون سا انسان ہے جو اپنی زندگی میں صبر وثبات اور عزیمت وہمت جیسے اہم اسباب وآلات کا محتاج نہیں رہتا؟ ان تمام کے حاصل کرنے کے لیے ریاضت نفس کے سوا اور کیا ذریعہ ہے؟ اور ریاضت نفس کے لیے روزہ سے بہتر کوئی اور موثر ذریعہ نہیں۔

روزہ انسان کو قناعت کی زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوشخص کفایت اور قناعت سے اپنی زندگی کے اوقات بسر کرتا ہے' کم تعداد میں غذا وخوراک استعمال کرنے کا عادی بن جاتا ہے نہ صرف یہی بلکہ ہر چیز پر قانع رہتا ہے' ایسا شخص حریص اور لالچی نہیں ہوتا۔ اس کی نظروں میں مال ودولت کی کچھ بھی وقعت باقی نہیں رہتی۔ بخلاف اس کے جو شخص بھر پیٹ کھانے کا عادی ہے' وہ بندۂ شکم ہو جاتا ہے۔ جب کبھی کسی وقت کی غذا نصیب نہ ہو یا کھانے میں تاخیر ہو جائے تو بھوک سے بے تاب وبے قرار ہو جاتا ہے۔ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کوئی چیز نہیں مل رہی ہے تو وہ ناجائز طور پر پیٹ بھرنے کی کوشش کرتا ہے اور جرائم کا ارتکاب کرنے میں ذرا بھر نہیں جھجکتا۔

روزہ مشکلات ومصائب میں صبر وعزیمت سے کام لینے کا بہترین ذریعہ ہے۔ روزہ دار کھانے پینے کی چیزوں اور دیگر نفسانی خواہشوں سے اپنے آپ کو باز رکھتا ہے۔ عین بھوک اور پیاس کی شدت میں جب اسے کسی چیز کی خواہش پیدا ہوتی ہے تو وہ اپنی قوت ارادی سے کام لیتا ہے نیز جب انسانی نفس کھانے پینے کی خواہش سے رکا رہتا ہے اور تھوڑا کھانے کی وجہ سے اسے بھوک اور پیاس کی شدتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے تو اس کے اندر ایک طرح سے مصائب وشدائد کو برداشت کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی قوت ارادی

اس قدر مضبوط رہتی ہے کہ اس کا دل صرف کھانے کے ایک دانہ اور پانی کے ایک قطرہ کے لیے کتنی ہی خواہش کیوں نہ کرے وہ شخص اپنے صبر و عزیمت کی سرحد سے ایک قدم بھی باہر نہ نکالے گا۔

روزہ خدا تک پہنچانے کا آسان ذریعہ ہے۔ روزہ دار کا دل عجز و انکسار کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے کیونکہ نفس بھوک کی وجہ سے جتنا عاجز ہوتا ہے' اتنا کسی اور چیز سے نہیں ہوتا۔ جب اس کو اپنی بھوک اور پیاس کے رفع کرنے کے تمام ذرائع مسدود نظر آنے لگتے ہیں اور کھانے کے ایک لقمہ اور پانی کے ایک گھونٹ کے لیے دنیا اس کی نگاہوں میں تاریک ہو جاتی ہے تو اس کو لامحالہ بارگاہ ایزدی میں حاضر ہو کر اپنے عجز و قصور کا اعتراف کرنا پڑتا اور اپنی حاجت رفع کرنے کے لیے الحاح وزاری سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس وقت اس کی دلی توجہ پروردگار عالم ہی کی طرف مبذول رہتی ہے اور اس کا دل خشیت باری تعالیٰ میں ڈوب جاتا ہے۔

نفس کو اس کی خواہشات سے روکنا ہی سب سے بڑا جہاد ہے' اس سے بڑھ کر جرأت و شجاعت کا مقام اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہی وہ معیار ہے جس پر انسانی خوبیوں اور محاسن کے جواہر ابھرتے ہیں۔ اس کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے:

"رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر"

"ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹے۔"

یہاں کافروں کے ساتھ جہاد کرنے کو جہاد اصغر اور نفس کے ساتھ مجاہدہ کرنے کو جہاد اکبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دنیا میں بہت سارے ایسے انسان موجود ہیں جن کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا میسر نہیں ہوتا۔ ایسے غریب اور فاقہ کش انسان بھی ہیں جن کی زندگی افلاس و فاقہ کی وجہ سے دھندلکے میں پڑی ہوئی ہے۔ ایسے ہی غریبوں محتاجوں اور فاقہ کش انسانوں کی تاریک زندگی کا تصور کرانے اور ان کے ساتھ ہمدردی و غم خواری کے جذبات و احساسات پیدا کرانے کے لیے روزہ مشروع ہوا تا کہ روزہ دار کو یہ احساس ہو سکے کہ بھوک میں کیسی شدت ہوتی ہے' پیاس کی وجہ سے انسان کس قدر بے قرار ہو جاتا ہے اور فاقہ کشی میں کس

قدر تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب اس کے اندر یہ جذبہ احساس پیدا ہو جائے گا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کو ایک غریب اور فاقہ کش انسان کے ساتھ ہمدردی نہ پیدا ہو۔ بخلاف اس کے اگر کوئی شخص روزہ ہی نہ رکھے تو اس کو کیا معلوم کہ بھوک کیا چیز ہے؟ پیاس کی شدت و تکلیف کسے کہتے ہیں؟ بھوکے اور پیاسے انسان پر کیا کچھ مصیبت نہیں گذرتی؟ پھر وہ ایک مفلس اور فاقہ کش کی کس طرح حاجت پوری کر سکتا اور اس سے اظہار ہمدردی کر سکتا ہے۔؟

حضرت یوسف علیہ السلام سے سوال کیا گیا:

"آپ کس لیے بھوکے رہتے ہیں حالانکہ اللہ نے آپ کو بہت کچھ دیا ہے۔؟"

آپ نے فرمایا:

"اگر میں بھر پیٹ کھاؤں تو یہ ڈر ہے کہ کہیں بھوکے کی خبر گیری نہ کر سکوں۔"

روزہ وہ روحانی گراں مایہ امانت ہے جو انسان کے تفویض کی گئی ہے۔ بحالت صوم خلوت وجلوت کی مختلف صورتیں در پیش ہوا کرتی ہیں۔ ان میں سے کٹھن اور دشوار منزل تنہائی اور خلوت ہے' یہی سب سے بڑی آزمائش گاہ ہے جہاں روزہ دار کو اپنی امانت اور دیانت داری کا امتحان ہر لحہ دینا پڑتا ہے۔

امانت و دیانت داری کو خلوت وجلوت کے تمام لحات میں ہاتھ سے نہ جانے دینا خود اس امر کی دلیل ہے کہ نفس کے اندر بڑی بڑی اہم امانتوں کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ ایسا شخص لوگوں کے پاس قابل اعتماد ہے اور عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھے جانے کے لائق۔

لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہونے اور تنہائی کی حالتوں میں رہنے کے باوجود اس نے اپنی قوت ارادی کو قائم رکھا اور پروردگار عالم کی اس نازک اور گراں مایہ امانت کی پاسبانی میں سر موکوتاہی نہیں کی۔ یہ خود اس کی کمال مروت' علو ہمتی اور فراواں حیاداری کی روشن علامت ہے۔ مروت نام ہے اس چیز کا کہ انسان اس کے ذریعے سے بلند مراتب وکمالات حاصل کرے۔

حیاء کے تین مراتب ہیں:

(1) احکام و اوامر الٰہی کی پابندی' اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے احتراز' سر اور پیٹ کی خواہشوں کی حفاظت' دنیوی زیب و آرائش کو ترک کرنا اور مصیبت و موت کو یاد کرنا۔

(2) لوگوں کی ایذا رسانی سے باز رہنا۔

(3) خود انسان کا تنہائیوں میں اپنے نفس سے حیا کرنا اور ہر حالت میں اس کی حفاظت کرنا' جیسا کہ بعض حکماء نے کہا ہے:

"اوروں سے حیا کرنے کی بہ نسبت تمہیں زیادہ تر خود اپنے نفس سے حیا کرنا چاہئے۔"

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

"میرا ظاہر و باطن ایک ہے یہی میرا اخلاق ہے۔ میری رات کی تاریکی میری صبح کی روشنی کے مانند ہے۔"

جس شخص نے حیاء کے یہ تین مدارج حاصل کر لیے اس کے اندر تمام محاسن اور خوبیاں جمع ہو گئیں اور وہ اخلاق فاضلہ کا بہترین نمونہ ثابت ہوگا۔ طب جدید کے مشاہدات واکتشافات بتا رہے ہیں کہ بیماریوں کے اکثر و بیشتر جراثیم جو جسم انسانی میں پیدا ہو جاتے ہیں روزہ ان کے وجود کو فنا کرنے کے لیے تیر بہدف علاج ہے۔ گویا روزہ بدن میں زہریلے جراثیم کے لیے تریاق ہے' یہی وجہ ہے کہ اطباء اکثر مریضوں کو روزہ رکھنے کی ہدایت کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ اور بہت سے طبی اغراض و مقاصد روزہ سے وابستہ ہیں۔

معدہ کو طب میں ام الامراض (بیماریوں کی جڑ) کہا جاتا ہے' اس لئے کہ اکثر بیماریاں زیادہ کھانے اور معدہ میں فضلات کے جمع ہونے سے پیدا ہو جاتی ہیں' دیگر اسباب سے جو بیماریاں پیدا ہوتی ہیں وہ بہ نسبت ان کے بہت کم ہیں اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے:

"البطنة اصل الداء
والحمية راس الدواء"

"شکم سیری بیماری کی جڑ اور پرہیز سب بیماریوں کی دوا ہے۔"

سال میں ایک مہینہ روزہ رکھنے سے معدہ تقریباً پاک ہو جاتا ہے اور جس قدر فضلات اس کے اندر جمع تھے وہ سب دور ہو جاتے ہیں۔

حضرت لقمان علیہ السلام اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"بیٹا! جب معدہ بھر جاتا ہے تو قوت فکر کمزور پڑ جاتی ہے، حکمت و دانش گونگی اور تمام اعضاء عبادت سے غافل ہو جاتے ہیں۔"

حضرت بصری فرماتے ہیں:

"ابن آدم مسکین ہے۔ ایک دن ضرور اس پر موت آئے گی جس میں اس کی آرزوئیں اور حسرتیں خاک میں مل جائیں گی' وہ صرف گوشت کے ایک لوتھڑے سے بات کرتا ہے' ان آنکھوں سے دیکھتا ہے جو چربی کا ایک ٹکڑا ہیں اور ان کانوں سے سنتا ہے' جو ہڈیوں سے بنے ہوئے ہیں۔ اپنی بھوک میں گرفتار' پیٹ کا بندہ' نفع ونقصان اور موت وحیات ان میں سے کسی چیز پر اس کو قابو نہیں۔"

☆☆☆

باب نمبر 11:

افراد کے میں جماعت کی صلاحیت پیدا کرنے کے وسائل اور اسلام

افراد میں جماعت کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے شریعت نے دو طریقے مقرر کیے ہیں:
1: حج۔ 2: زکوۃ۔

حج بیت اللہ

حج کے معنی:

کعبۃ اللہ اور مقدس مقامات کی مخصوص افعال و اقوال کے ساتھ زیارت کرنے کا نام حج ہے اس کے چند اہم اجتماعی مقاصد ہیں:

1: اخوت اسلامی۔ 2: آثار ماضیہ کی یاد۔ 3: اعتدال پسندی۔ 4: یاد محشر۔

اخوت اسلامی:

مذہب اسلام کا بغائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے اکثر احکام و تعلیمات میں اخوت اسلامی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ بیشتر اسلامی احکام میں برادرانہ تعلقات برقرار رکھنے اور ربط و اتحاد بڑھانے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے باہمی بغض و نفرت کو چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

"ولا تنازعوا فتفشلوا و تذهب ريحكم" (سورۃ انفال)

"آپس میں نہ جھگڑو ورنہ تم پسپا ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔"

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"لن تدخلوا الجنة حتى تومنوا ولن تومنوا حتى تحابوا"

"تم جنت میں ہرگز نہ داخل ہو گے جب تک کہ ایمان نہ لاؤ اور مومن نہیں

کہلاؤ گے جب تک کہ آپس میں اتحاد و محبت نہ پیدا کرو۔"

پنج وقتہ نماز' جمعہ اور عیدین میں ایک جگہ مجتمع ہونے کا مقصد یہی ہے کہ ایک شہر یا ایک محلہ کے لوگ ایک جگہ جمع ہوں اور باہمی ربط و محبت میں اضافہ ہوتا رہے۔ شرعی اور اجتماعی ہر قسم کے ضروری مصالح وقتاً فوقتاً سوچا کریں' چونکہ اجتماع کی اس نوعیت سے پورے اسلامی مقاصد کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی' اس کا فائدہ کسی شہر یا محلہ تک ہی محدود ہو جاتا ہے' اس لئے ایک ایسے عام اجتماع کی ضرورت پیش ہوئی جس میں روئے زمین کے تمام مسلمان ہر ملک و شہر سے ایک مقام پر جمع ہوں جن کا مقصد ایک' مذہب ایک اور خیالات ملتے جلتے ہوں۔ امت اسلامیہ کے علماء، خطباء اور حکماء ان لوگوں کو جو اسلامی تعلیمات سے ناواقف ہیں آشنا کرائیں' ان کو اسلامی احکام و مقاصد سمجھائیں اور اسلامی سلطنتوں اور ملکوں کے حالات دریافت کریں۔ وہاں کی قوم ملک و ملت کے اخلاق و عادات' علوم و فنون' کاروبار' دینی' سیاسی' اقتصادی حالات اور ہر قسم کے معاملات و امور سے روشناس ہوں۔ اجتماعی اہم مسائل پر تبادلہ خیال کریں' مصالح اسلامیہ اور غور طلب امور میں فکر و بحث سے کام لیں۔ باہمی تعاون کے نظریہ کے تحت ایک دوسرے کی حکومت و سلطنت کی بابت بلحاظ تجارت' زراعت' صنعت و حرفت اور طرز معاشرت وغیرہ کے معلومات حاصل کریں تاکہ کوئی ضرورت و حاجت تشنۂ تکمیل ہو تو باہمی امداد حاصل کی جائے۔

آثار ماضیہ کی یاد:

مقدس و متبرک مقامات کی زیارت دل میں گزشتہ آثار و واقعات کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے جنت سے نکل کر دنیا میں آنے کی حالت' ان کی گریہ وزاری اور توبہ و مناجات کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کے حالات اور ان کے عرفانی واقعات کے نقش و نگار ذرہ ذرہ میں آشکار نظر آنے لگتے ہیں کہ کس طرح یہ آزمائشوں میں مبتلا کیے گئے تھے۔ بیٹا باپ کے فرمان کی تعمیل کس خندہ پیشانی سے بجالایا' کیوں کر باپ نے بیٹے کو ذبح کر کے حکم خداوندی کی تکمیل کی تھی اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر انوار و برکات کی وہ بارش برسائی کہ ان کی تکالیف دور ہو گئیں اور ان کی جگہ مسرت و اطمینان نے لے لی۔

زائر کی آنکھوں میں اسلامی تاثرات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت' دین اسلام کی نشوونما' ہجرت کے مشاہدات' کفار قریش کے مظالم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ پر' غرضیکہ یہ اور اس قسم کے جملہ واقعات جن سے اسلامی عظمت وشان آشکار ہوتی ہے زائرین کے سامنے مجسم ہوتے ہیں جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ دین اسلام قوت واقتدار سے نہیں پھیلا بلکہ تائید ایزدی اس کے شامل حال تھی۔

کیا ان تمام واقعات کو زندہ کرنے سے زائرین کے دل و دماغ تاثرات کی گہرائی میں نہ ڈوب جاتے ہوں گے۔؟ اور اللہ کے احکام وامر کی پاسداری کا اقرار اور آرزو ان کے دلوں میں نہیں پیدا ہوتی ہوگی؟ ان کے اخلاق وعادات اور زندگی میں حیرت انگیز انقلاب برپا نہیں ہوتا ہوگا۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی باعظمت اور بلند نشانیوں وک دیکھنے اور گزشتہ آثار کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے بعد نفس انسانی کے اندر اسلامی عظمت واحترام کا بے پایاں جذبہ پیدا ہوتا اور الٰہی جلال وکبریائی کی تصویر سامنے آ جاتی ہے۔

اعتدال پسندی:

انسانی نفوس بے جا زیادتی کرنے کے عادی رہتے ہیں جن سے ان کو منع کرنا ہمیشہ ان پر شاق گزرتا ہے۔ اس کے اندر جو فساد ونقصان ہے وہ انسانی اجتماع کی برداشت سے باہر ہے' اس کی اصلاح دشوار ہو جاتی ہے۔ اس لئے حکمت ایزدی اس امر کی داعی ہوئی کہ نفوس کو بے جا ظلم وزیادتی سے روکا جائے اور عدل وانصاف کے جذبات ان کے اندر پیدا کئے جائیں۔

اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے انتہائی احترام وعظمت بجالانے کے لیے حج کے مراسم اور مقامات مخصوص کر دیئے اور احکام حج کو ادا کرنے میں دگنا ثواب اور ان کے ترک کرنے میں سخت عذاب مقرر فرما دیا تا کہ انسانی نفوس سرکشی اور ظلم سے باز رہیں اور عدل واحسان پر نظر رکھیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ شریعت نے زمانہ حج کے درمیان سلے ہوئے کپڑے پہننے اور خشکی کا شکار کرنے کو حرام قرار دیا ہے' حال آں کہ یہ اوقات حج کے بعد مباح ہیں؟ اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں:

پہلا یہ کہ انسان بعض اوقات کسی حکم کی اس طرح پابندی کرے کہ وہ اس کی عادت ثانیہ بن جائے، پس اگر وہ بعض اوقات یا مقامات میں سخت سزا کے خوف سے جرائم کا ارتکاب کرنے سے باز رہے تو یہ اس کی ایک مستقل عادت بن جاتی ہے۔

دوسرا یہ کہ عقل مند شخص بگاڑ پیدا کرنے والی چیزوں سے پرہیز کرتا اور اپنے کام کو رخنہ انداز اسباب سے حتی الامکان محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض اوقات یا بعض مقامات میں جب یہ امید رکھ کر عمل کرتا ہے کہ اس کو دگنا ثواب ملے گا تو گناہ سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتا اور برائیوں کی وجہ سے کوئی بگاڑ پیدا کرنے سے ہمیشہ روکے رکھتی ہے، اس کو ہر دم یہ خوف لگا رہتا ہے کہ اس کا قدم کہیں حدودِ اعتدال سے تجاوز نہ کر جائے۔

یادِ محشر:

جب تمام مسلمان ایک مقام پر جمع ہوں گے، ان کے دل باہمی خلوص و محبت میں ڈوبے ہوئے، خشیت و عظمت الٰہی سے لبریز ہوں گے، بہت سارے ہاتھ اس شان سے بلند ہوں گے کہ زبانیں ذکر الٰہی میں مصروف اور دل مختلف دعاؤں اور مناجات میں مشغول رہیں گے۔ ہر شخص اپنی خلوص نیت اور نیک ارادہ کے مطابق اللہ کی رحمت سے فیضیاب ہوگا، بہت سارے خوف ورجا کے عالم میں سرگرداں ہوں گے، بعض اپنے گزشتہ گناہوں کی یاد سے لرزاں اور رحمت الٰہی کے طلبگار اور بعض اپنے افعال پر پشیمان، خشیت ایزدی سے ان کے دل لبریز ہوں گے۔ ان میں قومی و نسلی رنگ و بو کی تمیز اڑ جائے گی، عالم و جاہل، امیر و فقیر اور ادنیٰ و اعلیٰ سب کے سب برابر ہوں گے۔ یہ تمام مناظر عرصۂ محشر کی یاد تازہ کرتے اور قیامت کبریٰ کا ہولناک اور ہیبت خیز نقشہ آنکھوں کے روبرو پیش کرتے ہیں اور یہاں یہ آیت صادق آتی ہے:

''یوم یفر المرء من اخیه وامه وابیه وصاحبته وبنیه''

''اس دن آدمی اپنے بھائی، ماں، باپ، ساتھ والی (بیوی) اور بیٹوں سے گریز کرے گا۔''

کیونکہ یہ اپنے مال، اولاد اور گھر بار کو چھوڑ کر آئے ہیں اور تمام طبقات سے ایک ہی لباس پہنے ہوئے، دنیوی تعلقات سے علیحدہ اور بلا امتیاز رنگ و نسل بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوئے ہیں۔ سب کے سب اپنے گناہوں پر شرمسار اور رحمت الٰہی کے امیدوار ہیں۔

زکوۃ فرضیت واہمیت

زکوۃ کا معنی ومفہوم:

لفظ زکوۃ تزکیہ سے نکلا ہے، جس کے معنی پاک وصاف کرنے کے ہیں اور زکوۃ کا لفظ پاکی، نمو اور ترقی کے معنی پر اطلاق کیا جاتا ہے چونکہ زکوۃ انسان کو بخل، گناہ اور عذاب سے نجات دلانے، پاک وصاف کرنے اور ترقی مال کا ذریعہ ہے جس کی طرف قرآن عزیز میں اشارہ فرمایا گیا ہے:

"خذ من اموالهم صدقة تطهر و تزكيهم"

(سورۃ التوبہ)

"ان کے مال میں سے زکوۃ لے کہ تو ان کو پاک کرے اور بابرکت کرے۔"

لفظ صدقہ سے تعبیر کی وجوہ:

اس لئے اس عمل کا نام زکوۃ ہوا نیز صدقہ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ فعل صدقہ دینے والے کے ایمان کی تصدیق کرتا ہے اور اس کی صدق دلی اور خلوص نیت کی علامت ہے۔

بخل و کنجوسی:

ارشاد الٰہی ہے:

"ومن يوق شح نفسه فاولئك هم المفلحون"

(سورۃ تغابن)

"جو اپنے نفس کی بخالت سے بچتا ہے وہی فوز و فلاح پانے والے ہیں۔"

نفس انسانی کے لیے بخل ایک خطرناک مرض ہے جو انسان کو خسیس و ذلیل بنا دیتا اور اس کے اندر دناءت اور کمینہ پن پیدا کر دیتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بخل اور بزدلی کو نہایت مہلک قرار دیا ہے:

"شر ما اعطى العبد شح و جبن خالع"

"نہایت ہی بری چیز یہ ہے کہ انسان کو بخل اور ہلاکت آفریں بزدلی ملے۔"

زکوٰۃ کے اکثر و بیشتر مقاصد ایسے ہیں جو انسانی سوسائٹی کی تشکیل و تنظیم اور اس کی خوش حالی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے ضمن میں وہ امور بھی آجاتے ہیں جو خود افراد کی ذات سے وابستہ اور ان کی تہذیب و اصلاح سے متعلق ہیں، جن پر حسب ذیل بیانات بخوبی روشنی ڈالتے ہیں۔

ایثار و استقلال:

دولت انسان کی محبوب ترین چیزوں میں سے ہے۔ جیسا جیسا دولت ہاتھ آتی ہے انسان اور زیادہ حرص و ہوس کے تاریک غار میں گرتا جاتا ہے۔ اس کا خرچ کرنا نفس پر بہت ہی شاق گزرتا ہے حتی کہ بعض ان صورتوں میں جہاں انسان کی زندگی اور موت کا سوال ہو، وہ سب چیزوں پر دولت کو ترجیح دے گا اور اپنی جان عزیز تک بھی قربان کرنے سے دریغ نہ کرے گا۔ زکوٰۃ ایسی ہی چیزوں کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے جس میں زکوٰۃ ادا کرنے والے کی ثابت قدمی ظاہر ہوتی ہے۔ جب اس نے ایک دشوار ترین چیز یعنی زکوٰۃ ادا کرنے پر قابو پالیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے اندر تمام باطل اور استبدادی قوتوں سے مقابلہ کرنے اور راہ حق پر ثابت قدم رہنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔ وہ اس قابل ہوگیا کہ اپنی نفسانی خواہشوں کے خلاف جو اس برائیوں کی طرف لیے جارہی تھی، جہاد کرسکے، قرآن عزیز نے اس ملکہ کو ثبات نفس سے تعبیر کیا ہے:

"ومثل الذين ينفقون اموالهم ابتغاء مرضاة الله وتثبيتا من انفسهم كمثل جنة بربوة اصابها وابل فاتت اكلها ضعفين فان لم يصبها وابل فطل"

(سورۂ بقرہ)

"اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال کو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اور اپنے دلوں کو ثابت کرکے خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے بلند زمین پر ایک باغ ہے اس پر زور کا مینہ پڑا تو وہ باغ اپنا دو چند پھل لایا اور اگر اس پر مینہ نہ پڑا تو پھوار ہی کافی ہے۔"

اسی زکوٰۃ کا خاصہ ہے کہ انسان کے اندر اپنی عزیز چیز کو قربان کرنے کا مادہ پیدا ہوتا

ہے حتی کہ اگر اسلام کی خاطر اپنی جان عزیز کو بھی ایثار کرنے کا وقت آ پہنچتا ہے تو بھی پیچھے نہیں ہٹے گا۔

ترقی مال:

زکوۃ مال داروں کے مالوں کی حفاظت اور ان کی زیادتی کا موجب ہے کیونکہ حاجت مند اور غریب انسانوں کو جب یہ اطمینان ہو جائے کہ مال داران کے لیے روپیہ صرف کرتا ہے تو ان کی دعائیں اور تمنائیں اس کے وجود اور بقائے نعمت کے لیے وقف ہو جائیں گی۔ وہ ہر وقت اس کی خارجی آفتوں کے لیے سینہ سپر رہیں گے۔ زکوۃ میں مالداروں کی جانی و مالی حفاظت و ترقی کی طرف قرآن عزیز نے کس لطیف پیرایہ میں اشارہ فرمایا ہے:

"مثل الذین ینفقون اموالهم فی سبیل الله کمثل حبة انبتت سبع سنابل فی کل سنبلة مائة حبة و الله یضاعف لمن یشاء"

(سورۃ بقرہ)

"جو لوگ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک دانہ، جس سے سات بالیاں اگیں، ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کو چاہتا ہے دو چند بڑھا دیتا ہے۔"

نیز زکوۃ مالدار کے لیے اپنے فیاض ازلی کے شکریہ کا اظہار ہے جس کے صلے میں مالدار ہر آفت اور زوال سے محفوظ رہتا اور اس کے مال میں اضافہ ہوتا رہتا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

"لئن شکرتم لا زیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید"

(سورۃ ابراہیم)

"اگر تم احسان مانو گے تو تمہارے لئے اور بھی زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو بے شک میرا عذاب البتہ سخت ہے۔"

رفع حاجات:

ہر سال زکوۃ کے ادا کرنے میں سوسائٹی کا توازن برقرار رہ سکتا ہے۔ انسانی ضروریات کی تشکیل انجام پاتی ہے، حاجت مند، غریب اور فاقہ کش انسان کی زندگی سنور سکتی

ہے اور قرض داروں کا قرض ادا ہو جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ لوگوں میں محبوب ترین شخص آپ کے نزدیک کون ہے۔؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

"انفع الناس للناس"

"جو لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچائے۔"

پوچھا گیا:

"یارسول اللہ! بہترین اعمال کیا ہیں۔؟"

ارشاد فرمایا:

"ادخال السرور علی المومن"

"مومن کو خوشی سے سرفراز کرنا۔"

پھر دریافت کیا گیا کہ مومن کی خوشی کیا ہے۔؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اشباع جوعه وتنفيس كربه"

"اس کی بھوک رفع کرنا، اس کی مصیبت کو دور کرنا اور اس کے قرض کو پورا کرنا۔"

اصلاح معاش:

تیموں کی پرورش، غریبوں کی امداد اور حاجت مندوں کی ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ مقرر کی گئی ہے جو زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ چیز باہمی بغض وعناد کو دور کرنے اور محبت و تعلق بڑھانے کا بہترین سامان ہے۔ تنگدستی اور غربت وہ بری بلا ہے کہ جس سے انسان ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کرنے پر آمادہ ہو جاتا، قتل وخونریزی کرنے سے بھی نہیں رُکتا، یہی چیز مالداروں اور محتاجوں کے درمیان پیدا ہو سکتی ہے۔ جب مالدار طبقہ اپنے فرائض انجام نہ دے تو مزدوروں کے دل میں بغض ونفرت کے جذبات پیدا ہو جاتے اور وہ اس کے زوال کی آرزو کرنے لگتے ہیں، باہمی کشمکش کے وہ اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ کتنی قومیں اس فریضۂ انسانی میں کوتاہی کرنے سے تباہ ہو گئیں؟ اس چیز کے مفقود ہونے سے کتنی قوموں کو نکبت وزوال کا منہ دیکھنا پڑا؟ اس سلسلہ میں دنیا کے ہر حصہ میں کیسی کیسی خونریز تحریکات پیدا ہونی شروع

ہوئیں؟ مالداروں کے خلاف کتنے مزدوروں اور بیکس انسانوں نے ہر زمانہ اور ہر سوسائٹی میں اپنی خوفناک صدائے احتجاج بلند کی؟ جن کے دل تھرا دینے والی چیخیں اب تک فضائے بسیط میں گونج رہی ہیں جو اب تک بھی سرمایہ داروں کو تھپیڑے دے دے کر اور جھنجھوڑ کر اپنی غفلت سے بیدار کر رہی ہیں؟ یہ وہ بڑے تلخ نتائج ہیں جو مال زکوٰۃ نہ نکالنے سے وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔

تشکیل جمہوریت:

اسلام نے ہمدردی واحساس کی روح پھونکنے' بنی نوع انسان کے فقر وفاقہ افلاس وغربت کا علاج کرنے اور ایک نظم واتحاد قائم کرنے کے لیے نظام زکوٰۃ کی وہ انقلابی اسکیم دنیا کے روبرو پیش کی ہے جس سے عظیم الشان کام انجام پا سکتے ہیں اور زندگی کا کوئی شعبہ تشنہ تکمیل رہنے نہیں پاتا۔ اس کا سب سے بڑا اور اہم مقصد یہ ہے کہ عالم اسلامی کی تمام کڑیاں مربوط ومنظم رہیں۔ ایک ایسی جمہوریت تشکیل پذیر ہو جس کو انفرادیت کا منتشر تخیل درہم برہم نہ کر سکے۔

قرآن مقدس کو شروع سے آخر تک پڑھ جایئے' اکثر وبیشتر مقامات پر صلوٰۃ کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان دونوں چیزوں کو بار بار دہرا کر جس قدر زور دیا گیا ہے اتنا روزہ اور حج پر نہیں دیا گیا۔ یہ اس امر کا زبردست ثبوت ہے کہ انفرادی اصلاح کے لیے نماز سے بڑھ کر اور جماعتی اصلاح کے لیے زکوٰۃ سے بہتر کوئی اور چیز نہیں ہے۔ صلوٰۃ سے اگر روحانی اور انفرادی طور پر تزکیہ ہوتا ہے تو زکوٰۃ سے جماعتی زندگی خوشگوار اور خوشحال ہوتی ہے۔ ایک میں اگر یہ قابلیت ہے کہ وہ افراد کی ذہنیتوں میں نمایاں تغیر پیدا کرے تو دوسری میں یہ قوت ہے کہ وہ سوسائٹی کی حالتوں میں انقلاب عظیم برپا کر دے اور ان کی زندگی کی اصلاح کرتے ہوئے ایک حد تک جماعتی توازن کو برقرار رکھے۔

اسلامی جمہوریت کی عظیم الشان عمارت جن بنیادوں پر قائم ہے ان میں سے ایک محکم بنیاد یہی زکوٰۃ ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جس وقت آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فتنہ ارتداد برپا ہوا یعنی نو واردان اسلام نے محض اس وجہ سے کہ ان سے زکوٰۃ کا مطالبہ کیا گیا انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور مرتد ہو گئے تو

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے جہاد کرنے کے لیے فوج بھیجنے کا ارادہ کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"خدا کی قسم! اگر یہ لوگ اس زکوۃ سے انکار کرتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ادا کرتے تھے تو میں ان سے جہاد کروں گا اور زکوۃ لوں گا۔"

چنانچہ اس اہم فریضہ کی تکمیل کے لیے آپ رضی اللہ عنہ نے ان سے جہاد کیا اور کسی طرح اسلام کے اس رکن عظیم کو گرنے نہ دیا۔

وعید:

جو لوگ اس فرض کی ادائیگی میں سستی اور کوتاہی کرتے ہیں' مال جمع کر کے اس کو خرچ نہیں کرتے اور راہ حق میں دینے سے پیچھے ہٹتے ہیں' ان کے بارے میں کس قدر سخت وعید آئی ہے:

"والذين يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقوها في سبيل الله فبشرهم بعذاب اليم يوم يحمىٰ عليها في نار جهنم فتكوى بها جباها زوجهم وظهورهم هذا ما كنزتم لانفسكم فذوقوا ما كنتم تكنزون"

(سورۃ التوبہ)

"جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو' جس دن کہ اسی سونے چاندی کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اسی سے ان کے ماتھے' کروٹیں اور پیٹھیں داغی جائیں گی۔ ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لئے دنیا میں جمع کر رکھا تھا تو اپنے جمع کئے کا مزہ چکھو۔"

اس سختی کے ساتھ جو وعید آئی ہے' اس کا مقصد یہ ہے کہ زکوۃ کے دینے میں انہوں نے سستی اور غفلت سے کام لیا اور نظام عالم کو خراب کرنے کا باعث ہوئے۔ انہوں نے انسانی ضروریات وحاجات کی ذرا بھر پروانہ کی' انہوں نے فقر وفاقہ میں مبتلا انسانوں کو اپنی

آنکھوں کے روبرو دم توڑتے اور ایڑیاں رگڑتے ہوئے دیکھا' ٹس سے مس تک نہ ہوئے، انہوں نے بھوکوں اور پیاسوں کو تڑپتے اور تلملاتے دیکھا ان کی کوئی خبر گیری نہ کی' ایک عالم کو انہوں نے ننگا پایا لیکن ان سے نگاہیں پھیر لیں' نرم نرم گدوں پر بیٹھے ہوئے اونچے اونچے ایوانوں سے بیکس اور مظلوم انسانوں کی آہ وفریاد کا حسرت ناک منظر دیکھا' لیکن ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی' یتیموں' بیواؤں اور مصیبت زدہ لوگوں کی بے قرار آہیں ان کے ظالم گلے میں باہیں ڈال ڈال کر انسانہ رحم و ہمدردی کی بھیک مانگ رہی تھیں، لیکن انہوں نے ان کی ٹھوکروں سے خبر نہ لی۔ ایسے لوگ جو انسانی سوسائٹی کے حق میں زہریلے سانپ اور انسانیت کے جسم میں خطرناک جراثیم سے بھی بڑھ کر تھے' قیامت کے دن ان کی سزا بھی ان کے لائق تجویز کی گئی کہ وہی سونا اور چاندی جس پر ان کو فخر وناز تھا' جس کی وجہ سے انہوں نے ایک عالم کی زندگیوں کو پامال کر دیا تھا' آج گرم کر کے ان کی ان پیشانیوں پر داغ دیئے جارہے ہیں جو مظلوموں اور محتاجوں کی حالت زار دیکھ کر بل کھا جاتی تھیں۔ ان کے ان پہلوؤں کو کباب کی طرح بھونا جارہا ہے جو کبھی نرم نرم ریشمی بستر پر لیٹے ہوئے مزدور' مفلس اور فاقہ و افلاس کے انگاروں پر لوٹتے اور کروٹیں لیتے ہوئے دیکھا کرتے تھے اور ان کی ان پشتوں کو جلایا جارہا ہے جن پر عالم کے بیکسوں، محتاجوں اور غریبوں کے بے شمار وزنی بوجھ لدے ہوئے تھے۔ یہ تمام سزائیں ان کو محض اس وجہ سے دی جارہی ہیں کہ انہوں نے انسانی حقوق کی نگہداشت نہیں کی' انہوں نے اس بات کو فراموش کر دیا کہ زکوٰۃ کے مصارف کیا کیا تھے اور کتنے کام اس سے سنور سکتے تھے۔ ان کے پیش نظر زندگیوں کے یہ مناظر موجود تھے، لیکن انہوں نے ان کو غور سے نہیں دیکھا:

"انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیها والمولفة قلوبهم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل الله ابن السبیل فریضة من الله"(سورۂ توبہ)

"زکوٰۃ حق ہے مفلسوں محتاجوں اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والوں کا اور جن کے دلوں کی تالیف منظور ہو اور گردنوں کے چھڑانے میں اور تاوان بھرنے کے لیے اور اللہ کے راستہ میں اور راہ کے مسافر کو اللہ کی جانب سے مقرر کیا ہوا ہے۔"

ان کو نہیں معلوم کہ زکوٰۃ نہ دینے سے کتنے محتاجوں کا گلا گھونٹ دیا' کتنے کام بگڑ گئے' کس قدر زندگیاں تباہ و برباد ہوگئیں اور کتنے انسانوں کا خون بہ گیا۔؟

درحقیقت اسلام نے نظام زکوٰۃ مقرر کر کے دنیا پر ایک ایسا عظیم ترین احسان کیا جس کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا' جب تک عالم اسلام اس پر کاربند رہا' اسلامی جمہوریت کی روح باقی تھی اور جب سے مسلمانوں نے اس سب سے بڑے اسلامی اصول سے روگردانی کی' ان کی ساری کڑیاں درہم برہم ہوگئیں۔ اسلام نے جس اہم مقصد کو پیش نظر رکھ کر جمہوریت کی تشکیل کی تھی اور اس پر جس شاندار عمارت کو کھڑا کیا تھا' کیا اس کے اصول کو چھوڑ کر اپنے من گھڑت قومی چندہ یا ''مہذب بھیک'' کے ناپائیدار ستونوں پر یہ بنیادیں کھڑی رہ سکتی ہیں۔؟

اسلام کے مبارک دور میں اس کا قائم کیا ہوا بیت المال تھا جو محتاجوں' غریبوں' غلاموں' مسافروں' مصیبت زدہ انسانوں' یتیموں' بیواؤں غرضیکہ ساری خزاں رسیدہ زندگیوں کے لیے ابر بہار تھا۔ یہی وہ سرچشمہ حیات تھا جہاں سے زندگی کے چشمے پھوٹ کر ایک عالم کو سیراب کیا کرتے تھے تمام قومی ضروریات اور عظیم الشان کام سرانجام دیئے جاتے تھے۔ اسی فقروافلاس اور فاقہ و غریب کی بیخ کنی کی جاتی تھی۔ اب بھی اسلام کے اس بیش بہا اصول میں یہ لچک باقی ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہر معاشی واقتصادی اصلاح کی جاسکتی ہے۔

اجتماعی پہلو اور دعوت فکر و نظر:

اسلام نے جو نظام زکوٰۃ پیش کیا ہے نہ صرف عالم اسلام بلکہ ساری دنیا اس کے بتلائے ہوئے اصول پر عمل کر کے اجتماعی زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے۔

یہی اقتصادی اور اجتماعی مشکلات ہیں جن سے قومیں دوچار ہوئی ہیں۔ قوموں کی تباہی کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ اپنا اقتصادی توازن کھو بیٹھتی ہے جس سے زندگی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ وہ سوسائٹی کے ربط اور اتحاد کو قائم نہیں رکھ سکتیں تاوقتیکہ اس کا مالدار طبقہ غریبوں' محتاجوں اور مزدوروں کی خبر گیری نہ کرے یہی وجہ ہے کہ دنیا کا اکثر و بیشتر حصہ خصوصاً یورپ اسلام کے اس مقصد عظیم سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے اقتصادی و معاشی پیچیدگیوں میں گھرا ہوا ہے۔ سوسائٹی کا ضبط و نظم بہت ہی خطرناک اور

نازک صورت اختیار کر چکا ہے' ان تمام خرابیوں کی جڑ وہ سرمایہ دار طبقہ ہے جس پر دولت وسرمایہ داری کا جن سوار ہے اور وہ بے شمار انسانی زندگیوں کو پامال کیے ہوئے ہے۔

یورپ اور امریکہ میں مزدوروں کی حالت ان غلاموں اور قیدیوں سے بدتر ہے جو مشرقی ممالک میں ہیں۔ روزانہ دس گھنٹے پہاڑوں، دریاؤں اور زمین کے اندر لگاتار کام کرتے رہتے ہیں' اس محنت وجفاکشی میں ان کے جسم کی ہڈیاں چور چور اور چہرے گردوغبار آلود ہو جاتے ہیں۔ شام کے وقت ان کو اتنی اجرت نصیب ہوتی ہے کہ جو ان کی خوراک کے لیے بھی ناکافی ہے۔ پھر جب وہ اپنے گھر واپس ہوتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ نہ تو بیوی اپنے کام سے فراغت پا کر آئی ہے اور نہ بچوں ہی کا پتہ ہے۔ پھر کچھ دیر بعد بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے کارخانوں میں مزدوری کر کے اپنی ناکافی خوراک کے ساتھ ایک اندھیرے جھونپڑے میں جو قرون وسطیٰ کی یادگار معلوم ہوتا ہے' جمع ہوتے ہیں اور آدھ پیٹ کھانا کھا کر سو جاتے ہیں۔ پھر صبح سویرے اٹھ کر حسب معمول مزدوری کرنے کے لیے چلے جاتے ہیں۔ غرض اسی طرح افلاس وغربت اور محنت ومشقت میں ان کی پوری زندگی بسر ہوتی ہے۔

یہ سب ان افراد کی خدمت بجالانے کا فیض ہے جو اونچے عالیشان محلوں میں رہتے ہیں۔ نفیس لباس پہنتے' ریشمی بستروں پر سوتے اور اچھی اچھی لذیذ غذائیں کھاتے ہیں۔ دن رات عیش وعشرت کی محفلوں اور رقص وسرود کی مجلسوں میں سرگرم رہتے ہیں۔ شراب کے رنگین جام جن میں مزدوروں کسانوں اور فاقہ مستوں کا خون جھلکتا اور رقص کرتا رہتا ہے اپنے منہ سے لگائے رہتے ہیں۔ گویا یہ اپنی زبان حال سے یہ کہتے ہیں کہ ہم ہی زندگی کی لذتوں کے مستحق ہیں' تم مرجاؤ! فنا وبرباد ہو جاؤ! ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمیں اپنی نفسانی خواہشوں کو پورا کرنے دو۔ تمہیں جینے اور زندگی کی مسرت بخش گھڑیوں سے لطف اندوز ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

یہی حالت یورپ میں سرمایہ داروں کی ہے۔ ایک طرف مالداروں اور امیروں نے غریبوں اور مزدوروں کا ناک میں دم کر رکھا ہے تو دوسری طرف اٹھارہویں صدی عیسوی میں اشتراکیوں کا گروہ سرمایہ داری کا سر کچلنے اور اس کے وجود کو صفحہ ہستی سے نیست ونابود کرنے پر تلا ہوا ہے اور لوگوں میں مساوات قائم کرنے اور انسانی حقوق کو برابر برابر حصوں میں تقسیم

کرنے کی آوازیں بلند کر رہا ہے۔ ایک طرف فرضویوں کی جماعت حکومتوں کے خلاف بغاوت پھیلا رہی ہے اور باآواز بلند پکار کر کہہ رہی ہے کہ حکومتوں کے تختے الٹ دو' ان کو دنیا سے فنا کے گھاٹ اتار دو' اس کی وجہ صرف یہی ہوئی کہ انہوں نے دیکھا کہ تمام بلاؤں اور انسانی مصیبتوں کا سرچشمہ صرف حکومتیں ہیں اور وہ انسانوں کو غلام بنا کر ان کے حقوق کو پامال کر رہی ہیں تو انہوں نے ان کے خلاف زبردست پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ حکومت کے بڑے بڑے حامیوں اور رؤساء کو قتل کر دیا اور آئے دن خونی تحریکات برپا کر رہے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر ان خرابیوں اور بدنظمیوں کا سبب کیا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ دونوں جانب سے خوفناک جنگ جاری ہے۔ روز افزوں فتنہ و فساد کی چنگاریاں بھڑک رہی ہیں؟ کیا کوئی ایسی صورت نہیں جو اغنیاء' اشتراکیوں اور مزدوروں کے درمیان اتحاد و نظم قائم رکھا جا سکے؟

بے شک اس مشکل مسئلہ کا حل اور اس مرض کا واحد علاج ایک اور صرف ایک ہے اور وہ زکوٰۃ ہے۔ یہی وہ حق انسانیت ہے جس کو مال دار سال میں ایک مرتبہ اپنے مالوں، تجارتوں اور زمینوں میں سے فقراء و غرباء اور مساکین کو ادا کیا کرتے ہیں۔ یہ زکوٰۃ اسلام میں واجب اور فرض ہے۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

> "خدا کی قسم اگر یہ لوگ اس زکوٰۃ کا انکار کر بیٹھیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ادا کرتے تھے تو میں ان سے جہاد کروں گا اور زکوٰۃ لوں گا۔"

زکوٰۃ کا مسئلہ اجتماعی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام نے جو نظریات اس کی تشکیل و تنظیم سے متعلق پیش کئے ہیں ایک طرح سے تمام اشتراکیوں' اقتصادیوں اور عمرانیوں کے نقطہ ہائے نظر سے ملتے جلتے ہیں۔ سب اس امر پر متفق ہیں کہ جو مال افراد قوم کے ہاتھوں میں متداول ہے وہ سب مجموعی حیثیت سے قوم ہی کا ہے' لیکن اس پہلو سے وہ اختلاف رکھتے ہیں کہ اس مال سے کس طرح استفادہ کیا جائے۔ اشتراکی کہتے ہیں کہ تمام مال کو افراد کے ہاتھوں سے لے لیا جائے اور ایک جگہ جمع رکھا جائے جس کو جتنی ضرورت ہو اس کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ اقتصادیوں کا گروہ اس نظریے کے مخالف ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ اگر مذکورہ بالا خیال تسلیم کر لیا جائے تو بہت سے بڑے بڑے کام انجام نہیں پا سکیں گے' کیونکہ ایک بہت بڑا سرمایہ تلف ہو جائے گا' اس لئے ضروری ہے کہ چند ایسے اولوالعزم اور اونچے افراد

کے ہاتھوں میں یہ مال دے دیا جائے جو اس کو کارہائے نمایاں میں صرف کریں' عمرانیوں کا طبقہ اس امر کا قائل ہے کہ اجتماعی زندگی میں اغنیاء اور فقراء کا وجود بہر صورت ضروری ہے کیونکہ تہذیب وعمران کی ترقی کا دارومدار انہیں پر ہے' ورنہ اونچے ارادوں کو ظاہر ہونے اور اولوالعزم انسانوں کو ابھرنے کا موقع نہیں ملے گا اور مقصد حیات فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ اسلام کا نقطہ نظر بھی یہی ہے کہ اس نے فرق مراتب اور طبقاتی نظام کو برقرار رکھا اور اس کے موافق اپنے قوانین واصول دنیا کے روبرو پیش کیے۔ ایک طرف اقتصادیوں کو وہ پکار کر اس امر کی طرف دعوت دے رہا ہے کہ میں تمہارے مالوں کی حفاظت کرتا ہوں' دوسری طرف عمرانیوں کو کہہ رہا ہے کہ میں تمہارے اغنیاء وفقراء کے طبقات کو باقی رکھتا ہوں۔ تیسری طرف اشتراکیوں کو سمجھا رہا ہے کہ تم جو یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ مال پوری قوم کا حق ہے اس میں کسی خاص فرد کا دخل نہیں' بے شک میں تمہاری اس تحریک میں تمہارا ہم نوا اور ہم آہنگ ہوں' اس وجہ سے میں نے ان مال داروں کو برقرار رکھا ہے تا کہ یہ قوم کی عظیم الشان خدمتوں کو انجام دیں' لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں نے ان پر یہ بھی واجب کر دیا ہے کہ وہ فقراء ومساکین کے لیے سال میں ایک مرتبہ اس مال میں صدقہ یا زکوۃ کے طور پر کچھ حصہ نکال دیا کریں تا کہ ان حاجت مندوں کی زندگی بھی اچھی طرح بسر ہو سکے۔

☆☆☆

باب نمبر 12:

اسلام اور جماعت کی اصلاح

اسلام نے جماعت کی اصلاح کے لیے دو طریقے اختیار کیے ہیں:

1: صنف نازک کے ساتھ انصاف۔

2: غلامی کا انسداد۔

صنف نازک کے ساتھ انصاف

عورت کا درجہ قدیم قوموں کی نظر میں:

اہل ایتھنز جو بلحاظ تہذیب و تمدن قدیم قوموں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ عورت کو پیش پا افتادہ سامان خیال کرتے تھے' بازاروں میں اس کی خرید و فروخت کی جاتی تھی' اس کو شیطان سے بدتر سمجھا جاتا تھا اور اس کو سوائے گھر کی تنظیم اور بچوں کی تربیت کے باقی تمام انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے مردوں کے لیے کئی عورتوں سے شادی کرنے کا جائز قرار دے رکھا تھا۔ اسپارٹا میں یہ حال تھا کہ یہاں قانوناً ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کرنا ممنوع قرار دیا گیا تھا' باوجود اس کے ہر شخص متعدد بیویاں رکھے ہوئے تھا' نہ صرف یہی بلکہ یہاں کا قانون یہ تھا کہ عورت ایک سے زیادہ مردوں سے شادی کر سکتی ہے' بڑی بڑی عورتیں اس رذیل عادت کا شکار ہو گئی تھیں۔

سلطنت رومانیہ میں متعدد زوجات کا رواج قانونی طور پر نہ شروع میں تھا اور نہ آخر میں لیکن باوجود اس کے وہاں کے اکثر شوہروں میں یہ رسم بکثرت عام تھی۔ یہاں کے حکمران فالنٹین دوم نے ایک حکم نافذ کیا جس میں تمام رعایا کے لیے ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ تاریخ سے یہ بات کہیں ثابت نہیں ہوتی کہ پادریوں اور

روسائے کنیسہ نے اس بری رسم کے خلاف آواز بلند کی ہو۔ وہ اس کا انکار کیا کرتے خود انہوں نے اسی کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا۔ اس طرح سے متعدد زوجات کا رواج پھیل گیا تھا' یہاں تک کہ جوسٹینان نے اس کے خلاف قوانین وضع کیے جس میں متعدد بیویاں کرنے کو ممنوع قرار دیا مگر لوگ اس مذموم رسم کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ ان سے اس قانون پر عمل نہ ہو سکا اور صرف طالب علموں کا ایک قلیل گروہ اس کا پابند تھا۔ جب ہجیہ قبائل نے مغربی ممالک پر تسلط پایا' تو متعدد زوجات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی' مگر اس میں ان کو کامیابی نصیب نہ ہوئی کیوں کہ بڑے بڑے روسا اور پیشوا اس کے عادی ہو چکے تھے۔ قوم کے رہنماؤں نے پادریوں کی خاموشی اور چشم پوشی سے اس کو جائز قرار دینے میں تسامح برتا۔ یہ وہ حالات تھے جو اس رسم کو باقی رکھنے میں ممد ومعاون ثابت ہوئے۔

بعض یہودی قبائل لڑکیوں کو خادم کے ہم پلہ شمار کرتے تھے' باپ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اس کو فروخت کر دے اور لڑکوں کے ہوتے ہوئے وہ کسی چیز کی وارث نہیں ہو سکتی تھی۔ جاہلیت میں بعض عربوں کے پاس جن پر اپنی ہمسایہ سلطنتوں کی عادت کے اثرات چھائے ہوئے تھے' عورت اس قدر گئی گزری تھی کہ وہ اس کو اپنے باپ یا اپنی بیوی کی میراث کا ایک جزو سمجھتے تھے۔ یہ قبیح عادت ترقی کرتے ہوئے یمن کے قبائل تک' جن میں یہودی اور عیسائی بھی شامل تھے' سرایت کر گئی۔

غرضیکہ تمام انسانی سوسائٹی میں عورت کا درجہ نہایت انحطاط پذیر تھا۔ متعصب پیشوایان دین نے اس کو حد درجہ حقیر سمجھا اور اس کو شر و فساد کا سبب ٹھہرایا مگر انہوں نے اس امر کو فراموش کر دیا کہ جس شر و فساد کو یہ عورت کی طرف منسوب کر رہے ہیں' یہ تمام اس وجہ سے پیدا ہو رہا ہے کہ سوسائٹی کی حالت گری ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ہر طرف یہی شور بپا تھا اور تجربات و مشاہدات سے ثابت ہو چکا تھا کہ تمام خرابیوں کی جڑ اور فساد کا سرچشمہ وہ بدنظمی اور خرابی ہے جو قدیم حکومتوں اور شرائع میں رونما ہو گئی تھی۔ عورت کی قدر و وقعت بالکل گھٹ چکی تھی' اس کے ساتھ حیوانوں کا سا سلوک اور برتاؤ روا رکھا جاتا تھا' وہ بیکس و مجبور کی طرح ظالموں کی استبدادی قوتوں میں گھری ہوئی تھی' غرضیکہ ہر حیثیت سے عورت کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی تھی۔

عورت اور اسلام:

اسلام نے اس کو استبدادیت اور مظلومیت کے پنجہ سے نجات دلائی اور اس کے درجہ کو نہایت بلند کر دیا۔ چنانچہ قرآن عزیز نے بانگ دہل اعلان کیا:

"ولهن مثل الذين عليهن بالمعروف وللرجال عليهن درجة"

(سورۂ بقرہ)

"اور عورتوں کے لیے بھی وہی حقوق ہیں جیسا کہ دستور کے موافق مردوں کے حق ان پر ہیں اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فوقیت ہے۔"

آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے عورت کا نہایت ہی احترام کیا اور اس کو اس کے درجہ تک پہنچایا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو از روئے تعظیم واحترام خواتین اہل جنت کی "پیش رو" سے موسوم کیا اور ثابت ہو گیا کہ حضرت عائشہ تقویٰ ودیانت داری، علم وفضل، صلاح ومشورہ اور پاک بازی میں عورتوں کے لیے بہترین نمونہ ہیں۔ آپ کے بعد بہت ساری خواتین نے آپ سے فیض حاصل کیا اور آپ ہی کے نقش قدم پر چل کر علم وفضل کے بلند مقام پر گامزن ہوئیں۔

دشمنان اسلام بے جا طور پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے عورت کے حقوق چھین لیے اور اس کو وہ درجہ نہیں دیا جو اس کے لائق تھا، نیز پردہ، طلاق اور دیگر چیزوں کو ایک مشکل امر اور انسانی سوسائٹی کے لیے خطرناک سمجھا ہے۔ اگر یہ لوگ بنظر انصاف کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور سلف صالحین کی سیرت وآثار کو دیکھیں تو لامحالہ ان کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلام نے عورت کے ساتھ کتنا انصاف کیا اور اس کو مقام انسانیت کے کس رفیع درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ عورت زہریلا سانپ اور بدتر شیطان سمجھی جاتی تھی۔ چین میں اس کو قید خانہ میں رکھا جاتا تھا، فارس میں اس کی کوئی قدر وقیمت نہیں تھی، مصر میں اس کو حقیر جان کر انسانیت کے حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ یورپ میں غلاموں اور خادموں کی ہم پایہ تھی اور ممالک عربیہ میں متاع میراث سمجھ کر تقسیم کر دی جاتی تھی۔ اب اگر اسلام نے اس کو مقام بلند تک پہنچا کر انسانی حقوق عطا کیے اور اس کا احترام کر کے اس کو علم وفضل

کے زیور سے آراستہ کیا ہے تو انصاف کیا جائے کہ اسلام نے عورتوں کے ساتھ انصاف کیا ہے یا ان قوموں نے جو اس کو استبدادیت کے شکنجہ میں جکڑے ہوئی تھیں۔

اس سے بڑھ کر عورتوں کے ساتھ ناانصافی اور انسانیت سوز برتاؤ اور کیا ہو سکتا ہے کہ 1886 کو فرانس کے بعض ممالک میں اہل فرانس نے ایک عام جلسہ منعقد کیا جس میں خاص طور پر اس مسئلہ پر بحث و تمحیص ہوتی رہی کہ عورت کو انسان شمار کیا جائے یا کچھ اور؟ آخر کار بحث اس امر پر ختم ہوئی کہ جلسہ نے یہ اقرار کر لیا کہ عورت انسان ہے لیکن محض مرد کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عرب میں اس زمانہ میں مبعوث ہوئے جب کہ بعض قبائل میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی عادت تھی۔ کوئی ملک بھی اس امر سے واقف نہ تھا کہ نظام جماعت میں عورت کا کیا درجہ ہے۔ عورت بیٹی ہونے کی حیثیت سے کیا حق رکھتی ہے۔ بیوی بننے کے وقت اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ماں کہلانے کے بعد اس کے کیا حقوق ہیں' یہ اور اس قسم کے جتنے امور ہیں ان پر شریعت اسلامیہ میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس نے عورتوں کے وہ حقوق مقرر کر دیئے جن سے انیسویں صدی عیسوی سے پیشتر بعض مغربی ممالک بالکل ناآشنا تھے۔

عورت بحیثیت بیٹی:

عرب جاہلیت میں یہ عادت تھی کہ وہ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے' کیونکہ وہ اپنے گھر میں داماد کو دیکھنا نہایت معیوب سمجھتے اور اس کو اپنی خودداری اور غیرت کے منافی تصور کرتے تھے' جس کی توضیح قرآن پاک میں اس طرح کی گئی ہے:

"واذا بشر احدھم بالانثی ظل وجھہ مسودا وھو کظیم
یتواری من القوم من سوء مابشر بہ اء یمسکہ علی ھون
ام یدسہ فی التراب الاساء مایحکمون"

(سورۃ نحل)

"اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خوشخبری ملے تو سارے دن اس کا منہ سیاہ رہے اور جی گھٹا رہے' خوشخبری کی برائی کے مارے لوگوں سے چھپتا پھرے۔

ذلت قبول کر کے اس کو رہنے دے یا اس کو مٹی میں داب دے۔ سنو! وہ کس قدر برا فیصلہ کرتے ہیں۔"

اسلام نے اس عادت قبیحہ اور انسانیت سوز حرکت کو ممنوع ٹھہرایا اور اس کے ذریعہ سے عورت کو زندگی کا حق عطا کیا۔ ادھر اس فعل قبیح پر سخت نفرت کا اظہار کرتے ہوئے قیامت کے دن بدترین سزا کے دیئے جانے کی وعید سنائی:

"واذا الموؤدة سئلت بای ذنب قتلت"

(سورۂ تکویر)

"اور جب کہ جیتی گاڑی گئی بیٹی کو پوچھیں کہ وہ کس گناہ میں ماری گئی۔؟"

اس کے بعد کوئی تعجب کا مقام نہیں کہ اگر تاریخ کے صفحات عورتوں کے نمایاں کارناموں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس لئے کہ یہ اسلام ہی کا فیض تھا جس نے عورت کو وہ مرتبہ عطا کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس جماعت کے ساتھ شریک ہو کر دین اسلام کی نشر و اشاعت' اعلاء کلمۃ الحق میں جدوجہد صرف کرنے اور میدان جہاد میں وقت ضرورت مردوں کے دوش بدوش حصہ لینے کے قابل بن گئی۔

عرب میں عورتوں اور بچوں کو وارث نہیں بنایا جاتا تھا۔ صرف وہی لوگ ورثہ کے قابل سمجھے جاتے تھے جو جنگ میں حصہ لے کر دشمنوں کا مقابلہ کرتے۔ اسلام نے جس طرح مردوں کے ورثہ کے مسائل سمجھائے اسی طرح عورتوں کو بھی میراث کے حقوق عطا کئے جو اس وقت کے عربوں کے لئے بہت ہی دشوار تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس وقت فرائض میراث کی آیات نازل ہوئیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بیٹی' بیوی' بیٹوں اور والدین کے حصے بیان فرمائے تھے' لوگوں نے اس کو ناپسند خیال کیا اور کہا کہ بیوی کے لیے چوتھائی اور آٹھواں حصہ اور بیٹی کے لیے نصف حصہ مقرر ہے اور چھوٹے بچے کو بھی میراث کا حصہ دیا جائے گا' حالانکہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو دشمنوں کے ساتھ مقابلہ کرے اور جنگ میں حصہ لے اور نہ ان کے لیے مال غنیمت جائز ہو سکتا ہے۔

اسی بناء پر اسلامی شریعت نے لڑکی کے لیے شادی سے قبل اس قدر حصہ مقرر کیا جو اس کی زندگی کے لیے کافی ہو سکے تاکہ وہ اپنے بھائیوں یا رشتہ داروں پر بوجھ نہ بن جائے۔ یہ

حصہ میراث وہ ہے جس میں کسی بحث وجدل کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم نے فرمایا:

"یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین فان کن نساء فوق اثنتین فلهن ثلثا ما ترك وان كانت واحدة فلها النصف"

(سورۂ نساء)

"اللہ تعالیٰ تم کو تمہاری اولاد کے حق میں حکم کرتا ہے کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے، پھر اگر دو سے زیادہ عورتیں ہوں تو ان کے لیے اس مال سے جو چھوڑ مرا' دو تہائی ہے اور اگر ایک ہی ہو تو اس کے لیے آدھا ہے۔"

لڑکی کے لیے بہ نسبت لڑکے کے نصف حصہ مقرر کرنے میں یہ راز مضمر ہے کہ لڑکا تو شادی کرتا ہے اور اپنی میراث کے حصہ میں سے مہر ادا کرتا اور اپنی بیوی کا نان ونفقہ دیا کرتا ہے' اس کے علاوہ گھر کے سازوسامان وغیرہ کی افزائش اور آرائش جوازدواجی زندگی کے لوازمات میں سے ہے عورت پر ان میں سے کوئی چیز واجب نہیں بلکہ مرد پر یہ سب ضروری اشیاء کی فراہمی واجب ہے۔ جیسا کہ اپنی بیوی کا خرچ ضروری ہے۔

لڑکی کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر سے مہر اور نان ونفقہ حاصل کرے اور اسی کو اپنی میراث کا حصہ سمجھے۔

یہاں سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ لڑکے کے مال ومتاع میں مختلف طور پر نقص وکمی واقع ہو سکتی ہے اور لڑکی کا مال اس کے لیے محفوظ ہے۔ مرد اپنے گھربار کی زندگی کو چلانے کا ذمہ دار ہے۔ کسب معاش کے لیے ہر قسم کی جدوجہد اور محنت ومشقت برداشت کرنا مرد کا کام ہے۔ اگر وہ اس طرح نہ کرے تو زندگی کی مشکلات میں ثابت قدم رہنے کی اس کے اندر طاقت نہ رہے۔ اس لحاظ سے لڑکے کو لڑکی پر میراث میں جو ترجیح وفضیلت شریعت نے دی ہے' وہ معاشی واقتصادی مصلحتوں کی بناء پر ہے اور ان ذمہ داریوں کی وجہ سے ہے جو مرد پر عائد ہوتی ہیں۔ اس میں سراسر انصاف طبعی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اب یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ یہ عورت کے بارے میں ظلم ہے یا اس کے کسی حق کو تلف کیا گیا ہے۔

لڑکا جب تک سن شعور کو نہ پہنچے اور کسب معاش کے قابل نہ ہو جائے اس وقت تک

اس کے اخراجات باپ پر لازمی ہیں۔ لڑکی کا نان ونفقہ اس کے باپ پر اسی وقت تک ہے جب تک کہ وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک نہ کردی جائے' اس کے بعد اس کی زندگی کے تمام اخراجات اس کے شوہر پر عائد ہو جاتے ہیں۔ جب کبھی کسی مجبوری کی صورت میں اس پر طلاق واقع ہو جائے اور وہ اپنے باپ کے گھر لوٹ آئے تو پھر اس پر اپنے باپ کی جانب سے نفقہ لازمی ہو جاتا ہے۔

باپ اسے مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ لڑکے کی طرح سے کمائے' ہاں اگر وہ اتفاق سے اپنی ذات سے کوئی جائز پیشہ اختیار کرلے اور اس سے اس قدر روزی حاصل کرے جو اس کی زندگی کی ضروریات کو کافی ہوسکتی ہے تو اس کے باپ پر سے اس کا نفقہ کی ذمہ داری اٹھ جاتی ہے لیکن اگر اس کی کمائی اس کی حاجتوں کی تکمیل نہ کرے تو پھر وہی نفقہ واجب ہو جاتا ہے۔

شریعت کا قانون یہ ہے کہ جب لڑکی سن شعور تک پہنچ جائے تو نکاح کی صحت کے لیے اس کی رضامندی شرط ہے۔ کسی انسان کے لیے ہرگز یہ جائز نہیں کہ شادی بغیر عورت کی اپنی مرضی کے یا عورت کے رضامندی کے کرسکے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں مسلمان لڑکیاں اپنے حق رضامندی سے محروم ہوگئیں اور سولہویں صدی کے اواخر میں مغربی لڑکیوں کو یہ حق حاصل ہوگیا کہ وہ نکاح اپنی مرضی کے مطابق کریں۔

عورت بحیثیت بیوی:

جاہلیت میں لوگ بری طرح ناپسندیدہ طور پر عورتوں کو وارث بنتے تھے۔ مرد کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ چاہے تو بلا مہر کے عورت سے نکاح کرے یا شادی کرکے مہر پورا کردے یا عورت پر شادی کو حرام کردے تاکہ اس کے مرنے کے بعد خود اس کا وارث ہو جائے' شریعت اسلامیہ نے اس ظالمانہ طریقہ کو باطل قرار دیا:

''یاایھاالذین آمنوا لایحل لکم ان ترثوا النساء کرھا''

(سورۃ نساء)

''ایمان والو! تمہارے لیے حلال نہیں کہ تم عورتوں کو زبردستی میراث میں لے لو۔''

عرب عورتوں کے وارث بننے میں مختلف طریقے اختیار کرتے تھے۔ ایک وارث

مورث کی عورت کو اس وقت تک شادی کرنے سے باز رکھتا تھا جب تک کہ اس سے وہ میراث حاصل نہ کر لیتا' جو عورت کو مل چکی ہے۔ مرد اپنی لڑکی کو اس وقت تک محروم رکھتا جب تک کہ لڑکی کے سارے مال کا وہ مالک نہ ہو جاتا۔ ایک مرد اپنی مطلقہ عورت کو یونہی چھوڑے رکھتا تاوقتیکہ اس سے اپنی مراد حاصل نہ کر لیتا۔ ایک شوہر جو اپنی بیوی سے نفرت کرتا اور اس کے فراق کو اچھا سمجھتا تھا' بیوی کو معلق چھوڑے رہتا تھا' اس سے برا سلوک کرتا رہتا تھا تاوقتیکہ وہ عورت مجبور ہو کر اپنا مہر نہ چھوڑ دے۔ اسلام نے ان تمام باطل طریقوں اور ظالمانہ سلوک سے باز رکھا:

"ولا تعضلوھن لتذھبوا ببعض ما آتیتموھن"

(سورۂ نساء)

"اور تم اس واسطے روکے نہ رکھو کہ ان سے کچھ اپنا دیا ہوا لے لو۔"

عورتوں کے ساتھ معاشرتی امور میں نہایت برے طور پر پیش آتے تھے' بود و باش' اختلاط اور نان نفقہ میں عدل و انصاف سے کام نہیں لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان عدل قائم رکھنے کا حکم فرمایا:

"وعاشروھن بالمعروف"

(سورۂ نساء)

"عورتوں کے ساتھ خوبی سے رہو۔"

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

"فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ"

(سورۂ نساء)

"اگر تمہیں یہ خوف ہو کر تم عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی پر اکتفا کرو۔"

جاہلیت میں یہ رسم جاری تھی کہ جب کوئی شخص کسی دوسری عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا' جس پر وہ فدا تھا تو اپنی بیوی پر فحش کاری کا الزام لگا دیتا تا کہ وہ اپنا مال متاع اس کو دے ڈالے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ شخص اس کی آبروریزی کرنے کے ساتھ اس سے برے طور پر پیش آتا اور اس کا مال و اسباب لوٹ کر اپنی محبوبہ پر خرچ کرتا۔ اسلام نے اس قسم کی

شرمناک حرکتوں اور بدتمیزیوں سے منع کیا:

"وان اردتم استبدال زوج مکان زوج واتیتم احداھن قنطارا فلا تاخذوا منہ شیئا"

(سورۂ نساء)

"اگر تم ایک عورت کی جگہ دوسری عورت کو بدلنا چاہو اور ایک کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی مت لو۔"

پھر اس انسانیت سوز حرکت پر تہدید کی:

"اتاخذونہ بھتانا واثما مبینا"

(سورۂ نساء)

"کیا تم اس کو ناحق اور صریح گناہ سے لینا چاہتے ہو؟"

عورتوں کو مال واسباب میں شمار کیا جاتا تھا' ان میں حسب دل خواہ تصرف برتا جاتا اور ان کے ساتھ نہایت بے دردی سے کام لیا جاتا تھا۔ شوہر اپنی بیوی کو کسی معاوضہ یا بلا معاوضہ دوسرے کے حوالے کر دیتا تھا خواہ اس میں عورت کی رضامندی ہو یا نہ ہو۔

اسلام نے عورت کو ان تمام مصیبتوں سے نجات دلائی' اس کو دنیا کی نظروں میں عزت واحترام سے دیکھے جانے کے قابل بنادیا۔ اس کو اس کے لائق حقوق دے کر عام رعایا میں اس کو شمار کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ الامام راع ومسئول عن رعیتہ' والمراۃ راعیۃ فی بیت زوجھا ومسئولۃ عن رعیتھا' والرجل راع فی اھلہ ومسئول عن رعیتہ والخادم راع فی مال سیدہ ومسئول عن رعیتہ کلکم راع ومسئول عن رعیتہ"

"تم سب محافظ اور اپنی رعایا کے جواب دہ ہو۔ امام حاکم ہے اور اپنی رعایا کا جواب دہ ہے۔ عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگران کار ہے اور اپنی رعایا کی جواب دہ۔ مرد اپنے خاندان کا محافظ اور اپنی رعایا کا جواب دہ ہے۔ نوکر اپنے

آقا کے مال کا رکھوالا ہے اور اپنی رعایا کا جواب دہ ہے۔ تم سب محافظ ہو اور اپنی رعایا کے جواب دہ ہو۔"

معترضین اپنی آنکھوں سے تعصب کی پٹی نکال کر اس حدیث میں فکر ونظر سے کام لیں کہ کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو اس کی فضیلت اور برتری کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی گھریلو زندگی میں مرحبہ حکومت عطا کیا ہے تو پھر انہیں یہ کہنے میں تامل کیوں نہیں ہوتا کہ اسلام نے عورتوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

شریعت اسلامیہ کی حسن وخوبی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ اس نے انصاف کے نقطہ نگاہ سے مرد وعورت کی طبعی قوتوں اور خصوصیتوں میں دیکھا کر عورت میں نزاکت ولطافت کا پہلو حد درجہ نمایاں ہے اور مرد قوت وطاقت اور محنت ومشقت میں اپنے فطری قویٰ کے اعتبار سے ممتاز ہے تو اس پر یہ فیصلہ صادر کیا کہ وہ اہم ذمہ داریاں اور بڑے بڑے حقوق کی نگہداشت مثلاً عورت کی ضروریات زندگی کی فراہمی' کسب معاش اور گھر کے اخراجات وغیرہ ان تمام فرائض کی تکمیل میں سرگرم رہا کرے۔ بخلاف اس کے عورت پر اس قدر ذمہ داریاں عائد نہیں کی گئیں۔ اس کے ذمہ جو کچھ حقوق وفرائض مثلاً بچوں کی پرورش' گھریلو نظام کی دیکھ بھال وغیرہ سپرد کیے گئے ہیں بہ نسبت مردانہ ذمہ داریوں کے سہل اور آسان ہیں۔ نیز مرد کا فریضہ یہ ہے کہ وہ عورت کی حفاظت کرے' آفتوں اور مصیبتوں سے بچائے' مرد پر مہر کو لازمی قرار دیا جس کو وہ شب زفاف سے پہلے ادا کردے' ہاں اگر میاں بیوی اس کی تاخیر پر متفق ہو جائے تو جائز ہے۔ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"ایما رجل تزوج امراۃ علی ماقل من المھر او کثر لیس فی نفسہ ان یودی الیھا حقھا' لقی اللہ یوم القیامۃ وھو زان"

"جس شخص نے کسی عورت سے کم وبیش مہر پر شادی کی اور اس کے دل میں اس کو ادا کرنے کی نیت نہیں تھی تو وہ قیامت کے دن زانی ہونے کی حالت میں اللہ سے ملے گا۔"

اسلامی عطوفت ورافت کی یہ کس قدر بہترین مثال ہے کہ مردوں کے حقوق وفرائض کے مقابلہ میں عورت کی ذمہ داریاں بہت تھوڑی اور نہایت آسان ہیں۔ اس کے متعلق یہ احکام جاری کیے گئے ہیں کہ وہ اپنے شوہر کے گھر میں اس کی رضامندی کے خلاف کسی شخص کو آنے کی اجازت نہ دے اور سوائے شرعی ضرورت کے گھر سے اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر باہر نہ نکلے۔ عورت کے جس قدر حقوق شوہر سے متعلق ہیں اس میں کسی دشواری یا مشقت کو دخل نہیں ہے' بلکہ خود عورت کے مجد وشرف کی حفاظت اور اس کی شان ووقار کو زیادہ کرنے کا باعث ہے۔

میاں بیوی کے اگر کوئی اولاد پیدا ہو تو ان کی کفالت اور اخراجات باپ پر واجب ہوتے ہیں۔ ماں اگرچہ دولت وثروت میں بڑھ چڑھ کر ہی کیوں نہ ہو۔ اس پر کفالت اولاد کا فرض عائد نہیں ہوتا۔

شریعت نے مسلمان بیوی کی شخصیت پر خاص توجہ مبذول کی ہے۔ جن حقوق سے ایک آزاد شخص بہرہ مند ہوتا ہے عورت بھی ان سے برابر فائدہ حاصل کر سکتی ہے۔ یہ اپنی دولت وثروت کی خود مختار و مالکہ ہے۔ قانون کی حدود میں رہ کر وہ اپنی مرضی کے مطابق اس میں تصرف کر سکتی ہے۔ اگر وہ تجارت پیشہ ہے تو اس سے جو کچھ نفع ملے گا وہ اسی کا حق ہوگا۔ اس کے اندر اس کے شوہر کا کچھ دخل ہوگا اور نہ کچھ حصہ اسے مل سکے گا۔ جس وقت شوہر فوت ہو جائے اس کی میراث میں سے عورت برابر حصہ لے گی:

"ولهن الربع مما تركتم ان لم يكن لكم ولد"

(سورۂ نساء)

"تمہارے چھوڑے ہوئے مال میں سے ان (بیویوں) کے لیے چوتھائی حصہ ہے اگر تمہاری کوئی اولاد نہ ہو۔"

اسی طرح اسلام نے عورت کے لیے رضاعت اور اولاد کی پرورش کی جو مدت مقرر کی ہے یہ اس مدت تک ادا کرنے میں مطلق اختیار رکھتی ہے۔ اس کے لیے اسے کسی قضائی (عدالتی) رائے کی اطلاع کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے حق نفقہ لازمی قرار دیا ہے۔ نیز جس وقت شوہر کسی خبیث مرض میں مبتلا ہو تو عورت اس سے طلاق مانگ سکتی ہے' اگر نکاح

کے وقت مہر ادا نہیں کیا گیا ہے تو ایسی صورت میں اس کے لیے مہر مثل دینا پڑے گا۔

عورت بحیثیت ماں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الجنة تحت اقدام الامهات"

"جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے۔"

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک جوان شخص علقمہ نامی بہت سخت بیمار ہوگیا۔ اس کا مرض روز افزوں بڑھتا گیا۔ تیمارداروں نے اس کو لا الہ الا اللہ کہنے کی تلقین کی، مگر وہ اپنی زبان پر قادر نہ ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا:

"کیا اس کے ماں باپ ہیں۔؟"

جواب دیا گیا کہ اس کا باپ مر چکا ہے جبکہ ماں زندہ ہے اور بوڑھی ہو چکی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پاس قاصد کو روانہ فرمایا، جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حاضر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹے کا حال دریافت فرمایا۔ بڑھیا نے کہا کہ وہ ایسی ایسی نمازیں پڑھا کرتا تھا جن کی تعداد اور وزن سے ہم ناواقف ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر فرمایا:

"تیرا اور اس کا کیا حال ہے۔؟"

بڑھیا نے کہا:

"میں اس پر بہت غضبناک اور کشیدہ خاطر ہوں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کس لئے۔؟"

اس نے کہا:

"وہ اپنی بیوی کو مجھ پر ترجیح دیا کرتا تھا اور اکثر امور میں اسی کی اطاعت کرتا تھا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ماں کی ناراضگی اور غصہ نے اس کی زبان لا الہ الا اللہ کہنے سے روک دی ہے۔
صلی اللہ علیہ وسلم

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"جاؤ! بہت ساری لکڑیاں جمع کر دو تا کہ میں اس کو آگ میں جلا ڈالوں۔"

بڑھیا نے کہا:

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے بیٹے اور میرے لخت جگر کو آپ میری ہی آنکھوں کے روبرو جلائیں گے۔؟ میرا دل اس کو کیسے برداشت کر سکتا ہے۔؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اگر تو چاہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے تو اس سے راضی ہو جا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس وقت تک وہ نماز اپنے روزہ اور اپنے صدقے سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جب تک کہ تو اس سے ناراض اور کشیدہ خاطر ہے۔"

بڑھیا نے اپنے ہاتھ اٹھا کر کہا:

"میں خدا کو گواہ بناتی ہوں کہ میں اس سے رضامند ہو گئی۔"

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بلال! جا کر تو دیکھ کیا علقمہ اب لا الہ الا اللہ کہنے کی طاقت رکھتا ہے؟ شاید اس کی ماں نے رسول اللہ سے حیاء کرتے ہوئے اپنے ضمیر اور دل کے خوف کہہ دیا ہو۔"

حضرت بلال تشریف لے گئے جب دروازہ کے قریب پہنچے تو علقمہ تو کو یہ کہتے ہوئے سنا لا الہ الا اللہ اور اسی دن علقمہ کی روح پرواز کر گئی۔

اس واقعہ سے واضح ہوا کہ افراد خاندان کے درمیان ماں کی کس قدر تعظیم و توقیر ہے اور اس کا درجہ کتنا بلند ہے۔؟

شریعت اسلامیہ نے یہ قانون مقرر کیا ہے کہ اگر کسی ماں کا لڑکا فوت ہو جائے تو ماں

کے لیے ایک معین میراث ہے تا کہ وہ اپنے بڑھاپے کے زمانے میں ہر قسم کی تکلیف و آفت سے محفوظ رہے جب کہ اس کی زندگی کا دارومدار اس کے لڑکے کی امداد ہی پر رہا ہو۔ قرآن عزیز نے بھی اسی طرف اشارہ فرمایا ہے:

"ولا بويه لكل واحد منهما السدس مما ترك ان كان له ولد فان لم يكن له ولد وورثه ابواه فلامه الثلث فان كان له اخوة فلامه السدس"

(سورۃ نساء)

"اور میت کے ماں باپ کو اگر اس کے اولاد ہے تو دونوں میں سے ہر ایک کے لیے اصل مال سے جو چھوڑ مرا چھٹا حصہ ہے اور اگر اس کے اولاد نہیں اور اس کے ماں باپ وارث ہیں تو اس کی ماں کا تہائی حصہ ہے، پھر اگر میت کے کئی بھائی ہیں تو اس کی ماں کا چھٹا حصہ ہے۔"

عورت انسانی جماعت کا رکن:

اسلام نے عورت کو مرد کے ہم مرتبہ سمجھا اور اس کو بھی وہی حقوق عطاء فرمائے جو مردوں کے لئے ہیں۔ دونوں پر فرائض، واجبات اور احکام الٰہی کی پابندیاں عائد فرمائیں۔ دینی اعمال میں جو نتائج مرتب ہوتے ہیں ان میں دونوں کا کوئی فرق نہیں رکھا:

"ومن يعمل من الصالحات من ذكر او انثى وهو مومن فاولئك يدخلون الجنة ولا يظلمون نقيرا"

(سورۃ نساء)

"جو شخص بھی نیک کام کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ایمان رکھتا ہو۔ وہی جنت میں جائیں گے اور ان پر تل برابر بھی ظلم نہ ہوگا۔"

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

"من عمل صالحا من ذكر او انثى وهو مومن فلنحيينه حياة طيبة ولنجزينهم اجرهم باحسن ما كانوا يعملون"

(سورۃ نحل)

"جو شخص بھی نیک کام کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت' بشرطیکہ ایمان رکھتا ہو تو ہم اس کو اچھی زندگی دیں گے اور ان کو ان کے بہترین کاموں کا بدلہ دیں گے۔"

دوسری جگہ فرمایا:

"فاستجاب لھم ربھم انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثی بعضکم من بعض"

(سورۂ آل عمران)

"ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کر لی کہ میں تم میں سے کسی محنت کرنے والے کی محنت کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کرتا' تم آپس میں ایک ہو۔"

شریعت اسلامیہ نے مرد و عورت کو جماعتی حقوق میں برابر کا درجہ عطا فرمایا ہے۔ اقتصادی معاملات' تعزیرات و عقوبات' طلب علم و فضل غرضیکہ ہر اس چیز میں' جس سے نفسی' ذہنی' عقلی' بدنی اور دینی صلاح و فلاح وابستہ ہے' دونوں کے درمیان نظام مساوات کو برقرار رکھا ہے۔ عورت کے لیے یہ جائز قرار دیا ہے کہ اگر اس کی زندگی کا کوئی سہارا نہ ہو تو اپنی ضروریات کی تکمیل اور اپنے وقار و شرف کی حفاظت کے لیے حلال روزی پیدا کر سکتی ہے اور اس کے لیے جتنے جائز طریقے اور ذرائع ابلاغ ممکن ہوں اختیار کر سکتی ہے۔ لیکن یہ تمام ذمہ داریاں اس وقت اٹھ جاتی ہیں جب کہ اس کا کوئی سہارا اور اس کی زندگی کا ''ولی مدد گار و کفیل موجود ہو' کیونکہ اس کی موجودگی میں عورت کا کسب معاش میں مصروف ہونا نظام خانہ داری اور دیگر اہم معاشرتی امور میں خلل اندازی کا باعث ہے۔ ہاں اگر کوئی حرج واقع ہونے کا خطرہ نہ ہو اور عورت کی خواہش ہو کہ وہ بھی جائز طور پر کمائے تو اس کے لیے جائز ہے۔

غرضیکہ اسلام نے عورت کے لیے بھی وہ تمام جماعتی حقوق دیئے ہیں جو دیگر افراد کے لیے ہیں۔ جس طرح عورت کے بھائی' شوہر اور باپ ملکیت میں تصرف کا حق رکھتے ہیں اسی طرح یہ بھی اپنی ملکیت اور سرمایہ میں مختار ہے۔ اس کو اس کی مرضی کے مطابق تصرف کرنے میں مطلق آزادی دی گئی ہے۔ عورت آقا اور سیدہ بن سکتی ہے' کسی چیز کی مالک بن سکتی ہے اور غلام خرید کر آزاد کر سکتی ہے۔ اس کو جس شخص کے ساتھ چاہے

عہد و پیمان اور معاملہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہ زندگی کی پیچیدہ راہوں کو ہموار کرنے اور مناقشات و نزاعات کو رفع کرنے کے لیے اوروں کی طرف سے وکیل بن سکتی ہے۔ ان تمام امور میں اس کے شوہر یا باپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ کچھ رخنہ اندازی کریں یا عورت کو ان میں حصہ لینے سے باز رکھیں۔

مرد اور عورت کے درمیان موازنہ:

مرد کی خصوصیات: مبداء فیاض کی جانب سے مرد کے اندر چند ایسی استعدادیں اور قوتیں ودیعت کر دی گئی ہیں جن سے وہ اپنی زندگی میں ہر قسم کے نمایاں کام سرانجام دے سکتا ہے۔ اسی بناء پر اسلام نے امامت عظمیٰ کا بار صرف مرد کے کندھوں پر ڈالا ہے اور اس کو اسی کا حق قرار دیا ہے' کیونکہ مرد اپنی فطری قابلیتوں کی وجہ سے رعایا کی مختلف حالتوں پر فکر و نظر سے کام لیتا اور سلطنت کے پیچیدہ اور مشکل امور کو سلجھا سکتا ہے۔ جنگی اور سیاسی انتظامات کو خوش اسلوبی سے انجام دیتا اور میدان جنگ میں وقت پڑنے پر دشمنوں سے مردانہ وار مقابلہ کر سکتا ہے۔

اگر یہ شبہ پیش کیا جائے کہ مردوں ہی پر کیا موقوف ہے بعض عورتوں میں بھی امور سلطنت کو انجام دینے اور زندگی کے کٹھن مراحل طے کرنے کی صلاحیت موجود رہتی ہے بلکہ بعض عورتیں تو ان میں سے ایسی ہیں جو بعض مردوں سے رائے و تدبیر' عقل و دانائی اور حسن فکر و نظر میں سبقت لے جا چکی ہیں۔ اس کا ایک جواب تو وہی ہے جو ابھی اوپر تمہیداً پیش کر دیا گیا ہے' مختصر حل یہ ہے کہ جو کچھ ذکر کیا گیا وہ بعض عورتوں کے متعلق تھا اور یقیناً ایسی عورتیں انگلیوں پر گنے جانے کے قابل ہیں۔ شرعی قانون میں اکثر و بیشتر احکام و قوانین کے لیے اکثر اور سواد اعظم کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

شریعت نے طلاق دینے کا حق مرد کے ذمہ کیا ہے' نہ کہ عورت کے۔ اس لئے کہ مرد ہی پر مہر ادا کرنا اور معاشرتی ساز و سامان اور نفقات کا فراہم کرنا لازمی ہے۔ یہ انصاف سے بعید تھا کہ ان حالات کے پیش نظر طلاق کی زمام اس کے ہاتھوں میں نہ دی جاتی۔ اس تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ عورت طبعی طور پر نازک اور لطیف صنف کہلاتی ہے۔ اس کی طبیعت بہت جلد متاثر ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر انقیاد و اطاعت کا مادہ رکھا ہوا ہے' جس سے وہ بہت

جلد کسی کے تابع و مطیع ہو جاتی ہے۔ اگر اس کے اختیار میں طلاق کی زمام دے دی جاتی تو یہ امر خلاف فطرت و منافی حکمت ہوتا۔ کیونکہ وہ اس صورت میں جب کبھی ادنیٰ سبب یا معمولی واقعہ سے متاثر ہوگی تو اس عقدۂ زوجیت کو توڑ دے گی۔ جب کبھی اس کو ادنیٰ تحریک پہنچتی ہے تو وہ اپنے جذبات سے بے قابو ہو جاتی ہے اور وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس پر یورپ کے بے شمار واقعات و حادثات دلالت کرتے ہیں کہ مردوں کے بالمقابل عورتوں کو ہر چیز میں مکمل آزادی دینے کی وجہ سے سوسائٹی میں کس قدر فتنہ و فساد واقع ہو گیا اور زندگی کا نظام کس حد تک بگڑ گیا ہے۔ یہ تمام فیوض و برکات نئی تہذیب کے لائے ہوئے ہیں جس میں عورتوں کو مردوں سے بھی کئی گنا بڑھا چڑھا کر انہی کے ہاتھوں میں عقدۂ زوجیت کو بھی دے دیا گیا ہے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق اس کو توڑ جوڑ سکتی ہیں۔ ہم اس پر طلاق کے باب میں تھوڑی بہت روشنی ڈالیں گے۔

شہادت کے معاملہ میں رعیت نے دو عورتوں کو ایک مرد کے قائم مقام کیا ہے۔ چنانچہ اس کی توجیہ خود قرآن عزیز نے اس طرح کی ہے:

"ان تضل احدهما فتذكر احداهما الاخرى"

(سورۂ بقرہ)

"تا کہ اگر ان دونوں میں ایک بھول جائے تو اس کو وہ دوسری یاد دلائے۔"

عورت کی اس خصوصیت اور وصف پر قرآن حکیم نے جو روشنی ڈالی ہے وہ موجودہ علم اور تجربہ کے عین مطابق ہے اور قرآن کے معجزہ ہونے پر یہ زبردست ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ بعض ایسے مقامات پر جہاں تک مردوں کی نگاہ نہیں پہنچتی مثلاً: ولادت' پردۂ بکارت کی پہچان اور ان تمام چیزوں میں جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں اسلام نے ایک ہی عورت کی شہادت پر اکتفاء کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے شہادت کو اجتماعی زندگی میں جو اہمیت دی ہے وہ اس کے کمال فکر و نظر کی دلیل ہے۔ یہی وہ شہادت ہے جس پر اکثر اجتماعی امور کی بنیاد قائم ہے۔ اگر اس کا تعلق ظاہری اثرات مثلاً: حقوق اور سرمایہ داری سے ہو تو یہاں پر دو عورتوں

کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے مقابل لی جائے گی کیونکہ عورت کی قوت یاداشت طبعی طور پر کمزور واقع ہوتی ہے' اکثر اوقات اس سے بھول چوک ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی تعداد میں اضافہ کر کے اس کمزوری اور نقص کی تلافی کر دی ہے۔ عورت کی طبعی کمزوری پر حکم لگانے میں صرف شریعت محمدیہ ہی نہیں بلکہ دیگر اقوام کے وضعی قوانین بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔

چنانچہ رومانی قانون اس طرح ہے کہ عورت اپنی زندگی بھر کسی قسم کا تصرف کرنے کی اہل نہیں جیسا کہ ایک بچے میں اس کی اہلیت نہیں ہوتی۔ عورت کے لیے یہ ضروری ہے کہ خاندان کے مربی اور سرپرست کو اپنا کاروبار سونپ دے۔

فرانسیسی قانون عورت کے حقوق کی اس طرح توضیح کرتا ہے کہ عورت اپنے شوہر کی مرضی کے بغیر معاملہ یا عہد و پیمان کرنے کی کسی طرح اہلیت نہیں رکھتی۔

اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ عورت وضعی قوانین میں اپنی ذات کے لیے تصرف کا حق نہیں رکھتی۔ جو اس طرح سے اپنے نفس کے لیے تصرف کرنے کا مالک نہ ہو وہ دوسروں کی ملکیت میں کس طرح تصرف کر سکتا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ شہادت حجت ہے جس پر حکومت' معاملات اور تمام نزاعات و مناقشات کی بناء قائم ہے۔ عدالتی نقطۂ نگاہ سے یہ کسی طرح درست نہیں کہ عورت کی گواہی مرد کی گواہی کے مساوی حیثیت رکھے۔

عورت کے حق میں علامہ بلینول کا یہ قول قابل غور ہے:

''جس عورت کا شوہر انتقال کر جائے تو اس کی اولاد کی تعلیم و تربیت کرنے کا حق قریبی رشتہ داروں کی زیر نگرانی عورت پر فرض ہے بخلاف باپ کے کہ اس کو یہ حق حاصل ہے کہ ایک اجنبی شخص کو اپنی اولاد پر وصی ٹھہرائے۔ ماں اس حق سے محروم ہے۔ ایک وہ عورت جو تجارت پیشہ نہیں ہے اگر تجارتی سند یا شہادت پیش کرے تو یہ مجرد وعدہ کے مساوی شمار ہوگی۔ اس کے برعکس اگر کسی مرد سے یہ چیز صادر ہو تو اس پر یہ نتائج مرتب نہیں ہوتے۔

عورت کی خصوصیات: اسلام نے مرد پر جہاد فرض کیا ہے' عورت اس فرض سے مستثنیٰ قرار دی گئی ہے مگر جس وقت دشمن مسلمانوں کے شہروں میں چاروں طرف سے سیلاب کی طرح امنڈ آئے تو اس صورت میں مرد و عورت دونوں پر اس کی

مدافعت ضروری ہو جاتی ہے کیونکہ جان و مال اور ملک کی حفاظت اور مدافعت شوہر کی اجازت کے بغیر عورت پر فرض ہو جاتی ہے۔

اگر مسلمان اپنے دشمنوں کے کسی شہر پر قابض ہو جائیں تو وہاں کی عورتوں پر جزیہ نہیں ہے، بلکہ کافر مردوں پر جزیہ فرض ہے۔

شریعت مرتد عورتوں کو قتل کر دینے کے بارے میں خاموش ہے' اگر مرد مرتد ہو جائیں تو ان کو قتل کر دینا ضروری ہے۔

ایک بالغہ اور عقلمند عورت پر جب دیت واجب ہو جائے تو اس سے کسی قسم کی دیت نہیں لی جائے گی' ہاں اس صورت میں جب کہ عورت قتل میں جو موجب دیت ہے حصہ لے تو اس سے دیت لی جائے گی۔

جس وقت محلہ والوں پر قسم کھانا واجب ہو جائے تو عورت سے قسم نہیں لی جائے گی۔

عورت پر جمعہ اور عیدین کی نماز واجب نہیں ہے' یہ صرف مرد پر واجب ہے۔

عورت جب بیوی بن چکی ہے تو اس کے اخراجات' ازدواجی زندگی کے جملہ ساز وسامان اور عورت کی ضروریات کی تکمیل صرف شوہر کے ذمہ ہے۔ عورت اگرچہ حیثیت والی کیوں نہ ہو۔ اگر وہ ماں بن چکی ہے اور اس کی اولاد بے روزگار اور مفلس ہے تو باپ پر سارے اخراجات عائد ہوتے ہیں۔ ماں اس کی اجرت رضاعت اور اولاد کی پرورش سے ادا کر دیتی ہے۔ عورت اگر لڑکی ہے تو اس کا خرچ باپ پر ضروری ہے' باپ کے علاوہ اس کی پرورش میں اس کے رشتہ داروں کو بھی حصہ لینا چاہئے تاوقتیکہ وہ سن بلوغ تک پہنچ کر ازدواجی زندگی کے رشتہ میں منسلک نہ ہو جائے۔ اس اثناء میں کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ لڑکی کو طلب روزگار کے لیے مجبور کرے۔

ان تمام بیانات سے واضح ہو چکا کہ شریعت اسلامیہ نے عورت کی نشوونما اور اس کی تدریجی زندگی کے منازل کو ملحوظ رکھتے ہوئے باعتبار اس کے لڑکی ہونے کے زمانہ سے بیوی اور ماں بننے کے زمانے تک وہ حقوق مقرر کیے جو اس کے ہر دور میں کفیل بن سکتے ہیں اور وہ احکام پیش کیے جو عدل و انصاف' عطوفت اور رحم دلی پر مشتمل ہیں۔

اسلام میں عورتوں کے حقوق:

عورتوں کے حقوق کی مزید تحقیق وتوضیح کے لیے ہم یہاں پر مصر کے مشہور عالم اور اسلامی مفکر علامہ فرید وجدی کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرتے ہیں جس کو انہوں نے حقوق نسواں کے نام سے اپنی کتاب ''الاسلام دین عام خالد'' میں لکھا ہے۔

اسلام نے عالم نسوانیت کے اندر جو حیرت انگیز انقلاب رونما کیا وہ مذہبی انقلابات کی تاریخ میں کہیں نہیں پایا گیا۔ ساتویں صدی بعد المسیح میں جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عمل میں آئی عورت ہر جگہ مظالم کا تختہ مشق بنی ہوئی تھی۔ یورپ اس زمانے میں جہالت وتاریکی میں پڑا ہوا تھا۔ یہاں عورت ایک قالب بے روح ہستی شمار کی جاتی تھی۔

روم کے باشندوں نے ایک بہت بڑا جلسہ منایا' اس میں انہوں نے عورت کے حقوق پر بحث وتنقید کی۔ آخر میں یہ طے پایا کہ وہ ایک بے جان قالب ہے' اسی وجہ سے وہ ایک اخروی زندگی میں کوئی حصہ نہ پائے گی۔ وہ ناپاک ہے، اس کو گوشت کھانے' ہنسنے اور بولنے کی ہرگز اجازت نہیں۔ اس کو اپنے تمام اوقات زہد وعبادت اور خدمت گزاری میں صرف کرنا ضروری ہے۔

اس کی زبان بندی کے لیے اس کے منہ پر ایک بھاری تالا ڈال دیا گیا تھا جس کا نام انہوں نے (Museliere) موزلیپر رکھا تھا۔ عورت خواہ وہ اعلیٰ خاندان کی ہو یا ادنی قبیلہ کی راستوں میں چلتے پھرتے وقت اپنے گھر میں رہنے کی حالت میں غرضیکہ ہر صورت میں اس کے منہ پر لوہے کا تالا پڑا رہتا تھا۔ ان جسمانی عقوبات کے علاوہ عورت کے باطن کو بے شمار زہریلے تیروں سے چھلنی کیا گیا تھا۔ اس کو بلحاظ جبلت یہ سمجھا گیا تھا کہ وہ بنی آدم کو بہکانے کا ایک دل کش آلہ ہے۔ دلوں میں بگاڑ اور فتنہ وشر وفساد پیدا کرنے کے لیے شیطان اس کی خدمت حاصل کرتا ہے۔

(ایک فرانسیسی رسالہ، جلد نمبر 11)

بلاد عرب میں عورت چوپائیوں کے درجہ کے مساوی تھی۔ شوہر کو جہیز میں چوپائے کے ساتھ ورثہ میں عورت دی جاتی اور یہ اسی کی ملکیت قرار پاتی۔ عصمت ریزی اور فسق وفجور پر عورت کو مجبور کیا جاتا تھا۔ مرد کے لیے عورتوں کی کوئی قید نہ تھی' وہ جتنی عورتیں چاہتا اپنے لیے

منتخب کر لیتا۔

اس وقت آج کل کی طرح سے عورتوں کو کوئی حق نہ ملتا تھا یہاں تک کہ اس کے والدین کی میراث سے بھی اس کو محروم کر دیا جاتا تھا۔ یہ شوہر کے حصہ میں محض چوپایہ سمجھ کر بھیج دی جاتی تھی۔

ایک قالب بے روح چوپایہ کس طرح میراث کا مستحق ہو سکتا ہے؟ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ عربوں نے غزل اور تشبیب کے بارے میں جتنے اشعار کہے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ گوارا تھا کہ وہ اپنی اونٹنی اور گھوڑے کی تعریف کریں لیکن انہیں کبھی یہ منظور نہیں تھا کہ عورت کو تغزل اور تشبیب کا موضوع ٹھہرائیں۔

اسلام کے ظہور قدسی کے وقت عورت ایسے ہی مصائب و آلام کا شکار تھی۔ مگر اسلام نے اس کو پنجۂ استبداد سے نجات دلائی اور اس کی حالت میں وہ انقلاب پیدا کیا جس کی نظیر کسی قسم کے انقلابات پیش نہیں کر سکتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سلطنت رومانیہ کے آخری دور میں عورتوں کے وجود کو تسلیم کر لیا گیا تھا' ممکن ہے کہ بعض لوگ اس دور کو ان کے لیے سنہری دور سے تعبیر کریں' مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ دور عورتوں کے لیے تمام ادوار میں خطرناک اور ان کی حکومت کے لیے غیر مفید ثابت ہوا۔ اس زمانے میں رومانیوں کے نفوس ان کی حکومت کے وسیع ہو جانے کی وجہ سے اس حد تک بگڑ چکے تھے کہ وہ ہمیشہ جسمانی لذتوں میں سرشار رہنے اور نفسانی خواہشوں سے لطف اندوز ہونے کے سوا اور کوئی خواب نہیں دیکھتے تھے۔ اس شہوانی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے عورتوں کو مطلق آزادی دے رکھی تھی' اس غرض کے لیے نہیں کہ ان کی انسانیت کا تقاضا یہی تھا اور اس کے ذریعہ سے وہ اپنے محکم اصول پر قائم رہ کر انسانی کمالات حاصل کریں اور ترقی یافتہ صورتوں میں اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دیں بلکہ انہوں نے ان کو اس لئے آزادی کامل دی کہ وہ ان کی شہوتوں کا آلہ اور اپنی نفسانی سیاہ کاریوں کا ذریعہ بن جائیں۔

انیسویں صدی کا دائرۃ المعارف کہتا ہے:

''جمہوریۂ رومانیہ کے ابتدائی ایام میں عورت اپنے گھر کی چار دیواری میں محصور تھی'

جس میں رہ کر کپڑے وغیرہ بنا کرتی تھی لیکن نفس پرستی کا سیلاب رفتہ رفتہ رومانیہ میں بڑھتا گیا یہاں تک کہ "کاتون" نے اس ہولناک حادثہ کی خبر دی جو تمام پر بدلیاں بن کر چھا جانے والا تھا' تھوڑی مدت گزرنے نہ پائی تھی کہ رومانیہ میں عیش پرستی' نفس پروری اور فسق و فجور کی انتہا نہ رہی۔"

آگے چل کر بیان کرتا ہے کہ:

"کاتون" اپنے قانون کی مدافعت میں جو عورت کی عصمت ریزی کی ممانعت میں تھا کامیاب نہ ہو سکا لیکن اس کی خطرہ اندیش اور ہولناک پیش گوئی ثابت ہو کر رہی۔ چنانچہ سلطنت رومانیہ کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ عورت کی حالت میں حیرت انگیز انقلاب رونما ہو گیا اور وہ غلامی کی مضبوط زنجیروں میں جکڑ دی گئی جس میں وہ تقریباً ہزار سال تک رہی یہاں تک کہ علوم و فنون کا بازار گرم ہوا جس سے آہستہ آہستہ عورت نے پنجۂ استبداد سے رہائی حاصل کی اور رفتہ رفتہ اس کو اس درجہ پر پہنچا دیا گیا جس کو آج زمانہ دیکھ رہا ہے۔

اس سے بھی عجیب و غریب وہ انقلاب ہے جس کو اسلام نے عورتوں کی حالت میں رونما کیا' اس لحاظ سے نہیں کہ وہ شہوت پرستی اور نفس پروری کا نشانہ بنائی جائیں بلکہ یہ انقلاب اس حیثیت سے تھا کہ ان کے طبعی حقوق کو زندہ کیا جائے اور سوسائٹی میں ان کا خاص درجہ مقرر کیا جائے' جس میں ان کی خصوصیات نمایاں ہوں اور ان کے فطری جوہر چمک اٹھیں تاکہ سوسائٹی کے عناصر تکمیل پذیر ہوں اور اجتماعی ترقیوں تک رسائی حاصل کریں۔

اس مقصد کے لیے چند اصول مقرر کیے گئے جن کو ابتدائی عقائد کا درجہ دیا گیا ہے' ان میں سے ایک اصول یہ ہے کہ مرد اور عورت وہ دو تکمیل پذیر عناصر ہیں جو خاندان کی ترکیب و تشکیل کے لیے وجود میں لائے گئے ہیں تاکہ دونوں باہمی اتحاد و محبت کے نظام میں منسلک ہو کر خوشگوار زندگی گزاریں جس کی طرف یہ آیت ہدایت کرتی ہے:

"ومن ایاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ"

(سورۂ روم)

"اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس کی بیبیاں بنائیں تا کہ تم ان کے پاس چین پاسکو اور تمہارے درمیان محبت اور مہربانی کو رکھا۔"

چونکہ جنس لطیف' صنف قوی ہی کا ایک جزو ہے اس لئے اس کے لیے بھی وہی اصول مقرر کئے گئے جو مردوں کی جنس قوی کے لیے ہیں:

"ومن یعمل من الصالحات من ذکر او انثی وھو مومن فلنحیینہ حیاۃ طیبۃ ولنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون"

(سورۂ نحل)

"جو شخص بھی نیک کام کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو اچھی زندگی دیں گے اور ان کو ان کے بہترین کاموں کا بدلہ دیں گے۔"

اس اصول کی رعایت شریعت اسلامیہ نے اور مقامات پر بھی کی ہے۔ چنانچہ عورتوں کو میراث کا مستحق ٹھہرایا۔ ملکیت کا حق' میراث کا حق اور ان میں تصرف کرنے کا حق غرضیکہ مدنیت وتہذیب کے وہ تمام حقوق دلائے جو مردوں کے لئے ہیں۔ تجارت' صنعت وحرفت وغیرہ جملہ قسم کے قابل برداشت پیشے ان کے لئے جائز قرار دیئے۔ زندگی کے شعبوں میں سے کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں داخل ہونے سے اسلام نے انہیں منع کیا ہو۔ ہاں صرف ایک چیز کی اس نے ممانعت کی ہے اور وہ یہ کہ عورت منظر عام پر حسن وجمال کا مظاہرہ کرنے اور عصمت وعفت کے حدود سے باہر قدم دھرنے کی مجاز نہیں۔ کوئی عقل مند اور فہم وبصیرت رکھنے والی قوم اس سے انکار نہیں کر سکتی۔ کسی زمانہ میں بھی عورت کے بارے میں انسانیت کا دائرہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو جائے ہم نہیں سمجھتے کہ کوئی اسلام کے ان زریں اور پاکیزہ اصولوں کی مذمت کر سکنے کی جرأت کرے گا۔

اسلامی دیانت کا جب یہ عالم ہے کہ اس نے عورت کو انسان شمار کرتے ہوئے مردوں کے مقام پر مساوی طور پر کھڑا کر دیا ہے تو انصاف کے دامن کو تھام کر غور کر سکتے ہیں کہ اس نے عورت کے لیے ذہنی وعقلی قوتوں کی ترقی کے راستے کھول دیئے یا اس کے سامنے کوئی

دیوار کھڑی کر دی کہ وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتیں جیسا کہ ایک صدی قبل ساری دنیا میں اگلی قوموں نے عورت کو آہنی دیواروں میں مقید کر رکھا تھا اور اس کو سوسائٹی میں حصہ لینے اور اعلیٰ تعلیم پانے سے ممنوع قرار دیا تھا۔

اسلامی تعلیمات کا تجزیہ و تحلیل کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام نے عورت کے لیے تعلیم کو نہ صرف مباح و جائز قرار دیا ہے بلکہ اس پر فرض کر دیا جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة"

"علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت کا فریضہ ہے۔"

اس نص صریح سے یہ امر روشن ہے کہ اسلام ہی وہ پہلا مذہب ہے جس نے عام تعلیمی نقطۂ نگاہ سے مردوں اور عورتوں کو مساوی تعلیم دینے کا اصول مقرر کیا۔ حالانکہ اس سے پیشتر تعلیم صرف طبقہ اغنیاء اور استبداد پسند قبائل میں محصور تھی۔ مگر اسلام نے تعلیم کی کوئی حد مقرر نہیں کی اور نہ اسے کسی خاص جماعت یا طبقہ کے ساتھ مخصوص کر دیا۔ عورت اس باب میں مختار ہے کہ وہ انتہائی تعلیم کی حد تک رسائی حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ حدود شریعت سے باہر نہ ہو جائے۔ اسلامی خواتین کے تذکروں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ ان میں سے بعض عورتیں اعلیٰ ذہنی قابلیت اور علمی لیاقت سے اونچے مدارج پر پہنچ گئیں۔

کیا یہ مقام حیرت نہیں ہے کہ اسلام نے عورت کے لیے یہ جائز قرار دیا ہے کہ جب وہ علم کی ایک بڑی منزل طے کر لیتی ہے تو وہ فتویٰ اور قضاء و عدالت کے امور انجام دے سکتی ہے اور خاندانی تعلیم و تربیت کی سرپرستی کر سکتی ہے۔

اس سے بڑھ کر حیرت اور تعجب کا مقام کیا ہوگا کہ اسلام نے اس امر کی اجازت دی ہے کہ مسلمان عورتیں مسجدوں میں نماز ادا کیا کریں۔ جہاں عامہ مسلمین مساجد میں اپنی ضروریات زندگی کی تکمیل اور سیاسی و اقتصادی مسائل پر تبادلہ خیال کرنے کے لئے اپنے سرداروں کی دعوت پر جمع ہوتے تھے تاکہ اجتماعی حوادث کی مدافعت کریں جو ان پر طاری ہوا کرتے تھے۔ اس غرض کے لیے ان مجلسوں میں عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ تو یہ حادثہ پیش آیا کہ خلیفۃ المسلمین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عورتوں کے مہر کی تجدید میں

لوگوں سے مشورہ لینا چاہا۔ جب منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں کے روبرو اپنی رائے کا اظہار کرنے لگے تو اتنے میں ایک عورت درمیان میں آئی اور اس بارے میں آپ سے بحث کی چنانچہ حضرت عمر نے اپنی رائے سے رجوع کیا اور عورت کی رائے سے اتفاق کیا۔

اسلام کے اس پیش ارتقائی تصور کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ خیال پیش کر سکتے ہیں کہ جب کوئی اجتماعی انقلاب کی ضرورت آپڑے خواہ وہ کسی زمانے میں ہی کیوں نہ ہو اور ہم اس کی طرف داری کریں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنی عورتوں کو تشریعی صورتوں میں انتخاب کے حقوق دیں؟

اسلام کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس نے جس ارتقائی وانتہائی شکل تک عورت کے طبعی حقوق کا احترام کیا اور جس مکمل پیرایہ میں عورت کی تصویر پیش کی آج تک اس قسم کا تخیل اور احترام کا یہ جذبہ کسی مہذب ومتمدن قانون دان کے دل ودماغ میں نہیں گزرا۔

عورت اسلام کی نظر میں جب کہ وہ بیوی کی حیثیت اختیار کر چکی ہے صرف اس امر کی مکلف قرار دی گئی ہے کہ وہ اپنے شوہر کی آبرو کی حفاظت کرے اور یہ سمجھ کر اس کی شرعی اطاعت کرے کہ وہ خاندان کا طبعی سرپرست ونگران کار ہے۔ شریعت اسلامیہ نے عورت کو نہ تو شوہر اور اپنی اولاد کی خدمت کا مکلف ٹھہرایا ہے نہ خود اپنے نفس کی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی اولاد کی اور ان کی پرورش کی بھی ذمہ دار نہیں ہے لیکن مرد پر یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی عورت کے لیے خدمتگار مہیا کرے۔ اگر وہ غریب ہے تو پھر خود عورت کی مرورتوں کی تکمیل کرے گا۔ اگر مرد وعورت کے کوئی اولاد پیدا ہو تو مرد کا فریضہ ہے کہ اگر ضرورت محسوس ہو تو وہ کسی مرضعہ کا انتظام کرے اگر ماں خود دودھ پلانے اور پرورش کے لیے آمادہ ہو جائے تو رضاعت کی دگنی اجرت ہوگی۔ ہاں اگر مرد غریب اور نادار ہے تو شریعت نے اس پر سے یہ قانون اٹھالیا ہے۔

مسلمان عورت اپنی شادی کی وجہ سے اپنے مالی استقلال کا حق نہیں کھو سکتی بلکہ اپنی املاک میں تصرف کرنے میں مطلق آزاد ہے۔ اس پر یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنے اقتصادی معاملات میں شوہر کی رائے کی پابند ہو۔ وہ اگر چاہے تو اپنی ملکیت کو فروخت کر سکتی ہے یا اسکو کسی اچھے مصرف میں لگا کر اس سے منافع حاصل کر سکتی یا اس کو رہن رکھ سکتی ہے

ان تمام امور میں اسی کے شخصی ارادہ کو دخل ہوگا۔

یہ وہ حقوق ہیں جو آج تک اجنبی قوموں کی عورتوں کو حاصل نہ ہو سکے کیوں کہ ان کی عورتوں پر شادی کے ساتھ ہی یہ پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں کہ وہ محض اپنے شوہر کے احکام کے تحت اقتصادی تصرفات کا حق رکھتی ہیں۔ اپنی املاک کو شوہر کی تصدیق یا اجازت کے بغیر نہ رہن رکھ سکتی ہیں نہ فروخت کر سکتی ہیں بلکہ کوئی چیز خرید بھی نہیں سکتیں۔ اس لئے کہ قانون ہی اس قسم کا ہے کہ شوہر کو اپنی بیوی کے املاک میں وہ حقوق حاصل ہیں جو بیوی کے والدین اور اس کے رشتہ داروں کو حاصل نہیں۔ اس میں کیا شک ہے کہ یہ قانون عورت کی غلامی کے لیے تاریک زمانے کی ایک یادگار ہے۔

شریعت اسلامیہ نے مسلمان عورتوں کے حقوق کا جو تصور پیش کیا ہے آج تک کسی مفکر و فلسفی کے وہم و گمان میں بھی نہ گزرا ہوگا۔ اسلام نے یہ حقوق محض اپنی بزرگی اور بلندی جتلانے کے لیے نہیں بلکہ عورت کو غلامی کی مضبوط زنجیروں سے آزاد کرانے اور مظالم و آفات سے نجات دلانے کے لیے عطا کیے ہیں۔

اسلام نے عورت کو مرد کی رفیقۂ حیات شمار کیا ہے اور اس کو عملی حیثیت سے وہ حقوق دیئے ہیں جو عالم اسلامی میں محقق ہیں اور جن پر تمام علماء و فقہاء کا اجماع ہے۔

جب ایک فلسفی و مفکر یا ماہر علم الاجتماع کی نظر محض تشریعی و اجتماعی نقطہ سے اسلامی حقوق نسواں پر پڑتی ہے تو اس کی حیرت و تعجب کی انتہا نہیں رہتی کہ ان حقوق کا سرچشمہ عرب کے وہ ممالک ہیں جہاں عورت بے انتہا مصائب و آلام کا شکار تھی۔؟ جہاں وہ بری گت بنی تھی کہ دنیا کے کسی اور ملک میں اس کے مماثل نہ تھی۔ عورتوں کے بارے میں اسلام کے یہ وہ زریں آئین و اصول ہیں جن کے مشابہ اور ہم آہنگ حقوق وہ ترقی یافتہ قومیں بھی پیش نہ کر سکیں جو تشریعی ارتقاء کے ادوار سے گزر چکی ہیں۔

تعددِ ازدواج:

مخالفین اسلام نے تعدد ازدواج پر گوناں گوں اعتراضات کیے ہیں اور اس کو خلاف فطرت اور خلاف معاشرت ثابت کرنے کی لا حاصل کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں مقاصد اسلام سے متعلق اس کے چند ابتدائی مباحث بالاجمال پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں تا کہ

اس کی مشروعیت میں اسلام کا مقصد ومنشاء پورے طور پر واضح ہو جائے۔

تہذیب وتمدن کے وجود میں آنے سے ہزاروں سال پہلے انسان کی شادی کی نوعیت کیا تھی؛ مرد وعورت کے تعلقات کس طرح قائم ہوتے تھے؛ اس کا جواب تاریخ کی ورق گردانی سے یہ ملے گا کہ ایسی کوئی جماعت اور قبیلہ نہ پایا جائے گا جس میں سے اکثر وبیشتر افراد نے ایک ہی عورت پر اکتفاء کیا ہو۔ تاریخی واقعات وحالات سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ بعض وحشی قبائل میں یہ رسم جاری تھی کہ مردوں کے لیے عورتیں عام ہو گئیں تھیں۔ حق انتخاب بھی مردوں کو حاصل تھا۔ دونوں میں شادی بیاہ کے معاملات و تعلقات باہم رضا مندی سے طے پاتے تھے؛ ماں ہی گھر کی ملکہ کہلاتی؛ باپ کا کوئی شمار و اختیار نہ تھا۔ جیسے جیسے انسان ارتقاء کے منازل طے کرتا گیا لوگ اس باہمی اختلاط اور میل جول کے نقصانات سے بھی واقف ہوتے گئے۔ چنانچہ سب سے پہلے قبیلہ میں اختصاص کی جو صورت درپیش ہوتی وہ یہ تھی کہ ایک قبیلہ کی عورتیں اس قبیلہ کے مردوں کے ساتھ خاص ہو جاتی تھیں؛ دوسرے قبیلے کو ان میں مداخلت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ زمانہ ترقی کرتا ہوا یہاں تک پہنچا کہ ایک مرد کئی عورتوں کو بلا تعین عدد اپنے لئے خاص کرنے لگا پھر ایک ایسا دور آیا جس میں مرد وعورت کی تاریخ میں ایک انقلاب رونما ہو گیا۔ اس دور جدید میں باپ گھر کا سردار اور مالک ومختار شمار ہونے لگا۔ ماں کی ہستی صرف اس قدر تھی کہ وہ گھر میں اولاد کی پرورش کرنے اور گھریلو انتظام کرنے کے لیے مخصوص تھی۔

دنیا کے گردوپیش کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ آج کل دنیا کے ہر خطہ میں تعدادِ ازدواج کا رواج پایا جاتا ہے۔ امریکہ؛ آسٹریلیا؛ کلدانیہ؛ جزائر سوماٹرا؛ شمالی اور جنوبی امریکہ کے وحشی قبائل اس کے پابند نظر آتے ہیں۔ اگر بنظر غور دیکھا جائے تو تعدد زوجات کو عین فطری اصول وقوانین کے مطابق تسلیم کرنے والے اشخاص بکثرت نظر آئیں گے۔ اس کا ثبوت اس سے ہو سکتا ہے کہ بہت سی قومیں تعدادِ ازدواج کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھتی ہیں لیکن غربت اور تنگ دستی کی وجہ سے ان کے اندر اتنی طاقت اور حیثیت نہیں کہ اس کو عملی جامہ پہنا سکیں جیسا کہ افریقہ کے بعض قبائل کا حال ہے۔

یہی حالت ہندوستان اور دیگر قبائل کی بھی ہے کہ یہاں بظاہر تعدد زوجات پر بہت کم

عمل درآمد کرنے کے موقع حاصل ہوتے ہیں کیونکہ کچھ تو افلاس و غربت اور کچھ رسم و رواج کی پابندیاں اس میں سدراہ ہیں۔ بخلاف اس کے آسٹریلیا اور دیگر جزائر میں یہ عارضی امور تعدد زوجات میں کسی طرح حائل نہیں ہو سکتے کیونکہ وہاں کی عورتیں خود اس لائق ہیں کہ مردوں کے دوش بدوش محنت مزدوری کر کے روزی پیدا کر لیتی ہیں' ان میں اتنی صلاحیت وطاقت ہے کہ وہ مختلف صنعتوں سے اپنی اولاد کی پرورش کر سکتی ہیں۔

ہمارے اس بیان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر قبیلہ تعدد ازواج کا پابند ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ ان افراد کے ساتھ مخصوص ہے جو مالدار اور ذی ثروت ہیں' غریب و نادار طبقہ اس سے زیادہ متمتع نہیں ہے۔ ملک کے رؤسا و امراء ہی ایک سے زیادہ عورتیں کرتے ہیں۔ یہی حال جاوا کا بھی ہے کہ تمام خاص و عام اعتقاداً اس کو مانتے ہیں مگر بادشاہوں اور امیروں کے علاوہ اس پر عمل کرنے کے لیے کسی کی ہمت نہیں بڑھتی۔

سوماٹرا میں تو یہ قانون مقرر ہے کہ مرد متعدد عورتیں کرنے میں مختار ہے' لیکن یہ قانون صرف رؤسا و اغنیا کے ساتھ مخصوص ہے' ہر کس و ناکس کو اس پر عمل کرنے کا حق حاصل نہیں۔

تعدد زوجات کے اسباب: یہ عادت طبعی اسباب کی بنا پر وقوع پذیر ہوئی ہے کہ بعض قبائل میں بعض افراد جسمانی قوت میں امتیازی شان رکھتے ہیں وہ اپنے قبیلے میں زیادہ بہادر اور جنگ جو خیال کیے جاتے ہیں۔ اسی امتیاز کی وجہ سے یہ ایک سے زیادہ عورتیں کرنے کی طرف قدرتی اور طبعی اسباب کی وجہ سے رغبت رکھتے ہیں خواہ یہ عورتیں اپنے قبیلے سے ہوں یا اجنبی خاندان سے تعلق رکھیں۔ ان لوگوں کے نزدیک کسی عورت کو زبردستی اپنا بنا لینا فخر و مباہات اور مجد و شرف کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ جس شخص کے پاس جس قدر زیادہ عورتیں ہوتیں وہ اتنا ہی بہادر' شجاع اور صاحب اقتدار تصور کیا جاتا۔ اکثر عالی ہمت بہادر ایک سے زیادہ عورتیں کرنے پر آمادہ رہتے تھے' اس کا ثبوت یہ ہے کہ حبشی قبائل کے لوگ اس شخص کو قابل احترام اور لائق تعظیم متصور کرتے جو سب میں زیادہ بیویوں والا ہوتا۔

ایک سیاح عورت لکھتی ہے:

''امریکہ میں میکسک کے بادشاہوں کے خلفاء اور مقربین کا یہ اعتقاد تھا کہ

عورتوں اور لونڈیوں ہی کی کثرت سے وہ بلند مراتب اور عالی مقامات حاصل کر سکتے ہیں۔" برٹن بیان کرتا ہے کہ "افریقہ کے بعض قبائل میں زیادہ عورتیں رکھنے والا قابل فخر مباہات گردانا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک ایک شخص 12 سے 300 عورتوں تک اپنے لیے اختیار کرتا ہے۔"

ان تمام بیانات وتصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ اس طریقہ طبعی کے رائج ہونے کے مختلف اسباب ہیں۔ یہ مسئلہ مختلف پہلو اختیار کر چکا تھا۔ زیادہ تر اس کا سبب عورتوں کی تعداد پر فخر وناز کرنا ہے کیونکہ ان کی تعداد سے مرد کی قوت اور پھر اس کے غنا وثروت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے' ظاہر ہے کہ یہ دونوں ہر قوم میں فخر وعزت کا سرمایہ شمار کیے جاتے ہیں۔

ایک لاطینی مورخ ٹاسٹ کہتا ہے:

"قدیم جرمنی قبائل ہی تھے جن کے پاس تعدد زوجات کے رواج نہ تھا۔"

فرانس کا مشہور سائنس دان مانٹسکو کہتا ہے:

"میرو ونجیین کے بادشاہان جنہوں نے پانچویں صدر سے لے کر 752 تک فرانس پر حکومت کی ایک سے زیادہ بیویاں کرتے تھے اور اس کو اپنی شان وشوکت کا باعث خیال کرتے تھے۔"

اس کے علاوہ اور بھی اقتصادی اسباب ہیں جو تعدد ازواج کا باعث بنے۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ ایک عورت کے لئے یہ دشوار تھا کہ وہ گھر کے کام کے ساتھ دوسرے امور بھی انجام دے۔ اوقیانوس میں کلدانیہ جدیدہ کے امیروں کی عادت تھی کہ وہ دس سے لے کر تیس عورتوں تک نکاح کرتے تھے تاکہ امور خانہ داری کے ساتھ ساتھ کھیتوں اور باغوں کے کام بھی انجام دے سکیں۔ یہ ایسا اقتصادی سبب تھا جس نے افریقہ کے اکثر و بیشتر لوگوں کو تعدد ازواج پر آمادہ کر دیا کیونکہ وہاں دور دور تک عورتوں ہی کے معاملات اور کاروبار پھیلے ہوئے تھے۔ پانی سینچنا' کھیتوں کی دیکھ بھال' باغوں کی سرسبزی وشادابی کا خیال رکھنا وغیرہ اس قسم کے بے شمار کام ان کو تفویض تھے۔

جنوبی افریقہ میں کفار کے جو قبائل ملتے ہیں یہ عموماً اپنی عورتوں کو چوپایہ کے مماثل سمجھتے ہیں اور ان سے سخت سے سخت محنت ومشقت کے کام لیے جاتے ہیں۔ ایک انگریز

سیاح خاتون نے وہاں کے قبیلہ کے کسی فرد پر اعتراض کیا کہ کیا وجہ ہے کہ تو اپنی عورت سے اتنی سخت محنت کا کام لیتا ہے۔؟ اس نے جواب دیا کہ اس سے میں یہ کام کیوں کر نہ لوں جب کہ میں نے اس کو اپنے مال سے خریدا ہے۔

مشاہدہ کیا گیا ہے کہ سوڈان میں عورتوں کا کوئی مرتبہ نہیں' ان کو حیوانی خواہشات کے پورا کرنے کا آلہ سمجھا جاتا ہے' اس کے ساتھ نہ اچھا سلوک کیا جاتا اور نہ محبت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک سیاح خاتون مونٹرو جس نے سوڈان میں کئی سال تک قیام کیا' بیان کرتی ہے کہ حبشی قومیں اپنی عورتوں کے ساتھ وحشیانہ برتاؤ کرتی ہیں اور ان کے نزدیک عورت کی کوئی قدر و منزل نہیں ہے۔ وہ اپنے چشم دید واقعات میں بیان کرتی ہے:

"میں نے یہاں پر کسی ایک کو بھی اپنی عورت سے محبت کرتے ہوئے اور اس سے مہربانی و کرم سے پیش آتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ ان کی لغت میں محبت کا لفظ ہی نہیں جو عشقیہ جذبات و احساسات کی تعبیر کر سکے۔"

فزیالوجی کا ایک مشہور انگریز عالم لارڈ امیری کہتا ہے کہ امریکہ میں ہاہنسٹ ایک شہر ہے جہاں کے قبائل کے مردوں اور عورتوں میں تھوڑا بھی میل ملاپ نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عشق و محبت سے ایک دم نا آشنا ہیں۔ اسی طرح جنوبی افریقہ کے کافروں کا حال ہے۔ آگے چل کر کہتا ہے کہ سوڈان میں مرد عورت سے شادی تو کر لیتا ہے لیکن شادی کے بعد عورت کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتا۔

اس انفرادی روئیداد سے تعدد زوجات پر کوئی عیب نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ یہ واقعات لاعلمی اور جہالت کی بنا پر سرزد ہوا کرتے ہیں۔

تعدد ازواج کے شائع ہونے کا ایک اور سبب یہ ہے کہ لوگ اس کو دینی مصلحتوں میں شمار کرتے تھے۔ چنانچہ شیبوی کے قبائل کا یہ عقیدہ تھا کہ زیادہ بیویاں کرنے والا ان کے معبود روح اکبر کے نزدیک عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

توریت میں تعدد ازواج کی طرف صراحتاً یہ اشارہ ملتا ہے کہ ہر شخص کے لئے مباح ہے کہ وہ جنگی قیدیوں میں سے جتنی لونڈیاں چاہے رکھ سکتا ہے اور جب چاہے ان کو چھوڑ سکتا ہے۔

قدیم مصریوں کا یہ حال تھا کہ ان کے نزدیک تعدد ازدواج کو اختیار کرنے میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ یہ چیز نہ تو اخلاق انسانی کے خلاف تھی اور نہ فطری والٰہی اصولوں کے ساتھ متصادم۔ اس کی شہادت کے لیے یہی کافی ہے کہ ان کے قوانین اس سے خالی نظر آتے ہیں اور اس کی مخالفت میں کسی قانون کی تصریح نہیں پائی جاتی۔ تمام کا یہی عقیدہ تھا کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ برکت وثروت عطا کرتا ہے وہ کثیر تعداد میں بیویاں اور لونڈیاں رکھتے ہیں۔

ایک عجیب وغریب بات یہ ہے کہ تعدد ازدواج کا مسئلہ ان قبائل کے مردوں ہی کے پاس مسلم نہیں بلکہ ان کی عورتوں نے بھی اس میں خاص دلچسپی لی ہے۔ مشاہدہ سے معلوم ہوا کہ شمالی امریکہ میں قبائل کوش کی عورتیں تعدد زوجات کو ناپسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتی ہیں بلکہ اس کو اپنی حق میں ایک مفید اور بہترین ذریعہ سمجھتی ہیں۔ اس کا بیشتر سبب یہ ہے کہ اس زمانے میں عورتوں کے بارے میں لوگوں کے خیالات ونظریات بے حد خراب تھے۔ عورت ان کے نزدیک چوپایہ سے بدتر سمجھی جاتی تھی اور اس کو بہت سے مشکل اور دشوار ترین کام سپرد کیے جاتے تھے۔ اس لیے اس مصیبت سے نجات پانے کے لیے وہ خود یہ چاہتی تھی کہ اس کے ساتھ اور مددگار عورتیں بھی ہوں جو اس کے مشکل کاموں میں وقتاً فوقتاً امداد بہم پہنچاتی رہیں۔

اسلام اور تعدد ازدواج: اسلام سے پیشتر جاہلیت کی حالت پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ نکاح ہی خاندان اور گھرانے کی تکوین وبنیاد کے لیے ضروری قرار دیا گیا تھا۔ مرد خاندان کا رئیس اور اصل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ مختلف مردوں کا ایک عورت کو رکھنا نہایت برا سمجھا جاتا تھا اور اس کو زنا میں شمار کیا جاتا۔ زنا اکثر لونڈیوں کے ساتھ کیا جاتا اور آزاد عورتوں سے کم سرزد ہوتا۔ مردوں کے لیے زنا معیوب نہیں تھا، البتہ! عورتوں کے حق میں مذموم تھا۔ تعدد زوجات کا اس قدر رواج تھا کہ ایک مرد قبیلہ کی عورتوں کو بلا تعیین عدد اپنے لیے مخصوص کر لیتا تھا۔ ان سے اولاد بھی پیدا ہوتی تھی۔ یہ عادت نہ صرف عرب میں بلکہ تمام مشرقی ممالک میں عام رواج پا چکی تھی۔ چونکہ عرب میں جنگ وجدل کا میدان ہمیشہ گرم رہا کرتا تھا اور لاکھوں جانیں تلف ہو جاتی تھیں؛ اس لیے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں کی تعداد

گھٹ گئی تھی اور عورتوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا۔ عرب ہی پر کیا موقوف تقریباً تمام قوموں کی یہی حالت ہے جہاں خوں ریز جنگیں ہوا کرتی ہیں۔

اسلام کا ظہور بھی عرب کی اس سرزمین میں ہوا جو متعدد خوں ریز جنگوں سے لالہ زار ہو چکی تھی۔ اسلام عرب ہی کی قوم میں ابتداً پھلا پھولا جن کے نفوس پر تعدد زوجات' زنا کاری اور مختلف فسق و فجور کے اثرات چھائے ہوئے تھے۔ اسلام نے جاہلیت کی بری رسموں کے دور کرنے کے لیے اپنا تدریجی اصلاحی نظام اختیار کیا۔ اس نے اولاً زنا کاری کو عورتوں' مردوں حتیٰ کہ لونڈیوں پر حرام اور ممنوع قرار دیا۔ چونکہ عرب کے لوگ ان ممنوعہ افعال کے عادی ہو چکے تھے اور اسلام کے ان سخت احکام کی پابندی کو برداشت نہ کرنے کا امکان قوی تھا اس لیے تعدد زوجات کی اس نوعیت کو جو جاہلیت میں رواج پا چکی تھی' جائز قرار دے کر اس کو اس قدر محدود کر دیا کہ جس میں محصور رہ کر ہر شخص اپنی صورت حال کے مطابق عمل درآمد کر سکتا ہے۔ اسلام تمام قوموں کے لیے تا ابد پیغام حیات بن کر آیا تھا' اس نے اپنے عام فطری اصولوں کے مطابق قوموں کی خصوصیات' زمانے کی ضروریات اور مردوں کے فطری غیر معمولی قویٰ کو ملحوظ رکھتے ہوئے تعدد زوجات کو ایک تنگ دائرہ میں برقرار رکھا۔

وجہ جواز: اس میں شک نہیں کہ اجتماعی نظام اور خاندانوں اور قبیلوں کی سعادت کا انحصار ایک بیوی اور شوہر پر ہے کہ دونوں اپنے فرائض و واجبات کو محبت و اخلاص کے ساتھ انجام دیں۔ پھر مخالفین کا یہ قول بھی درست ہے کہ ازدواجی تعلقات کو برقرار رکھنے اور زندگی کی ارتقائی حد تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مرد کا ایک ہی عورت کو انتخاب کرنا شرط ہے لیکن سوال یہ ہے کہ بعض اجتماعی صورتوں اور طبعی حاجتوں میں جن سے مختلف زمانوں میں مختلف قوموں کو سابقہ پڑتا ہے' ایک انسان اپنی مصلحتوں پر نظر رکھتے ہوئے ایک سے زیادہ عورتوں کے لیے مجبور ہوتا ہے۔ بعض اوقات ازدواجی نظام درہم برہم سا ہو جاتا ہے اور ربط و ضبط کے وہ امکانات جن سے میاں بیوی کی خوشگوار زندگی عبارت ہے آہستہ آہستہ زائل ہونے لگتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ کیا کوئی ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے کہ کسی فرد نے آج تک اس خصوصیت پر قناعت کی ہو۔ کیا یورپ میں کوئی

جگہ ایسی ہے جہاں زنا کاری نہ پھیل گئی ہو؟ ہر انسان اپنے اقتضائے طبعی پر ایک عورت پر اکتفا نہیں کر سکتا کیونکہ عورت پر مختلف حالات و تغیرات طاری ہوتے رہتے ہیں جن سے وہ ہر حالت میں مرد کی صحبت کے لائق نہیں رہتی خصوصاً اس وقت جب کہ مرد کی جسمانی قوتیں اوروں کہ بہ نسبت عروج پر ہوں۔ اس کے علاوہ نسل کی افزائش کے لیے عورتوں میں ہر زمانہ میں استعداد باقی نہیں رہتی۔ عورت مرد کی صحبت کے لائق اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ وہ حمل، حیض، نفاس اور حالت مرض سے پاک صاف ہو۔ نیز اس کا کیا جواب دیا جا سکتا ہے ایک شخص شادی کرتا ہے، اتفاق سے عورت بانجھ نکلتی ہے یا عورت بڑھاپا میں قدم رکھ چکی ہے اور مرد میں اتنی طاقت ہے کہ وہ دوسری عورت سے نکاح کر کے اپنی اولاد اور سابقہ بیوی کی پرورش کر سکتا ہے یا یہ کہ وہ اتنا قوی و توانا ہے کہ اس کو ایک عورت کافی نہیں ہوتی یا عورت مرد سے متنفر ہے۔ ان تمام صورتوں میں کیا زندگی کا توازن نہیں بگڑ جائے گا؟ کیا تعدد ازواج کو بند کر کے زنا کا دروازہ نہیں کھول دیا جائے گا۔ ان مشکلات کا واحد حل صرف یہی ہے کہ ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت دی جائے۔ عورت اگر بانجھ نکلے اور مرد خصوصیت کے ساتھ بادشاہ یا رئیس ہو تو وہ دوسرا نکاح کر سکتا ہے تا کہ اس کی اولاد اس کے منصب اور جائیداد کو سنبھالے، اس طرح سے نسل کا سلسلہ بھی منقطع نہ ہو گا۔ مرد اگر دوسروں کی بہ نسبت بلحاظ اپنی قوتوں کے بڑھ چڑھ کر ہے اور صرف ایک عورت اس کے لئے کافی نہیں ہے تو وہ دوسری بیوی سے نکاح کر لینا اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ وہ بغیر دوسری شادی کے زنا کاری اور فسق و فجور میں مبتلا ہو کر انسانیت سوز حرکات کا مرتکب ہو جائے جیسا کہ آج کل یورپ کا حال ہے اور نیز ان ممالک کا جہاں تعدد ازواج کو شرعاً و قانوناً ممنوع قرار دیا گیا ہے جس سے زنا اور فحش کاری کا رواج عام ہو گیا اور سوسائٹی میں ایک خلل عظیم واقع ہو گیا ہے۔ اس کا سبب دیگر اسباب کے قطع نظر مردوں کی تعداد میں کمی اور عورتوں میں زیادتی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔؟

ان تمام مفاسد اور برائیوں کا استیصال کرنے اور اجتماعی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اسلام نے تعدد زوجات کو مباح قرار دیا اور اس کے جواز کے لیے چند شروط عائد کر دیئے کہ جب تک اس کے اسباب نہ پائے جائیں ہرگز وہ جائز نہ ہو گا۔ جن میں سے چند اسباب یہ

ہیں:

وہ اہم تغیرات جو عورت پر طاری ہوتے ہیں جن سے مراد اپنی طبیعت پر قابو نہیں پا سکتا یا عورت کسی مہلک مرض میں گرفتار ہو اور اس سے نجات پانے کی سبیل نہ ہو۔

مشاہدہ اور تجربہ سے یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ عورتیں بہ نسبت مردوں کے تعداد میں زیادہ ہیں۔ اس کی وجہ اکثر یہ ہوتی ہے کہ مختلف زمانے میں مختلف قوموں میں اکثر اوقات خوں ریز جنگیں پیش آیا کرتی ہیں جن سے مردوں کی بے شمار جانیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ اگر مرد ایک ہی عورت پر اکتفا کرے تو عورتوں کی کافی تعداد باقی رہ جائے گی جس کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا' لامحالہ وہ زناکاری اور دوسری برائیوں میں مبتلا ہو جائیں گی۔

ان حالات میں سے جو عورت کو لاحق ہوتے ہیں' بعض وہ ہیں جو اس کے نسلی پیداوار کے سلسلہ کو ایک دم بند کر دیتے ہیں۔ نسل کی پیداوار کا مسئلہ مختلف حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے۔ انفرادی صورتوں میں جہاں حکومتی' معاشرتی واقتصادی مسئلہ درپیش ہو وہاں اس کی ضرورت کس قدر پیش ہوتی ہے اس پر ہر زمانہ کے واقعات وحالات شاہد ہیں۔ اجتماعی پہلو سے دیکھا جائے تو اس کی شان ہی جداگانہ ہو جاتی ہے' قوموں کی عظمت ووقار کا مسئلہ موجودہ دور بلکہ ہر زمانے میں بلحاظ سیاسی' معاشی' اجتماعی حقوق وضروریات کے اقلیت واکثریت پر منحصر ہوا کرتا ہے۔ مسلمانوں کی قوم کو دنیا کی قوموں میں ممتاز قرار دینے اور اس کو سربلند کرنے اور اس کی عظمت وشان کو بڑھانے کے لیے اسلام نے ان حالتوں میں جن میں نسلی برآمد کا سلسلہ موقوف ہو جائے تعدد ازواج کو جائز قرار دے کر ایک اجتماعی ضرورت کی تکمیل اور قومی مشکل مسئلہ کا حل پیش کیا ہے۔

تعدد ازواج قوموں کی طبعی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کس قدر مفید اور اہم ہے اس کا اندازہ مشہور محققین ومبصرین کے ان اقوال سے ہو سکتا ہے۔ شہرۂ آفاق متمدن عالم ہربرٹ اسپنسر اپنی کتاب ''علم الاجتماع'' میں لکھتا ہے:

''تعدد زوجات قوموں کے لیے بے حد مفید ہے۔''

آگے چل کر کہتا ہے:

''جب کسی قوم پر کوئی ایسی حالت طاری ہو مثلاً جنگوں اور خوں ریزوں کی وجہ

سے اس قوم کے اکثر مردوں کی جانیں تباہ ہو جائیں اور ان عورتوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے جن کے شوہر مر چکے ہیں یا مردم شماری میں اناث کی زیادتی ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نسل میں انحطاط واقع ہو جائے گا۔"

ایک اور مشہور عالم لیٹنسن کہتا ہے:

"اہل کفر کے مردوں کی تعداد عورتوں سے بہت کم ہے اس لئے کہ مرد پہلی خون ریز جنگوں میں کثیر تعداد میں مر چکے ہیں۔ یہاں سے تعدد زوجات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔"

مشہور و معروف فلسفی و محقق سر طامس مور سوسائٹی کی متعدی بیماریوں کے لیے یہ نسخہ تجویز کرتا ہے:

"مرد کے لیے ایک سے زیادہ عورتوں کو مباح کر دیا جائے۔ یہی ایک دوا ہے جو تمام مہلک امراض کے حق میں تریاق ہے اور یہی وہ تیر بہدف نسخہ ہے جو سوسائٹی کے زہریلے جراثیم کو تباہ کر دیتا ہے کہ یہاں کے مردوں نے محض ایک عورت پر اکتفا کر لیا ہے۔ یہی وہ تجدید ہے جس نے موجودہ زمانے میں ہماری لڑکیوں کو مردوں کے ساتھ ناجائز تعلقات پیدا کرنے اور برسر بازار اور زنا اور فحش کاری کرنے غرض کہ دنیا بھر کی برائیوں اور مہلک بیماریوں کا شکار بننے کے لیے آمادہ کر دیا ہے۔ اگر یہی حال رہا اور تعداد ازدواج کو مباح قرار دینے کے لیے کوئی قانون نافذ نہ ہوا تو اس طوفان بدتمیزی کے اور بڑھ جانے میں کوئی شبہ باقی نہ رہے گا۔ افسوس اگر اس مسئلہ کو پہلے ہی سے مباح قرار دیا جاتا تو آج اس قدر لاوارث اولاد جو حرام کاری کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے ابنائے قوم و وطن کے لیے باعث ننگ و عار اور انسانیت کے دامن پر بدنما داغ ثابت نہ ہوتی۔"

آنحضرت کے تعددزوجات کے اسباب: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد بیویاں کرنے کے دو اسباب ہیں:

1: عام۔ 2: خاص۔

عام اسباب: آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کے لیے پیغام حیات بن کر تشریف لائے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت تمام مردوں اور عورتوں کے لیے عام تھی۔ بعض احکام ایسے ہیں جن میں مرد اور عورت دونوں شریک ہیں اور بعض ایک دوسرے کے ساتھ مخصوص ہیں۔ چونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں زیادہ مدت تک نہیں رہنا تھا' ادھر اسلامی احکام و تعلیمات کی فراوانی تھی اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کی آواز کو دنیا کے گوشہ گوشہ مین پہنچانے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وارشادات کو عام کرنے کے لیے طبقہ ذکور واناث میں سے بے شمار افراد کی ضرورت تھی تا کہ ایک قلیل مدت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغی پروگرام سرانجام پائے۔ اس کے علاوہ عورتوں کے بعض احکام و مسائل ایسے ہیں جن میں عورت کو مرد سے اور مرد کو عورت سے دریافت کرنے میں شرم و حیا مانع ہوتی ہے۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت روشنی ڈالتی ہے کہ اسماء بنت یزید انصاریہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا:

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں غسل حیض کس طرح کروں۔؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایک روئی کا ٹکڑا رکھ لے اور وضو کر لے۔"

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرم و حیا سے اپنا روئے مقدس پھیر لیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پاس ہی تھیں، انہوں نے اسماء رضی اللہ عنہا کا دامن پکڑ کر کھینچا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کو سمجھایا۔

انہی ضروریات کے مدنظر یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طبقۂ نسواں کے کثیر افراد احکام اناث سے واقف ہوں اور دوسری عورتوں تک ان کی تبلیغ کریں۔ اس بلند پایہ مقصد کے لیے آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہن سے بڑھ کر اور کون اہل ہو سکتے ہیں اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض و غایت بغیر کسی شرم و حجاب کے یہی معلوم کر سکتی ہیں۔ جس کی طرف آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مقدس اشارہ کرتا ہے:

"خذوا نصف دینکم عن هذه الحمیراء"

"اس سرخ رنگ والی سے اپنا نصف دین سیکھو۔"

"اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اپنی زوجہ محترمہ سیدہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہے۔"

مقاصد نبوت میں سے یہ بھی اہم مقصد تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام خاندانوں اور قوموں کے درمیان ایک رابطہ اتحاد پیدا کردیں اور دلوں میں ربط ومحبت کی وہ چنگاریاں روشن کریں جو جلوہ گاہ قدس تک والہانہ اڑتی ہوئی پہنچیں۔ اس میں کس کو شک ہوسکتا ہے کہ باہمی تعلقات اور ربط وضبط کو قائم رکھنے کے لیے سمدھیانہ ہی سب سے بڑا محکم سبب ہے۔ دینی دعوت کو پھیلانے اور تبلیغی فریضہ انجام دینے کے لیے ابتداء خاندانوں اور رشتہ داروں کو زیادہ کرنے کی حاجت پیش آتی تھی تا کہ وہ باہم شریک کار اور معاون ومددگار ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ رسالت کی آواز کو گوشہ گوشہ میں بلند کریں۔ دشمنان اسلام کی استبدادی قوتوں اُن کی طوفانی بغاوتوں اور فتنہ خیزیوں کا مدافعانہ مقابلہ کرکے اعلاء کلمۃ اللہ میں ہر قسم کی قربانیاں پیش کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بنی المصطلق کے سردار کی صاحبزادی سے عقد کرنا کس قدر مفید ثابت ہوا کہ بنی مصطلق اس کی وجہ سے آزاد ہوگئے اور اسلام قبول کرلیا جن کی تفصیل ابھی آنے والی ہے نیز اس امر پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی روشنی ڈالتا ہے جو آپ کے صاحبزادہ ابراہیم رضی اللہ عنہ کے حق میں فرمایا گیا تھا:

"لو عاش لو ضعت الجزیة عن کل قبطی"

"اگر صاحبزادہ ابراہیم زندہ رہتا تو میں ہر قبطی سے جزیہ لینا موقوف کردیتا۔"

اس کا معنی یہ تھا کہ آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار اور خالو اس سے شاد وخرم ہوکر اس احترام وتوقیر کرتے ہوئے اسلام قبول کرلیتے اور میں ان پر سے جزیہ کی قید اٹھا دیتا۔

اس کی زبردست تائید کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندانی روابط وتعلقات کو

بڑھانے اور سمدھیانہ نتیجہ سے فائدہ اٹھانے کی خاطر متعدد بیویاں کیں اور زیادہ تر تعدد کا سبب بھی یہی تھا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کی اکثر زوجات مطہرات قریش یعنی سادات عرب میں سے تھیں۔

اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ مسلمان اپنے نبی کی طرف منسوب ہونے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تقرب حاصل کرنے کو قربت الٰہی اور شرف و منزلت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سمدھیانہ تعلقات پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا وہ اپنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہترین فرزندوں اور خوش قسمت لوگوں میں شمار کرتا۔

جس وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی کو جدا کر دیا اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پروانہ ہوگی اور عمر رضی اللہ عنہ سے رنج و غم دور نہ ہوگا تاوقتیکہ وہ لوٹا دی نہ جائے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی طرح سے قریبی تعلق رکھتے تھے ایک طرف تو آپ قریبی رشتہ دار اور دوسری جانب آپ کو فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی وجہ سے شرف حاصل تھا ان وجوہ کی بنا پر مزید مجد و شرف حاصل کرنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلمسے یہ تمنا ظاہر فرمائی کہ ابوطالب کی صاحبزادی اور اپنی ہمشیرہ ام ہانی سے عقد کر لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اس وجہ سے انکار فرما دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ اپنے ابناء کی خدمت میں رہنے سے حقوق رسول میں کوتاہی نہ کر بیٹھے۔

کیا ان تمام مشاہدات سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض و غایت تعدد ازدواج سے یہ تھی کہ اپنے خاندانی روابط کو بڑھا کر دین اسلام کی خدمات اور تبلیغی فرائض میں تعاون و امداد حاصل کی جائے۔

خاص اسباب: سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا بنی مصطلق کے سردار حارث بن ضرار کی صاحبزادی ہیں۔ ان کے باپ نے اسلام لانے سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرنے کے لیے بے شمار لشکر جمع کر دیا تھا' جب دونوں جماعتیں مڈبھیڑ ہوئیں تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ان کو اسلام کی دعوت دی' انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جنگ کرنے پر اڑے رہے۔ آخر کار جنگ کی اور شکست کھا گئے۔ مال غنیمت اور

قیدیوں میں سے جویریہ جو اس وقت برہ کے نام سے موسوم تھیں ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئیں۔ انہوں نے ان سے مکاتبہ کر لیا۔ اب جویریہ کی نظروں میں سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس کے دوسرا کوئی معین و دست گیر نہیں رہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارکہ میں حاضر ہو کر اپنا حسب و نسب بیان کرتے ہوئے آزادی کا مطالبہ پیش کیا۔ جب آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں میں جویریہ کے خاندان کی شان و شوکت' قوت و اقتدار اور ان کی سیادت و عزت کا نقشہ پھر گیا اور پھر یہ کہ وہ ان محاسن کے باوجود اپنی مخالفت اور غلط روش کی وجہ سے کس طرح مغلوب ہو گئے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جویریہ رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کے ساتھ بہترین سلوک اور برتاؤ کیا۔ ان پر جو فدیہ تھا اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کر دیا اور جویریہ سے شادی کر لی۔ مسلمانوں نے بنی مصطلق کو باہم تقسیم کر دیا تھا' جویریہ کے ساتھ حضور کے عقد کا منظر دیکھا تو کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سسرال والے غلام نہیں بنائے جا سکتے۔ چنانچہ انہوں نے تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ بنی مصطلق نے اسلامی رواداری اور مسلمانوں کی شان فراخ دلی کا جب یہ روح پرور نظارہ دیکھا تو اس کے شکریہ میں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قید و بند سے آزادی اور کفر و ظلمت کی ذلت سے نکالا اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے عقد کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کے باپ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید تعلق رکھتے اور آپ رضی اللہ عنہ کے دل میں تقریب نبوی کا ہمیشہ والہانہ جذبہ جوش زن رہتا تھا۔ یہ عقد خود سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خنکی چشم اور دیگر رشتہ داروں کے لیے فخر و مباہات کا باعث ہوا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر جو ان کی خالہ ہوتی ہیں' فخر کیا کرتے تھے۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کا شوہر جنگ بدر میں زخمی ہو کر انتقال کر گیا تھا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں' وفات پا چکی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی صاحبزادی کے عقد کا پیغام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نام بھیجا چونکہ آپ

حضور کی لخت جگر ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے عقد کرنے اور اس مجد و شرف کو باقی رکھنے اور ذوالنورین کا معزز خطاب حاصل کرنے کی تمنا رکھتے تھے اس لئے آپ رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا مگر اس حقیقت کا اظہار نہ کیا جس کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر آپ کا یہ انکار بہت شاق اور نا گوار گزرا اور رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی لیکن مشیت ایزدی یہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سے بہترین بیوی اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بہترین شوہر عطا کرے۔

سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا حی بن اخطب کی صاحبزادی تھیں جو بنو نضیر کا سردار تھا۔ صفیہ رضی اللہ عنہا اپنے خاندان والوں کے ساتھ قید ہو کر آئی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دحیہ کلبی کو اجازت دی کہ ان لونڈیوں میں سے کوئی ایک اختیار کرے انہوں نے صفیہ رضی اللہ عنہا کا انتخاب کیا۔ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یہ تو اپنی قوم کی سردار ہیں، سوائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور کے شایان شان نہیں ہیں۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے مہربان اور کریم ہیں خصوصاً اس شخص کے ساتھ جس کو ذلت و رسوائی کے بعد عزت حاصل ہوئی ہو۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے علاوہ دوسری لونڈی اختیار کرنے کا حکم دیا اور خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا سے مسلمانوں کی آرزوؤں کو برلانے کے لیے عقد کر لیا۔

جحش اسدیہ کی صاحبزادی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا سے شادی کرنے کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ شرعی قانون اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلا جائے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت الٰہیہ میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ جاہلیت کے رسوم و آداب کی اصلاح اور ان کے عقائد فاسدہ میں تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو چند ایسے اسباب وحوادث جمع کر دیئے جاتے ہیں جو ان کے باطل رسوم وعقائد کے چھوڑنے کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں یا یہ کہ پیشوائے دین و مصلح عالم یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ان عادات و رسوم کو اولاً مخالف یا موافق عملی جامہ پہناتے ہیں اور

مسلمان اس کے بعد سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے لگتے ہیں۔ اس طرح سے اقتداء اور تتبع کے لیے ایک صحیح راہ عمل متعین ہو جاتی ہے۔

اس قانون پر بے شمار مشاہدات و واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں' من جملہ ان کے یہ ہے کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار مکہ کے درمیان غزوہ حدیبیہ میں صلح کے لیے عہد و پیمان لکھا جا چکا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو قربانی کرنے اور سر منڈھوانے کا تین مرتبہ حکم فرمایا' لیکن کسی نے بھی اس پر عمل نہ کیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی' اسی غضبناک حالت میں اپنی بیوی ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ دریافت کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر فرمایا:

"مسلمان ہلاک ہو گئے۔ میں نے انہیں قربانی اور سر منڈھوانے کا حکم دیا تھا مگر انہوں نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی۔"

یہ سن کر ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا کہ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس فرمان کی ابتداء فرمائیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اونٹ ذبح کیے اور اپنا سر منڈھوایا۔ جب مسلمانوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں جلدی جلدی قربانیاں کرنا اور سر منڈھوانا شروع کیا۔

جاہلیت کی خوں ریزیوں اور سود کو موقوف کرنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے دن علی الاعلان خطبہ میں فرمایا:

"جاہلیت کا سود باطل کر دیا گیا ہے۔ جس پہلے سود کو میں ختم کرتا ہوں وہ میرے چچا عباس بن عبد المطلب کا سود ہے۔ جاہلیت کے تمام خون معاف کر دیئے گئے ہیں جس پہلے خون کو میں معاف کر رہا ہوں وہ عامر بن ربیعہ کا خون ہے۔"

یہ اور اس قسم کے بیشتر واقعات ہیں جہاں پر اقدامی طرز عمل اختیار کیا گیا ہے' اس لئے کہ شریعت میں قول سے بڑھ کر عمل اور کردار کو بڑی اہمیت اور قوت حاصل ہے اور ہر جگہ یہی دستور قائم رکھا گیا ہے تاکہ تنفیذی امر کی صورت میں ظاہر ہوا کرے۔

ان عادات میں سے جو عرب کی طبیعتوں میں گھر کر چکی تھیں اور جوان کی زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھیں ایک اہم "پسر گیری" کی بھی تھی۔ جب کوئی شخص کسی کو اپنا منہ بولا بیٹا (متبنیٰ) تسلیم کر لیتا تو وہ حقیقی بیٹے کے قائم مقام سمجھا جاتا۔ اس کی بیوی "پسر گیر" پر حرام ہو جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس اعتقاد کو باطل قرار دینے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسوۂ حسنہ ٹھہرایا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے یہ تدبیر کی کہ اپنے غلام زید رضی اللہ عنہ کو آزادی عطا کی اور ان کی کسی صورت سے برابری نہیں کرتے تھے۔ اس لئے زینب رضی اللہ عنہا اور ان کے بھائی عبداللہ رضی اللہ عنہکو یہ عقد ناگوار تھا۔ خود زینب رضی اللہ عنہا نے غیر کفو متبنیٰ کی زوجیت سے انکار کر دیا۔ اسی سلسلہ میں یہ آیات نازل ہوئیں:

"وما کان لمومن ولا مومنة اذا قضی اللہ ورسوله امرا ان یکون لهم الخیرة من امرهم ومن یعص اللہ ورسوله فقد ضل ضلالا مبینا"

(سورۂ احزاب)

"کسی ایماندار مرد اور عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو ان کو اپنے کام کا اختیار ہو اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ صریح چوک کر راہ بھٹک گیا۔"

نافرمانی اور مخالفت سے ڈر کر دونوں نے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر رضامندی کا اظہار کیا۔ مگر زینب رضی اللہ عنہا اس اختلاط کو دل ہی دل میں ناپسند سمجھتی تھیں اور زید رضی اللہ عنہ سے ان کو نفرت سی ہو چلی تھی۔ زید رضی اللہ عنہ نے جب یہ دیکھا کہ ان کے لیے زینب رضی اللہ عنہا کے دل میں کوئی جگہ نہیں' زید رضی اللہ عنہ کے غلام ہونے کی وجہ سے زینب اپنے آپ کو عالی مرتبہ خیال کرتی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت کی نافرمانی کر رہی ہیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے شوہر سے دلی ربط واتحاد قائم رکھنے کا حکم فرمایا تھا تو زینب رضی اللہ عنہا کے جدا کر دینے کو مناسب سمجھا اور اس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم اس رشتہ نکاح کو مضبوطی سے تھامے رہو اور اللہ سے ڈرو۔"

مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے عقد کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل چکا تھا' لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دل میں اس کو پوشیدہ رکھا اور کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا' مبادہ لوگ یہ کہہ بیٹھیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرزند کی بیوی سے شادی کر لی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم فرمایا کہ اپنے دل سے لوگوں کے خوف کو نکال ڈالیں اور اللہ سے ڈریں:

"واللہ احق ان تخشاہ"

(احزاب)

"اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ اس کا مستحق ہے تم اس سے ڈرو۔"

حضرت زید رضی اللہ عنہ کو اس عقد و ارتباط میں ذرا بھر لطف باقی نہ رہا تو انہوں نے زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شرافت کی حفاظت کا خیال کرتے ہوئے شادی کر لی۔ اس کی توجیہہ اللہ تعالیٰ نے کس لطیف پیرایہ میں بیان فرمائی ہے:

"لکی لا یکون علی المومنین حرج فی ازواج ادعیائهم اذا قضوا منهن وطرا"

(سورۃ احزاب)

"تا کہ مسلمانوں پر اپنے لے پالکوں کی بیبیوں سے نکاح کر لینے میں کوئی گناہ نہ ہو جب کہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر لیں۔"

کیا ان حقائق کے موجود ہوتے ہوئے تعصب زدہ اہل مغرب کے یہ اعتراضات اور شبہات بعید از انصاف نہیں ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے وہ خصوصیت روا رکھی جو نہ اپنی امت کے لیے ہے اور نہ جس کی شرعی قانون اجازت دیتا ہے چنانچہ آپ نے چار سے بڑھ کر شادیاں کیں حالانکہ یہ چیز (حاشا وکلا) جلال نبوت کے ہرگز شایان شان نہیں۔ غرضیکہ جان بوجھ کر یہ لوگ اس قسم کی افترا پردازیاں کرتے ہیں جو عدل وانصاف کے سراسر منافی ہیں۔ اگر یہ لوگ تاریخ کے صفحات الٹ کر چشم بصیرت وا کر کے دیکھتے تو اصل حقیقت ان کے سامنے ظاہر ہو جاتی اور وہ اس انسانی اجتماعی سبب کی گہرائی تک پہنچ

جاتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تعدد زوجات کے لیے پیش آیا۔
مخالفین کی نگاہوں میں یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچیس برس کی عمر میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اس وقت عقد کیا جب کہ ان کی جوانی کا آفتاب ڈھل چکا تھا اور وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچ چکی تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں بہت بڑی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اخلاص و محبت اور حسن و وفاداری کے ساتھ پچیس سال تک خوشگوار زندگی بسر کی۔ جس زمانے میں کفار قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو طرح طرح کی اذیتوں اور مصیبتوں میں مبتلا کر رکھا تھا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہترین مددگار ثابت ہوئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ نہایت استقامت و تمکنت سے طویل مدت گزاری جیسا کہ مخالفین کو اس کا اعتراف ہے۔ اس اثناء میں آپ نے کوئی شادی نہیں کی حالانکہ اگر آپ چاہتے تو اس سے بہتر نکاح کر سکتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کا گمان بھی یہی تھا کہ اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شادی کا حق حاصل ہے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات تک حسن وفاداری کا ثبوت دیا۔ جب وہ فوت ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شدید غم لاحق ہوا حتی کہ ان کی سال وفات کو عام الحزن (سال غم) کے نام سے موسوم کیا۔ اپنی زندگی بھر ان کی یاد کا سلسلہ برابر جاری رہا۔
ان کے بعد سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے جو بیوہ ہو چکی تھیں نکاح کیا۔ سودہ رضی اللہ عنہا سکران بن عمرو کی بیوی تھیں جو حلقہ بگوش اسلام ہو کر کفار کی پے در پے مصیبتوں سے نجات پانے کے لیے بلاد حبشہ کی جانب ہجرت کر گئے تھے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو سودہ رضی اللہ عنہا بیوہ ہو گئیں ان کا کوئی معین و مددگار نہ تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے شادی کر لی جو ان کی معاونت اور حمایت کا باعث ہوئی۔ آپ نے ان سے شادی کر کے اس شخص کی وفاداری کا ثبوت پیش فرمایا جنہوں نے اسلام اور عقیدۂ حق کی خاطر گھر بار کو چھوڑ کر اپنی زندگی فنا کر دی' جن کے ساتھ ان کی زوجہ نے بھی راستہ کی دشواریوں اور طوفانی حوادث کو برداشت کیا' صرف اس بنا پر کہ ان کی بیوی نے اپنے خاندان والوں کی مرضی کے خلاف اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت کی تھی اور انہوں نے ہولناک فتنوں میں ان کو مبتلا کر دیا

تھا۔

اسلامی شان و منزلت کو دوبالا کرنے کے لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شادیاں کیں۔ اس کی تائید اس سے ہو سکتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت میمونہ سے نکاح کیا جب کہ ان کی عمر تقریباً پچاس برس کی ہو چکی تھی۔ یہ شادی خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے اسلام میں داخل ہونے کا سبب ہوئی۔ یہی وہ اسلامی غازی اور بطل اعظم تھے جنہوں نے روم و فارس کی سلطنتوں کے تختے الٹ دیئے اور اسلامی شان و شوکت کا سکہ تمام کفار کے دلوں پر بٹھادیا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد زوجات کی وجہ سے ایک فیض یہ پہنچا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرا رضی اللہ عنہن کے رشتہ داروں کی زندگی کو جو کسمپرسی اور فاقہ و افلاح میں بسر ہوتی تھی' خوشگوار بنانے کا ذریعہ ثابت ہوئے۔ ان کی بھوک پیاس دور کرنے کے اسباب جمع ہو گئے اور ان کو امن اور چین کی گھڑیاں نصیب ہوئیں۔

متعصب گروہ کا اعتراض یہ ہے کہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعدد زوجات کو عملی جامہ پہنا کر اوروں کے لیے مثال ثابت ہوتے یا اس عادت کو باقی رکھنے کی اجازت دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تو یہ امر واجب تھا کہ ہر طرح اس خلاف فطرت قانون کا قلع قمع کر دیتے کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے کوئی شادی نہیں کی تھی۔

معترضین نے تعصب کی پٹی آنکھوں پر باندھ کر اعتراض تو کر دیا لیکن اس امر کو ایک دم فراموش کر دیا کہ قدیم و جدید ماہرین اجتماع نے اس کے بارے میں کیا نظریات و خیالات پیش کیے ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ قوموں کے حالات و عادات پر زمان و مکان کے تغیرات اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہر زمانے میں افکار و آراء میں تغیر و انقلاب ہوا کرتا ہے۔ انسان ابتدائے آفرینش سے تدریجی ارتقائی منازل و ادوار سے گزر رہا ہے' اس اصول کے ماتحت جو اسباب و حالات حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے کے مطابق تھے یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ محمد علیہ الصلوۃ والسلام کے زمانے کی فضاء کے بھی موافق ہوں۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے تمام کے اذہان و عقول کو آسمانی

حکومت کی طرف متوجہ کیا جس کے سامنے اجتماعی علاقات اور حسب ونسب کے اختیارات کو کوئی وقعت نہیں دی۔ چنانچہ مسیحیت نے اپنے ابتدائی نشوونما کے ظہور کے وقت شادی کی شدت سے مخالفت کی اور اس کو ناپسندیدہ امر ٹھہرایا اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات جاگزیں کرادی کہ مرد وعورت کا میل جول اگرچہ ایک مقدس چیز ہے لیکن یہ روحانی فضا کے لیے بالکل ناموافق ہے۔ اس کے بعد سے غیر شادی شدہ شخص بہ نسبت اس شخص کے جس نے شادی کر کے اپنے آپ کو پستی کے غار میں ڈھکیل دیا کئی گنا ترقی یافتہ شمار کیا جانے لگا۔

اسی کے مشابہ وہ اعتقاد ہے جس کو ہندوستان کے قدیم علماء اور پیشواؤں نے اختیار کیا تھا کہ انسان اس وقت تک علوم ومعارف کو حاصل نہیں کرسکتا تاوقتیکہ وہ جمیع خاندانی تعلقات وروابط سے دست بردار نہ ہو جائے۔ یہی خیالات قدیم پیشوایان ادیان سے منتقل ہو کر ان کی بعد کی نسلوں کے دل ودماغ میں پرورش پانے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتقاد کہ شادی نہ کرنے سے انسان مفکر بن سکتا اور ترقی کے انتہائی مدارج حاصل کرسکتا ہے، صریح اور فاش غلطی پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ اگر یہی نظریہ صحیح ہوتا تو شادی شدہ اہل کمال کی یہ تعداد معدوم ہو جاتی اور کمال زندگی کا مفہوم خلاف اور انسانی آبادی کو فنا کے گھاٹ اتار دینے والی ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ہر دور کے لیے چند عادات واخلاق ہوتے ہیں جو اس کی فضا اور ماحول کے ساتھ مختص ہوتے ہیں۔ ایک زمانے میں کسی قوم کے جو حالات ومصالح ہیں ان کا دوسرے زمانے میں دوسری قوموں کے مطابق ہونا ضروری نہیں۔ موجودہ زمانے پر قیاس کرتے ہوئے گزشتہ دور پر حکم لگانا کس قدر انصاف سے بعید ہے۔ زمان ومکان کی مصلحتوں اور ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ان پر عمل کرنے سے افکار وآراء کی عظمت وشان گھٹ نہیں جاتی۔ کیا یہ کہنا گمراہی اور بدیہی جہالت کی دلیل نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایسے خواب دیکھے جن کی تعبیر کچھ نہیں۔

اس سے بڑھ کر فساد اعتقاد کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وحضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی موجودہ زمانے کے حالات پر قیاس کرتے ہوئے بالکل علیحدہ تھی؟ بے شک ان اولوالعزم پیغمبروں کی زندگی عبرتوں اور نصیحتوں سے

معمور تھی جو ان کے زمانے کی قوموں کے لیے مشعل ہدایت اور نمونہ عمل تھی۔ یہ حقیقت ہمارے اس بیان کی تصدیق کرتی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے انسانوں کے لیے نبی بنا کر مبعوث فرمائے گئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات انسانی نشوو ارتقاء کی روشن مثال ہے۔ یہ امر مشیت ایزدی کے منافی تھا کہ اس اجتماعی حالت میں یکبارگی تغیر پیدا کر دیا جاتا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تھی۔ نیز یہ چیز بھی قانون قدرت کے خلاف ہوتی اگر اس زمانے کے قومی' سیاسی اور اجتماعی حالات میں ایک دم تبدیلی پیدا کر دی جاتی بلکہ ہر حال میں یہ اصول پیش نظر رکھا گیا کہ حسب ضرورت زمانہ عمرانی' تہذیبی اور اجتماعی حالتوں اور مصلحتوں کے لحاظ سے تدریجی انقلاب کا نظام پیش کیا جائے اور بقائے انسانی کی رفتار کے مطابق آئینی محکم اصلاحات نافذ کی جائیں۔

یہاں اس امر کا اظہار بھی نہایت ضروری ہے کہ یہ آیت کریمہ:

"لایحل لک النساء من بعد ولا ان تبدل بهن من ازواج ولو اعجبک حسنهن"

(سورۂ احزاب)

"(اے نبی!) تیرے لیے اس کے بعد عورتیں کرنا حلال نہیں اور نہ یہ کہ ان کے بدلے اور بیویاں کرے اگرچہ تجھے ان کی صورت بھلی معلوم ہو۔"

جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید بیویاں کرنے اور ان کو طلاق دینے کی ممانعت کی گئی ہے اس وقت نازل ہوئی جب کہ فریضۂ تبلیغ کی تکمیل ہوگئی، اسلام کی نشر و اشاعت کا حق پورا ہو گیا، تعدد ازواج کے احکام باقی رکھے گئے اور ان کو اس میں آزادی دی گئی کہ وہ حدود شریعت میں رہ کر اسلامی قوانین کی پابندی کرتے ہوئے مصالح و ضروریات کے مطابق چار شادیاں کر سکتے ہیں۔

طلاق:

تجربات اور مشاہدات سے معلوم ہوا کہ طلاق کشیدگی پیدا کرنے اور زندگی کو تلخ بنانے والے اسباب سے نجات پانے کے لیے ایک بہترین ذریعہ ہے۔ اس پر واضح دلیل و برہان قائم ہو چکی ہے کہ شریعت اسلامیہ نے طلاق کے باب میں جو اصول و احکام پیش کیے ہیں

وہ دیگر ادیان وشرائع کی بہ نسبت انسانیت سے قریب تر اور عدل وانصاف کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ گذشتہ قوموں نے عورت پر کسی صورت میں بھی طلاق لینے کو حرام کر دیا تھا۔ یہی حالت سلطنت رومانیہ کے دور تک باقی رہی' ازدواجی زندگی کے تعلقات کمزور پڑ گئے اور طلاق عام ہو گئی تھی۔ قدیم ایتھنز اور عبرانی قوانین بھی اسی قسم کے نافذ کیے گئے تھے۔

ہم یہاں پر طلاق کی مزید تاریخی تشریح کرتے ہیں۔

طلاق کا رواج قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنی عورت سے ناراض ہو جاتا تو اس کو اس کے گھر واپس بھیج دیتا تاکہ یہ جہاں چاہے چلی جائے۔ عورت کا کوئی حق نہیں تھا۔ جب یہ گھر سے نکال دی جاتی تو تمام حقوق سے محروم رہ جاتی۔

جب یونانی قوم برسراقتدار ہوئی اور اس کی تہذیب وتمدن میں ترقی ہوئی تو طلاق بھی بغیر کسی قید اور شرط کے عام ہو گئی۔

عثمانیوں کے نزدیک طلاق کا اعتبار تکوین عقد ہی سے ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر دونوں طرف سے عدم طلاق کی شرط لگا دی جاتی تو وہاں کی عدالت اس عقد ہی کو باطل قرار دیتی تھی۔

رومانیہ کی پہلی نسلوں کے پاس دینی شادی میں طلاق حرام تھی۔ اس کے مقابلے شوہر کو اپنی عورت پر اتنا اقتدار حاصل تھا کہ جس کی حد نہیں۔ اگر عورت کوئی گناہ کرے یا اپنی اولاد کو مار ڈالے یا گھر کی کنجیاں لٹکا دے یا شراب پی لے تو ان تمام صورتوں میں شوہر کو اس کے قتل کر دینے کی اجازت حاصل تھی۔ بعد کی نسلوں میں دیانت لوٹ آئی اور طلاق کو عام شہری قانون کے مطابق مباح کر دیا۔

جب موسوی مذہب کا ظہور ہوا تو اس نے ایک حد تک عورت کی ازدواجی اصلاح کی اور اس کے لیے طلاق کو نہایت وسیع حد تک جائز کر دیا۔

عورت اگر کوئی جرم یا برا فعل کر بیٹھتی تو مرد شرعی طور پر اس کو طلاق دینے پر مجبور کیا جاتا' اگرچہ وہ اس کے جرم کو درگزر کرنا چاہے۔ اسی طرح یہ قانون بھی تھا کہ اگر عورت مرد کے پاس بیس سال تک رہی اور اس سے کوئی اولاد نہ پیدا ہوئی تو مرد کو طلاق دینے پر مجبور کیا جاتا

خواہ وہ اس کو چھوڑنا بھی پسند نہ کرے۔

مسیحی مذہب نے سوائے ان صورتوں کے جن میں کوئی جرم یا گناہ ثابت ہو جائے، عورت پر طلاق کو حرام قرار دیا ہے یا یہ کہ اگر عورت بانجھ ثابت ہوئی ہے تو نسل کی برآمد کے لیے اس کو طلاق دی جا سکتی ہے۔

جاہلیت عرب میں لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ سراسر بے انصافی کرتے تھے۔ مرد شادی کرنے کے بعد بعض حالات میں عورت کو نہ تو پوری طرح اپنی بنائے رکھتا اور نہ ہی اسے کلی طور پر آزاد کر دیتا بلکہ اس کو یونہی معلق چھوڑے رکھتا تھا۔ اسلام نے ان کی ان عادتوں کو مذموم ٹھہرایا اور عورتوں کے بے شمار حقوق اس مسئلہ میں بیان کیے۔

"للذين يولون من نساءهم تربص اربعة اشهر فان فاء وافان الله غفور رحيم وان عزموا الطلاق فان الله سميع عليم والمطلقات يتربصن بانفسهن ثلاثه قروء ولا يحل لهن ان يكتمن ما خلق الله فى ارحامهن ان كن يومن بالله واليوم الاخر وبعولتهن احق بردهن فى ذلك ان ارادوا اصلاحا ولهن مثل الذى عليهن بالمعروف وللرجال درجة والله عزيز حكيم الطلاق مرتان فامساك بمعروف اوتسريح باحسان ولا يحل لكم ان تاخذوا مما آتيتموهن شيئا الا ان يخافا الايقيما حدود الله فان خفتم الايقيما حدود الله فلاجناح عليها فيما افتدت به تلك حدود الله فلاتعتدوها ومن يتعد حدود الله فاولئك هم الظالمون فان طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره"

(سورۂ بقرہ)

"جو لوگ اپنی بیبیوں کے پاس جانے سے قسم کھا بیٹھتے ہیں ان کے لئے چار

مہینے کی مہلت ہے۔ اسی عرصہ میں اگر وہ ملاپ کر لیں تو اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے اور اگر طلاق کا ارادہ کر لیا ہے تو بے شک خدا خوب سنتا جانتا ہے اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو وہ اپنے نفس کو تین حیض تک روکے رکھیں اور ان کو حلال نہیں کہ جو کچھ خدا نے ان کے پیٹ میں پیدا کیا ہے اس کو چھپائیں بشرطیکہ وہ اللہ اور قیامت پر ایمان بھی رکھتی ہوں اور ان کے خاوند اگر اچھی طرح رکھنا چاہیں تو اس عرصہ میں ان کو واپس لینے کے زیادہ مستحق ہیں اور عورتوں کے بھی ویسے ہی حقوق ہیں جیسا کہ دستور کے موافق مردوں کے حق ان پر ہیں اور مردوں کو عورتوں پر فوقیت بھی ہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ وہ طلاق (کہ جس کے بعد رجوع کر سکتے ہیں) دو ہی ہیں (اس میں) دستور کے موافق زوجیت میں رکھے یا اچھی طرح سے چھوڑ دے اور جو کچھ ان کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ بھی واپس لینا تم کو حلال نہیں۔ مگر جب کہ دونوں کو ڈر ہو کہ احکام الٰہی قائم نہ کر سکیں گے۔ پس تم کو یہ خوف ہو کہ وہ دونوں خدا کے حکموں پر قائم نہ رہیں گے تو اس بات میں ان پر بھی گناہ نہیں کہ عورت مرد کو کچھ دے کر پیچھا چھڑا لے۔ یہ خدا کی باندھی ہوئی حدیں ہیں۔ پس ان سے تجاوز نہ کرو اور جو خدا کی حدوں سے آگے بڑھتے ہیں وہی ظالم ہیں۔ پھر اگر اس کو (تیسری) طلاق بھی دے دی تو اب وہ عورت اس کو حلال نہ ہو گی جب تک کہ وہ کسی اور سے نکاح نہ کرے گی۔"

اسلام نے طلاق کے امکان کا اقرار کیا ہے اور اسے تمام حلال چیزوں میں نہایت ناپسندیدہ حلال ٹھہرایا ہے۔ محض اس پہلو پر نظر کی گئی کہ جب میاں بیوی کے درمیان اس حد تک اختلاف اور ناراضگی کے اسباب پیدا ہو جائیں جن سے ان کی زندگی تلخ ہونے لگے' خاندانی تعلقات کی بنیادیں کمزور پڑ جائیں اور محبت واتحاد کی کشش اور محبت کا اس لحاظ سے اسلام نے طلاق کو جو مشروع قرار دیا ہے وہ بہت سی مصیبتوں سے نجات کا بہترین طریقہ ہے۔ دیگر مذاہب میں طلاق کی جو نوعیت ہے اسلام نے اس کے تمام باطل طریقوں کا رد کرتے ہوئے طلاق کے محکم اصول نافذ کیے۔ طلاق کی حالت میں عورت کی حفاظت

حیات کے جملہ ساز و سامان مہیا کر دیئے۔ شوہر پر یہ احکام واجب کیئے کہ وہ اپنی عورت کو اگر چھوڑنا چاہے تو پسندیدہ اور احسن طریقہ سے چھوڑے۔ اس کے سامان اور مال ومتاع کو چھیننے کی کوشش نہ کرے۔ اس کے ذمہ جو مہر رہ گیا ہے ادا کر دے۔ عورت کی عدت کے ایام پورے ہونے تک اس کے جملہ اخراجات برداشت کرے۔ جب اس کی عدت ختم ہو جائے تو اس کو دوسری شادی کر لینے میں کوئی امر مانع نہیں رہتا۔ عورت اگر حیض کے جاری نہ ہونے کا دعویٰ کرے تو اس کا اعتراف کرتے تک مرد کو نان ونفقہ دینا ضروری ہے۔ یہ وہ مختلف طریقے ہیں جو عورت کی زندگی کی حمایت کے لیے اختیار کیے گئے ہیں۔ ان سے مقصود یہ ہے کہ زوجیت کے مرتبہ وشان کو بلند کیا جائے۔ عورت کو حقیر سمجھنے یا اس کو حقوق انسانیت سے محروم کرنے سے احتراز کرایا جائے اور طلاق کو بازیچۂ اطفال بنانے سے روکا جائے۔

حکومت اسلامیہ کے یہ قوانین دیگر مذہبی وحکومتی آئین واصول سے ممتاز ہیں۔ اس لئے کہ اسلام نے اجتماعی قوانین اور قوموں کی ضروریات ومصالح کے پیش نظر طلاق کو ایک دم حرام قرار نہیں دیا بلکہ اقتضائے طبیعت کے طور پر بعض خاص حالتوں میں مخصوص شرطوں کے ساتھ جائز رکھا ہے:

"الطلاق مرتان فامساك بمعروف اوتسريح باحسان"

(سورۂ بقرہ)

"وہ طلاق (جس کے بعد رجوع کر سکتے ہیں) دو ہی ہیں (اس میں) دستور کے موافق زوجیت میں رکھے یا اچھی طرح سے چھوڑ دے۔"

اگر اس آیت کریمہ میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ طلاق کو دو مرتبہ شروع کرنے میں مقصد یہ ہے کہ مفاہمت اور باہمی صلح کی راہ تلاش کرنے اور اپنے اپنے امور پر غور وفکر صرف کرنے کا موقع دیا جائے اس کے علاوہ شریعت نے طلاق سے پیشتر جو عدالتی قانون نافذ کیا ہے اس سے بھی یہی مقصد ہے کہ دونوں رشتۂ ازدواج کو توڑنے اور طلاق کے لیے پیش قدمی کرنے سے پہلے خوب سوچ سمجھ لیں۔ عدالتی فیصلہ یا قانون سے مراد یہ ہے کہ اسلام نے یہ وصیت کی ہے کہ طلاق واقع ہونے سے قبل شوہر اور بیوی اپنی کشیدگی واختلاف

کی اصلاح کے لیے کسی سلیم الطبع شخص یا قاضی کے پاس رجوع کریں تاکہ مفاہمت کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس کے باوجود اگر اصلاح کی کوئی سبیل نہ پیدا ہو تو اب طلاق کا قصد کریں' یہی ایک طریقہ ہے جو ان کو باہمی کشمکش سے نجات دے سکتا ہے۔

شرعی نقطۂ نگاہ سے اسلام نے طلاق کے دائرہ کو نہایت تنگ کر دیا ہے حتیٰ کہ اس کو ابغض حلال (بدترین حلال) کہا ہے۔ نیز یہ کہ طلاق دو مرتبہ ہے۔ اس سے قبل کہ طلاق ہو' عدالتی فیصلہ کی جانب توجہ کرنی چاہئے۔ عورت شرعی اسباب کے تحت طلاق لینے کا حق رکھتی ہے۔ یہ تمام قوانین اس لئے ہیں کہ جب تک طلاق کے اسباب و شروط پورے طور پر نہ جمع ہو جائیں۔ طلاق کے لیے پیشقدمی کرنا خاندانی سعادت کے لیے ناگوار اور اولاد کی تربیت میں برے اثرات پیدا کرنے کا موجب ہے۔

اس کے علاوہ بعض فقہاء کی نظر میں مرد کا بغیر انتہائی اشد ضرورت کے اپنے تسلط واقتدار کی بناء پر طلاق کا اقدام کرنا سراپا باطل ہے۔ کیونکہ جمہور فقہاء کے نزدیک طلاق مباح ہے' اس کے ساتھ ساتھ وہ اس طلاق کو جو شرعی شروط پر پوری نہ اترے' نہایت افسوسناک اور بدترین فعل شمار کرتے ہیں۔

یہاں یہ شبہ پیش کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے جس طرح طلاق کو بری چیزوں میں شمار کیا ہے کیا اس سے پیشتر اس طرح سے مسیحی مذہب نے بھی طلاق کو حرام نہیں کیا۔ پھر اس میں اسلام ہی کو کیا خصوصیت حاصل ہے۔؟

یہ کہنا کہ مسیحی مذہب کے مطابق اسلام نے بھی طلاق کو حرام کر دیا ہے غلط ہے کیونکہ اگر ایسا کیا جائے تو شادی کا وہ مقصد فوت ہو جاتا جو مرد اور عورت کی زندگی سے وابستہ ہے کہ ان میں اتحاد و محبت قائم ہو۔ اگر یہ چیز مفقود ہو جائے تو اس صورت میں صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ اصلاح کی کوشش یا جدائی تاکہ وہ افتراق و نزاع کے دائمی عذاب سے چھٹکارا پالیں۔ کیونکہ ازدواجی زندگی میں بدمزگی و کشیدگی مختلف مصیبتوں کی آماجگاہ ہے۔ شارع اسلام حضرت حق جل مجدہ کو یہ معلوم تھا کہ جو قومیں طلاق کو حرام قرار دے رہی ہیں کسی دن وہ بھی اس کو جائز قرار دینے پر مجبور و مضطر ہوں گی اور اس کے لیے ان کو اپنے مذہبی حدود اور قانونی دیواروں کو توڑ دینا پڑے گا' چنانچہ یہی ہوا جس پر بے شمار واقعات و حادثات شاہد

ہیں۔ انیسویں صدی عیسوی میں اکثر قومیں اس کو مباح قرار دینے پر آمادہ ہو گئیں۔ اس دور سے طلاق کا رواج اس حد تک ہو گیا' خصوصاً متحدہ امریکہ میں کہ جس کا وہم وگمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ امریکہ کے بلکہ یورپ کے تمام مصلحین اس معاملہ میں انجان ہو گئے کیونکہ ان کو اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ تہذیب وتمدن کے نظام کی بنیادیں اسی پر قائم ہو سکتی ہیں۔

اب سے کئی سو سال پہلے اگر اسلام نے طلاق کو مباح کیا ہے تو کیا اس نے تمام عمرانی اور تمدنی واجتماعی ضرورتوں کا پورا لحاظ نہیں رکھا؟

بعض تنگ نظر ارباب بحث یہ پیش کرتے ہیں کہ دولت رومانیہ کے ابتدائی زمانے میں طلاق کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی باوجود یہ کہ یہاں کا قانون اس کے جواز کا حامی تھا۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ عورت بہ نسبت دوسری قوموں کے یہاں پر نہایت ارفع واعلیٰ شان رکھتی تھی۔ یہ قول سراسر غلط ہے کیونکہ سلطنت رومانیہ میں جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے شوہر کو یہ حق حاصل تھا کہ اپنی بیوی کو کسی جرم پر قتل کر دے' اس کے باوجود عورت کو طلاق لینے کا کوئی حق نہ تھا۔ اگر طلاق لینے کا ارادہ بھی کرتی تو اس کا یہ فعل قابل قصاص شمار کیا جاتا۔ اس کے برعکس جمہوریت کے آخری زمانے میں طلاق بکثرت رائج ہو گئی جو انتہائی سرعت کے ساتھ سوسائٹی کے اخلاق میں انحطاط پیدا کرنے کا باعث ہوئی۔

سوال یہ ہے کہ اسلام نے طلاق کو جائز قرار دے کر عورت کی تعظیم وتوقیر کو بڑھایا اور اجتماعی اضطراب کے امکانات کو دور کیا یا دوسری قوموں نے جنہوں نے طلاق کو یکسر حرام قرار دے کر انسانیت کا گلا گھونٹ دیا' عورت کے لیے انواع واقسام کے مظالم کا دروازہ کھول دیا اور اخلاقیات کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا۔؟

ان عجیب وغریب مقدمات میں سے جن کو میں نے گزشتہ ماہ لندن کی عدالت گاہوں میں دیکھا ہے ایک شخص کا مقدمہ ہے جو "الن واتہام" سے موسوم تھا۔ یہ شخص اپنی ازدواجی زندگی سے بہت تنگ آ چکا تھا۔ آخر کار اس نے اپنی بیوی کو پانسو انگریزی سکول پر ایک تاجر فیلپس نامی کے ہاتھ بیچ دیا۔

مسٹر الن واتہام نے دوران مقدمہ میں بیان کیا کہ اس کی ازدواجی زندگی نہایت ناخوشگوار ہو گئی تھی کیونکہ اس کی بیوی کے اخلاق وعادات مرد کے بالکل مخالف تھے۔ اس

لئے کہ اس کی بیوی کو اس تاجر کے ساتھ عشق تھا اور وہ اپنی فروخت کے لیے تیار تھی۔

وکیل ملزم نے کہا کہ مدعی کو اب دعویٰ پیش کرنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ اس نے اپنی مدافعت میں ایک ایسا جملہ کہہ دیا ہے جس سے اس امر پر استدلال کیا جا سکتا ہے کہ آج سے سو سال پہلے انگریزی قانون بیویوں کو فروخت کرنے کے جواز میں تھا۔ اور 1801 میں ایک بیوی کی قیمت چھ پنس میں محدود تھی مگر شرط یہ تھی کہ بیوی کی رضا مندی اور اس کے اختیار سے اس بیع کی تکمیل ہونی چاہیے۔

عدالت نے اس بیان کی تردید کی کہ یہ جملہ صحیح ہے اور جس قانون کا ذکر کیا گیا ہے وہ واقعی موجود تھا مگر حکومت نے 1805 میں بیع زوجات اور ان کی تحقیر کے خلاف قانون صادر کر دیا ہے۔ بحث و مباحثہ کے بعد عدالت نے فروخت شدہ بیوی کے شوہر کو دس مہینوں کی قید کا فیصلہ صادر کیا۔

حکومتوں اور دیگر مذاہب وادیان کے ان قوانین سے جو عورتوں کے بارے میں پیش کیے گئے ہیں اگر اسلامی تعلیمات واحکام کا مقابلہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا عملی مذہب ہے جو محکم اساس پر قائم ہے۔ اس نے انسانی انقلابات اور تہذیبی و مرانی حالات و تغیرات کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ اس نے کوئی ایسا خیالی خاکہ پیش نہیں کیا جو عالی شان عبادت گاہوں تک محدود ہو اور میدان عمل میں اس قدر دشوار گزار گھاٹیاں حائل کر دے کہ لوگ ان کو عبور ہی نہ کر سکیں۔

یہاں یہ شبہ وارد کیا جا سکتا ہے کہ یہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو وہ حقوق دیئے جو دنیا کی کسی قوم یا مذہب نے عطا نہیں کیے حالانکہ اس نے مرد ہی کو عورت کی طلاق کا حق دیا ہے کہ جس وقت وہ ارادہ کرے عورت کی ازدواجی زندگی کو منہدم کر سکتا ہے؟ کیا یہ عورت پر صریح ظلم نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک اس قسم کی طلاق عورت کے درجہ کو گرا دینے کا موجب ہوتی اگر اسلام طلاق کے بارے میں عورتوں کو مردوں کے مساوی نہ شمار کرتا۔ اس نے حق طلاق مرد ہی کو نہیں دیا بلکہ اس میں مرد و عورت دونوں کو مساوی حقوق عطا کیے ہیں۔ اس نے یہ قانون پیش کر دیا کہ عورت کا حق ہے کہ وہ عقد کے وقت یہ شرط ٹھہرائے کہ طلاق کا حق

جس طرح سے مرد کو ہے اسی طرح اپنے لئے بھی ہوگا۔ وہ حسب ضرورت ومقتضائے حال جس وقت چاہے اس کو استعمال کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اکثر وبیشتر اسلامی خواتین نے اس حق سے فائدہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے اپنی عصمت وعفت کو اپنے ذمہ لیا اور اپنے شوہروں کے ساتھ نہایت شان ومنزلت کی زندگی گزاری اور جب انہوں نے یہ دیکھا کہ زندگی کا اطمینان اور مصیبتوں سے نجات پانے کی صورت مردوں سے جدا ہو جانے ہی میں ہے تو اپنا حق طلاق طلب کیا۔ جب سے مسلمانوں نے ان اسلامی حقوق کو نظر انداز کر دیا اور اپنی لڑکیوں کو کلی طور پر مرد کے قبضہ اقتدار میں دے دیا تو مخالفین کو اسلامی تعلیمات پر اعتراض کرنے کا موقع مل گیا مگر ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس سے اسلامی احکام وقوانین پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی جاسکتی۔ وہ وقت دور نہیں کہ لوگ بہت جلد پھر ان حقوق سے آگاہ ہو کر ان سے استفادہ کریں گے اور اپنا بھولا ہوا سبق یاد کر کے زندگی کو خوشگوار بنائیں گے۔

یہ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ مخالفین اسلام نے ان شروط سے آنکھیں بند کر لیں جن کی شارع اسلام نے اجتماعی ضرورت کے مدنظر طلاق کی اجازت دی ہے۔ نیز انہوں نے ان فقہاء مسلمین کے قوانین کو فراموش کر دیا جو اپنے محکم احکام میں ازروئے عدالت وانسانیت مغربی قوموں کے ارباب بحث وتفقہ پر فوقیت رکھتے ہیں۔ مسلمان فقہاء نے اس آیت کریمہ:

"فان طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره"

(سورۂ بقرہ)

"پھر اگر اس نے اس کو (تیسری) طلاق بھی دے دی تو اب وہ عورت اس کو حلال نہ ہوگی جب تک کہ وہ کسی اور سے نکاح نہ کرے۔"

سے یہ استدلال کیا ہے کہ یہ میاں بیوی ہر دو کے لئے ایک تہدیدی حیثیت رکھتی ہے، جہاں تک ہو سکے طلاق کا سدباب کرتی ہے اور بلا سوچے سمجھے طلاق پر اقدام کرنے سے باز رکھتی ہے۔

یہ امر کس قدر صریح بطلان خیز ہے کہ سر میور نے اپنی کتاب "سیرۃ محمد (علیہ السلام)" میں اس کا انکار کیا ہے لیکن اس نے یہ فراموش کر دیا کہ اسلام نے پہلے شوہر کے لئے اپنی

مطلقہ بیوی سے رجوع کرنے کے لیے جو دوسرے شوہر کی شرط لگائی ہے یہ خود طلاق کے واقعہ ہونے میں زبردست مانع ہے، خصوصاً عرب جیسی قوم کے نزدیک جو غیرت وخودداری میں مشہور اور عزت نفس میں ممتاز ہے۔ نیز یہ شرط اس عادت کو روکنے کا بہترین ذریعہ ہے جو اس زمانے کے یہود ونصاریٰ اور جاہلیت کے عربوں میں بکثرت پائی جاتی تھی۔ پس قرآن عزیز نے اس قوم کو شدت کے ساتھ منع کیا جو روئے زمین کی تمام قوموں سے شعور واحساس میں نہایت قوی تھی۔ جس پر عمل کر کے اس نے ابدی عزوشرف حاصل کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگ مجموعی طور پر انسانی جذبات میں باہم مشابہ ہیں۔ انسانی سوسائٹی میں سوائے ان چند اشخاص کے جنھوں نے اپنی انسانیت اور غیرت کو خیر باد کہہ دیا ہو کوئی انسان اپنے خاندانی مجد وشرف اور غیرت وحمیت کے تحت ہرگز یہ گوارا نہ کرے گا کہ اپنی عورت کو طلاق دے کر اس کو کسی دوسرے سے شادی کرنے کے لیے چھوڑ دے۔

اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر شریعت نے حلالہ کرنے کی شدت سے برائی کی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الا اخبر کم بالتیس المستعار قالوا ماھو یارسول اللہ؟ قال ھو المحلل لعن اللہ المحلل والمحلل لہ"

"کیا میں تمہیں عاریتی سانڈ کی خبر نہ دوں۔؟" لوگوں نے کہا: "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ کیا ہے۔؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ حلالہ کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حلالہ کرنے والے اور حلالہ کروانے والے پر لعنت کی ہے۔"

عورتوں کا مردوں کے ساتھ اشتراک عمل:

قوموں کی تاریخ میں اس سے بڑھ کر تاریک پہلو اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ عورت کو مطلق العنان کر دیا جائے اور اس نرم نازک آبگینے کو جو لطیف احساسات اور منفعل جذبات سے لبریز ہے کارزار حیات میں پھینک دیا جائے اور قوی چٹانوں سے ٹکرا دیا جائے۔ عورت مردوں کے دوش بدوش کام کرے اور تمام دن اور رات کا ایک حصہ کارخانوں کے شعلوں

اور دخانی بگولوں کے مابین یا سڑکوں پر طوفانی ہجوم کے درمیان گزارے۔ یورپ وامریکہ کے بڑے بڑے کارخانوں کے اندر ایک عجیب ہنگامہ نظر آتا ہے۔ یہاں صنف نازک سخت ودشوار کام کرتی ہے۔ اگر ہم تھوڑی سی زحمت کر کے ان سے سوال کریں کہ اس شعلہ زار جہنم میں کام کرنے کا ان کو روزانہ کیا صلہ ملتا ہے تو ان میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی زبانی یہ جواب ملے گا کہ اس کٹھن اور دشوار تر محنت کا صلہ روزانہ ایک فرانک سے زائد نہیں ہے۔ یہ اس قدر قلیل رقم ہے کہ وہ مشکل ہی سے اپنی زندگی گزار سکتی ہیں۔ اگر ہم اس کے بعد لیڈی ڈاکٹروں اور ہندسہ ہیئت دان خواتین پر ایک نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ بڑے بڑے متمدن ممالک میں فی صدی پانچ کے تناسب سے نظر آئیں گی۔ ہمارے ملک کے ''آزادی نسواں'' کے علمبردار بجائے اس کے کہ عالموں کے پاس مسلم ہے اور بجائے اس کے کہ وہ ہمارے ملکوں کو اس ''بلائے بے درماں'' سے نجات دلائیں جیسا کہ یورپ وامریکہ کے حکماء وفلاسفہ کوشاں ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ وہی خطرناک جراثیم ہماری فضا میں داخل کر دیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ ہم یورپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ لیکن کاش کہ انہوں نے ہماری اجتماعی اسلامی زندگی کی محفوظ فضاؤں کا تھوڑی دیر کے لیے اپنی خوردبینی نگاہوں سے معائنہ کیا ہوتا تو ان کو بخوبی علم ہو جاتا کہ ہم اپنی اسلامی روح کے اکتساب وفیضان کی وجہ سے ان جیسے خطرناک عمرانی امراض سے علیحدہ ہیں۔

''خاتون جدید'' کا مصنف کہتا ہے:

> ''ہم پرزور الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ اہل صنعت وحرفت عورتوں کی تعداد میں سال بسال اضافہ ہونا ضروری ہے' کیونکہ ہم اس راستہ پر چل رہے ہیں جس پر ہم سے پیشتر یورپ چل چکا ہے۔''

ہم مصنف کے اس نقطہ نظر سے بالکلیہ اختلاف رکھتے ہیں' کیونکہ ہم ہر طرح یورپ کی راہ پر گامزن نہیں ہیں۔ ان کی اجتماعی تشکیل اور ہماری اجتماعی ہیئت پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو اولین لمحہ میں ہماری اور ان کی زندگی کے اصولوں اور ہمارے اور ان کے عمرانی عوامل وعناصر کے درمیان بہت بڑا فرق نظر آئے گا۔ ہم ایک ایسی امت ہیں جس کے روابط وتعلقات اسلامی اصولوں سے مربوط ومحکم ہیں اور ہمارے ذہن میں یہ امر مرکوز ہے کہ ہم

عرش عظمت سے صرف اس لئے گر پڑے کہ ہم نے اسلامی اصولوں کو جو دنیا و آخرت کی سعادت کا موجب ہیں پس پشت ڈال دیا۔ بخلاف امت اسلامیہ کے یورپ کی قومیں ایسی ہیں کہ ان میں قومیت و وطنیت کے عناصر کارفرما ہیں اور ان کے باہم جنسی علاقے مربوط ہیں ان کے ذہن میں یہ بات جم چکی ہے کہ انہوں نے قدیم رسم ورواج کو چھوڑنے ہی کی بدولت ارتقائی منازل طے کیں۔ ہمارے اجتماعی عام اصولوں کا یہ بسیط نظریہ ہمارے اس دعویٰ کے لیے کافی ہے کہ ہم اسی صورت میں یورپ کے دوش بدوش اس کے تمام شعبوں میں چل سکتے ہیں جب کہ ہمارے تقلیدی رابطہ کی جگہ کوئی جنسی وقومی رابطہ لے لے اور ہمارے اذہان سے یہ تصور مٹ جائے کہ اوج سعادت تک ارتقاء محض ان تقلیدوں کو چھوڑنے سے حاصل ہوسکتا ہے۔ کیا اس قسم کا دشوار گزار انقلاب ممکن ہے حالانکہ ہمارے علمی تجربات ومشاہدات برابر ہر دن ہمیں یہ ثابت کررہے ہیں کہ ہماری زندگی کے اصول ومقاصد اور ہمارا اسلامی نظام حیات ہمارے لیے اکسیر شفاء اور ہمارے تمام زخموں کے لیے مرہم ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب تک ہمارا اجتماعی رابطہ جنسی وقومی روابط کے شائبوں سے پاک رہے گا، ہمیں اس کی مطلق حاجت نہیں کہ ہم دنیا کی کسی قوم کی ان مسائل حیات میں پیروی کریں جو ہماری طبعی ترکیب کے متضاد ہمارے تہذیبی عناصر کے مخالف اور ہمارے مزاج دینی سے متصادم ہوں۔ اس کے علاوہ مغرب نے عورتوں کے باب میں جو روش اختیار کی ہے وہ حد درجہ خطرناک ومہلک ہے۔ جس کے متعلق ان کے بڑے بڑے علماء نے شہادت دی ہے، کیونکہ وہ عورتوں کے لیے مردوں کے مشاغل انجام دینے کو بہت بڑا اجتماعی مرض شمار کرتے ہیں۔ بھلا ہمیں یہ کب روا ہوگا کہ ہم ان کے امراض میں گھر جائیں اور ان میں گھل جائیں پھر ہم خود کو مختلف عوارض وشکایات کا شکار بنا ڈالیں؟ اگر ہم کسی چیز میں ان کے نقش قدم پر چلنا ضروری سمجھتے ہیں تو کس لئے؟ ہم ایسی چیز کی تقلید نہ کریں جو واجبی ہے۔ ہمارے لیے یہ کسی طرح روا نہیں کہ بے سمجھے بوجھے ان کے اصول اخذ کرلیں اور بلا تحلیل وتجزیہ ان کے تمدن سے کوئی چیز کسب کریں۔

اس وقت ہمارے سامنے مغربی علماء ومفکرین کے بہت سے اقوال وآراء ہیں جو

ہمارے اس موضوع سے متعلق ہیں۔ ان میں سے عورتوں کے مسئلہ سے علاقہ رکھنے والے اقوال کو ہم یہاں پیش کرتے ہیں تا کہ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اگر ہم خود اپنے ہاتھوں اپنی بیماریوں کا مداوانہ کریں تو دیگر اقوام کے ہاتھوں سے ان کے ازالہ کی کوشش فضول اور فعل عبث ہے۔

پروفیسر جیوم فریرو نے 1896 میں ایک مجلہ میں لکھا کہ ہمارے موجودہ تمدن میں جس میں ہم سانس لے رہے ہیں بہت سی خطرناک نشانیاں نمودار ہوگئی ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس میں بحث وجستجو کرنے والا نت نئی خطرناک علامتوں سے دوچار نہ ہوتا ہو۔ ہم اپنے آپ پر ایک طبیب کی ذمہ داری عائد کرتے ہوئے اطباء کی اس تشخیص کی تائید کی کوشش کریں جس کو انہوں نے ہمارے اس دور کے اجتماعی مرض کے لیے جدید دری شکل میں رہبانیت کو تجویز کیا ہے۔ ہم بلا کسی دینی استناد کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ رہبانیت اس درجہ تک پہنچ جائے گی جہاں تک قرون وسطیٰ میں دینی رہبانیت پہنچ چکی تھی۔ ہر ملک کے مردوں اور عورتوں کو تجربات ومشاہدات کے ذریعہ بخوبی واقفیت حاصل ہے کہ وہ دشواریاں اور رکاوٹیں جو شادی کی راہ میں حائل ہیں روز بروز بڑھتی جارہی ہیں۔ بے شمار اسباب کے علاوہ بالخصوص اقتصادی اسباب ہیں جو شادی کے لیے مانع ہیں۔ اکثر اشخاص کے لئے جب اس منزل کو عبور کرنا دشوار ومحال نظر آیا تو ان کو مجبوراً تجرد کی زندگی پر صبر کرنا پڑا۔ ایسے میں ہمارے لیے یہ کہنا آسان ہے کہ دونوں صنفوں کے افراد لامحالہ اجتماعی ہیئت میں خطرناک آثار وعوارض پیدا کردیں گے جن کا موجب ان کی تجرد پسندانہ زندگی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تجرد پسند عورتوں سے جو نتائج وآثار برآمد ہوں گے وہ تجرد پسند مردوں کی بہ نسبت نہایت خطرناک ہوں گے کیونکہ تجرد پسندہ مرد کے اندر درحقیقت خاص نفسیاتی صفات وکیفیات پیدا کردے گی' مگر بلکلیہ اس کی شخصیت تحویل وتبدیل نہیں ہو جائے گی کیونکہ تجرد کا لازمی نتیجہ مرد کے اندر پاکدامنی نہیں پیدا کرتا۔ ممکن ہے کہ اس کو دختران ہوا وہوس کے درمیان زندگی گذارنے پر مجبور کیا جائے یا وہ فسق وفجور کا ارتکاب کربیٹھے' اس کے باوجود تجرد اس کے عضویاتی وظیفہ کو یکبارگی زائل نہیں کرسکتا۔ عورت کا حال اس کے برعکس ہے کیونکہ موجودہ اجتماعی حالات اس امر کے مقتضی ہیں کہ عورت کی عفت وعصمت کی

حفاظت اس کے تجرد میں مضمر ہے۔ عفت کا تقاضہ ماں کے فرائض کی ادائیگی کو ساقط کر دیتا ہے یہی وہ وظیفۂ حیات ہے جس کے لیے عورت جسمی وروحی طور پر پیدا کی گئی ہے۔ ایسی صورت میں بلاشک وشبہ عورت کی شخصیت میں فساد وتغیر کا رونما ہو جانا لازمی ہے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس قسم کی عورتوں کی ایک بڑی تعداد اجتماعی نظام کو درہم برہم کر دے گی۔

یہ قول ہے شہرۂ آفاق ماہر عمرانیات کا۔ ہمارے سامنے اس قسم کے بے شمار اقوال و امثال ہیں جو واضح طور پر بتا رہے ہیں کہ مغربی تہذیب وتمدن میں ایسی خوفناک علامتیں پائی جاتی ہیں جو عنقریب یورپ کے نظام تمدن میں بالخصوص عورتوں کے مسئلہ میں بڑی پیچیدگیاں پیدا کرنے والی ہیں۔ اگر ہم اس تمدن کی کسی شعبہ میں تقلید کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو کم از کم ہمیں اس کو عقل وحکمت کی کسوٹی پر جانچ لینا چاہیے۔ اگر ہم میں ان معرکۃ الآراء عمرانی مسائل کی جانچ پڑتال کی قدرت نہیں ہے جو قوموں کے مستقبل کی تعمیر سے تعلق رکھتے ہیں تو ہم بآسانی اس تمدن کے علماء سے فیضیاب اور ان کے روزمرہ کے تجربات ومشاہدات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ ہم قارئین کے روبرو اپنے دعویٰ کی مزید تشریح کے لیے فلسفۂ عملی کے پروفیسر اور علم العمران کے موسس وواضع فیلسوف اگسٹ کانٹ کا ایک قول اس کی کتاب ''سیاسی نظام حسب اصول فلسفۂ حسیہ'' سے پیش کرتے ہیں۔

مصنف مردوں کے اشغال کے ساتھ عورتوں کو مشغول ہونے کے مسئلہ اور اس سے اجتماعی نظام میں خلل واقع ہونے کے نتائج پر روشنی ڈالنے کے بعد کہتا ہے کہ ان فساد انگیز اور تباہ کن خوابوں کے بجائے ممکن ہے کہ کوئی طبعی اصول عورت کی زندگی کا بالکلیہ ضامن ہو جائے یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ صنف قوی پر صنف نازک کی طرف سے مساوی فرائض وواجبات کی تحدید وتعیین کر دی جائے۔ یہ کام محض فلسفۂ حسی سے ممکن ہے کیونکہ حقیقی روح کے ساتھ اس کو امتیازی نسبت حاصل ہے کہ اس فطری اصول کو قابل قبول طریقہ سے رائج کرے۔ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ جدید حسی فلسفہ نے اس عام میلان کو ایجاد کیا بلکہ اس نے تو انسانی مجموعی حرکت میں دقیق غور وتامل کرنے کے بعد صرف اس کا ایک تحقیقی اندازہ لگایا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ مرد کا فریضہ ہے کہ وہ عورت کو خوراک بہم پہنچائے۔ یہی قانون

طبعی ہے بنی نوع انسان کے لیے یہی وہ قانون ہے جو صنف نازل کے لیے اصل گھریلو زندگی کے مطابق ہے۔ یہی وہ قانون ہے جس کا حسن وکمال نوع انسانی کے ارتقاء کے مطابق جلوہ گر نظر آئے گا' کیونکہ وہ تمام مادی ترقیاں جن کا مطالبہ موجودہ حالت میں عورتوں کے لیے کیا جارہا ہے آخر میں لازمی طور پر اسی اساسی ناموس پر منطبق ہونے کے لیے تبدیل ہو جائیں گی۔ لامحالہ اس اصول کے نتائج ردعمل کے طور پر تمام اجتماعی نظاموں اور بالخصوص مزدور پیشہ افراد میں رونما ہوں گے۔ یہ وہ قانون ہے جو فطری میلان کے ہم آہنگ ہے اور جو عورتوں کی ذمہ داریوں سے علاقہ رکھتا ہے۔

کوئی شخص یہ اعتراض کرسکتا ہے کہ ہم اس صورت میں کیا کریں جب کہ موجودہ حالت کا تقاضا یہ ہے کہ بعض ایسی عورتیں پائی جاتی ہیں جن کا نہ کوئی سرپرست ہے اور نہ رکھوالا۔؟ کیا ہم ان کو بھوکوں مرنے کے لیے چھوڑ دیں اور وہ مردوں کے ساتھ مل کر کام نہ کریں؟ اس کا جواب بآسانی یہ دیا جاسکتا ہے کہ جب ہمیں اس بات کا بخوبی علم ہو گیا کہ عورتوں کا اپنے گھروں سے باہر کام کرنا اجتماعی نظام میں خلل وفساد کا موجب ہے۔ حیات اجتماعیہ کی محبت اور اس کا فرض دونوں اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہم اس طرح آسانی کے ساتھ اس اجتماعی خطرہ کو نفوذ کرنے نہ دیں' بلکہ ہم پر انسانیت کا یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ اس کی روک تھام اور اس کے علاج کی طرف امکان بھر کوشش کریں۔ ہم کسی ایسے نظام حیات کی تلاش کریں جو نوع انسانی کے مستقبل کی تعمیر میں جوہری عنصر کی حیثیت رکھتا ہو اور اس میں ایسے قوانین وضوابط پائے جائیں جو خصوصیت سے صنف نازک کی زندگی کے کفیل ہوں اور اس کی فلاح ونجات کے ذمہ دار۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہم اسلامی تہذیب وتمدن اور اس کے نظام حیات پر بھی ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ کیا اس میں وہ اصول وضوابط ہیں جو اس جنس لطیف کی زندگی کے کفیل وضامن ہیں جو فقر وفاقہ کے آہنی پنجوں میں گرفتار ہوئے؟ بے شک اسلامی قانون اس کی ضمانت اس طرح دیتا ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر مرجائے اور اس کے رشتہ داروں میں سے اس کی پرورش کرنے والا کوئی نہ ہو تو بیت المال کا فرض ہے کہ وہ اس عورت کی تمام ضرورتوں اور حاجتوں کی تکمیل کرے۔ یہی اسلامی تمدن اور اسلامی اصول ہے۔ یہی وہ فطری قانون

ہے جس کے اردگرد عملی حسی فلسفہ کے ارباب عام انسانی اجتماعی نقل وحرکت میں فکر ونظر کرنے کے بعد جمع ہوئے ہیں۔ جدید فلسفہ حسی کا شیخ اور اس کا موسس اگسٹ کانٹ اپنی کتاب ''سیاسی نظام'' میں بیان کرتا ہے:

''عورت کا شوہر اور اس کا کوئی رشتہ دار موجود نہ ہونے کی صورت میں ہیئت اجتماعیہ کا فرض ہے۔ ہر عورت کی زندگی کی ضمانت لے اسی میں انسانی ترقی کا حقیقی راز مضمر ہے' حتی الامکان عورتوں کی زندگی کا گھریلو ہونا ضروری ہے۔ نیز ان پر یہ امر واجب ہے کہ وہ ہر بیرونی کام سے چھٹکارا پائیں' تا کہ وہ اپنی زندگی کے فرائض کی تکمیل کر سکیں جو مقصود بالذات ہیں۔''

یہ وہ نقطۂ فکر ونظر ہے جس پر بیسویں صدی کے مفکرین وزعماء اپنی قومی زندگی کے ان ہزاروں ادوار واطوار کا مطالعہ کرنے کے بعد پہنچے ہیں جو ہر صدی میں نت نئی مشکلات اور پیچیدگیوں میں گھرے چلے آ رہے تھے' کاش کہ وہ اسلامی نظام حیات اور اس کے اجتماعی ضابطہ پر پہلے ہی سے ہمدردانہ غور کرتے تو ان کے تمدن میں تخریبی عناصر اس قدر کارفرمانہ ہوتے۔ ان اقوال وآراء کو پیش کرنے سے ہمارا ہرگز یہ منشاء نہیں کہ ہم ان کو اسلامی فکر پر منطبق کریں اور اسلام کے نظام حیات کی تصدیق کریں۔ کیونکہ اسلام تو ان چیزوں سے بہت بالاتر ہے۔ بلکہ ہمارا مقصد' مغرب زدہ افکار واذہان کو دعوت فکر ونظر دینا ہے کہ جس چیز کو وہ عین صداقت سمجھتے ہیں وہ تغیر وتبدل کے کتنے روپ بھرتی ہے اور جس شئے سے وہ انجان ہیں وہ ہزاروں انقلابات اور تبدیلیوں کے باوجود مجسم حقیقت بنی ہوئی ہے۔ اس کھرے اور کھوٹے کی تمیز کے بعد کس دلیل وحجت کے ذریعے ہم تمدن جدید کے جراثیم کو اپنے اندر داخل کرنے کا شورہ دیں اور بے شمار امراض کا شکار بن جائیں۔؟ ہمارا کیا حال ہوگا کہ پہلے ہی سے ہم اس قدر کمزور اور ہماری قوت مقاومت اس قدر مضمحل ہو چکی ہے جو مرض کے حملہ کو اور تقویت پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ پھر ہم اس کے بعد ایک نیا قانون پائیں جو عورت کو بیرونی کام کرنے اور کٹھن کام انجام دینے پر آمادہ کرے؟ ہم یورپ کی کورانہ تقلید اور اس کے تخریبی نظام کی طرف کس لئے رخ کرنے کی زحمت کریں' جب کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ اسلامی تمدن اور اسلامی اصول حیات ہی وہ نصب العین ہے' جس

کے قریب انسان روز بروز آ رہا ہے۔

کیا وجہ ہے کہ مغربی مفکرین نے بعض اہل مشرق کے اس عقیدہ کے خلاف کہ ایک اہم اقدام ہے" پھر اپنے قدیم نظریہ کی طرف رجوع کیا ہے اور عورت کو خارجی کاموں کے انجام دینے کو ناپسندیدہ نظر سے دیکھا ہے۔ ان کا یہ اعتدال پسند نظریہ نتیجہ ہے اس کا جس کو انہوں نے رات دن اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ بے چاری مرد کے دوش بدوش ہے لیکن اس کو کوئی چیز سوائے پسینے کی بو کے حاصل نہیں ہوتی۔ ہر جولان گاہ عمل میں غلبہ کا نشانہ بنتی ہے اور اپنی کمائی پر بھی اس کو قابو نہیں۔ فیلسوف فوریر جو آزادی نسواں کا زبردست حامی ہے کہتا ہے:

"آج عورت کی کیا حالت ہے؟ وہ اس عالم مصنوعات تک میں محرومی کی زندگی بسر کرتی ہے' جہاں مرد ہر طرف سے باریک کاموں مثلاً خیاطت اور اصلاح سازی کے مقصد کے لیے ٹوٹ پڑے ہیں' لیکن عورت تنہائی کے گوشوں میں بیٹھی ہوئی دشوار ترین کام انجام دیتی ہے۔ پھر ان عورتوں کی زندگی کی آمدنی کے ذرائع کیا ہوں گے جو مال و دولت سے محروم ہیں؟ یا چرخہ رانی یا حسن فروشی بشرطیکہ وہ حسین وجمیل ہوں؟ بے شک ان کی واحد تدبیر علی الاعلان فحش کاری یا پوشیدہ حسن فروشی ہے۔ یہ وہ شغف بے حیائی ہے' جس کی طرف یہ فلاکت زدہ عورتیں اس تمدن کی بدولت پناہ لینے پر مجبور ہوئی ہیں۔ یہ ازدواجی غلامی جس کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے اب تک انہوں نے کوئی فکر نہ کی' کیا عورتوں کے ان حقوق پر عدالت کا کوئی سایہ پڑ سکتا ہے؟"

اس طوفانی ازدحام میں بے چاری عورت کہاں جائے؟ جب کہ فلاسفہ وحکماء کا یہ نظریہ ہے کہ انسان جیسے جیسے مادی خوشحالی میں ترقی کے منازل طے کرتا جاتا ہے ویسے ویسے وہ ہر دور میں جنسی ترغیبات اور نفسی عواطف وجذبات میں ترقی کرتا جاتا ہے' پھر کس لیے بیسویں صدی میں جنس لطیف کی اس حالت زار پر دل نہیں پگھلتے اور رحمت وراحت کا جذبہ جوش زن نہیں ہوتا؟ کون ایسا انسان ہے جو یہ قبول کرلے کہ عورت کو اپنے اس فطری فریضہ سے جس کے لیے وہ جسمانی وروحانی طور پر پیدا کی گئی ہے' آزاد ہو جائے اور خود کو اس خون

ریز معاشی جنگ میں جھونک دے؟ مشہور ماہر اقتصادیات فلسفی برو ڈون اپنی کتاب "ابتکار النظام" میں کہتا ہے:

"نوع انسانی کسی نقطۂ فکر سے بھی خواہ وہ اخلاقی وسیاسی ہو یا فلسفیانہ عورت کی مرہون منت نہیں کیونکہ بنی نوع انسان نے عورت کی امداد و دستگیری کے بغیر علمی راستے طے کئے اور اس کے ذریعے حیرت انگیز ایجادات اور عجیب وغریب انکشافات انجام دیئے۔ نوع انسانی کسی صناعی اکتشاف میں عورتوں کا رہین منت نہیں ہے مرد ہی تنہا اختراع وایجاد کرتا' محنت ومشقت کرتا' شدائد و مصائب برداشت کرتا اور عورت کو خوراک بہم پہنچاتا ہے۔ یہ دور جس میں عورت زندگی کے ہر شعبہ میں خصوصاً میدان ادب میں تماشا دکھا رہی ہے بعینہٖ وہی دور ہے جس میں اس نے فبریکا میں اپنے کرتب وکمالات دکھائے ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ کوئی جدت واختراع کر سکے اور اپنی طبیعت کی جولانی دکھا سکے۔"

برو ڈون کے اس قول سے یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے عورت کی شان میں تحقیر وتوہین کی ہے بلکہ اس کا مقصد اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ عورت اس لئے نہیں پیدا کی گئی کہ وہ کسی کارخانے میں صنعت گری کرے یا علم وحکمت کے سمندر کھنگالتی رہے بلکہ اس کی تخلیق کا فطری منشاء یہ ہے کہ وہ ماں بن کر رہے اور بہترین مربی ثابت ہو۔

جو لوگ عورتوں کی اصلاح اور ان کی ترقی کے لیے کوشاں ہیں' ان کو چاہئے کہ وہ شہرۂ آفاق فلسفی' موجودہ مادی تمدن کے باوقات فرزند اور اس کے سب سے بڑے موسس جول سیمون کے اس بیان میں غور وفکر کریں جو اس نے علامہ لاجودیر فرانس کی کتاب میں ایک باب کی شکل میں قلمبند کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"عورت کا فرض ہے کہ وہ عورت ہی باقی رہے یہ قول ہے سیولا جودیر کا۔ بے شک عورت کو عورت ہی باقی رہنا چاہئے کیونکہ وہ اسی کی بدولت اپنی سعادت وفلاح حاصل کر سکتی اور دوسروں کو بھی اس کا فیض پہنچا سکتی ہے۔ ہم بھی عورتوں کی اصلاح کے موید ہیں' اس طرح سے نہیں کہ ان کی فطرت ہی کو بدل

ڈالیں اور ان کی شخصیت کو متغیر کر دیں۔ ہم ان کو تنبیہ کرتے ہیں کہ وہ مرد بننے سے پرہیز کریں کیونکہ وہ اس طرح کرنے سے بیشتر بھلائی کو فنا کر لیں گی اور ہم بھی اپنی ہر چیز کھو بیٹھیں گے کیونکہ فطرت نے اپنی ہر صناعی کو محکم طریقہ سے بنایا ہے۔ ہم اس سے سبق حاصل کریں اور اس کو بہتر بنانے کی کوشش کریں اور ہر اس چیز سے خوف کریں جو فطرت کے قوانین وضوابط سے دور کا بھی علاقہ نہیں رکھتی۔"

آگے چل کر کہتا ہے:

"بعض فلاسفہ کہتے ہیں کہ زندگی شدائد وآلام سے بھری ہوئی ہے لیکن وہ اس لئے کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی عمر بھر محبت کا ذائقہ نہیں چکھا لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ زندگی پاک اور خوشگوار ہے' مگر ایک شرط کے ساتھ وہ یہ کہ ہر مرد اور عورت اس مقام ومرتبہ کو معلوم کرے جس کو اللہ نے ان دونوں کے لیے بنایا ہے۔"

ایسے بڑے مفکر کے لیے یہ قول کہنے کا سبب صرف یہی ہوا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ عورت کا اپنے پردہ سے باہر ہو کر کام کرنا اس کے وظیفۂ طبع کے منافی ہے۔ اس فعل نے اس کی گھریلو زندگی کے نظام کو درہم برہم کر دیا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

عورتوں کا مردوں کے ساتھ اشتراک عمل علاوہ اقتصادی اور گھریلو زندگی پر برے اثرات مرتب کرنے کے ان پر اس سے زیادہ عجیب وغریب اثر پیدا کرتا ہے۔ مشہور محقق جیوم فریرو کہتا ہے کہ یورپ میں بیشتر عورتیں ایسی ہیں جو مردوں کے کام انجام دیتی ہیں اور اس کی وجہ سے وہ سرے سے شادی ہی نہیں کرتیں۔ اس قسم کی عورتوں کو "تیسری صنف" سے یاد کیا جائے تو صحیح ہوگا' یعنی نہ یہ مردوں میں شمار ہوتی ہیں اور نہ ہی عورتوں میں۔

محقق موصوف نے ان عورتوں کا نہایت دقیق مطالعہ کیا تو اس نے دیکھا کہ وہ اس ہنگامہ خیز زندگی میں معاشی کام انجام دینے اور خود کو اپنے ان طبعی وفطری وظائف سے علیحدہ رکھنے کی وجہ سے جن کے لیے وہ جسمی وروحی طور پر پیدا کی گئی تھیں' ان کے احساسات وجذبات ان کے ہم جنسوں کے احساسات کی بہ نسبت متغیر وزوال پذیر ہو گئے اور وہ مالیخولیا

کے مشابہ حالت میں ہوگئیں۔ گویا انسانی فطرت اپنی زبان حال سے ان کے اپنے حقوق سے غفلت کرنے پر دلیل و حجت پیش کر رہی ہے۔ پھر وہی محقق مختصر لفظوں میں کہتا ہے:

"علمائے عمران نے اس امر کے برے انجام میں جو فطری قوانین کے منافی ہے غور کرنا شروع کر دیا ہے۔ کیونکہ ان میں سے بعض عورتیں مردوں سے اپنی مزاحمت کی وجہ سے جماعت انسانی پر ایک بار گراں ہیں' کوئی کام ان کو نہیں ملتا' اگر یہی حال اس طرز پر باقی رہے گا تو اس سے ایک عظیم الشان اجتماعی خلل پیدا ہو جائے گا۔"

کیا ان کھلم کھلے شواہد کے بعد ہم عورتوں کو یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ وہ خود کو خارجی غوغائے حیات میں جھونک دیں۔؟

شرعی پردہ کی اہمیت وفضیلت:

پردہ کا رواج قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ یونان قدیم کی عورتیں بہت ہی حسین وجمیل تھیں۔ ان کی عادت تھی کہ گھر سے باہر نکلتے وقت اپنے چہروں کو اپنے دامن یا کسی خاص اوڑھنی سے ڈھانپ لیا کرتی تھیں۔

فنیقیہ کی عورتیں سرخ پردہ اوڑھا کرتی تھیں۔ یونان کے سب سے پہلے مصنف نے پردہ پر مضمون لکھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ عولیس کی بیوی بنلاپ ہمیشہ پردہ اوڑھے رہتی تھی۔

شہر شیب کی عورتوں کا پردہ خاص ہوتا تھا۔ جس میں آنکھوں کے سامنے دو سوراخ ہوتے تھے تاکہ بآسانی راستہ دیکھا جا سکے۔

اسپارٹا کی نوجوان لڑکیاں شادی ہونے سے پہلے لوگوں سے ملتی جلتی تھیں مگر شادی ہونے کے بعد پردہ پوش ہو جاتی تھیں۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عموماً عورتیں اپنے چہروں اور سروں کو ڈھانکے رہتی تھیں جب انہیں بازار جانا ہوتا تو سر سے لے کر پاؤں تک برقع اوڑھے ہوئے نکلنا ان پر ضروری تھا خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا کنواری۔

اسی طرح سیلطریہ ایشیا' ایران اور عرب میں پردہ کا رواج پایا جاتا تھا۔ رومانی عورتوں

میں یہ رسم انتہائی حد تک جاری تھی کہ جب ان میں سے کوئی عورت باہر نکلتی تو نہایت احتیاط کے ساتھ ایسا پردہ اوڑھتی جو ایک لمبی چادر کی شکل میں ٹخنوں کے نیچے تک لٹکا ہوا ہوتا تھا پھر اس کے اوپر ایک عبا پہن لیتی تا کہ کوئی عضو نظر نہ آئے۔

اسلام کے ظہور قدسی کے وقت عورت اخلاقی حیثیت سے حد درجہ گری ہوئی تھی۔ بیان کیا گیا ہے کہ عرب کی قوم میں شروع ہی سے پردہ کا رواج تھا۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ ادنیٰ درجہ کی عورتیں مردوں کے ساتھ بغیر پردہ کے سفر کرتی تھیں۔ چونکہ اس اختلاط سے دونوں جنسوں میں خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اس لئے اسلام نے عورتوں کو منظر عام پر ظاہر ہونے سے منع کیا اور ان کو اپنے گھروں کو زیب و زینت بخشنے کا حکم دیا:

”وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى“

(سورۃ احزاب)

”اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہو اور حسن کا مظاہرہ کرتی نہ پھرو جیسا کہ پہلے جہالت کے وقت میں دستور تھا۔“

نصوص شرعیہ یعنی قرآن صریح آیات اور صحیح احادیث و آثار سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام نے پردہ کے بارے میں تشدد برتا ہو جیسا کہ ہم ان ممالک میں مشاہدہ کرتے ہیں جہاں صحیح اسلامی تعلیمات کی کمی ہے:

”یاایها النبی قل لازواجك وبناتك ونساء المومنین یدنین علیهن من جلابیبهن ذلك ادنیٰ ان یعرفن فلا یوذین وكان الله غفورا رحیما“

(سورۃ احزاب)

”اے نبی! اپنی بیویوں اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی چادروں کو اپنے اوپر لٹکائے رکھیں، یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ پہچانی جائیں۔ تو ان کو کوئی نہ ستائے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“

”وقل للمومنات یغضضن من ابصارھن“

(سورۃ احزاب)

"اور مسلمان عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی آنکھوں کو نیچا رکھیں۔"

ان آیات کا سمجھنا اور اس سے اصلاحی مقاصد کے نتائج اخذ کرنا ان لوگوں کے لیے آسان ہے۔ جنہوں نے گزشتہ زمانے کی قوموں اور اجتماعی حالتوں کا مطالعہ کیا ہے۔ نیز ان پر یہ امر واضح ہو جائے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غرض وغایت یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دنیا کی اصلاح کی جائے اور برائیوں کا قلع قمع کیا جائے۔ عورت کے جملہ امور کی اصلاح کر کے اس کے ذریعہ سے ایک نظام قائم رکھا جائے تا کہ وہ ظالموں کے لیے مظالم کا تختہ مشق اور شہوت پرستوں کے حلق میں تر نوالہ نہ بن جائے۔

مغربی مصنفوں میں سے ایک منصف مزاج مصنف "ہملٹن" اپنے تاثرات کا اس طرح اظہار کرتا ہے:

"اسلامی احکام عورت کی شان میں نہایت صریح ہیں جو اس کی عزت افزائی کو برقرار رکھنے اور اس کو بے حرمتی وایذ ارسانی سے محفوظ رکھنے کی طرف خاص توجہ دلاتے ہیں۔ اسلام نے پردہ کے باب میں تنگ نظری سے کام نہیں لیا جیسا کہ بعض مصنفوں کا خیال ہے بلکہ اس نے غیرت ومروت کے اسباب کا لحاظ رکھا ہے۔"

ایک مغربی سیاح نے اپنے حالات سفر میں لکھا ہے:

"جاوا میں جو عرب مقیم ہیں وہ عام طور سے پردہ کی پابندی نہیں کرتے" جاوا کی عورتیں ہالینڈ میں رہنے والی اپنی ہم جنس بہنوں کی طرح آزادی سے بہرہ اندوز ہوتی ہیں۔"

تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ ازواج نبی کو ان کے گھروں میں ٹھہرے رہنے اور ان کو زیب وزینت کا مظاہرہ کرنے سے منع کرنے کا حکم صادر ہونے کے بعد وہ دنیا سے بے خبر اور عزلت گزیں نہیں ہو گئی تھیں جیسا کہ بعض مغربی مصنفین کا خیال ہے، کیونکہ سیدہ عائشہ زوجہ آنحضرت نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جنگ میں شرکت کی، سیدہ فاطمۃ الزہرا اور رضی اللہ عنہا نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دعوی میں بیشتر حصہ لیا اور سیدہ زینب بنت حسین رضی اللہ عنہا نے اپنے چھوٹے یتیم بھتیجے کو حادثہ کربلا کے بعد امویوں کے

پنجہ سے رہائی دلائی۔

غرضیکہ نامور خواتین اسلام کے تذکرے تاریخ کے صفحات پر جا بجا پائے جاتے ہیں۔ جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا ان پر گہرا اثر تھا اور وہ قومی زندگی کے میدان میں برابر شریک ہوا کرتی تھیں۔

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ عرب جاہلیت' یہود اور نصاریٰ کے اخلاق و کردار میں انتہائی زوال و انحطاط پیدا ہو چکا تھا۔ قرآن کریم نے ازواج نبی کو ان کے گھروں میں ٹھہرے رہنے اور جاہلیت کے سے زیب و آرائش کا مظاہرہ کرنے سے پرہیز اختیار کرنے کا جو حکم دیا تھا اس کی وجہ سے اخلاقی توازن برقرار ہو گیا اور سیرت و کردار کی سطح اونچی ہو گئی کیونکہ ازواج نبی اوروں کے لئے بہترین نمونہ تھیں۔

یہاں ''وان ہیمر'' کا قول درج کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا وہ کہتا ہے:

''پردہ کو اسلام نے ضروری اور عورتوں کو اجنبیوں سے میل جول رکھنے کو جو حرام قرار دیا ہے اس کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ عورتوں سے اعتماد کے جذبہ کو فنا کر دیا جائے بلکہ یہ ایک وسیلہ ہے ان کے ناموس کی حفاظت و احترام کا اور ذریعہ ہے ان کی رسوائی کی روک تھام کا۔ درحقیقت اسلام کی نظر میں عورت کا جو درجہ و مقام ہے وہ یقیناً قابل رشک ہے۔''

ایک منصف مزاج مصنف کے اس زرین قول کو مدنظر رکھ کر ذیل کے اقوال و آراء کا جائزہ لیجئے:

ترترلیان نے اپنی کتاب ''عورت کی تعریف'' میں یہ بیان کیا ہے:

''عورت شیطان کا دروازہ ہے کیونکہ اس نے آدم علیہ السلام کو جو خدا کا ایک مظہر ہیں' ممنوعہ درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دے کر بگاڑ دیا۔''

لوفی کہتا ہے:

''عورت ایک برائی ہے جو ناگزیر ہے' ایک نکہت ہے جس کی طرف دل کھنچے جاتے ہیں' ایک بلائے ناگہانی ہے جس سے راہ گریز نہیں' ایک بجلی ہے کوندتی ہوئی اور ایک بیماری ہے مہلک اور لاعلاج۔ اتھوڈ کلیسا کے حکام نے یہ فیصلہ

صادر کیا کہ عورت جماعت میں اپنے حق سے محروم رکھی جائے۔ چنانچہ اس کو محفلوں اور تقریبوں میں شریک ہونے سے ممنوع قرار دیا گیا۔ عورتیں چپ چاپ پردہ اوڑھے رہیں۔ ان کا کام محض یہ ہے وہ اپنے شوہروں کی اطاعت وفرماں برداری کریں اور چرخہ کاتنے' کپڑا بننے اور چکی پیسنے کے کام انجام دیتی رہیں۔ جب وہ اپنے گھروں سے باہر نکلیں تو اپنے بدن کو سر سے پاؤں تک ڈھانکے رکھیں۔"

یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ جاہلیت عرب میں عورت کو جو آزادی حاصل تھی وہ مقابلہ یونان کے بہت زیادہ تھی اسی کے بارے میں بائرن کہتا ہے:

"عورتیں جاہلیت میں مردہ دل اور مجبور نہیں تھیں' وہ میدان جنگ میں جنگجو شخص کی امداد کیا کرتیں اور ان میں حمیت وجواں مردی کے جذبات بیدار کیا کرتی تھیں۔ بہادر اور شہ سوار میدان جنگ میں اترتے تھے تو اپنی بہنوں' بیویوں اور اپنی معشوقوں کے گیت گایا کرتے تھے ان کے لیے یہی قابل تحسین وآفریں تھا کہ ان کی معشوقات ان کی بہادری کے کارناموں کو حیرت واستعجاب کی نظر سے دیکھیں۔ اس کے لیے ہر بہادر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ جس طرح اخلاق وشجاعت مردکی بلند ترین خوبیوں میں شمار ہوتے تھے' اسی طرح عفت اور پاکدامنی عورت کا خوبصورت اور دلفریب زیور تھا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ عورت کی توہین کسی غیر قبیلہ والے نے کر دی تو عرب کے ریگستانوں میں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور خون کی بارش ہونے لگی۔"

عربوں کی طبیعت میں غیرت وحمیت کا جذبہ غالب تھا جس کی وجہ سے وہ عورت کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ چنانچہ اسلام نے بھی ان کے اس عظیم الشان کردار کو اجاگر کیا اور ایسے احکام پیش کیے جنہوں نے عورت کے احترام اور اس کے مرتبہ کو دوبالا اور اس کی قدر ومنزلت کو دو چند بلند کر دیا۔ مسلمانوں کے اندر کمزوروں کی دست گیری' مظلوم کی دادخواہی اور انسانیت کی آواز پر لبیک کہنے کے جذبات پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے۔ یہ کردار

شامیانوں سے عالی شان محلوں تک سرایت کر گئے۔

کیا مورخین کی یہ روایت ہم نے نہیں پڑھی کہ عبدالملک بن مروان اپنے دسترخوان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے خبر پہنچی کہ ایک عرب دوشیزہ شکوہ کر رہی ہے کہ وہ رومانیوں کے پاس قید ہے اور کہہ رہی ہے:

"اے عبدالملک!"

خلیفہ نے یہ سن کر قسم کھائی کہ جب تک اس دوشیزہ کو اس قید و بند سے رہائی نہ دلائے گا اس وقت تک زندگی کی لذتوں کے نزدیک نہ جائے گا اور اس نے اپنی اس قسم کو پورا کر دکھایا۔

اسلام کی پہلی صدیوں میں مشرق میں عربوں کی حکومت کے زوال تک عورت کی بڑی قدر و منزلت تھی' عربی عورت کا مقام اور اس کا درجہ آج کل کی مغربی حکومتوں میں عورت کے مقام و درجہ سے کہیں زیادہ بلند و بالا تھا جس کے بعض شواہد و آثار یہ ہیں:

1: ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ اپنے عہد میں اپنے جلیل القدر کارناموں' بلند اخلاق اور بے شمار خوبیوں کی بدولت مشہور ہے۔

2: سیدہ سکینہ بنت حسین اپنی ہمسروں میں درنایاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی شان میں بائرن کہتا ہے کہ وہ اپنے عہد کی سردار تھی۔ کیونکہ وہ حسن و جمال میں یکتا ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاق و کردار میں بھی بے مثال تھی۔ طلب علم کا ان کو بے حد شوق تھا۔ علماء و صالحین کی صحبت میں بیٹھنے کا ان کو شرف حاصل تھا۔ اس کے ساتھ آپ نے اکثر علوم و فنون میں حصہ لیا ہے۔

3: شہدہ جو فخر النساء کے لقب سے مشہور ہے' پانچویں صدی ہجری میں جامع بغداد میں جمہور کو ادب اور تاریخ کا درس دیا کرتی تھی۔ ان کے حلقۂ درس میں اہل فضل و عرفان کا ایک جم غفیر شریک ہوا کرتا تھا۔ تاریخ اسلام میں ان کی وہی قدر و منزلت ہے جو بڑے بڑے علماء کو حاصل ہے۔ اگر یہی شہدہ یورپ میں اسلامی تمدن و ثقافت کی خوشہ چینی سے پیشتر نمودار ہوتیں تو وہ اس کو نذر آتش اس لئے کر دیتے کہ وہ جادوگر ہے۔

کیا ان تمام دلائل و شواہد کے بعد بعض مستشرقین دین اسلامی اور نبی عربی صلی اللہ علیہ

وسلم پر کوئی بہتان باندھنے کی جرأت کر سکتے ہیں؟ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح قول ہے:

"مازال جبریل یوصینی بالنساء حتی ظننت انه سیحرم طلاقھن"

"جبریل مجھے ہمیشہ عورتوں کی خیر خواہی کی وصیت کرتے رہے یہاں تک کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ وہ ان کی طلاق کو بھی حرام کر دیں گے۔"

یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ مغربی عورت انیس سو سال بعد اس مقام پر پہنچی جس میں اس نے اپنے احترام وشرف کا حصہ پایا' لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس نے وہ شرعی ومذہبی رتبہ حاصل کیا جو اسلامی عورت کو ملا تھا؟ ہرگز نہیں۔ مسلمان عورت کو وہ حقوق ومراعات دی گئیں جن سے اس کی وہ بہن محروم ہے جو اپنے قومی تمدن وثقافت پر فریفتہ وشیدا ہے۔

اتنا ہی کافی ہے کہ اسلام نے لڑکی کو جب تک وہ غیر عاقلہ ہے اور سن بلوغ کو نہیں پہنچی ہے' اس کے ماں باپ اس کے سرپرستوں کے زیر نگرانی وکفالت رکھا ہے۔ جونہی وہ سن بلوغ تک پہنچ گئی' اس کو وہ تمام حقوق سپرد کر دیئے جاتے ہیں جن سے وہ شخصی طور پر آزادی کے ساتھ اوروں سے بے نیاز ہو کر بہرہ ور ہو سکتی ہے۔ نیز اسلام نے اس کے والدین کی میراث کا اس کو حق دار ٹھہرایا ہے۔ نیز یہ کہ اس کے بالغ ہونے کے بعد کوئی شخص بغیر اس کے رضامندی کے اس سے شادی نہیں کر سکتا۔ جب وہ بیاہی جائے تو وہ انسانی جماعت میں ایک مستقل رکن ہونے کی حیثیت سے اپنی شخصیت نہیں کھو بیٹھتی۔ نیز اسلام نے شوہر پر بیوی کے تمام کاموں کے انتظام کو (جیسا کہ وہ اس کی خواہش کرے) انجام دینے کو ضروری قرار دیا۔ شریعت نے بیوی کے اموال اور اس کی آمدنی میں اس کی اجازت کے بغیر مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دی۔ عورت کو یہ حق عطا کیا کہ وہ اپنے شوہر یا اپنے باپ یا اپنے بھائی جس سے چاہے امداد طلب کر سکتی ہے۔ ماں ہونے کے اعتبار سے اس پر چند مقررہ حقوق ہیں۔

ان تمام مذکورہ بالا بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ شریعت اسلامیہ نے عورت کو وہ مقام اور رتبہ عطا کیا جو مغربی عورت سے کئی گنا بہتر اور بڑھ چڑھ کر ہے۔ اب مغربی عورت کے

مقابلہ میں مسلمان عورت کی پستی وانحطاط کا سبب محض یہ ہے کہ اسلامی جماعتوں کے درمیان علوم و معارف کی نشرو اشاعت بہت کم ہے' حالانکہ اسلام اس امر کا متقاضی ہے کہ علم جس قدر پختہ' گہرا اور وسیع ہوگا اتنا ہی اسلامی اصول اور اس کے احکام اجاگر ہوں گے اور مسلمان صحیح معنوں میں اس پر عمل درآمد کریں گے۔

کیا پردہ عورت کے لیے ضروری ہے؟:

گزشتہ صفحات میں ہم نے عورت کی ماہیت اور اس کے کمال کو بیان کر دیا اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ عورتوں کو یہ کمال مردوں ہی کے ماتحت رہنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اب اس جگہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ عورتوں کے استقلال اور ان کی صحیح حریت و سعادت کے لیے پردہ نہایت ضروری ہے۔ اگر چہ عورتیں موجودہ وقت میں کچھ دنوں کے لیے بے پردہ ہوگئی ہیں اور مرد و عورت خوش خوش نظر آ رہے ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ یہ حالت طویل زمانہ تک باقی نہیں رہ سکتی' کیونکہ عورت کی یہ حالت فطرت انسانی پر منطبق نہیں ہے۔ فی الوقت اگر چہ مردوں کی غیرت کو مدنیت کی بعض شلوں اور لہو واجب کے مظاہر نے کچھ دنوں کے لے مدفون کر دیا ہے' لیکن ہمیشہ کے لیے وہ فوت نہیں ہو سکتی' ایک روز آئے گا کہ یہ غیرت ابھر پڑے گی اور پھر عورتیں نہایت سختی کے ساتھ قید کی جائیں گی۔

میری یہ تحریر ان حضرات کے نزدیک جنہوں نے انسان اور انسانیت کی مجموعی حالتوں کا مطالعہ نہیں کیا ہے ایک خیالی اور شعری معلوم ہوگی' لیکن صاحب عقل و ہوش کے نزدیک یقیناً یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ ہماری اس تحریر پر تاریخی شہادت موجود ہے۔ چنانچہ بطور مثال ہم رومی سلطنت کو پیش کرتے ہیں جس سے یورپ کی تمام سلطنتیں پیدا ہوئی ہیں۔

آٹھویں صدی قبل مسیح میں رومی سلطنت ایک چھوٹے پیمانہ پر قائم ہوئی' لیکن آہستہ آہستہ مرور زمانہ کے ساتھ بڑھتی اور ترقی کرتی گئی' یہاں تک کہ لوگ زبردست مدنیت کے مالک ہو گئے۔ اس سلطنت میں تمام عورتیں پردہ کے اندر رہا کرتی تھیں اور اپنی حیات منزلی کی تدبیر میں مصروف تھیں' پردہ یہاں تک ترقی کر گیا کہ دایہ بھی اپنے مکان سے بالکل سر سے پیر تک مخفی ہو کر نکلتی تھی۔ اس دور پردگی میں رومیوں نے ہر چیز میں حیرت انگیز ترقی کی' بڑے بڑے مجسمے بنائے' عالی شان مکانات اور محل وغیرہ تیار کیے اور بڑی بڑی وسیع سلطنتوں

کو فتح کیا۔ اکثر قومیں ان کی غلامی میں زندگی بسر کرتی تھیں۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ لہو ولعب کی طرف میلان ہوا یہاں تک کہ عورتوں کو بھی پردے سے باہر نکالا گیا تا کہ مجلس طرب میں شریک ہوں اور مجلس کی زیب وزینت کو ترقی دیں۔ عورتیں پردہ سے باہر نکلیں تو اس طرح نکلیں کہ مردوں پر غالب آ گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں کی عفت وعصمت' اخلاق وطہارت سب ان کے نزدیک بے معنی الفاظ تھے اور وہ محض مردوں کی شہوات حیوانی کا آلۂ کار بھی جانے لگیں۔ تھیٹروں میں شریک ہوتی تھیں' محفلوں اور مجلسوں میں گاتی اور ناچتی تھیں۔ غرض اس طرح مردوں پر غالب ہوتیں کہ افراد حکومت کے عزل وتقرر میں بھی ان کی آوازوں کی قدر وقیمت تھی لیکن افسوس! رومی سلطنت کی اس حالت پر تھوڑا زمانہ بھی نہ گزرا کہ مصائب وآلام کی پیہم بارشیں ہونے لگیں اور تاریخ کا مطالعہ کرنے والا شخص حیرت زدہ ہو جاتا ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ سلطنت روما کی وسیع اور بلند عمارتوں کے پتھروں کو انہی عورتوں کے نازک ہاتھوں نے ہلا ڈالا اور ایک ایک کر کے پھینک دیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ عورتوں کی فطرت میں فساد داخل ہے' بلکہ مردوں نے ان کو فتنہ میں ڈال دیا اور خود بھی ان کے ساتھ فتنوں میں شامل ہو گئے۔ یہ ایک سیاسی حقیقت ہے جس میں مباحثہ ومجادلہ کی گنجائش نہیں۔

علامہ لوبز برول کہتا ہے:

"سیاسی فسادات ہر زمانے میں موجود ہوئے ہیں' لیکن یہ بات کس قدر حیرت انگیز ہے کہ اس فساد کے جو اسباب گزشتہ زمانے میں ہوئے ہیں بعینہٖ وہی موجودہ زمانے میں بھی ہیں' یعنی عالم کے ہر دور میں اخلاق فاضلہ کی بنیادوں کے منہدم کرنے میں سب سے زبردست سبب عورت کا وجود ہوا ہے۔"

اس عمرانی مصنف کے شایان شان تھا کہ وہ اس بگاڑ کے بہتان کو عورت کے سر چسپاں نہ کرتا' کیونکہ مرد ہی نے عورت کو محض اپنے میلانات وخواہشات کے لیے بگاڑ کا ذریعہ بنایا۔ پھر وہی مصنف موجودہ تمدن کی خطرناک علامتوں اور جمہوریہ رومان کے عہد کے حالات کے مابین موازنہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

"جمہوریہ رومان کے آخری عہد میں ارباب سیاست ان کمینہ عورتوں کی

صحبتوں میں زندگی بسر کرنے لگے تھے جن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ
آج کل وہی حال ہے جیسا کہ اس دور میں ہوگیا تھا۔ تم دیکھو گے کہ لوگ
خواہشات نفسانی اور لذات جسمانی کے پیچھے جنون کی حد تک پڑ گئے ہیں۔"

رومانی قوم کو (جو مجد و شرف کی دلدادہ تھی) وہ کیا واقعہ پیش آیا جس نے ان کی سابقہ تاریخ کو حرف غلط کی طرح مٹا ڈالا۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی آنکھوں کے روبرو اپنی عزت و شان کی بنیادیں اکھڑتی ہوئی دیکھیں مگر ان کے دل میں ذرا بھی غیرت و حمیت کا جذبہ نہ ابھرا۔ بھلا یہ کب تصور میں آنے والی بات تھی کہ رومانی قوم' جو اپنی عظمت و حکومت کے زمانے میں عورتوں کے پردہ میں غلو پسند واقع ہوئی تھی اس کے بعد ان کو اجازت دے ڈالے کہ وہ مرادن سیاست پر غالب ہو جائیں اور عزل و تقرر کی باگ جس وقت چاہیں ڈھیلی کر دیں؟ اس قدر تیزی کے ساتھ یہ عجیب و غریب انقلاب کیا تھا؟ کیا ان دونوں حالتوں میں طبعی تدریجی رفتار نہیں پائی جاتی؟ بے شک وہی نسوانی فساد و انتشار فطری اصول کے مطابق نشو و نما پایا' ابتدا حقیر مقدار میں شروع ہوا پھر وہ جسم میں ناگہاں مہلک مرض کی شکل میں نمودار ہوگیا۔ انیسویں صدی کا دائرۃ المعارف کہتا ہے:

"عورتوں کی زیب و زینت کے لیے یہ جنونی عشق شہنشاہیت کے عہد ہی میں رواج پایا، لیکن جمہوریت کے ابتدائی زمانے میں عورت اپنے گھر ہی میں رہا کرتی اور اس میں چرخہ کاتا کرتی تھی' لیکن فساد اور بگاڑ روم میں رفتہ رفتہ سرایت کرتا گیا یہاں تک کہ کاتون نے آنے والے سیلاب شر و فساد کے خطرہ سے آگاہ کیا' اس کے چند دنوں کے بعد فسق و فجور اور شر و فساد کی انتہا نہ رہی۔"

کاتون نے اپنی قوم کے روبرو کیا کہا؟ پردہ کو چھوڑ دینے کے خطرہ سے کس طرح ڈرایا اور اس کی پیش گوئی کس قدر درست نکلی؟ یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جن پر ہم یہاں ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں۔

رومانیہ میں اس قانون کی تنسیخ کے لیے جس میں عورتوں کی بے جا آرائش و زینت کی حد بندی کی گئی تھی' جب بغاوت و انقلاب کے آثار نمایاں ہونے لگے تو کاتون نے (جو دوسری صدی قبل مسیح میں جمہور روما کے نزدیک فلسفہ و حکمت میں مشہور تھا) اس انقلاب

کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور کہا:

''اے اہل روما! کیا تمہیں یہ وہم وگمان ہے کہ جب تم ان کے ان روابط وتقیدات کو توڑنے پر قابو پاؤ گے جوان کے استقلال کو محفوظ کرتے اوران کو اپنے شوہروں کی اطاعت گزار بناتے ہیں تو عورت کی رضامندی تمہارے لئے آسان ہو جائے گی؟ کیا موجودہ قیود وشروط کے ہوتے ہوئے ہمارے لیے یہ دشوار نہیں ہو گیا ہے کہ وہ اپنے فرائض وواجبات کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہی ہیں؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ قریب میں ہمارے دوش بدوش ہو جائیں گی اور ہمیں اپنے غلبہ واقتدار میں کر لیں گی؟ وہ کس دلیل وحجت کی وجہ سے اپنا اجتماعی انقلاب برپا کر رہی ہیں۔؟

ان میں سے ایک لڑکی نے جواب دیا:

''ہم یہ چاہتی ہیں کہ سونے اور چاندی میں جگمگائیں' ریشمی پوشاکوں میں لہرائیں' شہر کی سڑکوں پر تہواروں کے دن اور دوسرے دنوں میں چلیں پھریں' شاندار سواریوں میں سوار ہوا کریں تاکہ ہم منسوخہ قانون پر اپنی فتح وکامرانی کا مظاہرہ کریں اور آزادی کے ساتھ ہم تمہیں انتخاب کر کے بہرہ ور ہوں نیز ہماری یہ بھی خواہش ہے کہ تم ہماری نقل وحرکت کے لیے کوئی حد مقرر نہ کرو۔''

کاتون نے کہا:

''پس اے اہل روما! تم نے میرے وہ اکثر وبیشتر شکورے سن لئے جو میں نے تمہارے روبرو مردوں اور عورتوں کی بے جا زیادتیوں کے متعلق پیش کیے۔ یہ بھی تم نے سن لیا کہ جمہور دو متضاد بیماریوں افراط وتفریط کے مابین گرفتار ہیں۔ یہ ایسی بیماریاں ہیں جنہوں نے بڑی بڑی سلطنتوں کے تخت الٹ دیئے۔''

انیسویں صدی کا دائرۃ المعارف مذکورہ بالا بیان درج کرنے کے بعد کہتا ہے کہ کاتون کو اس قانون کی مدافعت میں کامیابی نصیب نہ ہوئی لیکن اس کی تمام پیش گوئیاں پوری ہوئیں۔ پھر اس کے بعد کہتا ہے:

''ہماری موجودہ اجتماعی ہیئت میں جس میں عورتیں اپنی بے جا آزادی سے

بہرہ یاب ہو رہی ہیں' ہم ان کے اندر اونیٰ درجہ کا ذوق اور میلان پاتے ہیں جو ان کو ہمیشہ اپنی آرائش جمال اور لوازمات حسن کی افزائش میں مشغول ہونے پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ تمام نہایت خطرناک علامات ہیں جیسا کہ روما اس سے پہلے ان میں گھر چکا ہے۔''

اس داستان کو چھوڑیئے! اب ایک قدم آگے بڑھ کر دیکھئے کہ کہ رومانیہ کی تہذیب میں بگاڑ اور ملک میں فساد وخلل پیدا ہونے کے بعد کیا حالت ہوئی؟ کیا عورتیں سونا اور چاندی میں جگمگا اٹھیں؟ نرم ومہین پوشاکوں میں لہرائیں' سڑکوں پر ان کی صبح وشام آمدورفت کا منظر رہا' شاندار سواریوں میں سیر کرتی رہیں' جیسا کہ سلطنت رومانیہ کے عظمت آفرین دور میں ان کی شان تھی؟ ہرگز نہیں، بلکہ ہم نے دیکھ لیا کہ لوگوں نے عورتوں کے حقوق کو ہضم کرلیا اور ان کو ان کے درجہ سے گرادیا' یہاں تک کہ ان کے لئے گوشت کھانا اور ہنسنا بولنا حرام قرار دے دیا' اسی پر اکتفانہ کیا بلکہ ان کے منہ میں بھاری مضبوط تالے ڈال دیئے جن کا نام انہوں نے موزلیبر رکھا تھا۔ حالت اس سے بھی نازک اور بدتر ہوگئی یہاں تک کہ ساتویں صدی عیسوی میں روما کی ایک مجلس میں جس میں بڑے بڑے لوگ جمع تھے یہ مسئلہ پیش کیا گیا کہ کیا عورت کے لیے روح ہے۔؟

الغرض عورت کو ایسے مظالم وآفات میں گھیرا گیا جن کو سننے سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں' ان حوادث وواقعات میں غور کرنے والا حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور خود سے سوال کرتا ہے کہ کل تک جو عورتیں خوشحال اور مردوں پر اپنی آزادی وغلبہ کی وجہ سے خوش خوش تھیں' وہ آج کس طرح ظلم وستم کا تختہ مشق بن کر رہ گئی ہیں اور کیوں کر ان کی حالت جانوروں سے بھی بدتر ہوگئی؟ اس قدر سریع انقلاب وتغیر کا سبب کیا ہے؟ وہ کیا راز ہے جس نے عورت کی گزشتہ آزادی کو چھین کر غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا اور اس کو وحشت وبربریت کے درجہ تک پہنچادیا۔؟

یہ تمام سوالات وہ ہیں جن کو تاریخ کا پڑھنے والا اپنے دل میں پاتا ہے اور اسی وقت ان کی گہرائی اور تہہ تک پہنچ سکتا ہے جب کہ وہ ان کو نفسیاتی وعمرانی اصولوں کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھے۔ ہم ان کا نچوڑ چند الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

جب روما کی سلطنت وسیع ہوئی' اہل روما نے دیگر قوموں پر تسلط اور برتری حاصل کر لی' جب انہوں نے روئے زمین پر کوئی مناظر باقی نہ چھوڑے تو ان کے اندر عیش پرستی اور عشرت پسندی کی محبت جاگزیں ہوگئی۔ یہ دونوں چیزیں دونوں جنسوں کے باہمی میل جول ہی سے پوری ہوتی تھیں۔ مزید برآں یونانی ملحدوں اور ان کے رومانیہ کے مقلدوں کی تعلیمات نے ان کے دل و دماغ پر سونے پر سہاگہ کا کام دیا' چنانچہ انہوں نے ان کی عورتوں کو پردہ سے باہر قدم نکالنے کی اجازت دے دی۔ اس میں رفتہ رفتہ یہاں تک ترقی ہوئی کہ عورتیں سیاسی امور پر غالب ہوگئیں۔ اس اختلاط میں ایسی آرائشیں گھل مل گئیں جن کے ذکر سے قلم شرمسار ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی ہمتیں مر گئیں' ان کے عزائم فنا اور ان کے دل مردہ ہو گئے۔ وہ باہم جنگ و جدال اور خوں ریزی میں پڑ گئے۔ فساد بڑھتا ہی گیا اور اس دوران میں نہایت تلخ ناک نتائج و حوادث رونما ہوئے۔ لوگوں کے دلوں میں یہ بات گھر کر گئی کہ اس شر و فساد کا سبب عورتیں ہیں۔ اس بناء پر رفتہ رفتہ ان کے خلاف کینہ و عداوت کی چنگاریاں سلگنے لگیں' دلوں میں کدورت روز بروز بڑھنے لگی' یہاں تک کہ بات اس نوبت پر پہنچ گئی جس کو ہم نے اوپر قرون وسطی سے سترھویں صدی کی انتہا اور انیسویں صدی کی ابتدا تک کے حالات میں بیان کر دیا ہے۔ آج ہم یورپ میں دیکھ رہے ہیں کہ وہاں کے لوگ جو روزانہ عورتوں کے فتنہ و فساد کو بڑھانے والے اسباب کا اختراع کرتے' ان کی طہارت و عفت پر حملہ کرنے اور ان کو اگلوں کی طرح گمراہی و تباہی کے غار میں دھکیلنے کے لیے مختلف وسائل و ذرائع ایجاد کرتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ بعینہ رومانیہ کے دور کا اپنے ملک میں اعادہ کریں۔ اس کا اندازہ ان کے عقلاء و مفکرین نے بخوبی لگا لیا ہے جیسا کہ ہم نے اوپر ان کے آراء و خیالات کا تھوڑا سا خاکہ کھینچا ہے۔

ایسے پر آشوب و پرفتن دور میں اور تہذیب و تمدن کے جاذب نظر مظاہر میں جب کہ عورت مرد کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی ہے' مسلمان عورت کا پردہ نشین ہونا ہی اس کی عصمت و عفت کا کفیل ہے۔ اسلام نے اس کے لیے ایسے حکیمانہ قوانین پیش کیے ہیں جو دلوں میں سرایت کر چکے ہیں۔ ان میں تبدیلی اسی وقت ممکن ہے جب کہ وہ بالکلیہ دین اسلام ہی کو بدل دیں حالانکہ ایسا ناممکن ہے۔ کیا یہ مشاہدہ نہیں ہے کہ مسلمان عورت تیرہ

سو سال سے ان حادثات وانقلابات سے محفوظ ہے' جن سے دنیا کی دیگر عورتوں کو دوچار ہونا پڑا ہے؟ پردہ کی نعمت سے بڑھ کر اور کون سی چیز ہو سکتی ہے جب کہ وہ عورت کو مرد کے ہاتھ کا کھلونا بننے سے مانع اور اس کی خواہشات کا نشان بننے میں رکاوٹ ڈالنے کا بہترین آلہ ہے۔؟

مصنف ''خاتون جدید'' کہتا ہے کہ یورپ میں کئی ایسی جماعتیں ہیں جو بھاری مطالبات طلب کر رہی ہیں اس کے باوجود کسی کے دل میں یہ بات نہیں گزرتی کہ وہ عورتوں کے پردہ کا مطالبہ کرے بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے' کیونکہ ارباب مذاہب میں سے جدت پسند افراد وسیع پیمانہ پر عورت کی آزادی اور اس کے حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں تا کہ وہ مرد کے مساوی ہو جائے۔ یہ لوگ معتدل مسالک رکھنے والوں کے ساتھ اس معاملہ میں متفق ہیں' اس اتفاق وہم آہنگی کا راز اور اس کا سبب کیا ہے؟ مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ فلسفۂ عصر حاضر کا موسس اگسٹ کانٹ اور تمام فلاسفۂ وقت جو فلسفۂ حسی کے علمبردار ہیں' یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ عورت نے اس ظاہر فریب اور باطل آزادی سے نہ صرف ایک بڑا حصہ حاصل کیا' بلکہ وہ فطری سرحدوں سے باہر نکل گئی ہے۔ گزشتہ بیان میں ان مفکرین کے اقوال ثبوت میں پیش کر دیئے گئے ہیں۔

ہم پردہ کو اس لئے پسند نہیں کرتے کہ وہ ان کی عفت کا سامان ہے۔ اس مقصد کے لیے تو پردہ کا مطالبہ نہیں ہے۔ بلکہ ہم اس کو محض اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ ایک مضبوط پناہ گاہ ہے۔ جس میں عورتیں مردوں کے فاسد ارادوں اور ان کے گمراہ کن حملوں سے محفوظ اور بے خوف رہ سکتی ہیں' کیونکہ ان کو اعتماد ہے کہ ان کی جسمانی ترکیب وساخت میں کوئی ایسی چیز نہیں کہ وہ کسی دن یا روزانہ بھی پردۂ عصمت کو چاک کر ڈالیں تو سر بازار رسوا ہو جائیں۔ اسی لیے ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ ہر حیلہ وتدبیر اور ہر وسیلہ سے عورتوں کو ورغلانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ دنیا کے حوادث کا استقراء کرنے سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مرد ہی عورت کے اغواء کا سبب ہے۔ یہاں تک کہ ''جریدۂ المعظم'' جس نے پردہ کی عمرانی پہلو سے مذمت کی ہے' 8 فروری 1501 کے پرچہ میں اس صریح حقیقت کی شہادت دیتے ہوئے کہتا ہے:

"ہر نظام جماعت کی تاریخ گواہ ہے کہ مرد ہی دامن عفت کو چاک کرنے والا اور عورت ہی اپنی عفت و عصمت کی مدافعت کرنے والی ہے۔"

عورت کی ترقی اور پردہ: انسانی زندگی کے ہر دور میں ہم دیکھتے آئے ہیں کہ وہ جب کسی چیز سے محبت کرنے لگتا ہے تو اس کے حسن و جمال پر ہزاروں دلیلیں پیش کر دیتا ہے اور جب وہ کسی سے نفرت کرنے لگتا ہے تو اس کے قبح و فساد پر دنیا بھر کی براہانوں کو لا کھڑا کر دیتا ہے۔ اگر وجود کے درمیان کوئی شاہد عادل آڑ نہ ہوتا تو حقائق وواقعات اس دنیا میں انسان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے۔ انسان ہر چیز کی بہ نسبت بے حد جدال پسند اور جھگڑالو واقع ہوا ہے۔

مصنف "خاتون جدید" کہتا ہے:

"پردہ کا نقصان یہ ہے کہ وہ عورت کو اس کی فطری آزادی سے محروم کر دیتا' اس کو اس کی نشوونما اور تربیت کی تکمیل کرنے سے روک دیتا اور بوقت ضرورت اس کے کسب معاش میں حائل ہو جاتا ہے' نیز اس سے میاں بیوی عقلی وادبی زندگی کی لذت سے بے بہرہ ہو جاتے ہیں۔ ان ماؤں کا وجود اس کو راس نہیں آتا جو اپنی اولاد کی تربیت پر قدرت رکھتی ہیں۔ پردہ کی وجہ سے قوم ایک ایسے انسان کی طرح ہو جاتی ہے' جس کا ایک بازو مفلوج ہو گیا ہو۔"

سابقہ حسی براہانوں اور دلیلوں کی روشنی میں پردے کے فائدے یہ ہیں کہ وہ عورت کو اس کی حقیقی آزادی عطا کرتا ہے' عورت کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ آزادی کیا ہے۔ پردہ سے عورت اپنے آپ کو تربیت مادری کے لیے آراستہ کرنے کی قدرت رکھتی ہے' اس کی وجہ سے وہ مردوں کے ساتھ اشتراک عمل سے باز رہتی ہے۔ اسی کے ذریعے شوہر اور بیوی زندگی کی حقیقی لذت سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں' اسی کی بدولت اپنی اولاد کی تربیت پر قدرت رکھنے والی مائیں صحیح اسلامی تربیت دے سکتی ہیں' اسی کے وسیلہ سے قوم ایک ایسے تندرست انسان کی طرح ہوگی۔ جس کے ظاہری اعضاء بھی ہیں اور باطنی بھی۔

مخالفین پردہ کہتے ہیں کہ پردہ میں درج ذیل تین اہم نقصانات ہیں جو عورت پر نہایت برے اثرات چھوڑتے ہیں:۔

1: پردہ عورت کی صحت کو کمزور کر دیتا ہے، مختلف امراض و آفات کا نشانہ بنا دیتا اور اس کے اعصاب کو مضمحل کر دیتا ہے۔ جب اعصاب کمزور پڑ گئے تو جسمانی قوتوں کا نظام درہم برہم ہو گیا' اس بناء پر پردہ نشین عورت لامحالہ اپنی شہوات و خواہشات کی اسیر ہو جائے گی کیونکہ تندرست اعصاب ہی انسان کے ضبط کے لیے بہترین مددگار ہیں اور ان کے کمزور ہو جانے سے انسان اپنی خواہشات کے ہاتھ میں کھلونا اور شہوات نفسانی کا غلام ہو جاتا ہے۔

2: پردہ منگنی کرنے والی اپنی منگیتر کا چہرہ دیکھنے سے باز رکھتا ہے' یہی بڑا سبب ہے کثرت طلاق اور باہمی مخالفت کا۔

3: پردہ عورت کو تہذیب و شائستگی اور علم و فن حاصل کرنے سے روکتا ہے، نیز وہ تعلیمی گھرانوں میں عورت کو عقلی و ادبی قوتوں کے نشوونما میں اپنے میلانات کی پیروی کرنے سے باز رکھتا ہے۔

ہم مخالفین کے مذکورہ بالا شکوک و شبہات کی اس طرح تردید کرتے ہیں کہ پردہ نشین عورتیں نہ بیمار ہیں اور نہ کمزور اعصاب کی بلکہ وہ مجموعی طور پر بے پردہ عورتوں کے مقابلہ میں زیادہ قوی اور تندرست ہیں۔ اس قضیہ کو ہر مشرقی مجرد نگاہ سے تسلیم کر سکتا ہے۔ مسلمان عورتوں پر چودہ سو سال گزر گئے کہ وہ پردہ نشینی میں اپنی عزت و آبرو کو محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ اگر محض پردہ ان کے اندر کسی قسم کا ضعف و اضمحلال رونما کرتا تو ضروری تھا کہ اس کو مرد اور عورتیں نسلاً بعد نسل موروثی طور پر پاتے' یہاں تک کہ آج مسلمان مرد اور مسلمان عورت کمزوری اور اضمحلال قوت کی ضرب المثل بن جاتے' کیونکہ عضویاتی اصول اسی کے متقاضی ہیں لیکن ہم اس کے برعکس مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پردہ نشین عورتوں کے لڑکے بے پردہ عورتوں کے مردوں سے زیادہ قوی و تندرست ہیں' اس کے علاوہ از روئے صحت مردم شماری سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ مرنے والوں میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اگر پردہ صحت کے لیے مضر ہوتا تو طبعی طور پر مرنے والی عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوتی حالانکہ یہ بات مشاہدہ کے خلاف ہے۔

مخالفین کا یہ قول کہ "پردہ نشین عورتیں اپنی خواہشات کی غلام ہوتی ہیں"، عملی نفسیاتی

نقطہ نظر پر چسپاں نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ امر کسی انسان سے پوشیدہ نہیں کہ شہوتوں کی طرف شدت کا میلان انسان میں صرف اسی وقت پایا جاتا ہے جب کہ وہ محرکات نفسانی میں گرفتار ہو گیا ہو۔ جب بآسانی انسانی عقل اپنے مطلوب تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈھ لیتی ہے تو بے قابو ہو جاتی ہے۔ اب شہوتوں کی جولان گاہ دونوں عورتوں میں سے کون ہیں؟ پردہ نشین یا بے پردہ؟ اپنے شدید موروثی دینی غیرت کے جذبہ کے ساتھ مردوں کے اختلاط سے بالاتر عورت یا ان سے میل جول رکھنے والی۔؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ دوسری قسم کی عورت ہی شہوتوں کی آماجگاہ بن سکتی ہے؟ نفسیاتی اصول اس حقیقت پر بہت بڑے شاہد ہیں۔ یہ تصویر کا ایک رخ ہوا، جبکہ اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ انسان کے لیے جب اپنی خواہشات نفسانی تک پہنچنا آسان ہوتا ہے تو اس کے دل پر اس کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے، کیونکہ اس سے اس کی عقل پر پردہ پڑ جاتا اور غیرت وحمیت کا جذبہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کو مثال کے ذریعہ سمجھانے کی ضرورت نہیں بلکہ ہمارے روبرو اس قسم کی بے شمار مثالیں اور شواہد موجود ہیں جو ہمارے اس دعوی پر بین دلیل ہیں۔

جب یہ ثابت ہو گیا تو پردہ نشین عورت ہی شہوتوں کی طرف بہت کم میلان رکھتی ہے اور دوسروں کی بہ نسبت یقینی طور پر اس کے دل ودماغ میں جذبات فاسدہ کا گزر بہت کم ہوتا ہے۔ اس مسلمہ قضیہ میں بحث وجدل کی کوئی گنجائش نہیں۔

ضعف اعصاب اور اس کی وجہ سے عقلی قوتوں کے نظام میں عدم توازن کی زد سے دیکھا جائے تو میں کہوں گا کہ یہ مشرقی عورتوں کے مقابلہ میں مغربی عورتوں کے نزدیک زیادہ ہے' کیونکہ یہ عصبی کمزوری محض پردہ نشینی اور گوشہ گزینی سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے بے شمار اسباب ہیں جن میں سے غم وہم' فکر وتردد' بے جا زیادتی' فقر وفاقہ اور عشق وہجر وغیرہ ہیں۔ جو شخص طبی رسالہ کی ورق گردانی کرے گا تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ بیماری مغربی عورتوں میں ایک معمولی چیز ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ کسی قوم میں کمزوری اعصاب کے لئے بے شمار علامات ہیں ان میں سب سے اہم کثرت خودکشی ہے۔ چنانچہ لومبروزو اور اس کے علاوہ دیگر محققین جرائم نے ثابت کر دیا ہے کہ انسان اپنی صحیح عقلی قوتوں کے ہوتے ہوئے ہرگز قتل یا خودکشی کے جرم کا ارتکاب نہیں کرتا' چونکہ عقلی قوتوں کی درستگی صحت اعصاب کے

تابع ہے۔ اس لئے کثرت خودکشی ایک ایسی علامت ہوگی جو ہمیں اس امر کی طرف رہبری کر رہی ہے کہ کس دنیا کی عورتیں عصبی کمزوری میں مبتلا ہیں۔

مجلہ مجلات جلد نمبر 11 نے اطالیہ کی سرکاری مردم شماری سے ثابت کیا ہے کہ وہاں 1889ء سے 1899ء تک یعنی دس سال کی مدت میں 569 عورتوں نے خودکشی کر لی۔ عین اسی مدت میں فرانس میں 5869 عورتوں کی خودکشی کے واقعات پیش آئے' ان آثار وشواہد کے پیش نظر کیا اسلامی ممالک میں اس قدر خودکشی کے حادثات کبھی دیکھنے میں آتے ہیں؟ لہٰذا کثرت خودکشی اس امر کی بین حسی دلیل ہے کہ لامحالہ اس کا سبب نفسانی بزدلی اور ضعف اعصاب ہے۔ اس بناء پر اسلامی عورتیں مغربی عورتوں کے بالمقابل قوی الاعصاب ہیں اور ان کی بہ نسبت اپنے نفس پر قابو رکھنے اور خواہشات پر غلبہ پانے کی زیادہ قدرت رکھتی ہیں۔

مخالفین کا یہ قول کہ پردہ منگیتر کو دیکھنے مانع ہے جس کی وجہ سے کثرت طلاق اور گوناں گوں شکایات عورتوں سے متعلق کی جاتی ہیں' صریحاً غلط ہے کیونکہ کثرت طلاق اور مردوں کا عورتوں پر ظلم وستم مسلمانوں ہی کے ساتھ کچھ مخصوص نہیں بلکہ یہ اکثر وبیشتر ہم سے زیادہ متمدن ملکوں اور تہذیب یافتہ طبقات میں بھی پایا جاتا ہے۔

باقی رہا مخالفین کا یہ دعویٰ کہ پردہ عورت کو تہذیب وتعلیم حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے' صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ لڑکی ابتدائی عمر سے لے کر بارہ سال تک مدارس میں جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی عقل کو تہذیب وشائستگی کا ایک پاکیزہ درجہ حاصل کرنے کے لیے یہ پانچ برس کافی ہیں۔ امت کے غیور افراد کے لیے یہ امر مانع نہیں کہ وہ فوقانیہ مدارس ایجاد کریں جن میں تمام معلمات عورتیں ہی ہوں۔ لڑکیاں بغیر نقاب کے اندرون رہیں اور جب مدرسہ سے باہر نکلیں تو اپنے چہرے پر نقاب اوڑھ لیں اور گھر جا کر اتار دیں۔ اگر وہ مدارس فوقانیہ یا اونچے درجے کی تعلیم کے لیے معلمات کے فقدان کا عذر کریں تو یہ بہانہ سازی میں شمار ہوگا کیونکہ کوئی چیز خلوص نیت سے کی جاتی ہے تو اس کے لیے ہمتیں اور عزائم بھی پختہ وبیدار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ایک فضول سی بات ہے کہ ہم کسی کام کو وقت واحد ہی میں شروع کر دیں۔ ہر کام آہستہ آہستہ انجام پاتا ہے' پہلے چھوٹے پیمانے پر کیا جاتا ہے

اور پھر وہی رفتہ رفتہ نشوونما پا کر درجۂ کمال و تمام تک پہنچ جاتا ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا تو یہ کہنا بہت آسان ہے کہ پردہ نہ تو صحت کے لیے ضرر رساں ہے اور نہ اعصاب کو کمزور کرنے والا' بلکہ یہ ایک مادی ڈھال ہے اور اکثر برائیوں اور برے ارادوں کے حملوں کی روک تھام کرتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ ساتھ پردہ پر علم و ادب کے نقش و نگار بھی کر دیئے جائیں تو یہ انسانی سوسائٹی کی بہت سی خرابیوں کو دور کر دے گا جو اس مادی تمدن کے جسم پر ایک مہلک زخم کی صورت میں نمودار ہو رہی ہیں۔

مسلمان عورت کا مقام تاریخ اسلام میں:

یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ قوموں کی ترقی اور ان کے تغیر و تبدل میں عورتوں کا بڑا دخل ہے' اسی لیے مردوں نے ادبی و مادی انقلابات کے پیش نظر جو گزشتہ صدیوں میں رونما ہوئے' رفتہ رفتہ اپنی جنس لطیف اور صنف نازک کے مابین حقوق و مساوات عطا کرنے کا ارادہ کیا۔

سب سے بڑھ کر ادبی و اخلاقی انقلاب عرب قوم کی تاریخ میں ظہور پذیر ہوا' یہ بھی جانتے ہیں کہ عربوں نے جب اوج عظمت تک رسائی حاصل کی اور سیف و قلم کی اقلیموں کے مالک بن گئے تو عورت ان کے نزدیک مرد کے مساوی تھی۔ اس کے لیے وہی مرتبہ و احترام تھا جو مرد کو حاصل تھا' لیکن اس کے بعد ظالم حاکموں کی زیادتی اور غیروں کی مداخلت کی وجہ سے حالات و عادات میں بگاڑ پیدا ہو گیا' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شریف اور آزاد عربی عورت تو زوال پذیر ہو گئی اس کے بجائے ادنیٰ طبقہ کی اور ہلکی طبیعت کی عورتیں جو عربی عنصر سے بیگانہ تھیں آ گئیں۔ مثال کے طور پر بیزنطینی و ایرانی کم مرتبہ عورتیں اور روم و صقالیہ کی لونڈیاں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان کا اثر یہاں تک ہوا کہ خاندانی اور گھریلو زندگی کے نظام میں ابتری پیدا ہو گئی۔ اس کے بعد سے زیب و زینت کا مظاہرہ ہونے لگا' عیش و عشرت کے جراثیم پھیل گئے اور اسراف و تکلفات کی نمائش ہونے لگی۔

پہلے عربی عورت کی بڑی شان و منزلت تھی' شہر میں وہ حکمران تھی تو گھر اور خاندان کی ملکہ۔ جبکہ وہ سیاسی و عدالتی امور میں بھی حصہ لیا کرتی تھی۔

حارث بن عوف کی عورت کو کون نہیں جانتا؟ اس نے دو قبیلوں کے مابین سمجھوتہ کرایا'

حالانکہ ان دونوں نے خوں ریزی اور تباہی و بربادی کی نذر کر لی تھی؟ پھر اس بعد کون ہے جو یہ دیکھ کر حسرت و افسوس نہ کرتا ہو کہ اس زریں دور کے خاتمہ کے بعد سے ایسے حالات رونما ہوئے جو ایتھنز اور اسپارٹا کے واقعات کے مشابہ تھے۔؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات و احکام سے مرد و عورت کی مساوات اور ان کے حقوق کے بارے میں روشنی پڑتی ہے چنانچہ عالم عربی میں چھ سو سال تک مردوں اور عورتوں کے درمیان گاڑھا پردہ نہ تھا' بعض فاضلہ اور عظیم المرتبت خواتین علم و ادب کی مجلسیں اور مناظرہ و مکالمہ کی محفلیں منعقد کیا کرتی اور ادیبوں اور عالموں کے درمیان فیصلہ صادر کیا کرتی تھیں۔ جب بھی جنگ کا سلسلہ چھڑ جاتا تو گھر سے باہر نکل کر مردوں کی ہمتوں کو تیز کرتیں' ان کی غیرت و حمیت کو بھڑکاتیں' زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں اور بہادروں کی ستائش کیا کرتی تھیں۔

مسلمان عورت کی بدولت اسلام نے رفتہ رفتہ کامیابی کی منزل طے کی' سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا پہلی خاتون ہیں' جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتداء نزول وحی کے وقت دلجوئی و تسکین بخشی۔ آپ رضی اللہ عنہا اولین خاتون ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد میں حصہ لیا اور مشورے دیئے اور مال و دولت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت فرمائی۔

اگر مسیحیوں کو سیدہ مریم رضی اللہ عنہا پر فخر ہے تو مسلمان آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر ناز کرتے ہیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تینوں صاحبزادے انتقال کر گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شفقت و محبت کے دھاروں کا رخ سیدہ فاطمہ کی طرف پھیر دیا' ان کو ادب و اخلاق کے زیور سے آراستہ کیا' چنانچہ یہ علم و عرفان اور فضل و شرف کی ایک درخشاں نشانی بن گئیں۔ سولہ سال کی عمر میں علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ان کا عقد ہوا جن سے حسن و حسین رضی اللہ عنہما جیسی فخر روزگار ہستیاں پیدا ہوئیں۔

سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا یہ کارنامہ بہت مشہور ہے کہ آپ گھر کے کام کاج میں کچھ بھی کوتاہی نہ کرتی تھیں۔ جب اس سے فارغ ہوتیں اور اپنے فرائض ادا کر دیتیں

تو صحابہ کو جمع کرتیں اور ان کے روبرو نصیحتوں اور حکمتوں کے موتی نچھاور کرتیں۔ آپ سے اقوال و آثار مروی ہیں۔ جو عورت کے احترام اور اس کی شان و منزلت کو دوبالا کرتے ہیں۔

سیدنا حسین کی صاحبزادی سیدہ سکینہ اپنے زمانے میں علم ادب کی ایک روشن نشانی تھیں۔ ان کا گھر ادیبوں اور عالموں کی زیارت گاہ تھا اور ان کا اثر و رسوخ عورتوں تک سرایت کر گیا تھا۔ وہ لباس' پوشاک نقل و حرکت میں ان ہی کی تقلید کیا کرتی تھیں۔

سیدہ سکینہ کو شعر و ادب اور حکمت و فلسفہ سے گہرا شغف تھا' وہ شاعری پر صحیح تنقید کرنے اور شاعروں پر جود و کرم کرنے میں مشہور ہیں۔

خیروان خلیفہ ابن عباس مہدی سویم کی بیوی ان یگانہ روزگار عربی خواتین میں شمار کی جاتی ہیں جو علم و دانش اور عقل و فراست میں مشہور ہیں۔ محل اور سلطنت میں یہی حکمران تھی' ہر دو جگہ اسی کے اوامر و نواہی نافذ تھے' عقل و شجاعت اور فہم و فراست میں عجوبۂ زمانہ تھی۔ اس کے دروازے پر علماء و شعراء ہاتھ باندھے کھڑے رہا کرتے تھے۔ اسی پاکباز نیک دل خاتون کی بدولت مہدی نے وہ جائیدادیں امویوں کے حوالے کر دیں جن کو عباسیوں نے جرمانہ میں لے لیا تھا۔

زبیدہ ہارون الرشید کی بیوی سے روئے زمین کا کوئی مسلمان ناواقف نہیں ہے۔ یہی وہ خاتون ہے جس نے تشنگان مکہ کی پیاس بجھانے کی خاطر ایک نہر کے ذریعے وادی مکہ کو سیراب کر دیا جو عین زبیدہ کے نام سے مشہور ہے۔ اسی نے اسکندرونہ کو جسے بیزنطیوں نے مسمار کر دیا تھا از سر نو تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ یہ بہترین شعر کہا کرتی تھی اور سیاست اور میدان جنگ میں اپنی صحیح آراء و خیالات کا اظہار کیا کرتی تھی۔

بوران مشہور خلیفہ عباسی مامون کی بیوی کا کوئی ایرانی عورت مقابلہ کرنے سے عاجز ہے۔ یہ مسلم خاتون ہے جس میں ایرانی فہم و فراست اور اسلامی فضیلت و کرامت جمع تھی' ذہن و ذکاء میں مشہور ہے۔ اس نے بغداد میں مدرسے اور شفا خانے قائم کیے۔

قطر الندی معتضد باللہ کی بیوی اور مکتفی کی ماں نامور خواتین اسلام میں بہت مشہور ہے۔ شرعی قوانین اور اصول قضاء سے بہت باخبر تھی۔ اس کے لڑکے کی بلوغت سے پیشتر اسی نے حکومت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا اور بذات خود لوگوں میں فیصلے اور احکام صادر کرتی

تھی۔ اس کے اردگرد بے شمار شاعرات اور شاعروں' ادیبوں اور ادیبات کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔

شجرۃ الدر نجم الدین ایوب کی بیوی نے بذات خود شاہ فرانس سان لوئیس کے ساتھ جنگ کی۔ لوگوں کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہی مصر کی ملکہ ہے۔

جب ہم اندلس کی طرف نگاہ دوڑاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ مسلمان عورت یہاں اوج عظمت پر پہنچ چکی تھی اور قدر و منزلت کی بلند چوٹی تک پہنچ گئی تھی۔ وان کرومر اپنی ایک کتاب میں لکھتا ہے:

"عرب فطرۃ قرطبہ میں عورتوں کا احترام کیا کرتے تھے۔ یہاں سے ہی اہل یورپ نے اپنی بیگمات کا احترام کرنا سیکھا۔"

عبدالرحمٰن الداخل نے اپنے محل کے دروازے پر اپنی بیوی کا شاندار مجسمہ نصب کرایا اور اس کی نیکی اور احسان کی یادگار کے لئے ایک محکم قصر کی تعمیر کرائی۔

سرزمین اندلس میں مسلمان طالبات علم کی تعداد بکثرت تھی' یہ عورتیں قرطبہ' غرناطہ' اشبیلیہ' ملقہ اور مرسیہ وغیرہ کی جامع مسجدوں میں نماز پڑھا کرتی تھیں۔

امیر سلیم شہنشاہ جہانگیر جب اپنے والد سلطان محمد اکبر کی وفات کے بعد تخت سلطنت پر بیٹھا تو اس نے سیدہ مہرالنساء سے شادی کی۔ یہ خاتون عربی اور فارسی زبان میں ماہر اور دونوں زبانوں کی ادبیات پر کافی عبور رکھتی تھی۔ اس کو علم موسیقی میں بھی وسیع معلومات تھیں۔ اس کا شوہر اس کو ازروئے محبت نور محل سے اور عوام نور جہاں سے پکارا کرتے تھے۔

نور جہاں مفید مشورے دیا کرتی' فوج کی تنظیم کرتی اور امیروں اور حاکموں کا استقبال کیا کرتی تھی۔ سلطنت میں بادشاہ اور ملکہ کے نام کا سکہ رائج تھا۔ گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر اپنی سہیلیوں کے ساتھ شکار اور تفریح کو جایا کرتی تھی۔

ایک مرتبہ جہانگیر کسی جنگ کے سلسلہ میں دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تو اس نے فوج کی ہراول بن کر اس کو دشمنوں کے پنجے سے رہائی دلائی۔ اس سے بڑھ کر اس کی نیکیاں مشہور ہیں۔ وہ یتیم بچوں اور بچیوں کی پرورش کرتی' ان کی شادی بیاہ کا انتظام کرتی' مظلوم کی دادخواہی اور مسکینوں کی غم خواری کیا کرتی تھی۔ ہندوستان کا کوئی شہر ایسا نہیں جہاں

اس کا نام نہ لیا جاتا اور اس کا نام نہ رکھا جاتا ہو۔

مورخین کو عربوں کے ارتقائی زینے عورتوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔ عورت کے دور انحطاط میں یہ پیش قدمی موقوف ہو گئی اور حالت ایام جاہلیت کی طرف عود کر گئی۔

اگر مسلمان آج بھی اپنی عظمت دیرینہ کو حاصل کرنا اور اپنی تاریخ کے زریں باب کو پھر درخشاں دیکھنا چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ مسلمان عورت کو وہ مقام اور وہ مرتبہ عطا کریں جو اوائل اسلام میں اس کو حاصل تھا۔

مرد اور عورت میں مساوات حقوق:

جس شخص نے قرآنی تعلیمات اور ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور پھر دیگر مذاہب واقوام کے ایک ایک قانون کو جانچا ہے وہ معلوم کر سکتا ہے کہ مذہب اسلام نے عورتوں کی معاشرت کو کس قدر بلند کر دیا اور مرد و عورت دونوں کے لیے کیسا موزوں درجہ مساوات عطا کیا ہے۔ قرآن مجید نے مساوات حقوق کا بار بار اعلان کیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف"

(سورۂ بقرہ، آیت نمبر: 28)

"عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہیں جیسے مردوں کے حقوق عورتوں پر۔"

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"هن لباس لکم وانتم لباس لهن"

"وہ عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔"

اور جہاں کہیں بھی قرآن پاک میں مرد وعورت کے آپس میں تعلقات ومعاملات کا ذکر ہے وہاں اکثر مردوں ہی کو عورتوں کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کرنے کی ترغیب دی گئی ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

"وعاشروهن بالمعروف"

"عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔"

مرد کو عورت کا مہر ادا کرنے کا حکم دیتا ہے تو بھی نیکی کے ساتھ ادا کرنے کا حکم ہے۔ ارشاد ہے:

"واتوھن اجورھن بالمعروف"

"بھلائی کے ساتھ عورتوں کا مہر ادا کرو۔"

اگر مرد عورت کو طلاق دینا چاہے تو اس کو بھلائی اور نیکی کے ساتھ طلاق دینی چاہیے:

"فامسکوھن بمعروف اور سرحوھن بمعروف ولاتمسکوھن ضرارالتعتدوا"

"تو ان کو بھلائی کے ساتھ رکھو یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دو اور ان کو نقصان پہنچانے کے لیے نہ روکو تا کہ تم زیادتی کرو۔"

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"ولاتضاروھن لتضیقوا علیھن"

"اور تنگ کرنے کی غرض سے ان کو دق نہ کرو۔"

طلاق دینے کے بعد عورت کو دیا ہوا مال مرد کو واپس نہ لینا چاہیے:

"وان اردتم استبدال زوج مکان زوج و آتیتم احداھن قنطارا فلاتاخذوا منہ شیئا اتاخذونہ بھتانا و اثمامبینا و کیف تاخذونہ وقد افضی بعضکم الی بعض واخذن منکم میثاقا غلیظا"

"اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور ان میں سے کسی کو ڈھیروں مال دیا ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو کیا تم اس کو جھوٹا الزام لگا کر اور کھلا گناہ کر کے لینا چاہتے ہو اور تم اس کو کس طرح لیتے ہو حالانکہ تم آپس میں ایک دوسرے سے بے حجاب ہو چکے ہو اور وہ عورتیں تم سے پکا عہد لے چکی ہیں۔"

اگر مرد عورت کو خلوت کے قبل ہی طلاق دے دے تو شریعت اسلامیہ کے مطابق آدھا مہر ادا کرنا واجب ہے، لیکن اس صورت میں بھی مرد کو پورا مہر ادا کرنے کی ترغیب دلائی جاتی

ہے اگرچہ یہ فرض نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"وان تعفوا اقرب للتقوی و لاتنسوا الفضل بینکم"

"اور تم معاف کرو (احق مہر پورا دے دو) تو یہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے اور اپنے درمیان بڑائی کو بھولو۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مختلف نصیحتوں سے مردوں کو عورتوں پر ظلم کرنے سے روکا ہے اور اس صنف نازک کی بڑی دلجوئی کی ہے۔ صحیح مسلم میں ہے:

"الدنیا متاع و خیر متاع الدنیا المراۃ الصالحۃ"

"دنیا متاع ہے اور دنیا کی بہترین متاع نیک بخت عورت ہے۔"

اسی قسم کے دیگر ارشادات سے کتب احادیث بھری پڑی ہیں۔

اب ہم مرد و عورت کے حقوق پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں' تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اسلام نے کہاں تک دونوں کے حقوق میں تناسب قائم رکھا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دیگر مذاہب و اقوام کے قوانین بھی دکھائے جائیں گے تاکہ شریعت اسلامیہ کی فضیلت و برتری کا ایک صحیح اندازہ قائم ہو سکے۔

ظاہر ہے کہ ہر ایک شخص اپنی جان و مال کا آپ مالک ہے' اپنا آپ مختار اور اپنا آپ آقا ہے' ایک دوسرے کا غلام نہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں' اسلام نے یہی اصول عورتوں کے متعلق برتا ہے اور اس کو یہی کرنا چاہئے تھا اور یہی کیا ہے۔ جس طرح اس نے مرد کو خود مختار اور آزاد قرار دیا ہے اسی طرح عورت کو بھی آزاد و خود مختار قرار دیا ہے' لیکن ہندو مذہب کے مطابق عورت خود مختار نہیں۔

"عورت نابالغ ہو یا جوان یا بوڑھی ہو گھر میں کوئی کام خود مختاری سے نہ کرے۔"

(منوسمرتی)

"عورت لڑکپن میں اپنے باپ کے اختیار میں رہے اور جوانی میں اپنے شوہر کے اختیار میں اور بعد وفات شوہر اپنے بیٹوں کے اختیار میں رہے' خود مختار ہو کر کبھی نہ رہے۔"

(منوسمرتی)

یونان و روم میں بھی عورتوں کی حیثیت ایک غلام کی حیثیت سے زیادہ نہ تھی۔

''بایں ہمہ بہ حیثیت مجموعی باعصمت یونانی بیوی کا مرتبہ بہ غایت پست تھا' اس کی زندگی مدت العمر غلامی میں بسر ہوتی تھی' لڑکپن میں اپنے والدین کی' جوانی میں اپنے شوہر کی اور بیوگی میں اپنے فرزندوں کی وراثت ہوتی۔ اس کے مقابلے میں اس کے مرد کے اعزہ کا حق ہمیشہ راجح سمجھا جاتا تھا' طلاق کا حق اسے قانوناً ضرور حاصل تھا' تاہم عملاً وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھی کیونکہ عدالت میں اس کا اظہار کرنا یونانی ناموس وحیا کے منافی تھا۔ البتہ وہ اپنے ساتھ جہیز ضرور لاتی تھی اور اپنی لڑکیوں کو بھی شادی کے وقت جہیز دینا اس کے فرائض میں داخل تھا۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ اتھینا کا قانون یتیم لڑکیوں پر خاص طور سے مہربان تھا' لیکن بس ان دونوں باتوں کے سوا اور کوئی شے حقوق نسواں کی تائید میں نہیں پیش کی جا سکتی' افلاطون نے بے شبہ مرد وعورت کی مساوات کا دعویٰ کیا تھا' لیکن یہ تعلیم محض زبانی تھی عملی زندگی اس سے بالکل غیر متاثر رہی۔''

(تاریخ اخلاق یورپ، جلد دوم، صفحہ نمبر 182)

''عورت کا مرتبہ رومی قانون نے البتہ ایک عرصہ دراز تک نہایت پست رکھا' افسر خاندان کو جو باپ ہوتا یا شوہر' اپنی بیوی بچوں پر پورا اختیار حاصل تھا اور وہ عورت کو جب چاہے گھر سے نکال سکتا تھا' جہیز یا دلہن کے والد کو نذرانہ دینے کی رسم کچھ بھی نہ تھی اور باپ کو اس قدر اختیار حاصل تھا کہ جہاں چاہے اپنی لڑکی کو بیاہ دے' بلکہ بعض دفعہ وہ کی کرائی شادی کو توڑ سکتا تھا' زمانہ مابعد یعنی دور تاریخی میں یہ حق باپ کی طرف سے شوہر کی طرف منتقل ہو گیا اور اب اس کے اختیارات یہاں تک وسیع ہو گئے کہ وہ چاہے تو بیوی تک کو قتل کر سکتا ہے۔ 520 سال تک طلاق کا کسی نے نام بھی نہ سنا۔''

(تاریخ اخلاق یورپ، جلد نمبر 2، صفحہ نمبر 190)

عرب میں سوتیلی مائیں بیٹوں کی وراثت میں آتی تھیں، ان کی محکوم ہو کر رہتی تھیں اور

قاعدہ تھا کہ بیٹا جس سوتیلی ماں پر اپنی چادر ڈال دیتا وہ اس کی بیوی بن جاتی۔ اسلام نے اس طریقہ کو مٹایا اور صریحاً اس کی ممانعت کر دی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"ولا تنکحوا ما نکح آباؤکم من النساء الا ما قد سلف انه کان فاحشة ومقتا وساء سبیلا"

"اور جن عورتوں کو تمہارے باپ دادا اپنے نکاح میں لائیں تم ان کو اپنے نکاح میں نہ لاؤ کیونکہ یہ بری بات ہے اور غضب کا کام ہے اور برا طریقہ ہے۔"

نکاح کے معاملہ میں طرفین کو پوری آزادی دے دینی چاہیے' تاکہ طرفین جس کو چاہیں اپنے لیے انتخاب کر سکیں۔ انتخاب کا اختیار غیر کے ہاتھ میں نہیں دیا جا سکتا' کیونکہ یہ وہ رشتہ ہے جو مرتے دم تک قائم رہنے والا ہے اور جب ایک دوسرے کی دلی خواہش اور پسند کے مطابق نکاح نہ ہو تو ہمیشہ کے لیے زندگی مرد و عورت پر وبال جان بن جاتی ہے' میاں بیوی میں سچی محبت پیدا نہیں ہوتی اور دونوں نااتفاقی اور آئے دن کے جھگڑے اور فسادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے خانگی نظام بگڑ جاتا ہے اور اطمینان کی زندگی نصیب نہیں ہوتی۔ ہندو مذہب نے مرد کو تو عورت کے انتخاب کا اختیار دیا ہے لیکن بیچاری غریب عورت اس اختیار سے محروم ہے:

"باپ جس کے ساتھ شادی کر دے یا باپ کے حکم سے بھائی جس کے ساتھ شادی کر دے اس کی خدمت میں رہے اور بعد وفات شوہر کسی غیر مرد سے صحبت نہ کرے۔"

(منوسمرتی)

یونانیوں اور رومیوں کا قانون بھی قریب قریب یہی تھا' عرب میں اس کے لیے کوئی خاص قانون نہیں تھا' بسا اوقات والی و وارث یا قریبی رشتہ دار نکاح کو روک دیتے تھے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں بہت سے واقعات ایسے پیش آئے ہیں۔ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی ایک بہن تھی جن کو ان کے شوہر نے طلاق دے دی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک دوسرے سے شادی کی' دوسرے شوہر نے بھی طلاق دے دی تو پہلے شوہر نے ان کی بہن سے نکاح کرنا چاہا اور معقل بن یسار کی بہن بھی اس پر راضی تھیں' لیکن حضرت

معقل رضی اللہ عنہ نے اس نکاح کو روک دیا۔ فوراً یہ آیت نازل ہوئی:

"ولا تعضلوھن ان ینکحن ازواجھن"

"عورتوں کو اپنے پہلے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکو۔"

اگر کوئی قریبی رشتہ دار کسی نابالغ بیوہ کا اس کی اجازت کے بغیر کسی مرد سے نکاح کر دیتا تھا تو بالغ ہونے کے بعد عورت کو نکاح کے فسخ کرنے کا اختیار نہیں تھا اور اگر کسی دور کے رشتہ دار نے اس عورت کا نکاح کیا تھا تو اس کو فسخ کا اختیار دیا جاتا تھا۔

مذہب اسلام نے مرد و عورت کو نکاح کے معاملہ میں پوری آزادی دی ہے، کسی والی و وارث کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ عورت کی اجازت کے بغیر کسی مرد سے اس کا نکاح کرے، نکاح کے انعقاد کے لیے مرد و عورت کی رضامندی شرط ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"لاتنکح الایم حتی تستامر ولا تنکح البکر حتی تستاذن قالوا یارسول اللہ و کیف اذنھا قال ان تسکت"

"بیوہ عورت کے حکم کے بغیر اس کا نکاح نہیں کیا جا سکتا اور کنواری لڑکی کی اجازت کے بغیر اس کی شادی نہیں کی جا سکتی۔" لوگوں نے کہا: "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس کی اجازت کیونکر ہوگی۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس کی اجازت یہی ہے کہ وہ خاموش رہ جائے۔"

اگر کبھی عورت کی رضامندی کے بغیر شادی ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نکاح کو توڑ دیا ہے۔ چنانچہ خذام انصاری نے اپنی لڑکی خنساء کا اس کی اجازت کے بغیر نکاح کر دیا تھا، خنساء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور واقعہ بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نکاح کو باطل قرار دے دیا۔

نکاح ہونے سے پہلے مرد و عورت کو حکم ہے کہ ایک دوسرے کو ایک دفعہ دیکھ لیں تاکہ آئندہ انہیں دھوکا نہ ہو۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص اس کے مقابلہ میں "کورٹ شپ" کی رسم کو پیش کر کے کہے کہ اسلامی قانون سے بہتر کورٹ شپ کی رسم ہے کیونکہ موخر الذکر صورت میں مرد و عورت کو کافی وقت ملتا ہے کہ ایک دوسرے کے اخلاق و عادات کو اچھی طرح سے

جانچ لیں لیکن یہ صرف دھا کا ہی دھوکا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ خواہشات نفسانی کا بندہ ہمیشہ اپنا مقصد و مطلوب حاصل ہونے تک ہی غیروں سے نہایت محبت اور حسن اخلاق سے پیش آتا ہے اور جب اپنا کام نکل جاتا ہے تو وہ حسن اخلاق وغیرہ کو بالائے طاق اٹھا کر رکھ دیتا ہے۔ اس صورت میں اگر مرد عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اس کے اخلاق بگڑے ہوئے ہیں تو شادی ہونے تک ہمیشہ عورت کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آئے گا۔ ایک بدسیرت عورت بھی اگر مرد کو اپنے دام گیسو میں پھانس لینا چاہتی ہے تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے تک مرد کو خوش رکھنے کی کوشش کرے گی اور نرمی و محبت اور حسن اخلاق سے پیش آئے گی۔ ایسی حالت میں دونوں کی سیرت کا کہاں پتہ چلے گا؟ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ بدسیرت سے بدسیرت مرد و عورت کے درمیان بھی شادی ہوتے ہی نا اتفاقی نہیں واقع ہوتی بلکہ ایک مدت کے بعد جب کہ دونوں کے شہوانی جذبات سرد پڑ جاتے ہیں تو ناچاقی واقع ہوتی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ سیرت کا اندازہ کرنے کے لئے ہر ایک کی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالی جائے کیونکہ گزشتہ زندگی ان کی سچی سیرت کا آئینہ ہوتی ہے اور یہ مرد و عورت کے ساتھ رات دن اٹھنے بیٹھنے والوں سے معلوم ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں "کورٹ شپ" صرف ایک سراب ہے جس کی کچھ حقیقت نہیں بلکہ اس سے نقصان کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو کورٹ شپ کے زمانہ ہی میں خلوت صحیحہ اختیار کر لیتے ہیں۔ کوئی شخص نادر ہی ایسا نکلے گا کہ جو کورٹ شپ کے زمانہ میں پورے ضبط سے کام لیتا ہو۔

ہندو مذہب کے مطابق عورت شوہر کی ملک ہے۔ اس کی جو کچھ ملکیت و جائیداد ہے وہ سب مرد کے قبضہ میں چلی جاتی ہے۔ یہودیوں کے قانون کے مطابق مہر کے علاوہ اور کوئی چیز عورت کی ملکیت میں نہیں رہتی یہاں تک کہ شوہر کی وفات کے بعد یا طلاق کے بعد عورت مہر کے علاوہ کسی اور چیز کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ یونانیوں اور رومیوں کا بھی یہی قانون تھا بلکہ اوپر گزر چکا ہے کہ شوہر عورت کی جان تک کا مالک تھا مگر اسلام نے اس معاملہ میں بھی پورے انصاف سے کام لیا ہے۔ عورت کا مال عورت ہی کے قبضہ میں رہے گا اور مرد کو اس پر تصرف کرنے کا کچھ حق نہیں۔ اگر عورت اپنی خوشی سے مرد کو اپنے مال میں سے کچھ دے تو

مرد لے سکتا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

"فان طبن لكم عن شيء منه نفسا فكلوه هنيئا مريا"

"پھر اگر وہ عورتیں اپنی خوش دلی سے اس میں سے کچھ چھوڑ دیں تو اس کو کھاؤ اچھا پچتا۔"

اسلام نے حسن معاشرت کے معاملہ میں طرفین کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ اسلام ایک طرف مرد کو یہ سکھاتا ہے کہ عورت کے ساتھ مہربانی اور حسن سلوک سے پیش آؤ، اس کو اپنی ایک بہترین رفیقہ حیات سمجھو اور اگر تمہاری نافرمانی کرے تو اس کو سمجھاؤ، اگر اس پر بھی نہ مانے تو اپنی خواب گاہ سے اس کو الگ کردو اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو ضرب خفیف سے کام لو جبکہ ضرب شدید کی سخت ممانعت ہے۔ دوسری طرف اسلام عورت کو یہ نصیحت کرتا ہے کہ مرد کی اطاعت اور فرماں برداری کرے اپنی عصمت وعفت کی پوری حفاظت کرے اور مرد کے مال میں سے ضرورت سے زیادہ خرچ نہ کرے۔ یہی وہ پاکیزہ اخلاقی تعلیم ہے جس نے مسلمانوں کے خانگی نظام میں خلل نہ آنے دیا، مرد وعورت میں سچی محبت پیدا کی اور حسن معاشرت کے ساتھ زندگی بسر کرنا سکھایا۔

سب سے بڑی چیز جس نے عورت کو مرد کے پنجوں سے آزادی دلائی وہ حق خلع ہے۔ تمام مذاہب واقوام میں صرف مرد ہی کو طلاق کا حق حاصل ہے۔ عورت کو آزادی حاصل کرنے کی انہوں نے کوئی ترکیب نہیں بتائی۔ ہندو مذہب تو یہ کہتا ہے:

"اگرچہ شوہر بے مروت ہو اور دوسری عورت کے ساتھ محبت رکھتا ہو یا بے ہنر ہو تو بھی بت برتا استری ہمیشہ اس کی سیوا دیوں کی طرح کرے۔"

(منوسمرتی)

موسوی قانون کے مطابق طلاق کا حق صرف مرد ہی کو حاصل ہے تورات میں ہے:

"اگر کوئی مرد کوئی عورت لے کے اس سے بیاہ کرے اور بعد اس کے ایسا ہو کہ وہ اس کی نگاہ میں عزیز نہ ہو۔ اس سبب سے کہ اس نے اس میں کچھ پلید بات پائی تو وہ اس کا طلاق نامہ لکھ کے اس کے ہاتھ دے اور اسے اپنے گھر کے باہر کرے اور جب وہ اس گھر سے نکل گئی تو جا کے دوسرے مرد کی ہو۔

پھر اگر دوسرا شوہر بھی اس سے ناخوش ہو جائے اور اس کا طلاق نامہ لکھ کے اس کے ہاتھ میں دے اور اپنے گھر سے نکال دے یا اگر دوسرا شوہر اسے جورو کرے کے مر جائے تو روا نہیں کہ اس کا پہلا شوہر جس نے اسے مکان دیا تھا اسے پھر لے اور بعد اس کے کہ وہ ناپاک ہو چکی اسے پھر اپنی جورو کرے۔ کیونکہ وہ خداوند کے حضور نفرتی کام ہے۔"

(استثناء، باب نمبر 24)

یہودیوں کے نزدیک مرد کسی سبب کے بغیر بھی عورت کو طلاق دے سکتا ہے اور ان کے ہاں کوئی چیز عورت کو طلاق دینے سے مانع نہیں۔ چونکہ ان کے نزدیک بقائے نوع انسانی کے لیے بہت سے نکاح کرنا ہر شخص پر واجب ہے، ورنہ وہ لعنت کا مستحق ہوگا۔ اس لئے اگر کسی عورت کو دس سال تک بچہ نہ پیدا ہو تو مرد پر واجب ہو جاتا ہے کہ عورت کو طلاق دے کر دوسری سے شادی کرے۔ عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ مرد سے کسی سبب کے ہوتے ہوئے بھی طلاق طلب کرے۔ چنانچہ فتاویٰ ہرشیا (یہودیوں کی مستند کتاب) میں ہے:

"عورت کے لیے جائز نہیں کہ مرد سے طلاق طلب کرے، اگرچہ شوہر میں بے انتہا عیوب ہی کیوں نہ ہوں۔"

(فتاویٰ ہرشیا، فصل نمبر 406)

مذہب عیسوی میں طلاق تو سرے سے ہے ہی نہیں۔ اگر کوئی مرد و عورت اپنے رفیق حیات کو طلاق دے کر دوسرے سے نکاح کرے تو وہ انجیل کے حکم کے مطابق زانی قرار پاتا ہے۔

عرب میں عورتوں کو مردوں سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ایک ایک مرد کے ماتحت کئی کئی عورتیں ہوتی تھیں۔ مرد ان پر ہزاروں ظلم کرے اور حق زوجیت ادا نہ کرے پھر بھی عورت کی آزادی کی کوئی سبیل نہ تھی۔ جاہلیت میں رواج تھا کہ شوہر بدنامی کے خیال سے یا شرارت سے نہ تو کامل طلاق دیتا تھا اور نہ حق زوجیت ادا کرتا تھا۔ قرآن مجید نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے:

"ولن تستطيعوا ان تعدلوا بين النساء ولو حرصتم فلاتميلوا كل الميل فتذروها كالمعلقة"

(سورۂ نساء)

"اپنی بیوی کے درمیان اپنی پوری خواہش کے باوجود تم عدل نہیں قائم رکھ سکتے' اس لئے ایسا نہ کرو کہ ایک طرف بالکل جھک جاؤ اور دوسری کو گویا معلق کر دو۔"

مذہب اسلام نے اگر ایک طرف مرد کو طلاق کا حق دیا تو دوسری طرف عورت کو بھی حق خلع عنایت کیا اور دونوں کے حقوق برابر برابر کر دیئے۔ یہاں ایک بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ اسلام نے طلاق و خلع کی صورت صرف مجبوری کی حالت میں جائز قرار دی ہے' اگر میاں بیوی کے درمیان نا اتفاقی کی خلیج حائل ہو جائے تو اسلام فوراً مرد کو طلاق دے دینے یا عورت کو مرد سے طلاق طلب کرنے کا حکم نہیں دیتا' بلکہ ہر ممکن طریقہ سے میاں بیوی کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کسی طرح سے صلح نہ ہو سکے تو اس صورت میں طلاق کی اجازت دی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"ابغض الحلال عند الله الطلاق"

"خدا کے نزدیک مبغوض حلال طلاق ہے۔"

قدیم اسلامی طرز معاشرت کو سامنے رکھ کر موجودہ مغربی طرز معاشرت کا معائنہ کرو تو صاف طور پر نظر آئے گا کہ اول الذکر معاشرت میں ازدواجی رشتۂ محبت کا ایک غیر فانی رشتہ ہے' جس کو نا اتفاقی کی آندھیاں بھی آسانی سے نہیں توڑ سکتیں' لیکن موجودہ مغربی طرز معاشرت میں نکاح وازدواج ایک بچوں کا کھیل ہے' جس کو ایک لمحہ کے اندر بنایا اور ایک لحظہ کے اندر بگاڑا جا سکتا ہے۔ مغرب نے عورت کو اپنا خدا بنایا اور اس کو اتنی آزادی دی کہ وہ معمولی سی بات پر عدالت میں طلاق کا دعویٰ دائر کر دیتی ہے۔ اسی لیے آج مغربیوں کو وہ چین اور اطمینان نصیب نہیں جو مشرقیوں کو نصیب ہے۔

اسلام کے علاوہ اور کسی مذہب نے عورت کو وراثت میں حصہ نہیں دیا۔ ہندوؤں کا قانون یہ ہے:

"جب تک پڑپوتے تک کوئی اولاد از قسم ذکور موجود ہو بیٹی وارث نہیں ہو سکتی کیونکہ جملہ آریہ قوموں میں اولادِ ذکور کو اناث پر ترجیح حاصل ہے۔"

(دھرم شاستر، صفحہ نمبر: 21)

یہودیوں کا قانون وراثت کہتا ہے:

"اگر کسی میت کے لڑکا نہ ہو تو وراثت پوتے کے لیے ہے اور اگر پوتا بھی نہ ہو تو اس صورت میں وراثت (میت کی) بیٹی کی ہو گی اور اگر بیٹی بھی نہ ہو تو بیٹی کی اولاد وراثت کی مالک ہو گی۔"

(حوش احکام الارث واتھیہ)

اس سے معلوم ہوا کہ بیٹی کا درجہ پوتوں کے بعد آتا ہے۔ یونان وروم کے قانون کے مطابق میت جس شخص کو خاندان کا سردار مقرر کرتا تھا وہی اس کی تمام جائیداد کا مالک قرار پاتا تھا۔ "موصی لہ" (جس کے حق میں وصیت کی گئی) کو پورا اختیار حاصل تھا کہ وہ جس طرح چاہے اس کی جائیداد کو کام میں لائے۔ میت کی اولاد کی شادی کرنا یا نہ کرنا موصی لہ کی مرضی پر موقوف تھا۔ گو مختلف زمانوں میں اس قانون میں رد و بدل ہوتا رہا، لیکن کسی زمانہ میں بھی عورت کو مرد کی برابری حاصل نہیں ہوئی' ہمیشہ عورت کا درجہ مرد کے بعد رہا۔

عرب زیادہ تر میراث اور دیگر معاملات میں اگلی قوموں کی پیروی کرتے تھے۔ اسی لیے وہ عورتوں کو میراث میں کسی قسم کا حصہ نہیں دیتے تھے۔ علاوہ ازیں ان کا ایک نظریہ یہ تھا کہ مرد ہی اپنی قوت و طاقت کے زور سے پورے خاندان کی حفاظت کر سکتا ہے اور مصیبتوں پر ثابت قدم رہ سکتا ہے' اس لئے میت کا پورا مال مرد کو ملنا چاہیے عورت کا اس میں کوئی حصہ نہیں، لیکن اسلام نے ان تمام کے مقابلہ میں میراث کا ایک ایسا قانون پیدا کیا جس کی برابری کا دعویٰ دنیا کا کوئی قانون نہیں کر سکتا۔ اس نے سب سے پہلے یہ بتایا:

"للرجال نصيب مماترك الوالدان والاقربون وللنساء نصيب مماترك الوالدان والاقربون مماقل منه اوراكثر نصيبا مفروضا"

(سورۂ نساء)

"ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکہ میں تھوڑا ہو یا بہت اس میں مردوں کا حصہ ہے اور ایسا ہی ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکہ میں عورتوں کا بھی حصہ ہے اور یہ حصہ ہمارا ٹھہرایا ہوا ہے۔"

اس کے بعد اس نے ہر ایک مرد اور عورت کے حصے مقرر کر دیئے۔ اس نے مرد و عورت کے حصوں میں کسی قدر کمی بیشی کی ہے۔ چنانچہ کسی میت کے لڑکے اور لڑکیاں ہوں تو ان میں سے ہر ایک لڑکا لڑکی کا دگنا حصہ پائے گا اور اگر میت کے لڑکے اور لڑکیاں اور ماں باپ ہوں تو اس صورت میں ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر میت کی اولاد نہ ہو تو ماں کو ثلث ملے گا اور باپ عصبہ قرار پائے گا۔ اس کمی بیشی سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اسلام نے عورت کا درجہ مرد کے درجہ سے کم قرار دیا ہے بلکہ میراث کا یہ قانون اقتصادی نظام پر مبنی ہے۔ چونکہ اسلامی نظام کے مطابق گھر کے انتظام کی ساری ذمہ داریاں مرد پر عائد ہوتی ہیں اور اہل و عیال اور بال بچوں کا کھانا کپڑا اور ان کے تمام خرچ کا ذمہ دار مرد ہے' اس لئے مرد کو زیادہ حصہ دیا اور عقل بھی یہی فتویٰ دیتی ہے کہ جس کا خرچ زیادہ ہو اس کو زیادہ دیا جائے اور جس کا کم ہو اس کو کم۔

مذکورہ بالا چند قوانین پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوا ہوگا کہ مذہب اسلام نے عورت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اگر اسی طرح مرد و عورت کے حقوق کی تمام جزئیات پر نظر ڈالیں گے اور دیگر اقوام کے قوانین کے ساتھ موازنہ کرتے جائیں گے تو ہر حال میں مذہب اسلام کی برتری اور فضیلت نمایاں رہے گی۔

تمام احکام اور امر و نواہی میں اسلام نے مرد و عورت دونوں کو برابر قرار دیا ہے۔ جس طرح نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج وغیرہ مرد پر فرض ہیں اسی طرح عورت پر بھی یہ چیزیں فرض قرار دی گئی ہیں۔ زانی اور زانیہ کی سزا ایک ہے' لین دین' خرید و فروخت اور وصیت کرنے میں مرد و عورت دونوں برابر ہیں۔ یہودیوں کے ہاں عورت وصیت نہیں کر سکتی بلکہ ان کے نزدیک عورت کی شہادت معتبر نہیں ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک اگر عورت زنا کرے تو اس کی سزا یہ ہے کہ کتوں کو چھوڑ کر اس کو نوچوا دینا چاہئے اور اگر مرد زنا کرے تو اس پر جرمانہ ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کے نزدیک عورت کی شہادت معتبر نہیں' اگر کسی عورت کا شوہر انتقال

کر جائے تو وہ کسی طرح دوسرے سے شادی نہیں کر سکتی۔ اگر کسی مرد کی بیوی وفات پا جائے تو وہ مرد دوسری عورت کو اپنے نکاح میں لا سکتا ہے' لیکن اسلام نے اس میں بھی دونوں کو برابر کر دیا ہے۔ آج ہندو بیوہ عورتوں کے درد انگیز و پر الم واقعات کو سن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کتنی ایسی عورتیں ہیں جن کی شادی صغر سنی میں ہوئی اور عین جوانی کے عالم میں بیوہ ہو گئیں۔ یہ درد انگیز منظر اس وقت نظر آتا ہے جب کہ یہ بدنصیب عورتیں مست ہو کر میلوں میں گاتی ہوئی نکلتی ہیں۔ کون دل ہو گا جو ان کی اس بری حالت کو دیکھ کر چار آنسو نہ بہاتا ہو گا۔ تعجب تو یہ ہے کہ ایسے لغو قانون کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے آج مذہب اسلام کے بہترین قوانین پر اعتراض کرتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

"ان المسلمین والمسلمت والمومنین والمومنت والقنتین والقنتت والصدقین والصدقت والصبرین والصبرت والخشعین والخشعت والمتصدقین والمتصدقت والصآئمین والصائمت والحفظین فروجھم والحفظت والذکرین اللہ کثیرا والذکرت اعد اللہ لھم مغفرۃ واجرا عظیما٥"

(القرآن الکریم ،پارہ نمبر 22 ،سورۃ نمبر 33 (الاحزاب)،آیت نمبر 35)

"بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور فرمان بردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور ڈرنے والے مرد اور ڈرنے والی عورتیں اور صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں اور روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد اور کثرت سے ذکر کرنے والی عورتیں اللہ

تعالیٰ نے ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم تیار فرما رکھا ہے۔"

سب سے پہلے ہم حقوق اور جدیدیت وغیرہ کے معانی پر غور کرتے ہیں۔ چنانچہ "آکسفورڈ" ڈکشنری کے مطابق "حقوق نسواں" سے مراد وہ حقوق ہیں جو عورتوں کو وہی قانونی اور سماجی مقام دلائیں جو مردوں کو حاصل ہے۔ عورتیں مردوں کی برابری میں جن حقوق کی آواز اٹھاتی ہیں ان میں ووٹ ڈالنے کا حق اور وراثت میں حصہ وغیرہ شامل ہیں۔

"ماڈرن" کے معنی جدید بنانے، ڈھالنے اور عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے ہیں یعنی جدید آسائشوں اور ضروریات کو اپنانا "ماڈرن" کہلانے کے مترادف ہے۔

"Webster's" ڈکشنری کے مطابق ماڈرن کا مطلب ایک جدید انداز اور ظاہری طور طریقے اپنانے کا نام ہے۔ مثال کے طور پر اپنے نظریات کو جدید بنانا وغیرہ۔ مختصر طور پر ماڈرن وہ عمل ہے جس کے ذریعے موجودہ قائم شدہ حالات کو نیا کیا جاتا ہے۔ یہ کوئی موجودہ حالت کو برقرار رکھنے کا نام نہیں ہے۔!

کیا ہم خود کو جدید بنا سکتے ہیں کہ ہم خود کو مشکلات سے نکال سکیں اور تمام نسلِ انسانی کو زندگی کا ایک نیا روپ بخش سکیں۔؟ میرا موضوع ان جدید خیالات پر مشتمل نہیں ہے جس میں ضعیف سائنسدانوں اور ناتجربہ کار نااہلوں کے تجربات و نتائج کا نچوڑ شامل ہو، جس میں بتایا گیا ہو کہ ایک عورت کو زندگی کیسے گزارنی چاہیے۔

میں اُن نتائج کو اپنے موضوع کی بنیاد بناؤں گا جو کہ سچائی پر مشتمل ہیں اور جن کو تجربے کی آنکھ سے پرکھا جا سکتا ہے۔ تجربہ اور غیر جانبدارانہ مخلص تجزیہ ہی سچائی کی چمک دمک کیلئے آزمودہ نسخہ وتھیوری ہے۔

ہمیں اپنی سوچ کو حقیقت کے آئینے میں پرکھنا ہوگا۔ نہیں تو ہماری سوچ و بچار حقیقت کی راہ سے بھٹک جائیگی۔ مغربی میڈیا جس طرح اسلام میں عورتوں کے حقوق کو پیش کرتا ہے اگر اس سے اتفاق کیا جائے تو کوئی شک نہیں کہ آپ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں کہ اسلام میں عورتوں کے حقوق فرسودہ ہیں۔ مغرب عورت کی جس آزادی کی بات کرتا ہے وہ اصل میں ایک گمراہی کی راہ ہے۔ جس میں عورت کے جسم کی نمائش کر کے اس کو عزت سے محروم کرتا

اور اس کی روح کو پامال کرنا مقصود ہے۔

مغربی معاشرہ اسلام میں عورتوں کے حقوق کو جدید دور کے متقاضی بنانے کی جو بات کرتا ہے اس نے عورت کو محض داشتہ اور طوائف بنا کر رکھ دیا ہے۔ جو کہ جنس کے کاروبار کرنے والوں اور جنسی لذت والوں کیلئے محض کھلونا ہیں۔ یہ عورتیں آرٹ اور کلچر کے رنگین پردے کی آڑ میں بھٹک چکی ہیں۔

اسلام کے انقلابی نظام نے عورت کو اس کے حقوق بخشے اور عورت کو آج سے 1430 سال قبل کے جاہلیت کے معاشرے میں عزت و احترام بخشا۔ اسلام کا مقصد ہماری سوچ، ہمارے رہن سہن، ہماری سماعت و بصارت، ہمارے جذبات و احساسات کو ان رویوں سے نجات دلانا تھا جو کہ عورت سے متعلق معاشرے میں موجود تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے موضوع کو تفصیلاً بڑھاؤں میں آپ کی توجہ چند اہم نکات کی طرف دلانا چاہوں گا:

1: پہلا نقطہ یہ کہ دنیا کا 1/5 حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ان میں مختلف معاشرے ہیں۔ جن میں کچھ اسلام سے زیادہ نزدیک ہیں اور کچھ اسلام سے دور ہیں۔

2: اسلام میں بیان کئے گئے عورتوں کے حقوق کا مصدقہ ذرائع سے جائزہ لینا چاہیے بجائے اس کے کہ یہ دیکھتے ہوئے کہ ایک مسلم معاشرے میں مسلمان کیا کرتے ہیں۔

3: اسلام کو سمجھنے کا مصدقہ ذریعہ قرآن مجید ہے جو کہ کلام الٰہی ہے اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو کہ مسلمانوں کا حقیقی ورثہ ہے۔

4: قرآن مجید میں کوئی بھی بیان کی گئی بات دوسرے سے متصادم نہیں ہوگی اور نہ ہی یہ دونوں مآخذات دین (قرآن و حدیث) آپس میں متصادم ہوں گے۔

5: بعض اوقات مختلف علماء کے مابین کچھ تفرقہ ہو اور اکثر اوقات یہ فرق قرآن مجید کو مجموعی طور پر سمجھتے ہوئے ختم کیا جا سکتا ہے۔ بجائے اس کے کہ آپ صرف ایک مخصوص آیت کا حوالہ دیتے رہیں کیونکہ اگر کسی جگہ قرآنی آیت میں کچھ وضاحت طلب بات ہو تو اکثر اوقات اس کا جواب قرآن مجید میں کسی اور جگہ پر دے دیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ ایک آیت کا حوالہ دے کر باقی تمام حوالوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔

6: ہر مسلمان چاہے وہ مرد ہو یا عورت اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کا طالب ہو اور اس کا نائب بن کر اس دنیا میں رہے۔ بجائے اس کے کہ شہرت حاصل کرنے یا نفس اور اَنا بلند کرنے کی کوشش میں لگا رہے۔

اسلام عورت اور مرد کی برابری کا یقین دلاتا ہے۔ اس برابری کا مطلب یکساں ہونا نہیں۔ اسلام میں عورت اور مرد کا کردار توصیفی ہے۔ یہ کسی فساد کو لئے ہوئے نہیں بلکہ باہمی تعاون پر مشتمل ہے۔ اس میں کوئی تضاد نہیں کہ اس میں کوئی ایسی نزعی کیفیت ہو کہ ہم میں سے بہتر کون ہے۔ جہاں تک اسلام میں عورتوں کے حقوق کی بات ہے تو ان کو چھ بنیادی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

1: مذہبی وروحانی حقوق۔ 2: معاشی حقوق۔
3: معاشرتی حقوق۔ 4: تعلیمی حقوق۔
5: قانونی حقوق۔ 6: سیاسی حقوق۔

اسلام اور عورتوں کے مذہبی و روحانی حقوق: مغرب کی سب سے بڑی غلط فہمی اسلام سے متعلق یہ ہے کہ جنت صرف مردوں کیلئے ہے اور عورتوں کا اس میں کوئی حق نہیں ہے۔ اس غلط فہمی کو سورۃ نساء آیت نمبر 124 کے ذریعے دور کیا جاسکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"من یعمل من الصلحت من ذکر او انثی وھو مومن فاولئك یدخلون الجنة ولا یظلمون نقیراo"

(القرآن الجید، پارہ نمبر 5، سورۃ نمبر 4 (النساء)، آیت نمبر 124)

"اور جو کوئی نیک عمل کرے چاہے وہ مرد ہو یا عورت، ہو صاحب ایمان تو ایسے لوگ جنتی ہیں اور ان کی تل (ذرہ) برابر بھی حق تلفی نہ کی جائے گی۔o"

یہی بات سورت نحل کی آیت نمبر 97 میں دہرائی گئی ہے۔ فرمایا:

"من عمل صالحا من ذکر او انثی وھو مومن فلنحیینه حیوۃ طیبة و لنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملونo"

(القرآن الجید، پارہ نمبر 14، سورۃ نمبر 16 (النحل)، آیت نمبر 97)

"جو کوئی نیک اعمال کرے چاہے مرد ہو یا عورت، ہو ایمان والا تو ہم اس کو پاک زندگی عطا فرمائیں گے اور ان کے اعمال کا نہایت اچھا صلہ دیں گے۔o"

اسلام میں جنت میں جانے کیلئے مرد و عورت کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

اسلام کے متعلق اہل مغرب کو جو دوسری غلط فہمی ہے وہ یہ ہے کہ عورت میں کوئی روح نہیں ہے۔ اصل میں یہ بات سترھویں صدی عیسوی میں روم میں منعقد کی گئی داناؤں کی مجلس میں متفقہ طور پر منظور کی گئی کہ عورت کوئی روح نہیں رکھتی۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں میں روح کی فطرت یکساں ہے۔ اس کے بارے میں قرآن مجید کچھ یوں کہتا ہے:

"یایها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة و خلق منها زوجها وبث منهما رجالاً کثیرا ونساء واتقوا الله الذی تساءلون به والارحام ان الله کان علیکم رقیباo"

(القرآن الجید، پارہ نمبر 4، سورۃ نمبر 4 (النساء)، آیت نمبر 1)

"اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے زمین میں بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کیں اور اللہ سے ڈرو جس کے نام پر تم آپس میں ناطے جوڑتے ہو اور (خیال رکھو) رشتوں کا، بیشک اللہ تم پر نگہبان ہے۔o"

سورۃ النحل میں فرمایا گیا:

"والله جعل لکم من انفسکم ازواجا وجعل لکم من ازواجکم بنین وحفدة ورزقکم من الطیبت"

(القرآن الجید، پارہ نمبر 14، سورۃ نمبر 16 (النحل)، آیت نمبر 72)

"اور اللہ نے تم میں سے تمہارے لئے تمہاری بیویاں بنائیں اور تمہاری بیویوں سے تمہارے لیے بیٹے اور پوتے پیدا کیے اور تمہیں پاک چیزیں عطا کیں۔"

سورۃ الشوریٰ میں فرمایا:

"فاطر السموات والارض جعل لکم من انفسکم ازواجا ومن الانعام ازواجا یذرؤکم فیہ لیس کمثلہ شیء وھو السمیع البصیرo"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 25، سورۃ نمبر 42 (الشوریٰ)، آیت نمبر 11)

"وہ (اللہ) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ اسی نے تمہاری جنس سے تمہارے لیے جوڑے اور چوپایوں کے جوڑے بنائے، وہ تمہیں اس دنیا میں پھیلاتا ہے، اس کے مثل کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔o"

کیا آپ اسلام کو محض اس بات پر فرسودہ کہیں گے کہ اس نے مرد اور عورت کی روح کو فطرت میں یکساں کہا ہے۔؟ قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روح انسانوں میں پھونکی۔ قطع نظر اس کے کہ وہ مرد تھے یا عورتیں۔ ارشاد ربانی ہے:

"پھر اس نے اس کے اعضاء کو ٹھیک کیا اور اس میں پھونکی اپنی (طرف سے) روح اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے، پھر بھی تم بہت کم شکر کرتے ہو۔o"

(القرآن المجید، سورۃ نمبر 32 (السجدۃ)، آیت نمبر 9)

ہم قرآن مجید میں یہ پڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا۔ جیسا کہ سورۃ الاسراء میں ہے:

"ولقد کرمنا بنی ادم و حملنھم فی البر و البحر و رزقنھم من الطیبت و فضلنھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلاo"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 15، سورۃ نمبر 17 (الاسراء)، آیت نمبر 70)

"اور تحقیق ہم نے اولاد آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور دریا میں سواری دی اور پاکیزہ روزق عطا کیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت بخشی۔o"

غور کیجیے گا اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام کہتا ہے:

"آدم علیہ السلام کی تمام اولاد کو شرف بخشا گیا ہے۔ مرد اور عورت دونوں کو۔"

کچھ مقدس صحیفے مثلاً انجیل میں حضرت حوا رضی اللہ عنہا پر یہ بہتان تراشی کی گئی ہے کہ ان کی وجہ سے نوعِ انسانی پر زوال آیا۔ حقیقت میں اگر آپ قرآن مجید کی سورۃ الاعراف کی آیت نمبر 19 سے لے کر 27 تک کا مطالعہ کریں تو حضرت آدم علیہ السلام اور حوا رضی اللہ عنہا سے تقریباً درجن سے زیادہ بار خطاب کیا گیا ہے۔ دونوں کو شیطان سے پھسلایا، دونوں نے معافی مانگی، دونوں نادم ہوئے اور دونوں کو معاف کر دیا گیا۔ اگر آپ بائبل میں Genesis کے باب نمبر 3 کا مطالعہ کریں تو اس میں صرف حضرت حوا رضی اللہ عنہا کو انسانی معراج کے زوال کا قصوروار ٹھہرایا گیا ہے۔ بائبل میں Genesis کے باب نمبر 3 کی آیت 16 میں ہے:

"حمل اور بچے کی پیدائش عورت کی تحقیر کا باعث ہیں۔"

بقول بائبل:

"دردِ زہ عورت کیلئے سزا کی مانند ہے۔"

اصل میں اگر آپ قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو اس میں حمل اور بچے کی پیدائش کے ذریعے عورت کی شان بڑھائی گئی ہے۔ سورۃ النساء میں ہے:

"واتوا النساء صدقتهن نحلة فان طبن لكم عن شيء منه نفسا فكلوه هنيئا مريئا"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 4، سورۃ نمبر 4 (النساء)، آیت نمبر 4)

"اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دیا کرو، ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے اس میں سے کچھ تم کو چھوڑ دیں تو اسے ذوق شوق سے کھالو۔"

سورۃ لقمان میں ہے:

"ووصينا الانسان بوالديه حملته امه وهنا على وهن من فصله في عامين ان اشكر لي ولوالديك الي المصيرo"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 21، سورۃ نمبر 31 (لقمان)، آیت نمبر 14)

"اور ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی تاکید کی، اسے

اسکی ماں تکلیف سہہ کر پیٹ میں اٹھائے رکھتی ہے پھر اس کو دودھ پلاتی ہے اور آخر کار دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے، (اے انسان!) میرا بھی شکر کرتا رہ اور اپنے ماں باپ کا بھی، میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔o"

سورۃ احقاف میں ارشاد فرمایا:

"ووصینا الانسان بوالدیہ احسانا حملتہ امہ کرھا ووضعتہ کرھاً وحملہ و فصلہ ثلثون شھرا"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 26، سورۃ نمبر 46 (الاحقاف) آیت نمبر 15)

"اور ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا۔ اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور تکلیف ہی سے جنا اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا ڈھائی برس کو پہنچ جاتا ہے۔"

اسلام کہتا ہے کہ عورت کا حاملہ ہونا اس کیلئے عزت افزائی اور فخر کا باعث ہے نہ کہ تحقیر کا۔ حمل عورت کی عزت میں اضافہ کرتا ہے۔

سورۃ الحجرات میں ہے:

"یاایھاالناس انا خلقنکم من ذکر وانثی وجعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقکم ان اللہ علیم خبیر o"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 26، سورۃ نمبر 49 (الحجرات)، آیت نمبر 13)

"اے لوگو! بیشک ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو، بیشک اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے، بیشک اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے۔o"

جنس، رنگ، نسل، قوم، قبیلے، ذات، علاقے، ملک اور دولت کسی کا بھی اسلام میں کوئی معیار نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف تقویٰ ہی معیار ہے۔ کوئی جنس کی تفریق نہیں کہ جنس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے ہاں انسان کے لیے سزا یا جزا ہو۔ چنانچہ سورۃ آل عمران میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثی "

"بیشک میں کسی عمل کرنیوالے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا، وہ (عمل کرنے والا) مرد ہو یا عورت۔"

(القرآن الجید، پارہ نمبر 4، سورۃ نمبر 3 (آل عمران)، آیت نمبر 195)

"ان المسلمین والمسلمت والمومنین والمومنت والقنتین والقنتت والصدقین والصدقت والصبرین والصبرت والخشعین والخشعت والمتصدقین والمتصدقت والصآئمین والصائمت والحفظین فروجهم والحفظت والذکرین الله کثیرا والذکرت اعد الله لهم مغفرة واجرا عظیماo"

(القرآن الکریم، پارہ نمبر 22، سورۃ نمبر 33 (الاحزاب)، آیت نمبر 35)

"بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں فرمان بردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور ڈرنے والے مرد اور ڈرنے والی عورتیں اور صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں اور روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد اور کثرت سے ذکر کرنے والی عورتیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم تیار فرما رکھا ہے۔o"

یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ اسلام میں مرد اور عورت کے روحانی و اخلاقی اقدار یکساں ہیں۔ دونوں کیلئے ایمان لازمی ہے۔ دونوں کیلئے نماز و روزہ وغیرہ لازم ہیں۔

البتہ! عورت کیلئے اسلام میں ایک خصوصی گنجائش ہے وہ یہ کہ اگر عورت ماہانہ ایام یا حمل کے دورے گزر رہی ہے تو اس کیلئے روزہ نہیں ہے وہ روزہ بعد میں رکھے گی جب وہ

صحت مند ہوگی۔ رہا نماز کا مسئلہ تو ماہانہ ایام اور حیض ونفاس کے ایام میں عورت کو نماز بالکل معاف ہے۔ روزے کی قضا لازم ہے، لیکن نماز کی قضا کسی بھی صورت لازم نہیں۔

اسلام میں عورتوں کے معاشی حقوق:

اسلام نے عورت کو مغرب سے تیرہ سو سال قبل ہی معاشی حقوق دے دیئے تھے۔ ایک بالغ مسلم عورت اپنی مرضی سے کسی کے مشورے کے بغیر جائیداد کی خرید وفروخت کر سکتی ہے۔ اس سے مستثنیٰ کہ وہ شادی شدہ ہے یا کنواری۔ 1970 میں انگلینڈ میں پہلی بار مغرب نے شادی شدہ عورت کے حقوق سمجھے اور اس بات کو منظور کیا کہ وہ خود جائیداد کی خرید و فروخت کر سکتی ہے۔ میں اس سے متفق ہوں کہ آج سے تیرہ سو سال قبل عورتوں کو جو معاشی حقوق دیئے گئے وہ قدیم حقوق ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ فرسودہ ہیں یا کہ جدید؟

اسلام میں عورت اگر چاہے تو کام کر سکتی ہے۔ قرآن مجید اور صحیح احادیث میں ایسا کوئی متن نہیں ہے جس سے ثابت ہو کہ عورت کو کام کرنے سے روکا گیا ہے۔ بلکہ بعض امہات المومنین رضی اللہ عنہا چمڑا رنگنے کا کام کیا کرتی تھیں۔ کام جب تک اسلامی شریعت کی حدود میں ہو اور عورت اپنا اسلامی لباس پورے اہتمام کے ساتھ قائم رکھے تو وہ کام کر سکتی ہے۔ شرعی طور پر عورتیں ایسی نوکری نہیں کر سکتی جس کیلئے انہیں اپنی خوبصورتی اور جسم کی نمائش کرنی پڑے۔ مثلاً ماڈلنگ اور فلمی اداکاری یا ایسی دوسری Jobs مثلاً ساقیا وغیرہ کی۔ بہت سے شعبے اور نوکریاں ایسی ہیں کہ جو شرعاً مرد اور عورت دونوں کیلئے ممنوع ہیں۔ مثال کے طور پر جواء خانوں میں کام کرنا یا غیر اخلاقی، غیر مہذبانہ کاروبار۔ ایسی تمام نوکریاں مرد وعورت کیلئے منع قرار دی گئی ہیں۔ ایک صحیح اسلامی معاشرے کی رو سے عورت کو چاہیے کہ وہ ڈاکٹری کے شعبے کو اپنائے۔ ہمیں خواتین گائنا کالوجسٹ، نرسوں اور خواتین اساتذہ کی ضرورت ہے لیکن سلام میں عورت پر کسی قسم کا معاشی بوجھ (ذمہ داری) نہیں ہے۔ معاشی ذمہ داری کا بوجھ خاندان کے مرد کے ذمے ہے۔ لہٰذا عورت کو زندہ رہنے کیلئے کسی جتن کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام میں کوئی عورت کو نوکری کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ ہاں! اگر وہ چاہے تو اپنی مرضی ورضامندی سے یا اپنی کسی مجبوری کے باعث نوکری کر سکتی ہے۔ وہ ان شعبوں میں نوکری نہیں کر سکتی جو حرام ہوں، جس میں اس کی عزت وآبرو کو خطرہ

ہو یا جس میں اسے اپنی جسمانی نمائش کرنی پڑے۔ وہ گھر بیٹھ کر سینے کا کام کر سکتی ہے، کندہ کاری کر سکتی ہے، برتن سازی کر سکتی ہے اور وہ ٹوکریاں بنا سکتی ہے۔ اسے فیکٹریوں اور ان انڈسٹیز میں کام کرنے کی اجازت ہے جو کہ خصوصی طور پر عورتوں کیلئے مخصوص ہوں۔ وہ ان جگہوں پر کام کر سکتی ہے جہاں پر Gents اور Ladies کے علیحدہ Section (حصے) ہوں کیونکہ اسلام مرد و زن کے آپس میں گھلنے ملنے کو پسند نہیں کرتا۔ وہ کاروبار بھی کر سکتی ہے اور جہاں اسے کسی غیر مرد سے لین دین کی ضرورت پیش آئے جو کہ نامحرم ہو تو وہ اس کام کو اپنے باپ، بھائی، شوہر یا بیٹے کے ذریعے کرا سکتی ہے۔ اگر چنداں ایسا نہ ہو سکتا ہو تو اسلامی تقاضوں کے مطابق چل کر وہ خود بھی اس سے لین دین کر سکتی ہے۔ میں آپ کو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی بہترین مثال دوں گا جو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ تھیں۔ وہ اپنے زمانے کی نہایت کامیاب تاجرہ تھیں اور وہ اپنے شوہر کے ذریعے تجارت کیا کرتی تھیں۔

اسلام میں عورت کو بہ نسبت مرد کے زیادہ معاشی تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ معاشی ذمہ داری اس کے کندھوں پر نہیں ہے بلکہ خاندان کے مرد کے ذمہ ہے۔ شادی سے پہلے یہ ذمہ داری عورت کے باپ، بھائی، دادا، چچا، ماموں اور تایا پر عائد ہوتی ہے اور شادی کے بعد اس کے شوہر یا بیٹے پر۔ شادی کے بعد اسے اپنے گھر کا خیال رکھنا ہوتا ہے، بچوں کی نگہداشت، کپڑوں وغیرہ کی دیکھ بھال اور معاشی ضروریات کا دھیان رکھنا اس کی ذمہ داری بنتی ہے۔ جب وہ شادی شدہ ہو جاتی ہے تو وہ لینے والوں میں شامل ہو جاتی ہے۔ وہ تحفہ لیتی ہے یعنی "مہر" جیسا کہ سورۃ النساء میں ہے:

"واتوا النساء صدقتهن نحلة فان طبن لكم عن شيء منه نفسا فكلوه هنيئا مريئاO"

"اور عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دے دیا کرو، ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے اس میں سے کچھ تم کو چھوڑ دیں تو اسے ذوق شوق سے کھالو۔O"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 4، سورۃ نمبر 4 (النساء)، آیت نمبر 4)

شادی کا فریضہ انجام دینے کیلئے مہر لازم ہے لیکن بد قسمتی کی بات ہے کہ ہمارے مسلم

معاشرے میں ہم محض نام کا ''مہر'' ادا کرتے ہیں۔ 151 روپے، بعض لوگ 186 روپے اور بعض تو لوگ سوا 32 روپے دیتے ہیں اور وہ لاکھوں روپے زیب و آرائش، استقبالیے، پھولوں اور دعوتِ طعام پر خرچ کر دیتے ہیں۔ اسلام میں مہر کی نہ کوئی کم سے کم حد ہے اور نہ زیادہ سے زیادہ لیکن ظاہر ہے کہ جو شخص استقبالیے پر لاکھوں خرچ کر سکتا ہے وہ یقیناً کافی زیادہ مہر ادا کر سکتا ہے۔

مسلم معاشرے خاص طور پر برصغیر پاک و ہند میں بعض بے معنی و فضول رسومات عود کر آئی ہیں۔ وہ شادی کے موقع پر بالکل معمولی ''حق مہر'' ادا کرتے ہیں اور اپنی بیوی سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ جہیز میں فریج، ٹی وی لے کر آئے گی اور ان کو فلیٹ دلائے گی۔ بعض تو سوچتے ہیں کہ وہ کار لے کر دے گی وغیرہ وغیرہ اور بہت زیادہ جہیز لا کر شوہر کے معیار زندگی کو تبدیل کر دے گی۔ اگر بیوی گریجویٹ ہے تو وہ ایک لاکھ کی توقع رکھتے ہیں، اگر وہ انجینئر ہے تو 3 لاکھ کی اور اگر وہ ڈاکٹر ہے تو پانچ چھ لاکھ کی توقع رکھتے ہیں۔ شوہر کا بیوی سے جہیز کا بالواسطہ یا بلاواسطہ مطالبہ اسلام میں ممنوع ہے۔ اگر لڑکی کے والدین اپنی مرضی سے کچھ دینا چاہتے ہیں تو اس کی اجازت ہے لیکن اصرار سے بالواسطہ یا بلاواسطہ مانگنا اسلام میں قطعاً منع ہے۔ اگر عورت کام کرتی ہے تو وہ جو بھی کماتی ہے اس کی اپنی ملکیت ہے۔ اگر چاہے تو خاوند کو دے اور اگر چاہے تو نہ دے۔ اسے گھر کی ضرورت پر ایک پائی خرچ کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتی ہے تو یہ اس کی اپنی مرضی ہے۔ بیوی کتنی ہی دولت مند ہو اس کے باوجود اسلام میں خرچ شوہر کی ذمہ داری ہے۔ اسلام میں لازم ہے کہ مرد عورت کی نگہداشت، کپڑے اور معاشی ضروریات کا خیال رکھے۔

طلاق کی صورت میں یا اگر عورت بیوہ ہو جاتی ہے تو عدت کے دوران اسے معاشی طور پر سنبھالا دیا جاتا ہے اور اگر اس کے بچے ہیں تو بچوں کی کفالت بھی کی جاتی ہے۔ اسلام نے صدیوں پہلے عورت کو وراثت کے حقوق تفویض کر دیئے تھے۔ اگر آپ قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو کئی سورتوں کی آیات میں (جیسا کہ سورۃ النساء، سورۃ البقرہ، سورۃ المائدہ) میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ عورت چاہے وہ بیوی ہے، ماں ہے، بہن ہے یا بیٹی ہے اس کا جائیداد میں حصہ ہے۔

اسلام میں عورتوں کے معاشرتی حقوق:

اب ہم معاشی حوالوں سے عورت کو دیئے گئے حقوق کا تجزیہ کریں گے۔ان حقوق کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

1: اسلام میں عورتوں کے معاشرتی حقوق بحیثیت ماں۔

2: اسلام میں عورتوں کے معاشرتی حقوق بحیثیت بہن۔

3: اسلام میں عورتوں کے معاشرتی حقوق بحیثیت بیوی۔

4: اسلام میں عورتوں کے معاشرتی حقوق بحیثیت بیٹی۔

ماں کے حقوق: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِی خلقکم من نفس واحدة و خلق منها زوجها وبث منهما رجالا کثیرا و نساء واتقوا اللہ الذی تسآء لون به والارحام ان اللہ کان علیکم رقیباo"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 4، سورۃ نمبر 4 (النساء)، آیت نمبر 1)

"اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑ ابنایا اور پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد وعورت پیدا کر کے روئے زمین پر پھیلا دیئے اور اللہ سے ڈرو جس کے نام کو تم اپنے رشتوں کا ذریعہ بناتے ہو اور (قطع مودت) ارحام سے (بچو) بیشک اللہ تم پر نگہبان ہے۔o"

سورۃ لقمان میں ارشاد ہوتا ہے:

"ووصینا الانسان بوالدیه حملته امه وهنا علی وهن وفصله فی عامین ان اشکرلی ولوالدیك الی المصیرo"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 21، سورۃ نمبر (لقمان)، آیت نمبر 14)

"اور ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی، اسے اسکی ماں

تکلیف پر تکلیف سہہ کر پیٹ میں اٹھائے رکھتی ہے، پھر اس کو دودھ پلاتی ہے اور آخر کار دو برس میں اس کا دودھ چھڑانا ہوتا ہے، میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرو! تمہیں میری ہی طرف پلٹنا ہے۔o"

سورۃ احقاف میں ہے:

"ووصينا الانسان بوالديه احسانا حملته امه كرها ووضعته كرها وحمله وفصله ثلثون شهرا"

(القرآن الکریم، پارہ نمبر 26، سورۃ نمبر 46 (الاحقاف)، آیت نمبر 15)

"اور ہم نے انسان کو ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا، اس کی ماں نے اسے تکلیف کے ساتھ اٹھائے رکھا اور اس نے اسے تکلیف کے ساتھ جنا اور اس کا حمل اور اس کا دودھ چھڑانا تیس مہینے میں ہوا۔"

ابن ماجہ اور مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا:

"ان الجنة تحت اقدام الامهات"

"بیشک جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے۔"

اس کا مطلب و معنی یہ ہے کہ بنیادی فرائض ادا کرنے کے بعد اگر آپ اپنی والدہ کی عزت کرتے ہیں اور ماں کے ساتھ شفیق ہیں تو آپ انشاء اللہ جنت میں داخل ہوں گے۔!

الصحیح البخاری، باب نمبر 2 حدیث نمبر 2 میں ہے کہ ایک آدمی نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کون اس دنیا میں میری صحبت و احترام اور محبت کا سب سے زیادہ مستحق ہے تو آپ نے جواب دیا:

"تمہاری ماں......!!"

اس نے عرض کیا:

"اس کے بعد۔؟"

فرمایا:

"تمہاری ماں!!"

اس نے پھر عرض کیا:

"اس کے بعد۔؟"

ارشاد فرمایا:

"تمہاری ماں!!"

اس آدمی نے چوتھی بار پوچھا:

"اس کے بعد۔؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

"تمہارا باپ۔"

اس حدیث کے مطابق 75% عزت و احترام ماں کے لیے ہے اور 25% عزت و احترام باپ کے لئے۔ تین چوتھائی حصہ پیار و محبت کا ماں کیلئے اور ایک چوتھائی حصہ باپ کیلئے۔ مختصراً یہ کہ سونے کا تمغہ ماں کیلئے اور چاندی کا تمغہ باپ کیلئے۔ تانبے کا تمغہ ماں کیلئے اور باپ کی فقط تسلی و تشفی۔

بھنوں کے حقوق: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"والمومنون والمومنت بعضهم اولياء بعض يا مرون بالمعروف وينهون عن المنكر ويقيمون الصلوٰة ويوتون الزكوٰة ويطيعون الله ورسوله اولئك سير حمهم الله ان الله عزيز حكيمo"

"اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ولی و مددگار ہیں، اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر اللہ عنقریب رحم فرمائے گا، بیشک اللہ تعالیٰ عزت والا حکمت والا ہے۔o"

(القرآن الجید، پارہ نمبر 10، سورۃ نمبر 9 (التوبۃ)، آیت نمبر 71)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مومن مرد و عورت ایک دوسرے کی کفالت کرنے والے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے کفیل ہیں۔ مختصراً کہ وہ ایک دوسرے کے لئے بہن بھائی

ہیں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

"صدقہ دینے سے بہتر ہے کہ اپنی بہن کی ضروریات کو پورا کیا جائے۔"

ایک مرتبہ فرمایا:

"عورتیں شقات ہیں۔ شقات مطلب بہن۔"

بیوی کے حقوق: پہلی تمام تہذیبوں نے عورت کو شیطان کا آلۂ کار قرار دیا لیکن اسلام عورت کو "محسنہ" قرار دیتا ہے۔ محسنہ کا معنی ہے "شیطان کے خلاف قلعہ۔"

اسلام میں عورت کو بیوی کی صورت میں ایک اعلیٰ درجہ دیا گیا۔ چنانچہ حدیث مبارکہ میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جن کے پاس شادی کی استطاعت ہے وہ شادی کریں، کیونکہ شادی (میاں اور بیوی دونوں کی) شہوت کو کم کرتی ہے اور (ان دونوں کے) حیاء کا تحفظ کرتی ہے۔"

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس کسی (مرد و عورت) نے شادی کی تو گویا اس نے اپنا آدھا دین مکمل کر لیا۔"

اس حدیث کا یہ معنی ہے کہ شادی تمہیں زنا سے روکتی ہے، زنا سے تحفظ فراہم کرتی ہے اور ہم جنس پرستی سے محفوظ رکھتی ہے جو کہ دنیا میں تقریباً آدھے جرائم کا باعث بنتی ہے۔ جب آپ شادی کرتے ہیں تو اسی صورت میں آپ کو والد یا والدہ بننے کا موقع ملتا ہے۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے دلوں میں محبت ڈال دی ہے۔ چنانچہ سورۃ الروم میں ہے:

"ومن ایته ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیها وجعل بینکم مودة و رحمة ان فی ذالك لايت لقوم یتفکرون ٥"

(القرآن المجید پارہ نمبر 21، سورۃ نمبر 30 (الروم)، آیت نمبر 21)

"اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے پیدا کیے تمہاری جنس سے جوڑے (بیویاں) تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے (میاں بیوی کے) درمیان محبت اور مہربانی (پیدا) کی، بیشک اس میں تفکر کرنے والی قوم کے لیے نشانیاں ہیں۔ ٥"

قرآن مجید کے مطابق نکاح ایک مقدس معاہدہ ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ہے:

"و کیف تا خذ ونہ وقد افضی بعضکم الی بعض و اخذن منکم میثاقا غلیظاo"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 4، سورۃ نمبر 4 (النساء)، آیت نمبر 21)

"اور تم (بیویوں سے بطور مہر) دیا ہوا مال کیونکر واپس لے سکتے ہو جبکہ تم ایک دوسرے کے ساتھ صحبت کر چکے ہو اور وہ تم سے عہد واثق بھی لے چکے ہیں۔"

اسی سورۃ میں ہے:

"یایھا الذین امنوا لا یحل لکم ما ترثوا النسآء کرھا ولا تعضلو ھن لتذھبوا ببعض مآ اتیتمو ھن الا ان یاتین بفا حشۃ مبینۃ وعاشر وھن بالمعروف فان کرھتموھن فعسی ان تکر ھوا شیئا ویجعل اللہ فیہ خیرا کثیراo"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 4، سورۃ نمبر 4 (النساء)، آیت نمبر 19)

"اے ایمان والو! تم کو جائز نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ اور دیکھنا اس نیت سے کہ جو کچھ تم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ لے لو انہیں (گھروں میں) مت روک رکھنا، ہاں اگر وہ کھلے طور پر بدکاری کی مرتکب ہوں (تو روکنا) نامناسب نہیں اور ان کے ساتھ اچھی طرح سے رہو سہو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں (تمہارے لیے) بہت سی بھلائی پیدا کر دے۔ ٥"

اسلام میں عورت کی مرضی کے بغیر اس کی شادی نہیں کی جا سکتی۔ شادی کیلئے فریقین کی رضامندی لازمی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ مرد اور عورت دونوں شادی کیلئے رضامند ہوں یہاں تک کہ باپ بھی اپنی بیٹی کو اس کی مرضی کے بغیر شادی پر مجبور نہیں کر سکتا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ مشہور و معروف کتاب مسند احمد میں ہے کہ ایک لڑکی کو باپ کی طرف سے شادی پر مجبور کیا گیا۔ جب وہ لڑکی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پہنچی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا:

"یہ بات تم پر منحصر ہے کہ تم یہ تعلق قائم رکھو یا توڑ دو۔"

(مسند احمد بن حنبل، حدیث نمبر 2469)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام میں شادی کے موقع پر عورت کی رضامندی نہایت ضروری ہے ورنہ شادی وقوع پذیر نہیں ہوگی۔ اسلام کہتا ہے کہ عورت گھر سنوارنے والی ہے۔ اسے گھرداری کیلئے نہیں بنایا گیا کیونکہ اسکی شادی مکان سے نہیں بلکہ انسان سے کی گئی ہے۔ اس لیے عورت کو فقط گھرداری کے لیے سمجھنا بہت بڑا گناہ ہے۔ اس کے بھی احساسات اور تفکرات ہیں اسلام ان کی قدر کرتا ہے۔

اسلام کہتا ہے کہ عورت کی شادی مالی طور پر اس کے برابر والے خاندان میں ہونی چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک غریب عورت کو ایک حاکم کے نکاح میں دے دیا جائے کہ وہ اس کے ساتھ باندیوں کا سا رویہ رکھے۔ مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بہترین ایمان والے وہ ہیں جو کہ کردار میں بہترین ہیں اور اخلاق میں اور وہ جو کہ اپنے خاندان اور بیویوں کے ساتھ بہترین ہیں۔"

(مسند امام احمد بن حنبل، حدیث نمبر 7396-7395)

اسلام میں عورتوں اور مردوں کو برابر حقوق دیئے گئے ہیں۔ قرآن مجید واضح طور پر بتاتا ہے کہ مرد و عورت، شوہر اور بیوی کے تمام جہات میں برابر حقوق ہیں، سوائے خاندان کی سربراہی کے۔

چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے:

"الرجال قوّمون علی النساء"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 5، سورۃ نمبر 4 (النساء)، آیت نمبر 34)

"مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔"

لوگ کہتے ہیں لفظ "قوام" کا معنی حاکم ہونے کے ہیں۔ حالانکہ اصل میں لفظ قوام اقامۃ سے نکلا ہے۔ آپ جب نماز سے پہلے اقامت کہتے ہیں تو آپ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اقامۃ کا مطلب کھڑا ہونے کے ہیں۔ لہٰذا لفظ "اقامۃ" کا مطلب ہوا کہ مرد ایک درجہ ذمہ داری میں اونچا ہے نہ کہ فضیلت میں۔

بہت سے لوگوں نے اس آیت میں قوام کے معنی کو غلط انداز سے سمجھا۔ چنانچہ اس کی تفصیل قرآن مجید سورۃ البقرۃ میں کچھ اس طرح بیان فرماتا ہے:

"والمطلقت یتربصن بانفسھن ثلثة قروء ولا یحل لھن ان یکتمن ما خلق الله فی ارحامھن ان کن یومن بالله و الیوم الاخر و بعولتھن احق بردھن فی ذلك ان اردوا اصلاحا ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف وللرجال علیھن درجة و الله عزیز حکیمo"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 2، سورۃ نمبر 2 (البقرۃ)، آیت نمبر 228)

"اور طلاق یافتہ عورتیں (جن کو ایک یا دو طلاقیں دی گئی ہوں) اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں اور ان کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ اس کو چھپائیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے رحموں میں پیدا فرما دیا ہے اگر وہ اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتی ہیں، اور ان کے خاوند اگر پھر موافقت چاہیں تو اس (مدت) میں وہ ان کو اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں اور عورتوں کے لیے ویسا ہی مہر ہے جو اس طرح کی خواتین کا ہوتا ہے دستور کے مطابق اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت ہے اور اللہ عزت والا حکمت والا ہے۔o"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قوام کا معنی ہے مرد کو ذمہ داری میں ایک درجہ زیادہ محتاط

رہنا چاہیے۔

قرآن مجید کہتا ہے:

"ھن لباس لکم و لکم لباس لھن"

"تمہاری بیویاں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔"

لباس کا مقصد کیا ہے۔؟ یقیناً لباس ڈھانپنے اور خوبصورتی کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ شوہر اور بیوی کو ایک دوسرے کی غلطیوں کی پردہ پوشی کرنی چاہیے اور ایک دوسرے کے حسن کو افزودگی بخشنی چاہیے۔ یہ ہاتھوں اور دستانوں کا سا رشتہ ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

"اگر تمہیں اپنی بیویاں پسند نہ ہوں تو پھر بھی تمہیں ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا چاہیے، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان میں تمہارے لیے بھلائی پیدا فرمادے۔"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 4، سورۃ نمبر 4 (النساء)، آیت نمبر 19)

سورۃ النساء میں عورتوں کے حق کو مردوں کے حق کے برابر قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

"یایھا الذین امنوا لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا"

"اے ایمان والو! تم کو جائز نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ۔"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 4، سورۃ نمبر 4 (النساء)، آیت نمبر 19)

کیا اس بناء پر آپ اسلام کو فرسودہ کہیں گے کہ یہ بیوی کے حقوق کو مرد کے حقوق کے برابر قرار دیتا ہے؟

بیٹی کے حقوق: اب ہم ان معاشرتی حقوق کی طرف بڑھتے ہیں جو اسلام نے بیٹی کے لئے مقرر کیے ہیں۔ اسلام نوزائیدہ بچی کو دفنانے سے روکتا ہے۔ لڑکی کو بچپن میں ہی قتل کر دینا اسلام میں قطعاً منع ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

"بایّ ذنب قتلت"

"جس لڑکی کو دفن کیا گیا اسے پوچھا جائے گا کہ کس گناہ کی وجہ سے وہ دفن کی

گئی۔o"

(القرآن المجید، سورۃ التکویر، آیت نمبر 8-9)

نہ صرف نوزائیدہ بچی کا قتل منع ہے بلکہ ہر طرح کے بچوں کا قتل اسلام میں ممنوع ہے۔ چاہے وہ بچہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

"ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق نحن نرزقھم وایاکم ان قتلھم کان خطا کبیراo"

"اور اپنی اولاد کو غربت کے ڈر سے قتل نہ کرنا تم کو اور ان کو ہم ہی تو رزق دیتے ہیں۔ بیشک ان کا قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔o"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 15، سورۃ نمبر 17 (الاسراء)، آیت نمبر 31)

اسلام سے پہلے عرب میں جب بھی کوئی لڑکی پیدا ہوتی تو عموماً اسے زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ الحمدللہ! اسلام کی اشاعت کے بعد اس مکروہ عمل کا خاتمہ ہوا، لیکن بدقسمتی سے یہ کچھ ممالک میں ابھی بھی جاری و ساری ہے۔ بی بی سی لندن کی رپورٹ کے مطابق ایک پروگرام "اسے مرنے دو!" (Let Her Die) میں ایک انگریز رپورٹر "Emily Bechenen" نے انگلستان سے ہندوستان آ کر بچیوں کو قتل کرنے کے اعداد و شمار مہیا کیے۔ اس پروگرام میں دیئے گئے اعداد و شمار کے مطابق ہر روز تقریباً تین ہزار حمل اس وجہ سے گرائے جاتے ہیں کہ ان سے بچی پیدا ہوگی۔ اگر آپ ان اعداد و شمار کو سال کے 365 دنوں سے ضرب دیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر سال ہندوستان میں ایک ملین سے زیادہ حمل گرائے جا رہے ہیں۔ تامل ناڈو اور راجستھان کی ریاستوں میں بڑے بڑے اشتہاروں پر یہ تحریر ہے کہ پانچ سو خرچ کیجئے اور پانچ لاکھ بچایئے۔!!

اس کا کیا مطلب ہے کہ میڈیکل ٹیسٹ Aminocententus یا "سونو گرافی" پر پانچ سو خرچ کر کے یہ پتہ چلایئے کہ ماں کونسا حمل اٹھائے ہوئے ہے۔ اگر تو یہ لڑکی ہے تو آپ اسے گرا کر پانچ لاکھ بچا سکتے ہیں کیونکہ دو لاکھ آپ اس کی پرورش پر خرچ کرتے ہیں اور باقی اس کے جہیز پر۔

تامل ناڈو کے گورنمنٹ ہسپتال کی رپورٹ کے مطابق ہر دس نوزائیدہ لڑکیوں میں

سے چار کو مار دیا جاتا ہے۔ اس بات پر کوئی حیرت نہیں کہ اسی وجہ سے ہندوستان کی آبادی میں عورتیں مردوں سے کم ہیں۔

نوزائیدہ بچیوں کا قتل عام ملک ہندوستان میں صدیوں سے جاری وساری ہے۔ اگر آپ 1901 کے اعداد وشمار دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہر ہزار مردوں کی نسبت نوسو بہتر عورتیں تھی۔ 1981 کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں ہر ہزار مردوں کے مقابلے میں نوسو چونتیس عورتیں تھی۔ 1991 کی جدید رپورٹ کے مطابق ہر ہزار مردوں کے مقابلے میں نوسو ستائیس عورتیں تھی۔

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عورتوں کی تعداد ہر سال کم ہوتی جارہی ہے اور جب سے میڈیکل سائنس نے ترقی کی ہے اس قبیح فعل کی تعداد میں اضافہ در اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ کیا آپ اسلام کو اس بنا پر فرسودہ قرار دیں گے کہ یہ آپ کو بتاتا ہے کہ لڑکا ہو یا لڑکی اسے ہرگز قتل نہ کیا جائے۔؟

اسلام صرف نوزائیدہ بچیوں کے قتل ہی سے نہیں روکتا بلکہ آپ کو اس بات سے بھی منع کرتا ہے کہ آپ لڑکی کی پیدائش پر غم کریں۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

"واذابشر احدھم بالانثی ظل وجھہ مسودا وھو کظیم یتواری من القوم من سوء ما بشربہ"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 14، سورۃ النحل، آیت نمبر 59-58)

"اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ روکھا ہو کر کالا ہو جاتا ہے اور اسے غم لاحق ہو جاتا ہے، وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اس خبر کو برا جان کر جو اسے دی گئی۔"

اسلام میں بچیوں کی بہترین پرورش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو کوئی اپنی بچیوں کی مناسب پرورش کرے گا تو اسے قیامت کے دن میرا ایسا قرب نصیب ہوگا جیسا کہ ہاتھ کی ایک انگلی کو دوسری انگلی کا ہوتا ہے۔"

نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا:

"جس نے دو بچیوں کی بہترین پرورش کی، انہیں اچھے آداب سکھائے اور ان کی شادی کی تو وہ قیامت کے دن جنت میں داخل ہوگا۔"

اسلام لڑکے اور لڑکی کی پرورش میں کوئی فرق بیان نہیں کرتا بلکہ ان میں سے ہر ایک کی پرورش بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ہمارے پیارے نبی علیہ السلام کی موجودگی میں ایک آدمی نے اپنے بیٹے کو چوما اور اس کو گود میں بٹھا لیا لیکن اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا نہ کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم ناانصافی کر رہے ہو۔ تمہیں چاہئے کہ اپنی بیٹی سے بھی پیار کرو اور اسے بھی اپنی گود میں جگہ دو۔"

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ خود نبی علیہ السلام کا اپنا عمل تھا کہ جب آپ علیہ السلام کی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا آپ علیہ السلام کے پاس آتیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاتے، ان کی پیشانی چومتے اور انہیں اپنی جگہ بٹھاتے۔

اسلام میں عورتوں کے تعلیمی حقوق:

قرآن مجید کی سب سے پہلے نازل ہونے والی پانچ آیات میں فرمایا گیا ہے:

"اقرا باسم ربك الذی خلق o خلق الانسان من علق o اقرا وربك الاکرم الذی علم بالقلم o علم الانسان مالم یعلم o"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 30، سورۃ نمبر 95 (العلق)، آیت نمبر 1 تا 5)

"پڑھئے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا o انسان کو چپکنے والی چیز سے o پڑھئے اپنے رب کے نام سے جو کرم فرمانے والا ہے۔ جس نے انسان کو قلم کے ذریعے سکھایا o جس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ o"

قرآن مجید کی طرف سے پہلی ہدایت جو کہ بنی نوع انسان کو دی گئی وہ نماز کی نہ تھی،

روزہ کی نہ تھی، زکوٰۃ کی نہ تھی، بلکہ تعلیم کے متعلق تھی۔ اسلام تعلیم کو خاص اہمیت دیتا ہے۔ اسلام نے والدین کو اس بات کا حکم دیا ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو دین کی تعلیم دیں اور جب لڑکی کی شادی ہو جائے تو اسلام کے مطابق اس کے شوہر کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنی بیوی کو تعلیم سے آراستہ کرے۔

صحیح بخاری کے مطابق عورتیں علم حاصل کرنے کیلئے بہت زیادہ پرجوش تھیں اور انہوں نے ایک بار حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

"آپ اکثر و بیشتر مردوں میں گھیرے رہتے ہیں۔ آپ ہمارے لئے ایک دن مخصوص کیوں نہیں کر دیتے تا کہ ہم بھی آپ سے سوال پوچھ سکیں۔؟"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کی اس درخواست کو قبول فرما کر ان کے لیے ایک دن مخصوص فرما دیا جس دن وہ تعلیم حاصل کرتی تھیں۔

اندازہ کریں چودہ سو سال پہلے جب عورتیں جاہل تھیں اور وہ محض بطور مال استعمال کی جاتی تھیں، اسلام نے ان کو تعلیم سے آراستہ کرنے کا حکم دیا۔ ہمارے پاس بعض مسلم خواتین کی مثالیں موجود ہے جو کہ سکالرز ہیں اور سب سے بہترین مثال جو میں آپ کو پیش کر سکتا ہوں وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہے جو کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ۔ انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم تک کو تعلیم دی۔ ان کے ایک مشہور شاگرد عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے:

"میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑا کوئی سکالر نہیں دیکھا جو کہ قرآن مجید میں بیان کئے گئے فرائض پر زیادہ عبور رکھتا ہو۔ وہ قانون اور دوسرے معاملات میں، ادب اور شاعری میں اور عرب کی تاریخ میں بھی مہارت رکھتی تھیں۔ وہ محض دینی معاملات میں ہی ماہر نہ تھیں بلکہ ان کو ادویات کا بھی گہرا علم تھا۔ وہ حساب کے معاملات میں بھی کافی دسترس رکھتی تھیں اور اکثر و بیشتر ان کے رفقاء ان سے میراث کے مسائل پوچھنے کیلئے آتے کہ کتنا حصہ تقسیم کیا جائے اور ایک فرد کے حصے میں کتنا آتا ہے۔"

انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ خلفائے راشدین کو بھی تعلیم دی۔ اس کے علاوہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو بھی انہوں نے بعض دفعہ تعلیم دی اور انہوں نے دو ہزار دو سو دس احادیث روایت کیں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"جب بھی ہم (صحابہ رضی اللہ عنہم) کو کسی مسئلے پر علم کی کمی محسوس ہوتی تو ہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس چلے جاتے اور ان کے پاس سے ضرور اس مسئلے کا حل نکل آتا۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے 88 سے زائد سکالرز کو تعلیم دی۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ عالموں کی استاذ تھیں۔

اس کے علاوہ اور بھی مثالیں ہیں۔ مثلاً حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ تھیں۔ آپ اسلامی عدالتی فقہ کی ماہر تھیں۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"حضرت سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا اپنے وقت کی ایک نابغہ رزگار شخصیت تھیں۔"

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ یہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ تھیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بتیس علماء کو تعلیم دی۔"

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سارا سارا دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ساتھ فقہ پر بحث کیا کرتی تھیں اور وہ دونوں ان کی بات کو غلط ثابت نہ کر پاتے تھے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق حضرت فاطمہ بن قیس رضی اللہ عنہا نے اول دنوں میں ہجرت کی اور اس وجہ سے ان کے پاس عمیق علم تھا۔

ام سلیم رضی اللہ عنہا جو کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔ ان کو دعوت و تبلیغ میں بہت مہارت حاصل تھی۔

سیدہ نفیسہ رحمۃ اللہ علیہا کی مثال بھی موجود ہے جو کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی پوتی تھیں اور کہتے ہیں کہ انہوں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو تعلیم دی۔

اس کے علاوہ ام دردہ رضی اللہ عنہا ہیں جو کہ ابودردہ رضی اللہ عنہ کی زوجہ تھیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سائنس میں ماہر تھیں اور یہاں تک کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی انہیں اس کا ماہر سمجھتے تھے۔

حدیث مبارکہ ہے:

"طلب العلم فريضة علىٰ كل مسلم و مسلمة"

"علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر یکساں فرض ہے۔"

وہ دور جب خواتین جاہل گردانی جاتی تھیں اور جب عورتوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا، اس وقت اسلام کے پاس علماء خواتین تھیں۔ طب کے میدان میں، سائنس کے میدان میں اور دین کے میدان میں کیونکہ اسلام کہتا ہے کہ ہر خاتون کو پڑھا لکھا ہونا چاہیے۔

اسلام میں عورتوں کے قانونی حقوق:

اسلامی قوانین کے مطابق عورت اور مرد برابر ہیں۔ شریعت اسلامیہ عورت اور مرد دونوں کی زندگی اور وراثت کی حفاظت کرتی ہے۔ اگر ایک مرد عورت کا قتل کرتا ہے اس کو بھی "حرث" کی سزا ملے گی جو کہ قصاص کی سب سے سخت سزا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

"يايها الذين امنو كتب عليكم القصاص فى القتلى الحر بالحر و العبد بالعبد و لانثى بالا نثى فمن عفى له من اخيه شى فاتباع بالمعروف واداء اليه باحسان ذالك تخفيف من ربكم ورحمة فمن اعتدى بعد ذلك فله عذاب اليمo ولكم فى القصاص حيوة ياولى الالباب لعلكم تتقونo"

"اے ایمان والو! تم پر فرض کر دیا گیا ہے کہ تم مقتولوں کے بارے میں

قصاص (یعنی خون کے بدلے خون) لو، آزاد کے بدلے آزاد (مارا جائے) اور غلام کے بدلے غلام مارا جائے اور عورت کے بدلے عورت اور اگر قاتل کو اس کے مقتول بھائی (کے قصاص میں) سے کچھ معاف کر دیا جائے تو (اسے چاہیے کہ وہ مقتول کے وارث کو) دستور کے مطابق خوشی سے کچھ دے، یہ اللہ کی طرف سے تمہارے لئے آسانی اور مہربانی ہے، جو اس کے بعد زیادتی کرے اس کیلئے دردناک عذاب ہے۔ ○ اور تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے عقل والو! تاکہ تم (قتل و خونریزی) سے پرہیز کرو۔ ○"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 2، سورۃ نمبر 2 (البقرۃ)، آیت نمبر 178-179)

اگر مرد عورت کو قتل کرے تو اسے بھی مار دینا چاہیے۔ اسی طرح اگر عورت قتل کرتی ہے تو اس کو بھی موت کی سزا ہے۔ اسلامی قوانین کے حکم "قصاص" کے مطابق عورت و مرد کی تخصیص کیے بغیر، ناک، کان، آنکھ، جسم سب کی سزا ایک سی ہے۔ اگر مقتول کی ولی ایک عورت ہے، نہ وہ قاتل کو معاف کرتی ہے اور نہ ہی دیت قبول کرتی ہے تو اس کا فیصلہ خارج نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مقتول کے ورثاء میں اختلاف ہے کہ دیت لی جائے یا قصاص تو لوگوں کو قصاص سے روکنا چاہیے اور بغیر تخصیص کیے کہ گواہ مرد ہے یا عورت ان دونوں کی اہمیت یکساں ہے۔

سورۃ المائدہ میں ہے:

"والسارق والسارقة فاقطعوا ايديهما جزآء بما كسبا نكالا من الله"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 6، سورۃ نمبر 5 (المائدہ)، آیت نمبر 38)

"اور چور چاہے وہ مرد ہے یا عورت اس کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ ان کے کسب کی سزا اور عبرت ہے اللہ کی طرف سے۔"

معنی یہ ہے کہ اگر کوئی چوری کرتا ہے چاہے وہ مرد ہے یا عورت تو اس کے ہاتھ کاٹ دینے چاہیے۔ سزا دونوں کیلئے یکساں ہے۔

سورۃ النور میں ہے:

"الزانية والزاني فاجلدوا كل واحد منهما مائة جلدة ولا تاخذكم بهما رافة في دين الله ان كنتم تومنون بالله واليوم الاخر و ليشهد عذا بهما طائفة من المومنين٥

"(کنواری) زانی عورت اور (کنوارہ) زانی مرد (جب ان کی بدکاری ثابت ہو جائے تو) دونوں میں سے ہر ایک کو سو درے مارو اور ان پر نرمی نہ کرو اللہ تعالیٰ کے دین میں، اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور چاہیے کہ ان کی سزا پر مسلمانوں کی ایک جماعت کو گواہ بنالو۔٥"

(القرآن الجید، پارہ نمبر 18، سورۃ نمبر 24 (النور)، آیت نمبر 2)

کنوارے مرد اور کنواری عورت کے لیے زنا کی سزا اسلام میں ایک سی ہے جو کہ سو کوڑوں پر مشتمل ہے۔

سورۃ بقرۃ کی آیات کے مطابق عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ گواہی دے سکے۔ اسلام نے عورت کو یہ گواہی کا حق سوا چودہ سو سال پہلے تفویض کر دیا تھا۔ حالانکہ 1980 کی آخری دہائیوں میں یہودی ربی اس بات پر سوچ و بچار کر رہے تھے کہ کیا عورت کو گواہی کے حقوق دیئے جائیں یا نہیں۔ اسلام اس کے مقابلے میں یہ حقوق چودہ سو سال قبل عورت کو دے چکا ہے۔

سورۃ النور میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"والذين يرمون المحصنت ثم لم ياتو باربعة شهدآء فاجلدو هم ثمنين جلدة"

"اور جو لوگ پرہیز گار عورتوں کو بدکاری کا عیب لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسی کوڑے مارو"

(القرآن الکریم، پارہ نمبر 18، سورۃ نمبر 24 (النور)، آیت نمبر 4)

اسلامی قوانین کے مطابق چھوٹے جرم کیلئے دو اور بڑے جرم کیلئے چار گواہ درکار ہیں۔ عورت پر غلط الزام دھرنا اسلام کی رو سے بڑے جرائم میں سے ایک ہے لہٰذا یہ چار گواہ

طلب کرتا ہے۔ آج کل کی ماڈرن سوسائٹی میں آپ دیکھتے ہیں کہ مرد عورتوں کو برے برے ناموں مثلاً: طوائف وغیرہ پکارتے ہیں اور اس پر کوئی مواخذہ نہیں کیا جاتا۔ اسلامی ریاست میں اگر کوئی شخص کسی عورت کو طوائف کہتا ہے۔ عوام میں یا کسی اور جگہ۔ اگر وہ عورت اس شخص کو عدالت میں لے جاتی ہے اور وہ شخص چار گواہوں کو لانے میں ناکام ہو جاتا ہے اور اگر وہ چار گواہ لاتا بھی ہے اور ان میں سے کوئی ایک جھوٹا نکلتا ہے تو وہ سارے اسی اسی کوڑوں کی سزا پائیں گے اور مستقبل میں ان کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔

اسلام عورت کی عزت کو خصوصی اہمیت دیتا ہے۔ عموماً جب لڑکی کی شادی ہوتی ہے تو وہ شوہر کا نام ساتھ لگاتی ہے۔ اسلام میں اس کے پاس یہ Choice موجود ہے کہ چاہے وہ اپنے پہلے نام کو قائم رکھے یا شوہر کا نام ساتھ لگائے یہ اس کی اپنی مرضی ہے۔ اسلام پہلے نام کو قائم رکھنے کو Recommend کرتا ہے اور اگر آپ بعض مسلم معاشروں میں دیکھتے ہیں کہ شادی کے بعد عورت اپنا پہلا نام برقرار رکھتی ہے تو یہ اس وجہ سے ہے کہ مرد و عورت کے حقوق برابر ہیں۔

اسلام میں عورتوں کے سیاسی حقوق:

سورۃ التوبہ میں ہے:

"والمومنون والمومنت بعضهم اولیآء بعض یامرون بالمعروف وینهون عن المنکر ویقیمون الصلوٰۃ ویوتون الزکوٰۃ ویطیعون الله ورسوله اولئك سیرحمهم الله ان الله عزیز حکیم ○"

"اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں کہ اچھائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نماز پڑھتے اور زکوۃ دیتے اور اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن پر عنقریب اللہ رحم فرمائے گا، بیشک اللہ تعالیٰ عزت والا حکمت والا ہے۔ ○"

(القرآن الکریم، پارہ نمبر 10، سورۃ نمبر 9 (التوبہ)، آیت نمبر 71)

اس آیت میں بیان ہوا کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کیلئے سہارا ہیں۔ محض معاشرتی سہارا نہیں بلکہ سیاسی بھی۔ سیاسی طور پر مرد اور عورت کو ایک دوسرے کی مدد (Support) کرنا چاہیے۔

اسلام عورت کو ووٹ کا حق دیتا ہے۔ سورۃ الممتحنہ میں ہے:

"یایھا النبی اذا جآءک المومنت یبایعنک علی ان لا یشرکن باللہ شیئا ولا یسرقن ولا یزنین ولا یقتلن اولادھن ولا یاتین ببھتان یفترینہ بین ایدیھن وارجلھن ولا یعصینک فی معروف فبایعھن واستغفر لھن اللہ ان اللہ غفور رحیمo"

"اے نبی جب آپ کے پاس مومن عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کو آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ نہ تو شریک کریں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ ہی اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ اپنے ہاتھ پاؤں سے کوئی بہتان باندھیں گی تو ان سے بیعت لے لیجئے اور ان کیلئے اللہ سے بخشش طلب کیجئے۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔o"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 28، سورۃ نمبر 60 (الممتحنہ)، آیت نمبر 12)

یہاں عربی کا لفظ "یبایعن" استعمال ہوا ہے اور یہ لفظ ہمارے موجودہ دور کے انتخابات سے زیادہ جدیدیت کا حامل ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محض اللہ تعالیٰ کے رسول ہی نہ تھے بلکہ وہ ریاست کے سربراہ بھی تھے اور عورتیں آپ کے پاس آئیں اور وہ آپ کے سربراہ ہونے پر راضی ہوئیں۔ لہٰذا اسلام عورت کو ووٹ دینے کا برابر حق دیتا ہے۔

عورت قانون سازی میں حصہ لے سکتی ہے۔ مشہور حدیث میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے مہر کے متعلق بات کر رہے تھے کہ آج کل عورتوں نے زیادہ مہر مقرر کرنا شروع کر دیا ہے جس کی وجہ سے اکثر غریب نوجوان مرد شادی کرنے کے معیار پر پورے نہیں اترتے تو پچھلی نشستوں سے ایک عورت اٹھی اور

کہنے لگی:

”اے عمر! جب قرآن نے ہمیں زیادہ حق مہر باندھنے سے نہیں روکا تو آپ کون ہوتے ہیں جو ہمارا حق مہر کم مقرر کریں۔؟ دیکھئے قرآن مجید میں ہے:

”وان اردتم استبدال زوج مکان زوج لا واتیتم احدهن قنطارا فلاتا خذوا منه شیئا اتا خذ ونه بهتانا واثما مبینا ٥“

”اور اگر تم ایک عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت سے شادی کرنا چاہو اور پہلی عورت کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ مت لینا۔ بھلا تم ناجائز طور پر اور صریح ظلم سے اپنا مال اس سے واپس لو گے۔؟“

(القرآن المجید، پارہ نمبر 4، سورۃ نمبر 4 (النساء)، آیت نمبر 20)

”اے عمر! جب اللہ تعالیٰ کو مہر کی حد پر کوئی اعتراض نہیں ہے تو آپ کون ہیں جو مہر کی حد مقرر کریں۔؟“

اسی وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا:

”عمر غلط ہے اور وہ عورت صحیح۔“

حدیث میں عورت کا نام موجود نہیں ہے لہٰذا آپ اسے ایک عام عورت سمجھ سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ ایک ادنیٰ عورت بھی سربراہ ریاست پر اعتراض کر سکتی ہے۔ اگر تکنیکی طور پر دیکھا جائے تو اس حدیث کا یہ مطلب ہوا کہ وہ عام خاتون قوانین کے غلط پہلو پر اعتراض کر رہی تھیں۔

عورتوں نے میدان جنگ میں بھی حصہ لیا۔ الصحیح البخاری میں عورتوں کے میدان جنگ کے حالات کے متعلق ایک پورا باب ہے۔ بخاری شریف میں ہے کہ عورتوں نے زخمیوں کو پانی پلایا، انہوں نے مجاہدوں کو ابتدائی طبی امداد دی اور حضرت نسیبہ رضی اللہ عنہا کا نام خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

”الرجال قوامون على النساء“

''مرد عورتوں کے محافظ ہیں۔''

لہٰذا عام حالات میں عورتوں کو میدان جنگ میں نہیں جانا چاہیے کیونکہ ان کی حفاظت کرنا مردوں کی ذمہ داری ہے۔ لہٰذا عورتیں کو صرف اشد ضرورت کے موقع پر ہی میدان جنگ میں حصہ لینا چاہیے۔ ورنہ! دوسری صورت میں آپ کی پوزیشن ویسی ہی ہو جائے گی جیسا کہ USA کی ہے۔ وہاں عورتوں کو میدان کارزار میں حصہ لینے کی 1901 تک آزادی تھی لیکن وہ صرف نرسنگ تک محدود تھیں۔ جب 1973 میں "Feminst Movement" شروع ہوئی اور انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ عورتوں کو بھی اجازت ہونی چاہئے کہ وہ بھی میدان جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ لہٰذا امریکہ حکومت نے 1976 کے بعد سے عورت کو جنگ کرنے کا اختیار دے دیا۔

پچھلے سال امریکہ کی وزارت دفاع کے جاری کئے گئے بیان کے مطابق 24 اپریل 1993 کے سال میں ایک کنونشن میں نوے افراد زنا کرتے پکڑے گئے۔ جن میں تراسی عورتیں اور ایک سو تیرہ آفیسر کو ڈسپلنری ایکشن چارج کیا گیا۔ اندازہ کریں کہ صرف ایک کنونشن میں تراسی عورتوں کو Sexually Assault کیا گیا۔ 117 آفیسرز کا جرم کیا تھا۔؟ انہوں نے عورتوں کو دوڑایا، ان کے کپڑے پھاڑ ڈالے، انہوں نے انہیں مادر زاد برہنہ مارچ کروائی اور ان کو پبلک کے سامنے سیکس کرنے پر مجبور کیا گیا۔ کیا آپ اسے Women's Right کہہ سکتے ہیں۔؟

اس واقعہ کی وجہ سے پارلیمنٹ میں ہنگامہ کھڑا ہوا اور صدر بل کلنٹن کو بذات خود عوام کے سامنے معذرت کرنا پڑی اور یہ کہنا پڑا:

''ضروری اقدامات کئے جائیں گے۔''

لہٰذا اسلام عورتوں کو اسی وقت میدان جنگ میں حصہ لینے کی اجازت دیتا ہے جب ان کی ضرورت ہو، لیکن اس صورت میں بھی چاہیے کہ وہ اپنا حجاب، اسلامی حدود و قیود اور اپنی شرم و حیاء کا خیال رکھیں۔

اسلام مرد اور عورت کی برابری میں یقین رکھتا ہے۔ یہاں برابری کا مطلب یکسانیت نہیں ہے۔

مثال کے طور پر ایک کلاس روم میں دو طالب علم A اور B امتحان میں فرسٹ آتے ہیں۔ دونوں 100 میں سے 80 فیصد نمبر لیتے ہیں۔ سینکڑوں طالب علموں میں دو طالب علم A اور B فرسٹ آئے۔ جب آپ "Question Paper" دیکھتے ہیں تو "Question Paper" میں سوالات ہوتے ہیں۔ ہر ایک کے دس نمبر۔ سوال نمبر 1 میں طالب علم A 10 میں سے 9 نمبر حاصل کرتا ہے اور طالب علم B 10 میں سے 7۔ سوال نمبر 1 میں طالب علم A کے نمبر B سے زیادہ ہوئے اور سوال نمبر 2 میں A دس میں سے 7 نمبر لیتا ہے اور B دس میں سے 9۔ لہٰذا دوسرے سوال میں B کے نمبر زیادہ ہوئے۔ البتہ سوال نمبر 3 میں دونوں آٹھ آٹھ نمبر حاصل کرتے ہیں۔ دونوں برابر اور آخر میں جب ہم تمام نمبروں کو جمع کرتے ہیں تو دونوں طالب علم A اور B سو میں سے 80 نمبر لیتے ہیں۔

لہٰذا مختصراً A Student اور B آپس میں برابر ہیں اور بعض سوالات میں A کے نمبر B سے زیادہ ہیں اور بعض سوالات میں B کے نمبر A سے زیادہ ہیں۔ باقیوں میں دونوں برابر ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مردوں کو زیادہ طاقت دی ہے۔ مثلاً: ایک چور گھر میں داخل ہوتا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ میں Women's Right میں یقین رکھتا ہوں تو کیا آپ اپنی والدہ، بہن یا بیٹی سے کہیں گے کہ آگے بڑھو اور چور سے لڑو۔ لہٰذا جسمانی طور پر مرد عورت سے ایک درجہ فضیلت رکھتا ہے۔

آیئے! ایک اور مثال سمجھتے ہیں جو کہ والدین کی عزت سے متعلق ہے۔ بچوں کو اس بات پر ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ ماں کا احترام باپ کی نسبت تین گنا زیادہ کریں۔ یہاں عورتیں مردوں سے ایک درجہ اوپر ہیں۔

مجموعی طور پر دونوں برابر ہیں۔ لہٰذا اسلام برابری میں یقین رکھتا ہے۔ یکسانیت میں نہیں۔ مجموعی طور پر مرد اور عورت اسلام میں برابر ہیں۔ یہ اسلام میں عورتوں کے حقوق کی محض چیدہ چیدہ خصوصیات تھیں۔

اس کے بعد مسلم معاشروں نے کیا امتیاز روا رکھا۔ بعض مسلم معاشروں نے عورتوں کو ان کے حقوق سے محروم کیا اور انہوں نے قرآن اور سنت سے روگردانی کی۔ اس کی بڑی وجہ

مغربی معاشرہ ہے کیونکہ مغربی معاشرے کی وجہ سے مسلم معاشرے زیادہ تحفظات و احتیاطوں کا شکار ہو گئے، وہ ایک انتہا پر چلے گئے اور اس طرح وہ قرآن وسنت سے دور چلے گئے۔ اس کے مقابلے میں بعض مسلم معاشروں نے مغربی کلچر کو اپنا لیا اور اسی رنگ میں رنگ گئے۔ میں مغربی معاشرے کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر آپ قرآن وسنت کے مطابق عورتوں کے حقوق کا تجزیہ کریں تو آپ اسے جدید پائیں گے نہ کہ فرسودہ۔

اعتراضات اور ان کے جوابات:

اعتراض نمبر 1:...... کثرت ازدواج سے کیا مراد ہے؟ اس کی وجوہات کیا ہیں اور کس ضرورت کے تحت کثرت ازدواج کی اجازت دی گئی ہے۔؟

جواب: صرف اور صرف ایک صورت میں مرد کو ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی اجازت ہے اور وہ صورت انصاف واعتدال ہے۔ مرد چار شادیاں کر سکتا ہے اگر وہ بیویوں میں انصاف کر سکتا ہو تو۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو پھر اسے صرف ایک بیوی پر موقوف رہنا ہو گا، لیکن یہاں بعض اور وجوہات بھی ہیں جن کی وجہ سے ایک سے زیادہ شادیاں کرنا دانش مندی کا تقاضا ہے۔ ان میں سے ایک وجہ ان عورتوں کی زیادتی ہے جن کو شوہر نہیں مل پاتے۔ اسلام نے کثرت ازدواج کو اس لئے فروغ دیا ہے تاکہ عورت کی عصمت اور عزت ووقار قائم رہے۔ مثال کے طور پر ایک جوان عورت ہے، اس کی شادی ہوئی، شادی کے چند ماہ بعد اس کا کوئی Accident ہوا اور وہ معذور ہو گئی۔ اس طرح وہ شوہر کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی۔ مرد کے پاس صرف ایک صورت بچتی ہے کہ یا تو وہ پہلی بیوی کو قائم رکھے جو کہ معذور ہے اور ایک بیوی اور کرے یا پہلی بیوی کو طلاق دے دے اور نئی شادی کر لے۔ فرض کریں کہ آپ کی بہن وہ بدقسمت خاتون ہیں جو کہ معذور ہوئی ہیں۔ آپ کس بات کو ترجیح دیں گے۔؟ کیا آپ اس بات کو ترجیح دیں گے کہ آپ کا بہنوئی آپ کی بہن کو طلاق دے کر نئی شادی کرے؟ یا پھر آپ یہ چاہیں گے کہ آپ کا بہنوئی پہلی شادی قائم رکھتے ہوئے دوسری بیوی کرے۔؟ ایسے بہت سے واقعات ہوتے ہیں جن میں بیوی بہت زیادہ بیمار ہو جاتی ہے، وہ کسی ایسے مرض کا شکار ہو سکتی ہے جس میں وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرنے کے قابل رہتی ہے اور نہ ہی اپنے شوہر کی۔ ایسی صورت حال میں اس

بیوی کیلئے بہتر ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ایک اور بیوی کی موجودگی میں رہ لے جو کہ اس کے شوہر کے ساتھ ساتھ اس کے بچوں کی بھی دیکھ بھال کرے گی۔ بہت سے لوگ یہ اعتراض کریں گے کہ وہ شخص ملازم کیوں نہیں رکھ لیتا۔؟ میں آپ سے بالکل متفق ہوں کہ آپ ملازم بھی رکھ سکتے ہیں جو کہ آپ کے بچوں کی دیکھ بھال کرے لیکن اس صورت میں آپ کی دیکھ بھال کون کرے گا۔؟ آپ کی جسمانی و نجی ضروریات کا خیال کون رکھے گا۔؟ لہٰذا بہترین طریقہ یہی ہے کہ آپ پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری بیوی لے آیئے اور دونوں کے ساتھ منصفانہ برتاؤ رکھیے۔

آپ ایسی صورتحال سے بھی دوچار ہو سکتے ہیں کہ شادی کے کئی سال بعد بھی آپ کے گھر اولاد نہ ہو اور شوہر اور بیوی دونوں کو اولاد کی شدت سے کمی محسوس ہو رہی ہو اور عورت خوشی سے اپنے شوہر کو اجازت دے کہ وہ دوسری شادی کرے اور اس طرح ان کے گھر اولاد ہو جائے۔ بہت سے لوگ یہ اعتراض کریں گے کہ وہ ایک بچہ کیوں Adopt نہیں کر لیتے۔ اسلام Adoption کی اجازت نہیں دیتا۔ جس کی کچھ وجوہات ہیں۔ میں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہوں گا۔ یہاں صرف ایک صورت ہی رہ جاتی ہے کہ وہ پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرے اور دونوں ازواج میں منصفانہ رویہ رکھے۔

اعتراض نمبر 2:...... کیا عورت وزیراعظم یا صدر (Head of State) ہو سکتی ہے۔؟

جواب:...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”وہ لوگ جن کی سربراہ عورت ہو وہ کامیاب نہ ہوں گے۔؟“

علماء کرام کہتے ہیں کہ اسلامی ریاست کے سربراہ کا یہ حق ہے کہ وہ جماعت کروائے، جمعہ قائم کرے، عدل و انصاف قائم کرے اور خود قاضی بنے۔ اگر عورت ریاست کی سربراہ ہو تو اس کو باجماعت نماز کی امامت کرانا ہوگی اور اس دوران وہ قیام، رکوع و سجود وغیرہ کرے گی اور ایسا اگر وہ جماعت کے سامنے کرتی ہے تو میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نماز میں خلل آئے گا۔

اگر وہ آج کے ماڈرن دور میں ریاست کی سربراہ ہے تو دوسرے سربراہ مملکت کے

ساتھ (جو عموماً مرد ہوتے ہیں) اس کو بند کمرے میں گفتگو (Meetings) کرنا ہوں گی جہاں دوسروں کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہوتی اور اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا، کیونکہ اسلام عورت کو نامحرم کے ساتھ اکیلا ہونے کی اجازت نہیں دیتا اور پھر ایک مرد دوسرے ملک سے تعلق رکھنے والا......؟ اسلام میں مخالف جنس کے افراد کے ساتھ مل بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔

سربراہ مملکت کی اکثر پبلسٹی کیلئے ویڈیو بنتی ہیں، فوٹوگرافی ہوتی ہے، اکثر اوقات اس میں دوسرے سربراہان مملکت کے ساتھ نزدیکی تعلقات استوار نظر آتے ہیں اور دوسرے معززین کے ساتھ بھی۔ لہٰذا آپ کسی عورت کی تصویریں جو کہ سربراہ مملکت ہے، مثلاً: مارگریٹ تھیچر کی مثال رکھ سکتے ہیں۔ آپ اس کی تصاویر دیکھتے ہیں جن میں وہ دوسرے سربراہان مملکت کے ساتھ مصافحہ کر رہی ہوتی ہے۔ جس کی اسلام میں قطعی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے سربراہ مملکت ہونا مرد کیلئے ہی مخصوص ہے۔

اگر عورت سربراہ مملکت (Head of State) ہے تو اس کو عام آدمی سے ملنا ہو گا۔ ان کی مشکلات حل کرنا ہوں گی اور سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ مخصوص ایام کے دوران عورت کے رویہ میں تبدیلی آتی ہے کیونکہ وہ ان ایام میں "Hormonestogene" خارج کرتی ہے اور یہ تبدیلیاں بہر طور اس کے قوت فیصلہ پر اثر انداز ہوں گی۔

سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ عورت کے پاس مرد کی بہ نسبت زیادہ "Verbal and Vocal Skills" ہیں اور مرد کے پاس زیادہ قوت تخیل "Specialiatity" یعنی مستقبل میں جھانکنے کی قوت ہوتی ہے اور سربراہ مملکت کیلئے یہ چیز اشد ضروری ہے۔ عورت کو "Verbally and Locally" مرد کے اوپر برتری دی گئی ہے کیونکہ بطور ماں اسے اس چیز کی ضرورت ہے۔

عورت حاملہ بھی ہو سکتی ہے اور اس دوران اسے لازمی آرام درکار ہوتا ہے۔ چند ماہ کیلئے تو خصوصاً اسے آرام کرنا پڑتا ہے۔ اس صورت میں مملکت کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ بہر حال یہ عمومی طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک مرد عورت کے مقابلے میں بہتر طور پر باپ اور سربراہ مملکت کی ذمہ داریاں نبھا سکتا ہے۔ لہٰذا میرا جھکاؤ ان سکالرز کی طرف زیادہ

ہے جو یہ کہتے ہیں کہ عورت کو سربراہ مملکت نہیں ہونا چاہیے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورت فیصلہ کرنے میں حصہ نہیں لے سکتی۔ عورتوں کو ووٹ (Vote) دینے کا حق ہے۔ ان کو قانون سازی میں حصہ لینے کا حق ہے۔ صلح حدیبیہ کے دوران حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سہارا دیا اور انہیں مشورہ دیا۔ اس وقت جب کہ پوری مسلم امت پریشان تھی۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سہارا دیا۔ جیسا آپ جانتے ہیں کہ صدر یا وزیر اعظم "سربراہ" ہوتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر ان کی PA یا سیکرٹریز بھی فیصلہ کرتی ہیں۔ لہٰذا یقیناً عورت مملکت کے اہم فیصلوں میں مرد کی مدد کر سکتی ہے۔

اعتراض نمبر 3:...... کیا قرآن مجید یہ سکھاتا ہے کہ عورت اور مرد کے حقوق یکساں ہیں۔؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو پھر عورت کیلئے پردہ کیوں ہے۔؟ پردہ مرد اور عورت کے درمیان فاصلہ بنتا ہے۔

جواب:...... اسلام پردہ کا حکم کیوں دیتا ہے۔؟ اگر آپ قرآن مجید میں عورت کے حجاب سے متعلق پڑھیں تو اس سے پہلے آپ کو مردوں کے حجاب کا حکم ملے گا۔

سورۃ النور میں ارشاد ہوتا ہے:

"قل للمومنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم ذلك ازکی لھم ان اللہ خبیر مبما یصنعونo"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 18، سورۃ نمبر 24 (النور)، آیت نمبر 30)

"مومن مردوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں، یہ ان کیلئے بڑی پاکیزگی کی بات ہے اور جو کام یہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے باخبر ہے۔o"

اس سے اگلی ہی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

"وقل للمومنت یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن"

(القرآن المجید، پارہ نمبر 18، سورۃ نمبر 24 (النور)، آیت نمبر 31)

''اور مومن عورتوں سے فرما دیجئے کہ وہ بھی اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر جو اس میں سے ظاہر ہو (جس کا ظاہر ہونا ناگزیر ہے) اور وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں۔''

پردہ ہر ایک سے ہے ماسوائے اپنے باپ، بیٹے، شوہر اور بعض اور رشتے داروں کے...... اور نامحرم کی ایک لمبی فہرست ہے یعنی ہر وہ رشتہ دار جس کے ساتھ شادی ہو سکتی ہے۔

میں نے حجاب کی چھ شرائط قرآن مجید اور احادیث سے معلوم کی ہیں۔ وہ چھ شرائط اس سلسلے میں ہیں:

پہلی شرط یہ کہ مرد اپنی ناف سے لے کر گھٹنوں تک کو ڈھانپے رکھے اور عورت کیلئے اس کا پورا جسم ماسوائے چہرہ اور ہاتھوں کے ڈھانپنا ضروری ہے۔ اگر وہ ان کو بھی ڈھانپنا چاہتی ہے تو بہت بہتر۔

دوسری شرط یہ ہے کہ جو کپڑے وہ پہنتے ہیں اتنے چست نہیں ہونے چاہئیں کہ وہ اس کے جسم کی نمائش کریں۔

تیسری شرط یہ کہ وہ ایسے کپڑے نہ پہنے جن کے آر پار دیکھا جا سکتا ہو۔

چوتھی شرط یہ کہ وہ شوخ کپڑے نہ پہنے جو کہ دوسری صنف کو اپنی طرف کھینچنے کا کام کریں۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ ایسے کپڑے نہ پہنے جائیں جو کہ مخالف صنف کے لئے مخصوص ہوں اور ان کی مشابہت لیے ہوں۔ جیسا کہ آپ مردوں کو بالی پہنے دیکھتے ہیں۔ اگر آپ ایک بالی پہنتے ہیں تو یہ کچھ اور ظاہر کرتا ہے۔ اگر آپ دونوں کانوں میں پہنتے ہیں تو پھر یہ کچھ اور ظاہر کرتا ہے۔ یہ اسلام میں منع ہے۔

اور چھٹی شرط یہ ہے کہ آپ کو ایسے کپڑے نہ پہننے چاہئیں جو کہ اس بات کی غماز ہوں کہ آپ دہریئے یا کافر ہیں۔

آیئے! دوبارہ سوال کی جانب بڑھتے ہیں کہ اسلام پردے میں اور مخالف جنسوں کے

درمیان فاصلہ میں یقین کیوں رکھتا ہے۔؟ آیئے! دیکھتے ہیں وہ سوسائٹی جو پردہ کی حامی ہے اور وہ جو کہ پردہ کے خلاف ہے۔

امریکہ وہ ملک ہے جہاں سب سے زیادہ جرائم ہوتے ہیں۔ FBI کی 1990 کی رپورٹ کے مطابق 10255 خواتین کے ساتھ زنا کیا گیا۔ یہ صرف وہ کیسسز ہیں جن کی رپورٹ درج کرائی گئی ہے اور رپورٹ کہتی ہے کہ یہ کل جرائم کا صرف 16% ہے۔ اگر آپ صحیح فگر چاہتے ہیں تو 10255 کو 6.25 کے ساتھ ضرب دیں تو یہ بتاتی ہے کہ صرف 1990 میں 640000 عورتوں کے ساتھ زنا کیا گیا۔ اگر آپ اس کو 360 دنوں پر تقسیم کریں تو یہ 1756 کا ہندسہ بنتا ہے۔ یعنی ہر روز 1756 خواتین کے ساتھ زنا کیا گیا۔ رپورٹ کے مطابق 1991 میں 1900 خواتین کے ساتھ زنا کیا گیا ہر دن۔ امریکی اور دلیر ہو گئے جیسا کہ 1993 کی رپورٹ میں ہے جو خزاں میں شائع ہوئی کہ ہر 1.3 منٹ میں ایک زنا کا کیس ہوا۔ آپ جانتے ہیں کیوں۔؟ کیوں کہ وہاں پردہ نہیں ہے۔

امریکہ نے عورت کو زیادہ حقوق دیئے ہیں اور وہیں زیادہ عورتیں کے ساتھ زنا ہو رہے ہیں۔ ان 16% کیسوں میں صرف 10% کو سزا دی گئی یعنی صرف 1.6% کو حراست میں لیا گیا۔ جن میں سے 7 آدمیوں کو مقدمہ کے دوران بری کر دیا گیا یعنی پیچھے صرف 0.8% کیس بچے جن پر مقدمہ بنا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ایک آدمی 125 خواتین کے ساتھ زنا کرتا ہے تو آپ اسے صرف ایک بار حراست میں لیں گے۔ امریکی قانون کے تحت زنا کی سزا عمر قید ہے لیکن وہ ہر آدمی کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ صرف پہلی بار ہوا ہے کہ اس نے زنا کیا ہے اور پکڑا گیا ہے۔ اس کو ایک چانس دیتے ہیں اور کم مدت کی سزا دی جاتی ہے۔

حتیٰ کہ انڈیا میں "National Crime Bureau" کی رپورٹ موجود ہے جو کہ یکم دسمبر 1992 کو ایک اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ اس رپوٹ کے مطابق ہر 54 منٹ بعد انڈیا میں زنا کا ایک کیس درج ہوتا ہے۔ ہر 26 منٹ کے بعد چھیڑ چھاڑ کا کیس اور ایک گھنٹے 43 منٹ بعد جہیز کی وجہ سے قتل کا ایک کیس ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ اگر آپ اس ملک کے تمام اعداد و شمار کو جمع کریں تو ہر دو منٹ کے بعد

ایک زنا کا کیس ملتا ہے۔ اگر آپ ہر عورت کو حجاب کرنے کو کہیں تو کیا یہ کیس کم ہوں گے، بڑھیں گے یا برابر رہیں گے۔؟ اگر آپ انڈیا میں عمل درآمد کریں تو کیا یہ کم ہوگا، بڑھے گا یا کہ برابر رہے گا۔؟ یقیناً ایسا کرنے سے زنا بہت کم ہو جائے گا۔ آپ کو اسلام تمام حوالوں سے سمجھنا ہوگا۔ اس کے باوجود کہ عورت حجاب لیتی ہے یا نہیں مرد کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھے اور اس کے بعد اگر وہ پھر بھی زنا کا مرتکب ہوتا ہے تو اسلام میں اس کی کڑی سزا ہے۔ آپ اسے "Barbaric Law" کہتے ہیں۔

میں نے یہی سوال بعض مردوں سے پوچھا کہ فرض کریں کہ آپ کی بہن کے ساتھ زنا کیا گیا اور آپ کو جج بنایا گیا۔ اس بات کو چھوڑ دیں کہ اسلام کیا کہتا ہے، انڈیا کا قانون کیا کہتا ہے اور امریکی قانون آپ کو کیا بتاتا ہے۔ اگر آپ کو جج بنایا گیا ہے تو آپ مجرم کو کونسی سزا دیں گے۔؟ سب نے یہی کہا کہ "موت کی سزا" بعض انتہا پہ چلے گئے کہ ہم اسے موت آنے تک ٹارچر کریں گے۔ اب اگر میں آپ سے پوچھنا چاہوں کہ اگر اسلامی شریعت کو امریکہ میں لاگو کرایا جائے تو کیا زنا کے کیس بڑھیں گے، کم ہوں گے یا برابر رہیں گے۔؟ اگر آپ اسلامی شریعت کو انڈیا میں لاگو کرتے ہیں تو کیا یہ کم ہوں گے یا بڑھ جائیں گے۔؟

آپ کہتے ہیں کہ آپ نے عورت کو تمام حقوق تفویض کیے ہیں لیکن عملی طور پر آپ نے اسے محض داشتہ بنا کے رکھ چھوڑا ہے۔ میں صرف پردہ کے موضوع پر دنوں تک بول سکتا ہوں اور میں اپنا جواب ایک مثال کے ذریعے دینا چاہوں گا کہ دو عورتیں، دو بہنیں جڑاوں ایک جیسی خوبصورت گلی میں جا رہی ہیں اور ایک اوباش گلی کی نکر پر ان کو پکڑنے کیلئے کھڑا ہے۔ نقصان پہنچانے کی خاطر۔ دونوں بہنیں ایک جیسی خوبصورت ہیں۔ ایک نے اسلامی حجاب لیا ہوا ہے اور دوسری نے منی سکرٹ پہن رکھا ہے۔ کس لڑکی کو اوباش پکڑے گا۔؟ فطری طور پر اسے پکڑے گا جو کہ سکرٹ پہنے ہوئے ہے۔ اگر لڑکی نے عام شلوار قمیض پہن رکھی ہے، سر کھلا ہے، شلوار قمیض چست ہو سکتی ہے اور دوسری لڑکی نے حجاب لے رکھا ہے تو وہ اوباش کس لڑکی کو چھیڑے گا۔ لازمی طور پر سے جو کہ حجاب کے بغیر ہے۔ یہ عملی ثبوت ہے اس بات کا کہ اسلام میں حجاب کا حکم کیوں دیا گیا۔؟ عورت کو کم تر ثابت کرنے کیلئے حجاب کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ اس کی عصمت کی حفاظت کیلئے پردہ کا حکم دیا گیا۔

اعتراض نمبر 4:...... اسلام کیوں مرد کو یہ اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کی عورت سے جو اہل کتاب ہو شادی کر سکتا ہے جبکہ عورت کو اس کی اجازت نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ قرآن مجید خود مشرک مرد وعورت سے نکاح کرنے سے منع کرتا ہے اور یہاں اہل کتاب کی عورت سے شادی کرنے کو جائز قرار دیتا ہے۔ کیا موجودہ عیسائی یا یہودی عورتیں مشرک نہیں۔؟

جواب:...... قرآن مجید کی سورۃ المائدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

"آج کے دن سے تمہارے لئے یہ قانون ہے وہ سب کچھ جو اچھا اور خالص ہے، اہل کتاب کی خوراک تمہارے لئے جائز قرار دے دی گئی ہے اور تمہاری خوراک ان کیلئے جائز اور اس کے علاوہ جو کہ ایمان والی ہیں، حتیٰ کہ اہل کتاب میں سے بھی جو کہ باعصمت ہیں تمہارے لئے حلال ہیں۔o"

(القرآن المجید، سورۃ نمبر 6 (المائدۃ)، آیت نمبر 5)

اسلام مرد کو اہل کتاب کی باعصمت عورت سے شادی کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ کیوں؟ کیونکہ جب عیسائی یا یہودی عورت ایک مسلمان مرد سے شادی کرتی ہے تو شادی کے بعد اس کے شوہر کی فیملی اس کو برا نہیں کہے گی۔ نہ ہی اس کے نبی کو۔ ہم مسلمان عیسائیوں کے تمام انبیاء پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم حضرت آدم علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں۔ لہٰذا جب ہم تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان رکھتے ہیں تو عورت کا مذاق نہیں اڑایا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام مرد کو اہل کتاب کی لڑکی سے شادی کی اجازت دیتا ہے، جبکہ عورت کو اس کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ عورت کی جب عیسائی یا یہودی کے ساتھ شادی ہوگی تو اس کا قبیلہ مسلمان عورت کو طعنہ وتشنیع کا نشانہ بنائے گا کیونکہ وہ ہمارے نبی علیہ السلام پر ایمان نہیں رکھتے۔ اسی وجہ سے مسلمان عورت کا اہل کتاب کے مرد سے شادی کرنا ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

اب سوال کے دوسرے حصے کی جانب آتے ہیں کہ کیا وہ اہل کتاب خواتین مشرکات میں نہیں آتیں۔ سورۃ البقرۃ آیت نمبر 221 میں ہے:

"مشرک عورتوں سے شادی نہ کرو حتیٰ کہ وہ ایمان لے آئیں حتیٰ کہ ایک مومنہ جو کہ غلام ہے وہ مشرک عورت سے بہتر ہے چہ جائے کہ وہ مشرک عورت تمہیں لبھاتی ہی کیوں نہ ہو۔"

ملکہ انگلستان مشرک، امیر اور خوبصورت ترین عورت ہے اور اس کے مقابلے میں ایک غلام عورت ہے جو کہ زہد والی ہے، اللہ ورسول پر ایمان رکھتی ہے تو وہ ملکہ انگلستان سے کئی گنا بہتر ہے۔

سورۃ المائدۃ کی نمبر 72 میں ہے:

"وہ کفر بول رہے ہیں، کفر کر رہے ہیں وہ جو یہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں۔ O "لیکن عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں: "اے بنی اسرائیل! اللہ کی عبادت کرو جو کہ میرا رب ہے اور تمہارا بھی اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود ٹھہرائے، اللہ اس کیلئے جنت کو حرام کردے گا اور اس کا کوئی مددگار نہ ہوگا اور آگ اس کا ٹھکانہ ہوگی۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ماننے والے مشرک ہیں۔ آپ سوچیں گے اور کہیں گے کہ قرآن مجید کی ایک آیت کہہ رہی ہے کہ اہل کتاب کے ساتھ شادی کرنا جائز ہے، دوسری آیت کہہ رہی ہے کہ اہل کتاب مشرک ہیں اور تیسری آیت میں ہے کہ مشرکین کے ساتھ نکاح جائز نہیں۔ آخر حقیقت کیا ہے۔؟ سامعین! قرآن مجید کو مجموعی طور پر سمجھنا چاہیے۔ سورۃ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے:

"کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر و تومنون باللہ ولو امن اھل الکتب لکان خیرا لھم منھم المومنون واکثرھم الفسقونO"

(القرآن المجید، سورۃ نمبر 3 (آل عمران)، آیت نمبر 110)

"(اے ایمان والو!) تم بہترین امت ہو، تمہیں لوگوں سے چنا گیا ہے تاکہ تم نیکی کا حکم دو اور برائی سے منع کرو اور تم اللہ پر ایمان لاتے ہو اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے تو ان کیلئے بہت اچھا ہوتا، ان میں بعض ایمان والے بھی ہیں اور اکثر نافرمان ہیں۔ O"

لہذا قرآن مجید سے ثابت ہو گیا کہ اہل کتاب میں بعض وہ بھی ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا رسول و نبی تسلیم کرتے ہیں اور وہ عقائد عیسیٰ علیہ السلام پر ہیں۔ لہذا قرآن مجید فرما رہا ہے کہ اے مومنو! تمہیں اہل کتاب کی ان عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت ہے جو اس بات پر ایمان رکھتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا نہیں اور نہ ہی خدا کے بیٹے ہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

اعتراض نمبر 5:...... اسلام میں عورت کو وصیت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے۔؟

جواب:...... اسلام میں عورت کو اس کو اپنی مرضی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔؟ یہ بالکل غلط ہے۔ اسلام کے مطابق کوئی بالغ خاتون جو کہ میچور ہے وہ شادی شدہ ہو یا کنواری وہ اپنی مرضی سے وراثت بیچ سکتی ہے۔ ہاں! اگر وہ بالغ نہیں ہے تو وہ ایسا نہیں کر سکتی کیونکہ وہ میچور نہیں ہے۔ میچور نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے حقوق استعمال نہیں کر سکتی۔ کوئی بھی عورت بلا تخصیص اس کے کہ وہ شادی شدہ ہے یا غیر شادی اسے اجازت ہے کہ وہ اپنی وراثت بیچ سکتی ہے۔ اگر وہ مشورہ چاہتی ہے تو لے سکتی ہے۔ اگر مشورہ نہیں لینا چاہتی تو نہ لے۔ اسے وصیت کرنے کی بھی اجازت ہے۔ اسلام اس بات سے اسے منع نہیں کرتا۔ جب ایک چیز کو بیچ دینے کا حق اس کے پاس محفوظ ہے تو وصیت کا کیوں نہیں۔؟

اعتراض نمبر 6:...... مسلمانوں کا کہنا ہے کہ اسلام مرد و عورت کو یکساں حقوق دیتا ہے، حالانکہ مرد کو چار بیویوں کی اجازت ہے اور عورتیں اس عنایت سے محروم ہیں۔ مرد شادی کے بعد بھی دوسری عورت کے متعلق سوچ سکتا ہے تو عورت دوسرے مرد کے بارے میں کیوں نہیں سوچ سکتی۔؟

جواب:...... پہلی بات یہ کہ آپ کو یہ خیال کرنا ہوگا کہ عورت کی بہ نسبت مرد زیادہ Sexual ہے۔ دوسرا نقطہ یہ کہ مرد Biolegically ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ ازدواجی تعلقات تندرستی کے ساتھ سرانجام دے سکتا ہے جب کہ ایک عورت ایک سے زیادہ شوہر رکھتی ہے تو ایسا کرنے سے قاصر ہے۔ میڈیکل سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ عورت اپنے ماہانہ ایام کے دوران جسمانی و ذہنی تبدیلیوں سے گزرتی ہے اور زیادہ

تر لڑائی جھگڑے انہیں خاص ایام میں ہوتے ہیں۔ امریکہ کے عورتوں کے جرائم ریکارڈ کے مطابق عورتوں نے جو جرائم کیے ان میں سے زیادہ تعداد ان عورتوں کی تھی جو اپنے ماہانہ ایام سے گزر رہی تھیں۔ لہٰذا اگر عورت کے ایک سے زیادہ شوہر ہیں تو اس کیلئے ذہنی طور پر مطمئن (Adjest) ہونا زیادہ مشکل ہے۔

میڈیکل سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ اگر ایک عورت کے ایک سے زیادہ شوہر ہیں تو جنس میں منتقلی جراثیم کا زیادہ خدشہ ہے، اس کے ساتھ ساتھ (Venereal) جراثیم کا بھی اور وہ اس کو شوہر میں منتقل بھی کر سکتی ہے۔ جب کہ مرد نے اگر زیادہ شادیاں کی ہوں تو اس صورت میں یہ ممکن نہیں۔ یعنی اگر عورت ایک سے زیادہ شادیاں کرے تو بیماری پھیلنے کا خدشہ ہے لیکن اگر مرد زیادہ شادیاں کرے تو بیماری پھیلنے کا خدشہ نہیں۔

فرض کریں کہ ایک آدمی کی ایک سے زیادہ بیویاں ہیں اور اس کے بچے بھی ہیں تو اس صورت میں والدین کی شناخت بآسانی ممکن ہے یعنی والد کو شناخت کیا جا سکتا ہے اور والدہ کو بھی۔ لیکن دوسرے کیس میں اگر عورت کے ایک سے زیادہ شوہر ہیں تو آپ صرف والدہ کی شناخت کر سکتے ہیں والد کی نہیں۔ اسلام حسب ونسب کی شناخت پر خصوصی زور دیتا ہے اور سایکالوجسٹ ہمیں بتاتے ہیں کہ اگر بچہ اپنے والدین کو شناخت نہ کر سکے تو وہ ذہنی صدمہ سے گزرتا ہے۔ اس بات میں کوئی حیرت نہیں کہ طوائفوں کے بچے بڑی کیفیت میں زندگی بسر کرتے ہیں اور اگر بچہ کو سکول میں داخل کرانا پڑتا ہے اور اس سے باپ کا نام پوچھا جاتا ہے تو اس کو کم از کم دو نام دینا ہوں گے اور آپ جانتے ہیں کہ اس بچے کو کیا کہا جائے گا۔؟

ایسی بہت سی وجوہات ہیں جن کی بنا پر عورت کو زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت نہیں دی گئی اور اس بات کے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے میں آپ کو وہ وجوہات بتا سکتا ہوں جن کی بنا پر کثرت ازدواج کی اجازت دی گئی۔

مثال کے طور پر شوہر اگر بانجھ ہے تو بیوی دوسرا شوہر نہیں کر سکتی ہیں کیونکہ کوئی ڈاکٹر اس بات کی گارنٹی نہیں دے سکتا کہ شوہر سو فیصد بانجھ ہے۔ حتیٰ کہ اگر آپ نس بندی بھی کراتے ہیں تو پھر بھی کوئی ڈاکٹر آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ شخص باپ نہیں بن سکتا لہٰذا

اگر عورت کے زیادہ خاوند ہوں اور ایک کے سوا باقی سب نے نس بندی کروادی ہو تو اس صورت میں بھی بچہ کی شناخت میں شبہ آ جاتا ہے۔

دوسرا کیس کہ اگر شوہر کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جاتا ہے یا وہ بہت زیادہ بیمار ہو جاتا ہے تو کیا بیوی دوسرا شوہر نہیں کر سکتی۔؟ آیئے! اس بات کی تہہ تک جاتے ہیں۔ اگر شوہر بیمار ہے اور وہ کام سر انجام نہیں دے سکتا۔ وہ اپنے خاندان کی معاشی ضروریات پوری نہیں کر پاتا اور بیوی کو بھی جنسی طور پر مطمئن نہیں کر پاتا۔

پہلی صورت میں اگر وہ بچوں اور بیوی کی ضروریات کو پورا نہیں کر پاتا تو وہ زکوۃ لے سکتے ہیں۔ دوسری صورت میں میڈیکل سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ بیوی کو جسمانی طور پر شوہر کی کم ضرورت ہوتی ہے اور اگر پھر بھی وہ مطمئن نہیں ہو پاتی تو وہ خلع لے سکتی ہے۔ یہاں بیوی کے لئے خلع زیادہ بہتر ہے کیونکہ جب بیوی طلاق لیتی ہے تو وہ صحت مند ہوتی ہے اور دوسری صورت میں اگر وہ معذور ہے پھر وہ طلاق لیتی ہے تو کون اس سے شادی کرے گا۔؟

سوال نمبر 7:...... تمام مذاہب میں چاہے وہ ہندوازم ہو، عیسائیت ہو یا اسلام۔ ان کی کتابوں میں بہت سی اچھی باتیں ہیں لیکن ہزار ہا ہزار سال سے ان مذاہب کا عورتوں کے ساتھ غیر منصفانہ رویہ رہا ہے اور اس بات سے کوئی بھی مذہب مستثنیٰ نہیں ہے۔ لہٰذا بائبل، قرآن یا گیتا میں لکھا ہوا ہونا اہم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ معاشرے میں ان پر عمل درآمد ہونا چاہیے اور اگر ان مذاہب کی پریکٹس زیادہ اہم ہے تو ہمیں اس بات کی طرف کم توجہ دینی چاہیے کہ قرآن یا گیتا یا جو بھی ہے ان میں کیا لکھا ہے۔؟ لہٰذا میرا سوال ہے کہ Practice کے لئے کیا اقدامات کئے جا سکتے ہیں بجائے اس کے کہ اس کتاب میں کیا لکھا ہے یا اس کتاب میں کیا لکھا گیا ہے۔؟

جواب:...... تمام صحیفے بڑی اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں لیکن دیکھنا چاہیے کہ لوگ عمل کیا کرتے ہیں۔؟ بہ نسبت یہ کہ تھیوریٹیکل باتوں کے ہمیں عمل کی جانب زیادہ توجہ دینی چاہیے اور میں اس بات سے متفق ہوں۔ ہم یہاں پر کیا کر رہے ہیں۔؟ جن مسلم معاشروں نے قرآن و سنت سے منہ موڑا ہے۔ ہم یہاں ان لوگوں سے کہہ رہے ہیں کہ وہ قرآن اور سنت کے قریب آئیں۔

سوال کے پہلے حصے کی جانب آتے ہیں کہ تمام مذہبی کتابیں بڑی اچھی باتیں بتاتی ہیں لہٰذا یہ بے فائدہ ہے کہ ہم ان کے متعلق بات کریں۔

میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔ گزشتہ صفحات میں عورت کا تقابل اسلام میں ہندو ازم، بدھ مت، عیسائیت اور یہودیت سے کیا ہے اور یہاں آپ خود منصف ہیں۔ یقیناً آپ جانتے ہیں کہ عورتوں کو اسلام زیادہ سے زیادہ حقوق دیتا ہے۔ لہٰذا اب ہمیں عملی طور پر بھی اسی کو ماننا چاہیے۔ یہاں بہت سے لوگ ہیں جو کچھ باتوں پر عمل کر رہے ہیں جن پر دوسرے لوگ عمل نہیں کر رہے۔ مثال کے طور پر اسلامی قانون کی بات اگر جرائم کی سزا اور سول رائٹس کے متعلق ہوتی ہے تو سعودی حکومت بہت اچھے اقدام کر رہی ہے۔ الحمد للہ! حالانکہ وہ بعض قرآنی تعلیمات سے انحراف بھی کر رہے ہیں۔ ہمیں یہاں سعودی حکومت کی عملی مثال لینی چاہیے کہ وہ اسلامی قانون کے مطابق جرائم کی سزا دیتے ہیں اور اگر یہ قابل عمل ہے تو اسے پوری دنیا میں لاگو کرنا چاہیے۔ یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں معاشرتی حوالے سے اسلامی قانون پر عمل ہو رہا ہے، لہٰذا یہ بہتر ہوگا کہ اگر آپ اسے پوری دنیا میں لاگو کریں۔ اگر ہم اس پر عمل نہیں کر رہے تو ہم قصوروار ہیں مذہب نہیں۔ لہٰذا اسی لئے ہم لوگوں کو دعوت دیتے ہیں تا کہ وہ قرآن اور حدیث کو سمجھیں، صحیح طریقے سے۔ جب وہ قرآن وحدیث کو صحیح معنوں میں سمجھیں گے تو پھر وہ اس پر پوری طرح عمل درآمد کرنے کی بھی کوشش کریں گے۔

اعتراض نمبر 8:...... کسی عورت کو پیغمبری کا درجہ کیوں نہیں ملا۔؟

جواب:...... پیغمبر کیوں کہ توحید کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت الٰہیہ کا قیام بھی کرتا ہے اس لیے فقط مرد ہی نبی بنا کر مبعوث کیے گئے۔

پیغمبر کو کیونکہ جماعت کی امامت کروانا ہوتی ہے اور یہ کام عورت نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ بعض باتیں مثلاً قیام، رکوع، سجود اگر پیغمبر عورت کرتی ہے تو جو مقتدی ہیں وہ Distrub ہوں گے۔ بہت سے موقعوں پر پیغمبر کو عام آدمیوں سے ملنا پڑتا ہے اور اگر عورت نبی ہوتی ہے تو وہ مخالف صنف سے میل جول کیسے رکھ سکتی تھی۔؟ اگر عورت پیغمبر ہوتی ہے اور حاملہ ہو جاتی تو فطری طور پر وہ اپنی ذمہ داریاں چند ماہ کیلئے نہ نبھا پاتی۔ اگر عورت

اولا د والی ہے تو یہ اس کیلئے مشکل ہو جائے گا کہ وہ ماں اور پیغمبر دونوں کی ذمہ داریں ساتھ ساتھ نبھائے۔ مرد باپ اور پیغمبر کے فرائض سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اعتراض نمبر 10:...... اسلام میں چار بیویوں کی حد تک اجازت ہے لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں گیارہ شادیاں کیں۔؟

جواب:...... میں اتفاق کرتا ہوں کہ واقعی زیادہ سے زیادہ چار شادیاں کی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کی سورۃ النساء کی آیت نمبر 3 میں ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ چار شادیاں کر سکتے ہو۔ اس کے علاوہ سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر 52 میں ہے:

"لا یحل لك النسآء من بعد ولا ان تبدل بهن من ازواج ولو اعجبك حسنهن الا ما ملكت يمينك وكان الله على كل شيء رقيبا٥"

"(اے پیغمبر!) ان (موجودہ بیویوں) کے سوا اور عورتیں آپ کے لیے جائز نہیں اور نہ یہ کہ ان بیویوں کو چھوڑ کر اور بیویاں کر لو خواہ ان کا حسن (سیرت) آپ کو اچھا لگے مگر وہ جو آپ کی لونڈیاں ہیں ان کے بارے میں آپ کو اختیار ہے اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔٥"

قرآن مجید کی یہ آیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام بیویاں رکھنے کی اجازت دیتی ہے لیکن اس کے ساتھ اور شادیوں سے منع بھی کرتی ہے۔ ماسوائے اس کے جو کہ ان کی لونڈیاں ہیں۔ اگر آپ تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت نہ تھی اور اس کے ساتھ وہ اپنی موجودہ بیویوں کو طلاق نہیں دے سکتے تھے لیکن قرآن مجید کی ایک اور آیت میں ہے کہ "جہاں تک ازواج نبی کی بات ہے تو کوئی شخص ان سے شادی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ امہات المومنین ہیں وہ امت کی مائیں ہیں۔"

لہٰذا کوئی نبی کی بیویوں سے شادی نہیں کر سکتا اور نہ ہی وہ ان کو طلاق دے سکتے تھے۔ اگر آپ غور کریں کہ تمام گیارہ شادیاں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیں وہ یا تو معاشرتی بہتری کیلئے تھیں یا سیاسی وجوہات کی بناء پر تھی۔ جنسی تسکین کیلئے ہرگز نہ تھیں۔

پہلی شادی جو انہوں نے کی وہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے کی۔ وہ اس

وقت 40 سال کی تھیں اور آپ محض پچیس برس کے۔ وہ دوبار بیوہ ہو چکیں تھیں اور آپ کنوارے۔ ذرا سوچیں کہ اگر ان کو جنس کی تسکین کیلئے شادی کرنا ہوتی تو انہوں نے اپنے سے پندرہ سال بڑی خاتون کے ساتھ شادی کیوں کی اور پھر اس کے ساتھ جو دوبار پہلے بیوہ ہو چکیں تھیں۔ اگر آپ تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ جب تک حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا زندہ رہیں آپ نے کوئی اور شادی نہ کی۔ جب آپ کی عمر مبارک پچاس برس ہوئی تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا وفات پا گئیں۔ صرف 53 سال سے 56 سال کی عمر کے درمیان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری شادیاں کیں۔ اگر پیغمبر زیادہ جنس آور ہوتے تو وہ جوانی میں شادیاں کرتے۔ سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ مرد جتنا بوڑھا ہوتا جاتا ہے اس کی جنسی قوت گھٹتی جاتی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف دو شادیاں عام شادیوں کی طرح تھیں اور وہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تھیں۔ باقی تمام شادیاں حالات کی وجہ سے تھیں یعنی معاشرتی تعمیر نو کیلئے تھیں۔ اگر آپ غور کریں تو صرف دو ازواج کی عمر 36 سال سے کم تھی۔ باقی تمام ازواج کی عمر 36 سے 50 سال کے درمیان تھی۔

یہاں پر ہم کثرت ازواج کی چند حکمتیں بیان کرتے ہیں جن سے قارئین کرام کو اس کے فوائد وثمرات سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

اهتمام تعلیم و تربیت: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد نکاح فرمانے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ عورتوں کیلئے کئی معلمات تیار کی جائیں جو انہیں شرعی احکام سکھائیں۔ اس لیے کہ عورتوں پر مردوں کے مقابلے میں بہت سی تکالیف ڈالی گئی ہیں اور اکثر عورتیں بعض امور شرعیہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے میں حیاء کرتی تھیں۔ خاص کر حیض، نفاس، جنابت اور حقوق زوجیت وغیرہ کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے میں شرماتی تھیں اور جب بھی ان مسائل میں سے کسی کے بارے میں سوال کرنے کا کوئی ارادہ کرتیں تو ان پر شرم وحیاء غالب آجاتی تھی جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق میں کامل حیاء شامل تھی جس کے بارے میں احادیث وسنن کی کتابیں روایت کرتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کنوری لڑکی جو اپنی چادر میں ہوتی ہے اس

سے بھی زیادہ حیاء والے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی طرف سے پیش کیے گئے ہر سوال کا صراحت و وضاحت کے ساتھ جواب نہ دیتے بلکہ بعض اوقات کنایات استعمال فرماتے تھے اور سائلہ کبھی کنایہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کو نہ سمجھتی۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ عفیفہ طاہرہ طیبہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انصار کی ایک خاتون نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حیض کے غسل کے متعلق سوال کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کا طریقہ سمجھایا پھر اسے فرمایا:

''ایک خوشبودار کپڑا لے کر اس کے ساتھ پاکی حاصل کرو۔!''

اس نے عرض کیا:

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اس کے ساتھ کیسے طہارت حاصل کروں۔؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''پس تم طہارت حاصل کرو۔''

اس نے پھر عرض کیا!

''میں کیسے پاکیزگی حاصل کروں۔؟''

وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کنایہ کو نہیں سمجھ رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''سبحان اللہ! اس کے ساتھ پاکی حاصل کرو۔''

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اسے کہا کہ اس کپڑے کو فلاں جگہ (شرمگاہ) پر رکھو اور خون کے اثر کو اس کے سات صاف کرو۔ میں نے صراحت کے ساتھ اس جگہ کا ذکر کیا جہاں پر اس نے کپڑے کو رکھنا تھا یعنی شرمگاہ۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح صراحت کرنے سے حیاء فرماتے تھے اور بہت کم ایسی خواتین بھی تھیں جو اپنے نفس اور حیاء پر غلبہ حاصل کر کے واضح

طور پر در پیش مسئلہ کے متعلق سوال کرتی تھیں۔ جس کی مثال صحیحین میں مروی یہ روایت ہے کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی زوجہ ام سلیم رضی اللہ عنہا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا:

”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ حق بات کہنے سے حیاء نہیں فرماتا، کیا جب عورت کو احتلام ہو تو اس پر بھی غسل ہے۔؟“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”ہاں! جب کہ وہ پانی (منی) دیکھے۔“

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ام سلیم رضی اللہ عنہا کو فرمایا:

”تو نے عورتوں کو رسوا کر دیا ہے، کیا کبھی عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے۔؟“

اس کے جواب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اگر عورت کو احتلام نہ ہو تو پھر بچہ اس کے مشابہ کیسے ہوتا ہے۔؟“

حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

”اللہ تعالیٰ انصاری عورتوں پر رحم فرمائے ان کو حیاء نے دین سیکھنے سے منع نہیں فرمایا اور ان عورتوں میں سے کوئی عورت اندھیرے میں ازواج مطہرات کی طرف آتی تاکہ ان سے بعض دینی امور اور حیض، نفاس، جنابت وغیرہ کے احکام کے متعلق سوال کرے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات ان کیلئے بہترین معلمات اور عمدہ راہ دکھانے والی ہوتیں اور انہیں کے طریقہ سے عورتوں نے اللہ کے دین میں سمجھ بوجھ حاصل کی۔“

یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ عورتوں تک دین کا وافر حصہ امہات المومنین کے ذریعے پہنچا۔ ازواج نبی علیہ السلام کے علاوہ کون ہے جو گھر میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال کو ہمارے لیے نقل کرتا۔؟ بیشک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احوال واطوار اور گھر کے افعال کو نقل کرنے میں ازواج مطہرات کو بہت فضیلت حاصل ہے اور انہی نے عورتوں تک ان کے مسائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھ کر پہنچائے۔ ازواج مطہرات میں سے ہی بعض معلمات اور محدثات بنیں جنھوں نے آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کی سیرت کو نقل کیا اور وہ قوت حافظہ، قابلیت اور لیاقت میں مشہور ہوئیں۔

علماء فرماتے ہیں:

"کان الرجال یرجعون بعده علیه السلام الی امهات المؤمنین فی کثیر من احکام الدین ولا سیما الزوجیة"

"مرد بھی دین کے بہت سے مسائل میں امہات المؤمنین کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ خصوصاً ازدواجی زندگی کے مسائل میں۔"

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی فقاہت، حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کی دقیقہ رسی، سیدنا صدیق اکبر و سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کی عقدہ کشائی جن مسائل میں آ کر اٹک جاتی تھی وہاں ان کی گرہ کشائی کیلئے انہیں بعض زواج مطہرات ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا کیونکہ خلوت گاہِ نبوت کا راز دار امہات المومنین کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ شمع نبوت کے پروانے خلوت کی زندگی سے واقف نہ تھے اور امہات المومنین حقائق خلوت کی بھی راز دار تھی۔ ہم تو یہاں تک دیکھتے ہیں کہ بعض امہات تفسیر فقہ کے حقائق ودقائق بھی ان واقف کارانِ جلوت کو بتاتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ نصف دین کی تکمیل اور دنیا کی آدھی آبادی کی تعلیم کا یہ عظیم الشان کام ایک دو عورتوں سے نہیں چل سکتا تھا۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زائد نکاح فرمائے تاکہ دنیا کی نصف آبادی (یعنی عورتوں) تک بھی ان کے مکمل مسائل پہنچ جائیں۔

اسی حکمت کا تذکرہ علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں فرمایا:

"لتکثره النساء حکمته دینیة جلیلة ایضاد هی نشر الاحکام الشرعیة لا تکاد تعلم الا بواسطهن"

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت ازواج میں ایک عظیم دینی حکمت یہ بھی ہے کہ اس سے ان احکام شرعیہ کی اشاعت ہوئی جو خواتین کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی۔"

(تفسیر روح المعانی، پارہ نمبر 23، صفحہ نمبر 64)

جاهلیت کی نا پسندیدہ رسوم کا قلعہ قمع : حضور نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد شادیاں زمانہ جاہلیت کی بعض ناپسندیدہ عادات ختم کرنے کیلئے کیں تھیں۔ مثلاً: کسی کو منہ بولا بیٹا بنانے کی بدعت کہ عرب اسلام سے قبل ایسا کرتے تھے۔ کوئی شخص کسی کو اپنا متبنی بیٹا بنالیتا تھا جو کہ اس کی پشت سے نہیں تھا اور اسے صلبی بیٹے کے حکم میں رکھتا تھا اور جیسا کہ نسبی بیٹوں کے احکام ہوتے ہیں (مثلاً میراث، طلاق، شادی رضاعی محرمات اور نکاح کے ساتھ حرام ہونے والی اشیاء وغیرہ) متبنی کو بھی اسی طرح حقیقی بیٹا بنا لیتے تھے اور تمام احوال میں نسبی بیٹے کی طرح احکام جاری کرتے تھے اور یہ تقلیدی دین تھا جس کی جاہلیت میں پیروی کی جاتی تھی۔ ان میں سے کوئی غیر کے بیٹے کو بیٹا بنا کر کہتا تھا تو میرا بیٹا ہے میں تمہارا وارث ہوں اور تم میرے وارث ہو اور اسلام کے لائق یہ بات نہیں تھی کہ وہ باطل کا قلعہ قمع نہ کرے اور نہ ہی یہ بات لائق تھی کہ لوگ جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتے رہیں۔

رسول کریم علیہ السلام نے عرب کے دستور کے مطابق زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اپنا بیٹا بنالیا اور اس طرح جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو بیٹا بنایا تو لوگ اس دن کے بعد زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو "زید بن محمد" کہہ کر پکارنے لگے۔

امام بخاری و مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ بیشک لوگ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام زید بن حارثہ کو زید بن محمد کہہ کر پکارتے تھے یہاں تک کہ قرآن پاک نازل ہوا (کہ لوگوں کو ان کے آباء کے نام کے ساتھ پکارا جائے یہ اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے) اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم زید بن حارثہ بن شراحیل ہو۔"

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منہ بولے بیٹے کی شادی اپنی پھوپھی زاد حضرت زینب بنت جحش الاسدیہ رضی اللہ عنہا سے کی تھی اور انہوں نے ایک مدت تک ان کے ساتھ زندگی بسر کی لیکن زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ان دونوں کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا حضرت زید رضی اللہ عنہ کو سخت بات کہتی تھیں اور اپنے آپ کو ان سے زیادہ معزز سمجھتی تھیں کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولا بیٹا بنانے سے پہلے وہ غلام تھے جبکہ یہ اعلیٰ حسب ونسب والی تھیں۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ علیہ السلام حضرت زینب رضی اللہ عنہ سے شادی کریں تا کہ متبنّٰی کی بدعت کا بطلان کیا جائے، اسلام کی بنیادوں کو مضبوط کیا جائے اور وہ جاہلیت پر اپنے اصولوں کی وجہ سے غالب آ جائے۔ لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین اور فجار کی وجہ سے کہ وہ کہیں گے کہ محمد نے اپنے بیٹے کی بیوی سے شادی کی ہے تھوڑی سی تاخیر فرمائی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اور آپ لوگوں سے ڈرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ آپ اس سے ڈریں پس جب زید نے اس سے حاجت پوری کی تو ہم نے آپ کا نکاح اس (حضرت زینب) سے کر دیا تا کہ مومنین کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں (سے نکاح کرنے) میں حرج نہ ہو جب وہ ان سے اپنی حاجت کو پورا کر لیں اور اللہ تعالیٰ کا امر ہونے والا ہے۔ o"

اس طرح وہ عادات کہ زمانہ جاہلیت میں جن کی پیروی کی جاتی تھی اور جو موروثی دین میں شامل تھیں ان سب کا بطلان ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی نئی شریعت کی تاکید کیلئے یہ ارشاد ربانی نازل ہوا:

"نہیں ہیں محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ لیکن اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر شے کو جاننے والا ہے۔"

(القرآن الکریم، پارہ نمبر 22، سورۃ الاحزاب، آیت نمبر 40)

صحیح البخاری میں ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا دیگر ازواج مطہرات کے مقابلے میں فخر سے کہتی تھیں کہ تمہاری شادی تمہارے گھر والوں نے کی ہے جبکہ میری شادی اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔

پیاروں کی دل جوئی: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں میں سب سے محبوب اور قدر و منزلت میں سب سے بلند شخص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نور نظر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے

میں لوگوں پر سبقت کی، اپنا جسم، روح، مال اللہ کے دین کی نصرت کے راستے میں وقف کر دیا اور اسلام کے راستے میں اذیتیں برداشت کیں۔ یہاں تک کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

"ہم نے ہر ایک آدمی کے احسان کا پورا پورا بدلہ دیا ہے سوائے ابو بکر صدیق کے۔ بیشک ان کا ہمارے پاس احسان ہے جس کا بدلہ انہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ خود عطا فرمائے گا اور کسی کے مال نے مجھے کبھی بھی اتنا فائدہ نہیں دیا جتنا فائدہ ابو بکر کے مال نے دیا ہے اور میں نے کسی پر بھی اسلام پیش نہیں کیا مگر اس نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا مگر ابو بکر کہ انہوں نے ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔ اگر میں کسی کو دوست بناتا تو ابو بکر کو دوست بناتا اور خبردار! سن لو تمہارا ساتھی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کا خلیل (دوست) ہے۔"

پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بدلہ اس کے سوا نہ پایا کہ ان کی آنکھوں کو ان کی بیٹی کے ساتھ شادی کر کے ٹھنڈا کریں اور ان کے درمیان رشتہ اور قرابت پیدا ہو جائے جو ان دونوں کی صداقت اور مضبوط ربط کو زیادہ کرے۔ جیسا کہ آپ علیہ السلام نے حضرت حفصہ بنت عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے شادی فرمائی جو کہ ان کے باپ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اسلام، صدق، اخلاص اور اس دین کے راستے میں فنا ہو جانے پر ان کی آنکھوں پر ٹھنڈک بن گئی۔ پس حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے ساتھ مصاہرت کا طریقہ ان کے اسلام کے راستے میں دوسرے لوگوں پر مقدم ہونے کا بہترین بدلہ تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مصاہرت کے شرف میں دونوں وزیروں (سیدنا ابو بکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما) کے درمیان مساوات اختیار فرمائی اور ان دونوں کی بیٹیوں کے ساتھ شادی۔ یہ ان دونوں کیلئے نہ صرف بہت بڑا شرف تھا بلکہ عظیم بدلہ، احسان بھی تھا اور اس زندگی میں اس سے بڑھ کر ان دونوں کو بدلہ دینا ممکن نہ تھا۔

امن عامہ کیلئے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض عورتوں کے ساتھ شادی ان پر تالیف قلب کے سبب اور اسلام کی سربلندی کے لیے کی۔ یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ انسان جب کسی قبیلہ یا خاندان میں سے شادی کرتا ہے تو ان کے درمیان قرابت پیدا

ہو جاتی ہے اور یہ بات طبعی طور پر ان لوگوں کو اس شخص کی نصرت اور حمایت کی طرف بلاتی ہے۔ ہم اس پر بعض مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ ہمارے لیے وہ حکمت واضح ہو جائے جس کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شادیوں کے پیچھے ہدف بنایا تھا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی مصطلق کے سردار کی بیٹی سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا بنت حارث سے شادی فرمائی جو کہ اپنی قوم اور خاندان کے ساتھ قیدی بنالی گئی تھیں۔ قید کے بعد انہوں نے اپنی طرف سے فدیہ دینا چاہا تو وہ کچھ مال لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدد طلب کرنے کے لیے آئیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے یہ بات پیش کی کہ کیا میں تمہاری طرف سے فدیہ ادا کردوں تو تو مجھ سے شادی کرلے گی۔؟ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات قبول کرلی اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے شادی کی۔ اس پر مسلمانوں نے کہا:

"کیا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حال میں شادی کی ہے کہ وہ بنو مصطلق ہمارے قیدی ہیں۔؟"

تو مسلمانوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قبیلہ میں نکاح کرنے کی وجہ سے ان تمام قیدیوں کو رہا کر دیا جو کہ ان کے قبضے میں تھے۔ جب بنو مصطلق نے یہ کرم و بلندی، یہ بزرگی اور مروت دیکھی تو وہ سب اسلام لے آئے اور دین خداوندی میں داخل ہو گئے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے شادی کرنا ان کے لیے اور ان کی قوم و خاندان کے لیے برکت کا باعث بنا کیونکہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا ان سب لوگوں کے اسلام لانے اور ان کی آزادی کا سبب تھیں۔

اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین سیدہ صفیہ بنت حیی بن اخطب رضی اللہ عنہا سے شادی فرمائی جو کہ غزوۂ خیبر میں شوہر کے قتل کے بعد قیدی بنالی گئی اور ایک صحابی کے حصہ میں آئی۔ مسلمانوں کے اہل رائے لوگوں نے کہا:

"یہ بنی قریظہ کی سردار کی بیٹی ہیں اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور کیلئے ان کا ہونا صحیح نہیں۔"

یہ بات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور دو باتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا حق دیا۔

پہلی یہ کہ انہیں آزاد کر دیا جائے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کر لیں

۔دوسری یہ کہ انہیں آزاد کر دیا جائے اور وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ مل جائیں۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ بننا پسند فرمایا اس لیے کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت، حسنِ معاملہ کو دیکھ لیا تھا، اسلام بھی قبول کر چکی تھیں اور ان کے اسلام کے سبب بہت سے لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔

اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے شادی فرمائی۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ ان دنوں مشرکین مکہ میں شامل تھے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید ترین دشمنوں میں سے تھے۔ ان کی بیٹی مسلمان ہو چکی تھی اور اپنے قبیلے سے فرار اختیار کرتے ہوئے اپنے شوہر کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کر چکی تھی۔ وہیں پر ان کے شوہر کا وصال ہوا اور آپ اکیلی رہ گئیں کہ نہ کوئی ان کا مددگار تھا اور نہ ہی غمگسار۔ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے معاملے کا علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی رضی اللہ عنہ کو پیغام ارسال کیا کہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی ان سے کر دیں۔ نجاشی رضی اللہ عنہ نے یہ پیغام جب حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو پہنچایا تو وہ اتنا زیادہ خوش ہوئیں کہ جس کی انتہا نہیں۔ اس لیے کہ اگر وہ اپنے والد اور گھر والوں کے پاس لوٹ جاتیں تو وہ اسے کفر اور ارتداد پر مجبور کرتے یا اسے شدید عذاب دیتے۔ نجاشی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو چار سو دینار حق مہر اور عمدہ تحائف دیئے اور جب وہ واپس مدینہ لوٹیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے شادی کر لی۔ جب یہ خبر ابو سفیان رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو انہوں نے شادی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا:

"وہ ایسے مرد ہیں جن کی صداقت و امانت کی ہر کوئی گواہی دیتا ہے۔"

اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی ہدایت عطا فرما دی۔ یقیناً یہ ہمارے لیے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے شادی کرنے کی

حکمت جلیلہ ظاہر ہوتی ہے کیونکہ یہ شادی آپ سے اور آپ کے صحابہ سے اذیت کو کم کرنے کا سبب بنی خصوصاً جبکہ آپ کے اور ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے درمیان نسبت اور قرابت قائم ہو گئی۔ حالانکہ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ اس وقت بنو امیہ میں سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے شدید دشمن تھے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے شادی کرنا بنو امیہ کے دلوں کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی الفت ومحبت کا سبب بنا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو اپنے لیے اختیار فرمایا ان کے ایمان کی تکریم کرتے ہوئے کیونکہ وہ اپنے گھر سے اسلام کی خاطر ہجرت کرتے ہوئے نکلی تھی۔

بیوگان سے نکاح : جس معاشرے میں بیوہ خاتون کے ساتھ نکاح ایک عیب تصور کیا جاتا ہو ایسے معاشرے میں متعدد بیوگان کو اپنے عقد میں قبول کر کے اس بدترین رسم پر ضرب کاری لگانا بھی مقصود تھا۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے بھی نکاح کیے ان میں سے صرف ایک نکاح کنواری خاتون کے ساتھ کیا، بقیہ سب نکاح آپ نے بیوگان اور طلاق یافتہ خواتین سے کیے۔

جاہلیت میں بیوہ عورت کو جانوروں سے بھی کم درجہ دیا جاتا تھا۔ لوگوں کی جہالت کا یہ عالم تھا کہ ایک عورت کو اس لیے کم تر اور اپنے لیے باعث شرمندگی سمجھتے تھے کہ وہ عورت ہے۔ ان کی ذہنی پسماندگی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہوتی تو اسے زندہ درگور کر دیتے۔ جس معاشرے میں عورت کا یہ مقام ہو تو وہاں پر ایک بیوہ کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا ہو گا؟ چونکہ مصطفیٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سارے جہانوں کیلئے رحمت بن کر تشریف لائے ہیں اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم وستم کی چکی میں پستے ہوئے اس طبقہ کو اپنا کر اسے لوگوں کی نظروں میں وہ عزت ووقار عطا کیا جو کوئی دوسرا معاشرہ انہیں نہ دے سکا۔

بوجۂ خدمت اسلام : بعض کو خدمت اسلام کی وجہ سے شرف زوجیت سے مشرف کیا گیا۔ مثلاً: حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے اپنے خاوند اور والدہ کے ساتھ حبشہ ہجرت کی وہاں ان کے خاوند کا انتقال ہو گیا۔ انہی دنوں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا وصال

ہو گیا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکی قربانوں کا لحاظ کرتے ہوئے اور ان کے مصائب ختم کرنے کیلئے اپنے نکاح میں لیا۔

اہل و عیال کو سہارا دینا : بعض جانثاروں اور راہ خدا میں قربانیاں پیش کرنیوالوں کے اہل و عیال کو سہارا دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیوگان سے نکاح کیا۔ یہ کسی قائد کا اہم فریضہ ہوتا ہے کہ وہ تحریک سے وابستہ افراد کی ہر معاملہ میں حوصلہ افزائی کرے۔

حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، لیکن وہ غزوہ احد میں شہید ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شہادت کی وجہ سے پیدا ہونیوالی بے سہارگی کا مداوا کرنے کیلئے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو عقد کا شرف بخشا۔

حضرت ام سلمٰی رضی اللہ عنہا ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی اور گیارہویں مسلمان تھے۔ انہوں نے حبشہ اور مدینہ دونوں طرف ہجرت کی۔ جب یہ ہجرت مدینہ کیلئے روانہ ہوئے تو ان کے بیوی اور بچے خاندان والوں نے ان سے زبردستی چھین لیے۔ حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس کے باوجود عزمِ ہجرت کو پورا کیا۔ حضرت ام سلمٰی رضی اللہ عنہ ہر روز شام کو اس مقام پر آ کر رویا کرتی تھیں جہاں انکو ان کے شوہر سے چھینا گیا تھا۔ ایک سال کا عرصہ اسی طرح روتے ہوئے گزار دیا مگر ترکِ اسلام کا کبھی خیال تک بھی دل میں نہ لائیں۔ حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ غزوۂ اُحد میں زخمی ہوئے اور جانبر نہ ہو سکے۔ وفات کے وقت ان کے دو چھوٹے لڑکے عمر و اور سلمہ اور دو لڑکیاں زیب اور درہ تھیں۔ آخری وقت انہوں نے یہ دعا کی:

"اللھم اخلفنی فی اھلی بخیر"

"اے اللہ! میرے اہل کی بہترین نگہداشت فرما۔"

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو سلمہ اور ام سلمٰی رضی اللہ عنہا کی ان قربانیوں کا صلہ دینے کے لیے اور ان معصوم بچوں کی کفالت کو احسن طور پر نبھانے کیلئے حضرت ام سلمٰی رضی اللہ عنہا سے نکاح فرما لیا۔

اعتراض نمبر 11:...... کسی کنواری عورت کا کسی شادی شدہ سے شادی کرنا کس لحاظ سے عورت کے لئے سود مند ہے۔؟

جواب :...... حقیقی سوال ہے کہ کیا کثرت ازدواج عورت کیلئے فائدہ مند ہے؟ اگر فائدہ مند ہے تو کس طرح۔؟ کیسے امرد ایک سے زیادہ شادیاں کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس طرح جو عورتیں اس کے نکاح میں ہیں وہ باعصمت رہتی ہیں۔ اگر ہر مرد صرف ایک شادی کرے تو لاکھوں خواتین دنیا میں ایسی ہوں گی جن کو شوہر نہیں مل پائیں گے اور ان کیلئے صرف ایک راہ بچے گی کہ وہ پبلک پراپرٹی بن جائیں۔ لہٰذا اسی لیے اسلام میں کثرت ازدواج کی اجازت دی گئی ہے تاکہ عورت کی عزت محفوظ رہ سکے، تاکہ وہ پبلک پراپرٹی بننے سے بچ سکے۔

سوال نمبر 12:...... کیا بچہ گود لینا اسلام میں جائز ہے۔؟

جواب :...... اگر Adoption سے مراد ایک غریب بچے کی دیکھ بھال اور اس کا کھانا، پینا، تعلیم اور کپڑے وغیرہ اپنے ذمہ لینا ہے تو اس کی اجازت ہے۔ اسلام نے ہمیشہ زور دیا کہ تم غریبوں کی مدد کرو، ضرور تمندوں کی مدد کرو۔ آپ ایسے غریب بچے کو گھر میں لا سکتے ہیں اور آپ اس کو باپ کی شفقت دے سکتے ہیں۔ اسلام قانونی طور پر گود لینے پر اعتراض کرتا ہے۔ اسلام کے مطابق آپ اس بچے کو اپنا نام نہیں دے سکتے۔ قانونی طور پر بچہ گود لینا اسلام میں منع ہے۔ کیوں؟ کیونکہ اگر کوئی شخص قانونی طور پر بچہ گود لیتا ہے تو وہاں کچھ پیچیدگیاں ہو سکتی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ بچہ لڑکا یا لڑکی اپنی شناخت سے محروم ہو جائے گا۔ دوسرا یہ کہ فرض کریں کہ آپ نے بچہ Adopt کر لیا ہے اور آپ کے اپنے بچے بھی ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ کے گھر ساری عمر بچے نہیں ہوں گے اور اگر آپ کے اپنے بچے ہو جاتے ہیں تو آپ کا جھکاؤ اپنی اولاد کی طرف زیادہ ہوگا اس گود لئے بچے کی بہ نسبت۔

تیسرا یہ کہ وہ بچہ گھر میں آزادی سے نہیں رہ سکتا۔ خصوصاً جبکہ وہ مخالف جنس والا ہو کیونکہ وہ بچے آپ میں سگے بہن بھائی نہ ہوں گے۔ اگر گود لیا گیا بچہ لڑکی ہے تو بڑا ہونے کے بعد اسے حجاب کرنا ہوگا باپ سے بھی کیونکہ وہ اس کا سگا باپ نہیں ہے۔ اگر گود لیا بچہ لڑکا ہے تو بڑا ہونے کے بعد وہ مرد بنے گا تو اس کی شادی کے بعد اس کے منہ بولے باپ سے

بہو کو حجاب کرنا ہوگا اور بھی بہت سی وجوہات ہیں۔ اگر آپ بچہ گود لیتے ہیں تو آپ اپنے رشتہ داروں کے چند حقوق سے غفلت برتنا شروع کر دیں گے۔ جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو اس کی جو بھی جائیداد ہو وہ قرآنی فیصلوں کے مطابق تقسیم کر دی جاتی ہے۔ اگر اس شخص کے اپنے بچے بھی ہیں اور وہ گود لیا بچہ بھی تو قدرتی طور پر وہ اپنے بچے کو حق سے محروم کر رہا ہوگا۔ اگر بندہ مر جاتا ہے اور اس کی کوئی اولاد نہیں تو اس کی بیوی کو آدھا حصہ ملے گا۔ اگر اولاد ہے تو اس کا 1/6 حصہ ملے گا۔ اگر کوئی اولاد نہیں تو پھر 1/3 تیسرا حصہ۔ اگر آپ بچہ گود لیتے ہیں تو آپ بیوی اور دیگر رشتے داروں کو ان کے حق سے محروم کر رہے ہیں۔ لہٰذا ان پیچیدگیوں سے بچنے کیلئے قانونی طور پر بچہ گود لینے کی اسلام میں ممانعت ہے۔

اعتراض نمبر 14:...... اگر اسلام میں مرد و عورت کے حقوق یکساں ہیں تو پھر اسلام میں عورتوں اور مردوں کے جائیداد اور وراثت کے حقوق برابر کیوں نہیں ہیں؟

جواب:...... اسلام میں مرد و عورت کے معاشی حقوق ایک جیسے ہیں۔ عام طور پر لوگ یہ کہتے ہیں کہ عورت کو مرد کی بہ نسبت نصف حصہ ملتا ہے۔ اس سوال کا جواب قرآن مجید میں سورۃ النساء آیت نمبر 11 اور 12 میں دیا گیا ہے۔

مختصراً یہ کہ عورت کو زیادہ تر آدھا حصہ ہی ملتا ہے مرد کی بہ نسبت، لیکن یہ ہر صورت میں نہیں ہے۔ مثال کے طور پر بھائی اور بہن کو 1/6 حصہ ملے گا۔ اگر مرنے والے کا آگے پیچھے کوئی نہیں تو دونوں کو برابر حصہ ملے گا۔ اگر مرنے والے کی کوئی اولاد نہیں ہے تو پھر والد اور والدہ دونوں کو برابر 1/6 حصہ ملے گا اور بعض دفعہ مرنے والی اگر کوئی خاتون ہے اور اس کی کوئی اولاد نہیں تو شوہر کو آدھا حصہ ملے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کچھ صورتیں ایسی ہیں کہ جن میں عورت کو مرد کی بہ نسبت دوگنا حصہ ملتا ہے یعنی کہ والدہ کو والد کی نسبت دوگنا حصہ مل رہا ہے۔

بہر حال سوال کا جواب یہ ہے کہ چونکہ مرد کے سر پر خاندان کا بوجھ اٹھانے کی ذمہ داری ہے اور اس بات پر کہ مرد کیلئے ناانصافی نہ ہو اللہ تعالیٰ نے مرد کو بڑا حصہ تفویض کیا عورت کی بہ نسبت۔ میں یہاں ایک مثال دینا چاہوں گا کہ ایک شخص مرتا ہے اور اس کی جائیداد تقسیم کر دی جاتی ہے۔ اس کے دو بچے ہیں، ایک بیٹا اور بیٹی۔ دونوں کا حصہ ڈیڑھ

لاکھ روپیہ بنتا ہے۔ لڑکے کو ایک لاکھ ملے گا اور لڑکی کو 50 ہزار۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ لڑکے کو ملنے والے اس ایک لاکھ روپے کا زیادہ تر حصہ اپنے خاندان کی کفالت پر خرچ ہو جائے ۔شاید 80 ہزار یا 85 ہزار...... شائد ایک لاکھ سب کا سب۔ اس کو خاندان کی کفالت کیلئے خرچ کرنا ہی پڑے گا لیکن اس عورت کو جب 50 ہزار ملتے ہیں تو اسے ایک پائی بھی خاندان کی کفالت کیلئے کرچ نہیں کرنا پڑے گی کیونکہ خاندان کی کفالت مرد کے ذمہ ہے عورت کے نہیں۔ کیا آپ ایک لاکھ لے کر سارے کا سارا خرچ لینا پسند کریں گے یا پچاس ہزار جس میں سے کچھ بھی خرچ نہ کرنا پڑے۔؟ آپ خود فیصلہ کریں کہ اسلام کے یہ قوانین جدید ہیں یا فرسودہ؟

اعتراض نمبر 15:...... اسلام مخالف اصناف کا میل جول اور اکٹھا ہونا پسند کرتا ہے ۔حتی کہ کام کرنے کی جگہوں پر بھی۔ کیا یہ جدید ہے یا فرسودہ؟ اور اس کے ساتھ ایک دوسرا سوال ہے کہ کیا عورت ایئر ہوسٹس کی جاب کر سکتی ہے یا نہیں۔ حالانکہ یہ ایک Decent اور Highly paid Job ہے۔؟

جواب:...... پہلے سوال کی طرف آتے ہیں کہ اسلام Intermingling of Sexes کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر جدیدیت سے مراد یہ ہے کہ آپ عورت کو For Sale بنا کر رکھ دیں کہ آپ ان سے خلط ملط ہو سکیں یا آپ ماڈلنگ کا شعبہ اپنا لیں تو پھر اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اعداد و شمار کے مطابق 50 فیصد امریکن عورتیں جو کہ جاب کیلئے جاتی ہیں زیادتی کا شکار ہوتی ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ 50% کیوں؟ کیونکہ امریکہ کی زیادہ تر نوکری مخالف اصناف کے میل جول پر مرتب ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ عورت کے ساتھ زنا ہونا چاہیے تو پھر اسلام فرسودہ ہے۔ اگر آپ ایسا نہیں سمجھتے تو پھر اسلام جدید ہے۔

اب ہم سوال کے دوسرے حصے کی جانب آتے ہیں کہ کیا اسلام عورت کو ایئر ہوسٹس کی جاب کیلئے اجازت دیتا یا نہیں تو جواب ہے کہ نہیں۔ میں سوال کے پہلے حصے سے اتفاق کرتا ہوں کہ واقعی یہ نوکری زیادہ تنخواہ والی (Highly Paid) ہے لیکن دوسرا حصے کو آیئے پرکھتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ایئر ہوسٹس جب چنی جاتی ہے تو اس کی بڑی شرط

خوبصورتی ہوتی ہے۔ آپ کو کبھی بھی بدصورت ایئر ہوسٹس نہیں ملے گی۔ وہ چنی جاتی ہیں کیونکہ وہ جوان اور پرکشش ہوتی ہیں۔ ان کو ایسا لباس پہنایا جاتا ہے کہ جو اسلامی اقدار کے منافی ہوتا ہے۔ انہیں میک اپ کرنا پڑتا ہے تاکہ نگاہوں کو Attract کیا جا سکے۔ انہیں مسافروں کی ضرورت پورا کرنا ہوتی ہے۔ جن میں زیادہ تر مرد ہوتے ہیں اور جس میں مرد اور عورت کے درمیان فاصلہ بہت کم ہوتا ہے۔ اکثر اوقات مرد مسافر بغیر کسی ضرورت کے ایئر ہوسٹس کے ساتھ گفت وشنید کرتے ہیں اور اگر ایئر ہوسٹس کوئی سخت جواب دینا بھی چاہے تو ہوا ایسا نہیں کر سکتی کیونکہ اس کی نوکری خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اکثر اوقات مسافر کہتے ہیں:

"میڈم! پلیز ذرا میری سیٹ بیلٹ باندھ دیں۔"

وہاں ایئر ہوسٹس کے پاس کوئی Option نہیں ہوتی اور اسے سیٹ بیلٹ باندھنی پڑتی ہے تو پھر کیا ہوتا ہے۔ وہاں مرد وعورت کی جسمانی قربت بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ بہت سی ایئر لائنز شراب پیش کرتی ہیں۔ اسلام کسی بھی مرد یا عورت کو شراب پیش کرنے سے منع کرتا ہے۔ انہی کاموں کے لیے عورتیں ایئر ہوسٹس کیلئے منتخب کی جاتی ہیں۔ حالانکہ فلائٹ میں مرد ویٹر بھی ہوتے ہیں لیکن وہ کچن تک محدود ہوتے ہیں۔ جہاز میں یہ اُلٹ ہے اور آپ میرا یقین کریں کہ کوئی ایئر لائن عورتوں کو جاب دیئے بغیر نہیں چل سکتی۔ حتیٰ کہ سعودی ایئر لائنز بھی جو کہ سب سے زیادہ اسلامی سٹیٹ سمجھی جاتی ہے۔ ان کے پاس بھی لیڈیز ایئر ہوسٹس ہیں لیکن چونکہ وہ سعودی لڑکیوں کو بطور نوکر (Appoint) نہیں رکھ سکتے اس لئے وہ لڑکیاں Import کرتے ہیں۔ ان کے پاس غیر ملکی ایئر ہوسٹس ہوتی ہیں۔ ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔

ایئر لائن ایک پروفیشن ہے جس میں کہ خواتین کا ہونا لازم ہے تاکہ وہ نگاہوں کو Attract کر سکیں۔ آپ ایئر لائنز کے کچھ قوانین سن کر ششدر رہ جائیں گے۔ مثلاً: انڈین ایئر لائن اور ایئر انڈیا کا کہنا ہے کہ اگر آپ بطور ائیر ہوسٹس سلیکٹ ہو جائیں تو آپ چار سال تک شادی نہیں کر سکتے۔ بعض ایئر لائن کہتی ہیں کہ اگر آپ حاملہ ہو جاتی ہیں تو آپ کی نوکری ختم۔ جبکہ بعض ایئر لائن کہتی ہیں کہ آپ 35 سال کے بعد ریٹائر کیونکہ پھر آپ پر

کشش نہیں رہتے۔ کیا آپ اسے Decent جاب کہتے ہیں۔؟

اعتراض نمبر 16:...... جس عورت کی زبردستی شادی کی گئی وہ متعلقہ بورڈ کو بتائے کہ اس کی شادی زبردستی ہوئی تو اس کا نکاح تنسیخ کردیا جائے گا۔؟ قرآن مجید عورتوں اور مردوں کا آئینہ ہے کیا اس میں یہ باڈی ہے۔؟ اگر ہے تو نام بتایئے جو کہ تنسیخ نکاح کرسکتی ہو۔؟

جواب:...... واضح طور پر قرآن اور حدیث میں لکھا ہے کہ اگر عورت کو شادی کیلئے زبردستی مجبور کیا گیا ہے تو وہ شادی باڈی قرار دی جاسکتی ہے۔ کیا آج کوئی متعلقہ ادارہ ہے جو کہ ایسی شادیوں کو باطل قرار دے سکے؟ اس کا جواب ہے کہ جمیع مسلم ممالک میں ایسی عدالتیں ہیں۔

اعتراض نمبر 17:...... کیا اسلام میں مخلوط تعلیم جائز ہے۔؟

جواب:...... آیئے! پہلے غور کرتے ہیں کیا لڑکی اور لڑکا ایک اسکول میں پڑھ سکتے ہیں۔؟ پچھلے سال The World this Week رپورٹ کے مطابق اسکولز کا سروے ہوا۔ یہ سروے کوایجوکیشن اور یونی سیکس دونوں سکولوں پر مشتمل تھا۔ چنانچہ یونی سیکس سکولوں کا مجموعی طور پر نتیجہ کوایجوکیشن سکولوں سے بہتر تھا۔

جب اساتذہ کے انٹرویو لئے گئے تو معلوم ہوا کہ یونی سیکس سکول کے طلباء زیادہ Concentrate کرتے ہیں کوایجوکیشن سکول کی نسبت۔ جب طالب علموں کے انٹرویو لئے گئے تو انہوں نے کوایجوکیشن سکول میں پڑھنے کو ترجیح دی بہ نسبت یونی سیکس سکول کے۔ آپ بڑی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے۔؟! یہ سروے جاری رہا اور نتیجہ یہ نکلا کہ کوایجوکیشن اسکول میں پڑھنے والے لوگ اس لیے ان سکولوں میں پڑھتے ہیں تا کہ وہ مخالف صنف میں مقبول ہوسکیں۔ وہ ٹیچرز کو مختصر جواب دیتے ہیں اور زیادہ وقت Dating میں ضائع کرتے ہیں۔ بجائے اس کے وہ اسکول میں تعلیم حاصل کریں۔ سروے کا آخری نقطہ یہ تھا کہ یو کے گورنمنٹ ملک میں یونی سیکس اسکول کے نظام کو فروغ دینے کے متعلق سوچ رہی ہے۔ امریکن رپورٹ کے مطابق اسکول میں لڑکیاں اساتذہ سے علم حاصل کرنے کی بجائے ساتھی لڑکوں سے ناروا سیکس ٹیکنیکس کو سیکھنے میں زیادہ وقت ضائع

کرتی ہیں۔ اسکولز کے متعلق جو بھی نکات میں نے بیان کئے یہ کالج اور یونیورسٹی کی بات آئے تو بہت بڑھ جاتے ہیں۔ نیوز ویک کی رپورٹ (جو کہ 18 مارچ 1980 کو شائع ہوئی) کے صفحہ نمبر 50 پر لکھا ہے:

"یونیورسٹریز میں عورتوں کے ساتھ Saxual assault ہوتا ہے۔"

اس رپورٹ کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ لیکچرارز اور پروفیسرز عورتوں کو جنسی طور پر ہراساں کرتے ہیں اور بدلے میں ان کو اچھے گریڈز سے نوازتے ہیں۔ جب آپ جنسی طور پر ہراساں ہو جائیں تو قدرتی طور پر پڑھائی میں آپ کا ارتکاز کم ہو جائے گا۔

The World this Week رپورٹ کا ایڈیشن جو 26 اگست میں شائع ہوا اس میں ہے کہ خواتین کا 25% حصہ امریکہ کے اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں زنا بالجبر کا شکار ہوتا ہے۔

میرا سوال یہ ہے کہ آپ کا بچہ اسکول میں تعلیم پائے، تاروا ٹیکنیس سیکھنے جائے یا جنسی طور پر ہراساں ہو۔؟ اگر آپ اپنے بچے کو تعلیم سکھانا چاہتے ہیں تو میں آپ کو نصیحت کروں گا کہ آپ انہیں یونی سیکس اسکول میں داخل کرائیں۔

اعتراض نمبر 18:...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مذہبی سکالر تھیں اور وہ Interpret کیا کرتی تھیں۔ میرا سوال ہے کہ آج کتنی خواتین عالمہ قرآن وحدیث کو Interpret کررہی ہیں۔ ان کی کیا شرح ہے۔؟ اور ان کا تناسب مردوں کی بہ نسبت کیا ہے۔؟

جواب:...... نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایسی خواتین تھیں جو کہ نہ صرف حدیث کی تشریح کرتی ہیں بلکہ وہ یاد بھی کرتی تھیں ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے 2210 احادیث مروی ہیں۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ آج کتنی خواتین علماء ہیں۔؟ وہ ان کی شرح جاننے چاہتے ہیں تو جواب یہ ہے کہ ایسی بہت سی مسلم تنظیمیں ہیں جن میں خاتون علماء ہیں۔ بعض مسلم تنظیمیں ہیں جو کہ خواتین کو علماء بناتی ہیں۔ شرح فیصد کا مجھے علم نہیں ہے لیکن وہ فقط مصر میں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔

اعتراض نمبر 19:.......کیا صرف شوہر ہی تین طلاق دینے کا حق رکھتا ہے۔ عورت کو کیا کرنا چاہیے اگر وہ طلاق کی طلبگار ہو تو۔؟

جواب:.......بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر مرد طلاق دے سکتا ہے تو کیا عورت بھی طلاق دے سکتی ہے؟ عورت طلاق نہیں دے سکتی۔ کیونکہ طلاق عربی کا لفظ ہے اور جبھی استعمال ہوتا ہے جب کوئی مرد اسے عورت کیلئے بولتا، لکھتا یا اشارے کنائے سے کہتا ہے۔ اسلام میں عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ طلاق لے سکتی ہے۔

اسلام میں پانچ قسم کی طلاقیں ہے۔

پہلی قسم طلاق بالرضا ہے جو کہ شوہر اور بیوی کے درمیان ہوتی ہے اور دونوں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے درمیان ہم آہنگی ممکن نہیں لہٰذا جدا ہو جاتے ہیں۔

طلاق کی دوسری قسم ہے یکطرفہ مرضی کی طلاق جو کہ طلاق کہلاتی ہے۔ جس میں کہ اسے حق مہر ادا کرنا ہوتا ہے۔ اگر اس نے پہلے حق مہر ادا نہیں کیا ہوا تو اسے کرنا پڑے گا۔ ان تحائف سمیت حق مہر ادا کرنا ہوگا جو کہ اس نے دیئے ہوئے ہیں۔

تیسری قسم بیوی کی یکطرفہ مرضی پر ہے۔ اگر وہ اپنے نکاح نامے میں اس کا ذکر کرتی ہے تو اسے حق ہے کہ کسی وجہ سے طلاق لے لے۔ اگر وہ اپنے نکاح نامے میں اس کا تذکرہ کرتی ہے کہ اگر فلاں مسئلہ ہوا تو اسے طلاق لینے کا حق ہے تو جب وہ مسئلہ ہوگا تو وہ طلاق لے سکتی ہے۔ یہ "اسما" کے طور سے جانا جاتا ہے۔ میں نے آج تک کسی کو "اسما" کے متعلق بولتے نہیں سنا۔ یہ "اسما" کہلاتا ہے یعنی کہ عورت طلاق دے سکتی ہے۔

چوتھی قسم یہ کہ اگر شوہر اسے مارتا پیٹتا ہے یا مساوی حقوق نہیں دیتا تو اسے یہ اختیار ہے کہ وہ قاضی کے پاس جائے جو کہ نکاح کو فسق کر دے۔ یہ نکاح فسق کہلاتا ہے۔ اس کے مطابق قاضی شوہر کو حکم دے سکتا ہے کہ میرے سامنے اسے طلاق دو اور وہ اسے پورا حق مہر دینے کا پابند کر سکتا ہے یا مہر کے کچھ حصہ کا۔ یہ ساری بات قاضی پر منحصر ہے۔

طلاق کی آخری قسم خلع ہے۔ یعنی اگر شوہر بہت اچھا بھی ہے اور بیوی کو اس کے خلاف کوئی شکایت بھی نہیں لیکن اپنی ذاتی وجوہات کی بنا پر وہ شوہر کو پسند نہیں کرتی تو وہ شوہر سے درخواست کر سکتی ہے کہ وہ اسے طلاق دے دے۔ یہ طلاق خلع کہلاتی ہے لیکن بہت کم لوگ

عورت کے طلاق دینے کے متعلق بات کرتے ہیں۔ علماء نے طلاق کی پانچ اقسام رکھی ہیں ۔ کچھ اسے دو اور تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں لیکن عام طریقہ عمل پانچ طلاق کی قسموں والا بھی ہے۔

اعتراض نمبر 20:...... عورتوں کو مساجد جانے کی اجازت کیوں نہیں۔؟

جواب:...... سوال پوچھا گیا کہ عورتوں کو مساجد میں جانے کی اجازت کیوں نہیں۔؟ جواب یہ ہے کہ قرآن مجید واحادیث میں ایسا کوئی بیان نہیں ہے جو کہ عورت کو مسجد میں جانے سے روکتا ہو۔ کچھ لوگ عام طور پر یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"یہ عورتوں کیلئے بہتر ہے کہ وہ مساجد کے بجائے گھر میں نماز پڑھیں۔"

وہ لوگ محض ایک ذریعہ علم پر انحصار کر رہے ہیں اور باقی سرے سے نظر انداز کر رہے ہیں۔ آپ کو وہ حدیث دیکھنی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب کوئی باجماعت نماز ادا کرتا ہے تو 27 گنا زیادہ ثواب ملتا ہے۔"

لہٰذا ایک خاتون نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

"یارسول اللہ! ہمارے نوزائیدہ بچے ہوتے ہیں۔ ہمیں گھر کا کام کاج کرنا ہوتا ہے تو پھر ہم مساجد میں کیسے جاسکتی ہیں۔؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اگر عورت نماز گھر میں پڑھے تو یہ اس کیلئے بہتر ہے۔"

عورت مسجد میں نہ جائے بہتر ہے کہ وہ گھر میں نماز پڑھ لے، بلکہ گھر کی بجائے کمرے میں نماز پڑھے۔ اگر اس کے نوزائیدہ بچے ہیں یا اور مسائل ہیں تو اس کو برابر کا ثواب ملے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ کے غلاموں یعنی عورتوں کو مساجد میں جانے سے نہ روکو۔"

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شوہر کو حکم دیا کہ اگر قاری عورتیں مسجد میں جانا چاہیں تو انہیں مت روکو۔

معلوم ہوا کہ اسلام عورت کو مسجد جانے کی اجازت دیتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہاں علیحدہ حصہ ہو اور سہولتیں بھی۔ ہم مخالف اصناف کے میل کو پسند نہیں کرتے۔ ہم کو معلوم ہے کہ دوسری مذہبی جگہوں میں کیا ہوتا ہے۔ لوگ بنت حوا کو تنگ کرنے اور تاڑنے کیلئے آتے ہیں عبادت کے لیے نہیں۔ لہٰذا اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ مسجد کے ایک ہی حصہ میں مرد و خواتین اکٹھی ہوں۔ وہاں عورتوں اور مردوں کیلئے علیحدہ دروازے (Entrance) ہوں، وضو کیلئے علیحدہ جگہیں ہوں اور مردوں عورتوں کیلئے علیحدہ قیام کی جگہ ہو۔ عورت آگے کھڑی نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر وہ سامنے کھڑی ہوتی ہے تو اس کے پیچھے جو شخص کھڑا ہو وہ فطری طور پر تنگ (Distrub) ہوگا۔ اسلام میں نماز کے دوران ہم کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے ہیں اور میڈیکل ڈاکٹر ہمیں بتاتے ہیں کہ عورتوں کا درجہ حرارت "1c" زیادہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کے ساتھ عورت کھڑی ہو تو آپ نرمی اور گرمی محسوس کریں گے اور بجائے اس کے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان دیں آپ اس عورت کی طرف دھیان کریں گے۔ اس لئے اسلام میں عورت کو پیچھے کھڑا ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔

آپ سعودی عرب جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ عورتوں کو مسجد جانے کی اجازت ہے۔ آپ لندن جائیں وہاں بھی عورتوں کو مسجد جانے کی اجازت ہے۔ چاہے آپ امریکہ جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ عورتوں کو آزادی ہے مسجد جانے کی۔

اعتراض نمبر 24:...... "Films, Videos culture, Songs, Magzines etc." نے آج کل جنسی طوائف الملوکی پھیلادی ہے۔ کیا ان حالات میں یہ ناگزیر (Recommendable) ہے کہ ہم اپنی بچیوں کو اپنی مرضی سے شادی کی اجازت دیں۔؟

جواب:...... سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں ہمارے پاس سیکس اور بہت سی موویز ہیں۔ کیا یہ Advisable ہے کہ بیٹیوں کو ان کی مرضی سے شادی کی اجازت دی جائے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ والدین رہنمائی دے سکتے ہیں۔ یقیناً وہ بیٹی کو شادی کے متعلق رہنمائی دے سکتے ہیں۔ وہ ان کو مجبور نہیں کر سکتے ہیں اور آپ کیسے جانتے ہیں کہ والدین ہمیشہ صحیح ہی ہوں۔؟ لہٰذا یہاں اسلام والدین کو اپنے بچوں کی شادی سے متعلق فقط

رہنمائی کرنے کی ہی اجازت دیتا ہے لیکن زبردستی مجبور کرنے کی نہیں۔ لڑکی کو بھی آخر شوہر کے ساتھ رہنا ہوتا ہے۔

اعتراض نمبر 25:......قرآن واحادیث اور "Islamic Personal Law" کے تحت صرف باپ ہی اپنی اولاد کا ولی ہوتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

جواب:......اسلامی شریعت کے مطابق اگر بچہ اپنی ابتدائی نشوونما میں ہے یعنی اگر اس کی عمر سات سال سے کم ہے تو گارڈین شپ (حفاظت کی ذمہ داری) کا حق ماں کو جاتا ہے کیونکہ ابتداء میں ماں کی ذمہ داری باپ سے زیادہ ہے۔ اس کے بعد باپ گارڈین ہوتا ہے۔ جب بچہ بیچور (بالغ) ہو جاتا ہے تو اسلام کے مطابق بچے کی اپنی آزادانہ مرضی ہو گی کہ وہ جس کے ساتھ مرضی رہے۔ اس دوران اسلام کے مطابق بچہ باپ کے ساتھ ہے یا ماں کے ساتھ اس کو دونوں سے ملنے کی اجازت ہے۔

ولایت کا حق تینوں کو حاصل ہے۔ ماں کو، باپ کو اور خود بچے کو۔ ماں کو یہ حق بچے کی ولادت سے لے کر سات سال کی عمر تک حاصل ہے، باپ کو حق ولایت سات سال کی عمر سے لے کر بالغ ہونے (14 سال) کی عمر تک حاصل ہے اور اس کے بعد بچہ خودمختار ہو جاتا ہے۔ یعنی اسلام نے حق ولایت جتنے سال ماں کو دیا اتنے ہی سال باپ کو۔ اس کے بعد بچہ خودمختار۔

اعتراض نمبر 22:......کیا شوہر کیلئے ضروری ہے کہ وہ دوسری شادی سے پہلے پہلی بیوی سے اجازت لے؟

جواب:......کیا شوہر کیلئے دوسری شادی کیلئے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری ہے؟ جواب یہ ہے کہ مرد کیلئے لازمی نہیں ہے کہ وہ پہلی بیوی سے دوسری شادی کی اجازت لے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

"صرف ایک صورت میں مرد ایک سے زیادہ بیویاں کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ انصاف کر سکتا ہو بیویوں کے درمیان، اگر ایسا نہیں کر سکتا تو پھر ایک بیوی ہی پر موقوف رہے۔"

مرد اگر اپنی پہلی بیوی سے اجازت لیتا ہے تو یہ بہتر ہے۔ یہ اس کا فرض ہے کہ وہ پہلی

بیوی کو بتائے کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے کیونکہ اسلام کہتا ہے:

"اگر تمہاری ایک سے زیادہ بیویاں ہیں تو تمہیں انصاف کرنا ہوگا۔"

اگر پہلی بیوی اجازت دے دیتی ہے تو قدرتی طور پر دونوں بیویاں اور شوہر کے درمیان زیادہ مخلص تعلقات فروغ پائیں گے لیکن یہ لازمی نہیں ہے۔ ماسوائے ایک صورت کے۔

اگر عورت اپنے نکاح نامے میں یہ واضح کرتی ہے کہ میرے ہوتے ہوئے تم دوسری شادی نہیں کر سکتے تب یہ شوہر کیلئے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ شادی کرنے سے پہلے اجازت لے۔ دوسری صورت میں یہ لازم نہیں لیکن بہتر ہے۔

انسدادِ غلامی

غلامی کا انسداد:

عربی زبان میں "رق" کے معنی کمزوری کے ہیں' اسی سے رقت قلب نکلا ہے۔ فقہا کے نزدیک رق ایک قسم کی حکمی درماندگی ہے جو بعض لوگوں کو پہنچتی ہے۔ فرنگیوں کی اصطلاح میں غلامی سے مراد کسی شخص کا اپنی فطری آزادی سے محروم ہو جانا اور اس کو دوسرے کی ملک بنا دینا ہے۔

غلام بنانے کا رواج:

کسی دور میں انسانی جماعت کا توازن برقرار نہیں رہا۔ دور وحشت و بربریت سے لے کر دورِ تہذیب و تمدن تک بلکہ عالم انسانی کے تمام ارتقائی ادوار میں قوت وضعف کے مظاہر رونما ہوتے رہے ہیں۔ غلامی بھی اسی انسانی کمزوری کا ایک مظہر ہے۔ اس کا رواج اس وقت سے ہوا ہے جب سے کہ جہالت وظلمت کے پردے انسانی سوسائٹی پر پڑے ہوئے تھے۔ غلامی کے شیوع پذیر ہونے کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

اسباب:

1: چونکہ محنت ومشقت کے کام دشوار ترین اور جسم کے لیے آفت رساں ہیں

اس لئے انسان کو ایسے ذرائع کی تلاش دامنگیر ہوئی جو اس کو اس محنت و مشقت سے نجات دلائیں۔ اس نے سوسائٹی میں نظر دوڑائی تو اپنی آنکھوں کے روبرو ہی اس کی مراد نظر آئی' قوی و طاقتور نے اپنے کاموں کی تکمیل کے لیے کمزور و ناتواں انسانوں کو اپنا مطیع و ماتحت بنایا' یہیں سے غلامی کا رواج شروع ہوا۔

2: حرص و آواز اور ملک گیری کے جذبات آندھیوں کی طرح اٹھے جن کے نتیجہ میں جنگیں ہوئیں' فاتح قوم نے مفتوح قوموں کو اپنا غلام بنالیا۔ اس طرح بڑی بڑی قوموں کے پاس غلام بنانے کا رواج پھیل گیا۔ کوئی قوم جب دشمن پر غالب ہو جاتی تو اس کو قتل نہیں کرتی بلکہ اپنی ضروریات زندگی کی تکمیل اور اپنے کاموں کو پورا کرنے کے لیے ان کو اپنا ماتحت بنائے رکھتی۔

3: غلامی کے دائرہ کو وسیع کرنے اور اس کے وسائل کو زیادہ کرنے میں جغرافیائی ماحول اور اقلیتی طبائع کو جو انسانی جماعتوں کی تکوین میں زبردست عامل و موثر کی حیثیت رکھتے ہیں بہت بڑا اثر ہے۔ چنانچہ جو قومیں تمام مشرقی ممالک میں فطری درجہ پر تھیں ان میں غلامی حد درجہ وسیع پیمانہ پر پہنچ چکی تھی' کیونکہ غلام کی قیمت بہت تھوڑی تھی اور اس کا کام صنعت و تجارت میں نہایت مفید تھا۔

مگر شمال میں جنوبی خطوں کے مقابلہ میں غلام بنانے کا رواج بہت کم تھا' کیوں کہ ان کے پاس غلام کی خوراک کے لیے بھاری خرچ پڑتا تھا اور اس کی محنت اور اس کے کام سے کوئی بڑا فائدہ بھی نہیں تھا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ غلامی کا رواج چند ایسے اقتصادی امور سے متعلق تھا جو محنت و عمل کا نتیجہ تھے۔

دور قدیم میں غلامی

قدیم مصریوں کے ہاں غلامی: قدیم مصریوں کے پاس غلام ایک مسخر آلۂ کار تھا اور اس کا شمار زیب و زینت کے مظاہر اور شان و شوکت کے آثار میں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ بادشاہوں کے محلوں' کاہنوں اور سپہ سالاروں کے گھروں میں غلام موجود ہوتے تھے اور جنگ میں جو قیدی بنالیے جاتے وہ حکومت کے غلام متصور ہوتے اور ملک کی

ضرورتوں کے مطابق کام انجام دیتے یا ملک کی آرائش اور اس کی حسن تشکیل کے متقاضی فرائض کی تکمیل کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ قومی مصلحتوں اور عام حاجتوں کو بھی پورا کیا کرتے تھے۔ ان حالات میں اخلاق وعادات کا تقاضا یہ تھا کہ غلاموں کے ساتھ شفقت ورحم دلی کا معاملہ کیا جائے اور ان کی اذیتوں اور تکلیفوں کو دور کیا جائے۔

ہندوؤں کے ہاں غلامی: ہندوؤں نے لوگوں کو دو ممتاز طبقوں میں منقسم کیا ہے:

1: دویداس: یہ وہ لوگ ہیں جن سے اونچے طبقے ترکیب پاتے ہیں مثلاً برہمن وغیرہ۔

2: شودر: یہ نیچ طبقہ ہے اور خادم۔

پھر شودروں کے درجہ کی برہموں کے مقابلہ میں حد بندی کی گئی ہے، ان کو نہایت کم درجہ میں رکھا گیا اور ان کے لیے نہایت تیز قوانین بنائے گئے ہیں جن میں سے چند قوانین حسب ذیل ہیں:

1: ایک برہمن کے لیے یہ جائز ہے کہ شودر کو خدمت کے لیے مجبور کرے خواہ اس نے اس کو خریدا ہو یا نہ خریدا ہو' کیونکہ وہ غلام ہے اور وہ محض برہموں کی غلامی وخدمت گزاری کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

2: اگر شودر کا آقا اس کو آزاد بھی کر دے تو وہ اپنی خدمت گزاری کی صفت سے جدا نہیں ہوتا' کیونکہ یہ اس کی فطری وطبعی خصوصیت ہے جو اس کی زندگی سے وابستہ ہے۔

3: جب کوئی شودر کسی برہمن کو اذیت پہنچائے تو اس کو قتل کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔

4: اگر اس نیچ طبقہ والا کوئی شخص کسی برہمن کو فحش گالی دے تو اس کی زبان کاٹ ڈالی جائے۔

5: اس نیچ طبقہ والا اونچے طبقہ کے کسی آدمی کا نام حقارت کے طور پر اور عیب چینی کی غرض سے زبان پر لائے تو اس کی سزا یہ ہے کہ اس کے منہ میں ایک خنجر' جس کی لمبائی

دس انگلیوں کے برابر ہو آگ پر سخت گرم کرنے کے بعد رکھ دیا جائے۔

6: اگر کوئی شودر برہموں کے فرائض وواجبات کے متعلق ان کو نصیحت کرنے اور وعظ کرنے کی جرأت کرے تو بادشاہ کا فرض ہے کہ اس کے کان اور منہ میں کھولتا ہوا تیل ڈال دے۔

7: اگر کوئی برہمن شودر کے پاس کی کوئی چیز چرا لے تو اس پر جرمانہ عائد کیا جائے گا' لیکن اگر شودر چوری کرے تو اس کی سزا اس کو آگ میں جلا دینا ہے۔

8: اگر کوئی شودر کسی قاضی کو مارنے کی جسارت کرے تو اس کو زندہ لٹکا کر آگ میں بھونا جائے' لیکن اگر کوئی برہمن اسی قسم کے جرم کا ارتکاب کرے تو اس پر تاوان عاید کیا جائے۔

برہموں کی شریعت میں تمام خدمت گزاروں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ خدمت گزار اور غلام۔ پاکیزہ کام خدمت گزاروں کی خصوصیت میں سے ہیں اور گندے اور نجس کاموں کو غلام کی گردن پر ڈالا گیا ہے۔

آشوریوں اور ایرانیوں کے ہاں غلامی: مملکت آشور کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ غلامی ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی تھی' محلات ان عورتوں اور غلاموں سے بھرے پڑے تھے جن کو زینت و جمال کے لیے مخصوص کر لیا گیا تھا۔

مملکت ایران نے جس کی سلطنت کے گوشے ایشیائے قدیم کے حدود تک وسیع ہو گئے تھے' تمام اقسام کے خدمت گزاروں کو جو بیشتر مختلف قوموں کے پاس مشہور و معروف تھے' اپنے اندر جمع کر لیا تھا۔ اس کے اندر غلام ہی چرواہے تھے اور غلام ہی زیب و زینت اور دولت و ثروت کی حاجتوں کے ساتھ مختص بھی۔

بعض شہروں میں عرف و اصطلاح نے یہ روا قرار دیا کہ غلاموں کے لیے بھی آرام وراحت کی گھڑیاں ہونی چاہئیں' جیسا کہ واضعان قوانین نے غلاموں کے بارے میں عدل وانصاف کرنے اور ان کو ظلم کا تختہ مشق بننے سے روکنے کی کوشش کی۔ ہیرڈوٹ کہتا ہے:

"کسی ایرانی کو یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے غلام کو کسی ایک گناہ پر ایسی سزا دے جو شدت و درشتگی کی حد کو پہنچ چکی ہو' لیکن غلام جب اسی گناہ کا دوبارہ ارتکاب

کرے تو اس کے آقا کو حق حاصل ہے کہ اس کی زندگی کا خاتمہ کر دے یا اس کو ہر قسم کا عذاب دے جو تصور میں سما سکتا ہے۔"

چین میں غلامی: میلاد مسیح سے کئی صدیاں پیشتر چین میں عام منفعت کے لیے خدمت لینے کا طریقہ رائج تھا۔ محکوم اور قیدی خدمت کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد غلام بنانے کا طریقہ جاری ہوا۔ اہل چین غلاموں کو باہر کے لوگوں سے جنگ کر کے حاصل کیا کرتے یا ان کو خود چینیوں میں سے بنایا کرتے تھے جیسا کہ خود حکومت یہ کام کیا کرتی تھی کیونکہ محتاج و فقیر فاقہ و احتیاج کی وجہ سے اپنی اولاد کو فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ آقا کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ غلام میں آزادانہ تصرف کرے۔ اس کو فروخت کرے یا اس کی اولاد کو، مگر ممالک چین میں غلامی شدت کے ساتھ نہیں تھی، کیونکہ وہاں کے قوانین اور اخلاق و رسوم غلاموں کے ساتھ مہربانی کرنے اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کی اعانت کرتے تھے۔

چنانچہ شہنشاہ کوانجوں نے جو مسیح علیہ السلام کے بعد 35 سال تک زندہ رہا، غلام کی زندگی اور اس کی شخصیت کی حفاظت کے لیے دو قانون نافذ کیے اور ان کے ضمن میں ایسی عبارت پیش کی جس میں کمال انسانیت و مروت کا رنگ جھلکتا ہے۔ چنانچہ ان دونوں احکام میں کہا گیا ہے:

"انسان آسمان و زمین کی مخلوقات میں اشرف و افضل ہے۔ جو شخص اپنے غلام کو قتل کر دے تو اس کے اخفائے جرم کے لیے کوئی سبیل نہیں۔ جو شخص اپنے غلام کو آگ میں جلانے یا اس کو آتشیں داغ دینے کی جرأت کرے گا تو قانون کے مطابق اس کو بھی یہی سزا دی جائے گی۔ جو شخص اپنے سردار کو نذر آتش کر دے تو وہ آزاد منش وطن پرست طبقہ میں شمار کیا جائے گا۔"

بعض غلاموں کی اچھی قدر و منزلت تھی۔ وہ مختلف عہدوں پر فائز ہوتے تھے اور اپنے آقاؤں کا اعتماد بھی ان کو حاصل ہوتا تھا۔ غلام کو بعض کسب معاش کے طریقوں میں اتنی سہولت تھی کہ وہ اپنی آزادی حاصل کر لیتا تھا اور غلامی کے قلاوہ سے چھٹکارا پالیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غلامی کا رواج اس چینی قوم کے پاس بہت کم تھا جو جودت فکر اور درستگی رائے میں

ممتاز ہے۔

عبرانیوں میں غلامی: عبرانی قوم کے نزدیک غلامی کا رواج بہت قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ بنی اسرائیل میں غلاموں کو ان رؤساء وامراء کے پاس دولت وثروت کے اصول اور تونگری کے ذرائع واسباب میں شمار کیا جاتا تھا جن کی عادت سیر وسیاحت تھی، لیکن ان کے پاس غلاموں کے لیے چند حقوق تھے۔ مثلاً سال میں سات ہفتے ان کو آرام کا موقع دیا جاتا اور ان کو شدید زدوکوب کرنا ناجائز تھا۔ اگر کوئی ایسا کرتا تو اس کو شدید سزا دی جاتی۔ اسی طرح غلام کو زخمی کرنا یا اس کی ہڈی یا دانت توڑنا ممنوع تھا۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ عبرانی غلاموں کے ساتھ اپنے جیسا معاملہ کیا کرتے تھے۔ اکثر مرتبہ ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ آقا اپنی کسی لونڈی کو ممتاز کر لیتا اور اسے اپنی زوجہ بنالیتا تھا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ غلام کے لیے بعض اوقات اس کی اجازت تھی کہ وہ اپنے آقا کی لڑکی سے شادی کرلے جب کہ آقا کی کوئی اولاد ذکور میں سے نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ عبرانیوں اور ان کے علاوہ دیگر تمام مشرقی قوموں کے پاس غلاموں کے ساتھ نرمی اور مہربانی کا برتاؤ کیا جاتا تھا جس کی مثال یونان وروما میں نہیں ملتی۔ اس کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں وارد ہوا ہے کہ غلام جب کسی قصاص کا مستحق ہو تو یہ حکم قاضی ہی کے ذریعے سرزد ہوگا' تاکہ اس کو آقاؤں کی درشتی اور ان کے انتقام سے بچا کر اس کی حفاظت کی جائے۔

یونانیوں میں غلامی: غلامی کا رواج دورِ قدیم سے تمام بلاد یونان میں شائع تھا۔ جس کے جواز اور صحت کو فلاسفہ یونان کے سرگروہ ارسطو نے ثابت کیا ہے اور اس نے غلام کی اس طرح تعریف کی ہے:

> "غلام ایک ایسا ذی روح آلہ یا متاع ہے جس کے ذریعے زندگی کا نظام چل رہا ہے۔"

پھر ارسطو نے بنی نوع انسان کو دو گروہوں میں منقسم کیا ہے ایک آزاد اور دوسرے بالطبع غلام یونانیوں نے غلام کی دو جداگانہ قسمیں قرار دی ہیں۔

1: مفتوح ومغلوب ممالک کے باشندے جو وہاں کے حکمرانوں کے محکوم

ہیں۔ یہ لوگ ان کی حکومت کے اسی طرح زیر نگیں ہیں جیسا کہ اس کا ایک حصہ۔

2: غلامان خرید و فروخت کہ جن کے آقاؤں کو ان پر مطلق سرداری حاصل ہے۔ زیادہ تر غلام دوسری صنف سے تعلق رکھتے ہیں۔

سمندروں میں رہزنی اور ساحلی مقامات پر رہنے والوں کی لوٹ مار یہ تمام غلام بنانے کے طریقے تھے۔ یونان' ایتھنز' قبرص' ساموس اور صاقس کی نوآبادیاں غلاموں کی خرید و فروخت کے بڑے مراکز اور منڈیاں تھیں۔ غلام اپنے آقاؤں کے لیے یا اپنے لیے اس شرط پر کام کیا کرتے تھے کہ وہ ان کے سرداروں کے لیے ہر دن معینہ رقم ادا کر دیں۔ اکثر یونانیوں نے غلاموں کو خرید کر ان کو مزدوری کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ یہ جلب زر اور تونگری حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ تھا۔ ایتھنز کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں کوئی غلام اپنی خدمت گزاری پر نہ مقرر ہو خواہ اس کا مالک فقیر ہی نہ ہوتا ہو۔ آقا کو اپنے غلام میں آزادانہ تصرف کا حق حاصل تھا۔ اگرچہ غلام کے ساتھ معاملہ کرنے میں یونانیوں کے پاس اس قدر شدت نہیں برتی جاتی تھی جتنی کہ رومانیوں کے پاس تھی۔

غلاموں کی سزا تازیانہ اور آسیا گردانی تھی۔ جو غلام بھاگ جاتا یا بربری ملکوں سے کسی ملک میں چلا آتا تو اس کی پیشانی پر تپتے ہوئے لوہے سے داغ دیا جاتا۔ اس کے علاوہ غلام کی زندگی اور اس کی شخصیت کا قانون ذمہ دار تھا۔ قانون حکم صادر ہونے ہی پر اس کو موت کا حکم سنایا جاتا۔

ایتھنز میں چند آزاد لوگ ایسے تھے جو مدت العمر اپنے آقاؤں کی دوستی لازم کر چکے تھے اور ان پر چند مقررہ ذمہ داریاں عائد کر دی گئی تھیں لیکن ان کو وطنی حقوق حاصل نہ تھے بلکہ ان کا مقام اجنبیوں کی طرح تھا۔ اسی طرح ان کے پاس ایسے غلام تھے جن سے حکومت شہروں کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لیے خدمت لیتی تھی اور امن قائم کرنے اور عام اجتماعوں میں راحت و آسائش کے وسائل فراہم کرنے کے لیے ان سے امداد لی جاتی تھی۔

رومانیوں میں غلامی: تمام کام رومۃ الکبریٰ میں آزاد کاریگروں کے سپرد تھے۔ اسی لیے اس تاریخی شہر کے تمام باشندوں میں جواں مردی اور بہادری کی روح درخشاں ہوگئی لیکن جب جنگیں بکثرت ہوئیں' روم کی فتوحات کا سیلاب ہر

طرف سے امنڈ پڑا اور خوش حالی وعیش پرستی کا دور دورہ ہو گیا تو مالداروں نے غلاموں کا سہارا ڈھونڈا' ان کو زمین کی کاشت میں استعمال کیا اور فنون وصنائع کو ان کے حوالے کر دیا گیا۔

روم میں غلام بنانے کے اسباب بہت سے ہیں:

1: جنگیں غلامی کا بیشتر سبب تھیں۔

2: غلاموں کی اولاد۔

3: وہ آزاد لوگ جن کو بعض قوانین کی عبارتوں اور اشاروں کے ذریعے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا گیا۔ مثلاً وہ قرض دار جس کو اپنا قرض ادا کرنے کے ذرائع بآسانی فراہم نہیں ہوئے۔

اکثر مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ بعض دلال فوجیوں سے مل جاتے اور ہزاروں قیدیوں کو کم دام میں فروخت کر دیتے تھے۔ اسی طرح ان میں یہ طریقہ تھا کہ وہ بچوں کو چرا کر فروخت کر دیتے تھے اور عورتوں کو بھی خلاف تہذیب کاموں کے لیے بیچ دیتے تھے۔

روم میں یہ عادت تھی کہ غلام کو نیلام کے ذریعے فروخت کیا جاتا تھا۔ اس کو ایک پتھر پر کھڑا کیا جاتا تا کہ ہر شخص اس کو دیکھ سکے۔ اسی طرح یہ رسم تھی کہ خریدنے والا غلام کو ننگا کر کے دیکھنے کا مطالبہ کرتا تھا تا کہ ان کے عیوب سے واقف ہو جائے۔

تعلیم یافتہ غلاموں اور تمثیلی کرداروں کی صلاحیت رکھنے والوں اور حسین وجمیل لونڈیوں کی قیمتیں نہایت گراں تھیں۔ جب ہر طرف فتنہ وفساد کا بازار گرم ہو گیا اور اصول وآداب کی بنیادوں میں خرابی واقع ہو گئی تو خوبصورت لونڈیوں کی خرید وفروخت دولت وتونگری کا ذریعہ بن گئی۔

رومہ نے بھی ممالک یونان کی طرح غلاموں کی تقسیم اس طرح کی ہے:

1: وہ غلام جو رفاہ عام کے فرائض انجام دیتے ہوں اوروں کی بہ نسبت خوشحال ہیں۔ عمارتوں کی نگرانی وحفاظت قاضیوں اور کاہنوں کی امداد کے کام ادا کرتے اور قیدیوں اور جلادوں سے خدمت لیتے ہیں۔

2: خصوصی غلام۔ یہ لوگ اپنے آقاؤں کی خدمت گزاری کا فرض ادا کرتے

اور ان کی مصلحتوں اور ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔

قانون کی نظر میں غلام کوئی چیز نہیں تھا' اس کو نہ تو ملکی حقوق حاصل تھے، نہ خاندانی اور نہ شخصی۔ وہ باعتبار آزادی وغلامی اس کی ماں کے تابع ہے۔ یہ اعتبار وضع حمل کے وقت ہوگا نہ کہ بحالت حمل۔

غلاموں پر ان کے آقاؤں کے لیے غلبہ واقتدار کی کوئی حد بندی نہیں تھی۔ آقا غلام کو کسی ناروا حرکت پر اپنی جی بھر کے سزا دے مثلاً اس کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ کر زراعت وکاشتکاری کی مشقتیں برداشت کرائے۔ جسم کی کھال پر اتنے کوڑے لگائے کہ وہ آخر کار ہلاک ہو جائے۔ اس کے دونوں ہاتھ لٹکا کر اس کے دونوں پاؤں میں بھاری اور وزنی بوجھ باندھ دے اور اس کو درندوں اور جنگلی جانوروں سے لڑنے کے لیے بھیج دے۔ الغرض یہ تمام اختیارات ایک آقا کو حاصل تھے۔

قانون رومہ نے غلاموں کے اس دردناک منظر کو شفقت ورحمدلی کی نظر سے دیکھا اور ان کے لیے اولین قانون جو "قانون پترونیا" کے نام سے مشہور ہے وضع کیا گیا۔ اس میں یہ درج تھا کہ آقاؤں پر یہ حرام ہے کہ وہ اپنے غلاموں کو وحشیوں سے جنگ کرنا ضروری قرار دیں لیکن یہ سزا قاضی کی اجازت سے واقع ہونا صحیح ہے۔

پھر "انطوفان اور کلودیوس" کا ظہور ہوا' ان دونوں نے غلاموں کے ساتھ برا معاملہ کرنے کو منع قرار دیا اور یہ قانون نافذ کیا کہ اگر آقا اپنے غلام کو قتل کر دے تو اس کو جرم قتل کا مرتکب شمار کیا جائے گا۔

قرون وسطی میں غلامی:

بربری قوموں کے قوانین رومانیوں کے قوانین کے مشابہ ہیں۔ قانونی اعتبار سے غلام کو حیوان کی طرح شمار کیا جاتا تھا۔ اس کا آقا اس میں من مانے تصرف کر سکتا تھا اور اس کو قتل کرنا اس کے لیے روا تھا کیونکہ غلام اشیائے ملکیت میں سے تھا۔ ان قوموں کے کئی گروہ ہیں:

پہلا گروہ غالیوں کا ہے۔ ان کے پاس غلاموں کو زمین پر ہل چلانے' زراعت اور فصل کاٹنے کی تکلیف دی جاتی تھی' کیونکہ یہ تمام کام شیشرون کے زمانے میں حقیر اور کم

درجہ کے تھے۔ آزاد اشخاص کو ان کی مزاولت لائق نہیں تھی۔

دوسرا گروہ جرمنوں کا ہے۔ ان کے نزدیک غلامی کا انحصار اس پر تھا کہ غلاموں کو ان کے آقا مزدوروں کی طرح گیہوں یا چوپائے یا کپڑے معینہ مقدار میں ادا کر دیتے۔ ہر غلام کے لیے ایک گھر تھا۔ وہ اس میں جیسا چاہتا انتظام کرتا تھا۔ کیونکہ ان کے آقا جوا بازی میں منہمک رہتے تھے۔

تیسرا گروہ فرنگیوں کا ہے۔ غلامی کا رواج ان میں انتہائی شدت کو پہنچ چکا تھا۔ کیونکہ ان کے قانون نے آزادوں اور غلاموں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کر دی تھی۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اجنبی لونڈی سے شادی کرتا تو وہ بھی غلامی کے پھندوں میں گرفتار ہو جاتا اور وہ آزاد عورت جو کسی غلام سے شادی کرتی تو اپنی آزادی سے محروم ہو جاتی۔

چوتھا گروہ ویزیقوط ہے۔ اس قوم کے پاس غلام کے ساتھ انتہائی شدید معاملہ کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر آزاد عورت اپنے غلام سے شادی کر لیتی تو اس کو غلام کے ساتھ زندہ جلا دیا جاتا۔ ہر ایک کو کوڑے لگائے جاتے۔ اگر وہ عورت غلام کی مالکہ نہ ہوتی تو عقد کو فسخ کر دیا جاتا۔

پانچواں گروہ استروقوط اور مبرویون کا ہے ان دونوں قوموں کے نزدیک بہت سخت احکام وقوانین نافذ تھے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی آزاد عورت غلام سے شادی کرتی تو اس کو جلاوطنی کی سزا دی جاتی۔

چھٹا گروہ اینگلوسکسون کا ہے۔ یہ لوگ غلام کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کرتے تھے۔

1: وہ غلام جو جائیداد کے مشابہ ہیں' یہ زمین سے جدا نہیں ہوتے تھے۔ زمین جوتنے اور اس کی کاشت کے ذمہ دار تھے، پھر ان کے لیے اس کی اجازت تھی کہ وہ اتنا سرمایہ جمع کر لیں جس سے وہ اپنی آزادی پر قابو پا سکیں۔

2: وہ غلام جو متاع کے مشابہ تھے۔ ان لوگوں کی خرید وفروخت جائز تھی۔

دور جدید میں غلامی:

خدمت گزار شخصیت کی حیثیت سے نئے زمانے میں حبشیوں کو غلام بنائے رکھنا رومانیوں کے غلام بنانے کے مشابہ ہے۔ لیکن اس اعتبار سے یہ غلامی رومانیہ کی غلامی سے

جوہری تضاد رکھتی ہے کہ نو آبادیوں کی فتوحات نے زمینوں کا ان کے مزدور کاشتکاروں سمیت مالک نہیں بنا ڈالا بلکہ انہوں نے وہاں کے باشندوں کو دور کر دیا اس لیے حبشیوں کی حاجت پڑی۔

حبشی قانون: قانون اسوہ کا اطلاق تمام شہروں میں ان مجموعی قوانین واصول پر کیا جاتا ہے جو غلامی کے باب میں مدون ہوئے ہیں۔ چنانچہ 17 مارچ 1685ء میں فرانس میں ایک فرمان نافذ ہوا جو فرانسیسی نو آبادیوں میں بسنے والے غلاموں اور آزادوں کے حالات کی درستگی اور ان کی تنظیم سے متعلق تھا، لیکن اس کو رائج کرتے وقت بہت سے قوی اعتراضات اس پر وارد کیے گئے۔ جس کی وجہ سے اس کی خوبی زائل ہو گئی اور اس کی برائی باقی رہ گئی، غلام کے ضمن میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس کا نہ تو نفس ہے، نہ روح اور نہ ارادہ۔ اس کے بعض گوشے یہ ہیں:

1: اگر کوئی حبشی ان کے آقاؤں کو تھوڑا بھی دکھ پہنچائے یا آزاد و اشخاص پر تھوڑی بھی زیادتی کرے یا خفیف سرقہ بھی کرے تو اس کی سزا قتل ہے۔

2: پہلی اور دوسری مرتبہ بھاگنے والے غلام کی سزا کان کاٹنا اور تپتے ہوئے لوہے سے داغ دینا ہے اور تیسری بار بھاگنے کی سزا قتل ہے۔

3: مالک یا رئیس غلام پر کسی جرم کا ارتکاب کرے خواہ اس کو قتل ہی کیوں نہ کر ڈالے تو قاضیوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اس کو بری قرار دیں۔

4: سفید فام اشخاص کے علاوہ دوسروں کے لیے یہ حرام ہے کہ وہ فرانس میں علوم و معارف سیکھنے کے لیے حاضر ہوں۔

یہ حال تو فرانس کا تھا۔

امریکہ میں اس سے بھی زیادہ سخت اور انسانیت سوز قوانین نافذ تھے:

1: آقا کو غلام کے فروخت کرنے، اس کو کرایہ پر دینے اس کو رہن رکھنے اور اس پر جوا کھیلتے وقت بازی لگانے کا پورا پورا اختیار تھا اور غلام کو بے چون و چرا تابعداری فرض تھی۔

2: غلام کو آمد و رفت کا کوئی حق نہیں۔ زراعت کے لیے بغیر اپنے آقا کی

اجازت کے باہر نہیں نکل سکتا۔

3: شاہراہ عام پر اگر سات غلاموں سے زیادہ جمع ہو جائیں تو ان کو مخالفوں اور دشمنوں میں شمار کیا جائے گا۔

4: حبشیوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ سوائے ان کے ہم جنسوں کے کسی اور کے قضیہ میں گواہی دیں۔ ان کو اپنے فریق کی حفاظت کے لیے قسم بھی نہیں کھانی چاہیے' لیکن ان کے فرائض منصبی میں ان کو آزاد شمار کیا جائے۔

5: جو سیاہ فام سفید فام کی مدافعت کی جرأت کرے گا اور اپنے اوپر ظلم کرنے والے کو قتل کر دے گا تو جرم قتل کا مرتکب سمجھا جائے گا۔

6: اس پر سفر کرنا حرام ہے اور اس کو جائز قرار دینا ممنوع۔

7: جو شخص کسی غلام کو یا ان کے چند افراد کو اطاعت چھوڑنے کا مشورہ دے یا غلاموں کو عدول حکمی کی ترغیب دلانے کے لیے کوئی اشتہار یا رسالہ شائع کرے یا غلامی پر مذمت یا طعن کرتے ہوئے حکومت کے ملکوں میں اپنے قلم کے ذریعے کوئی اخبار یا پمفلٹ یا کتابیں روانہ کرے تو اس کو سخت سزا دی جائے گی۔

یہ وہ خصوصی احکام وقوانین ہیں قانون اسود کے جو اس تمدنی جنگ کے شعلوں کے بھڑکنے سے پیشتر مدون کیے گئے تھے۔ جس نے ممالک متحدہ کو تباہ و برباد کر دیا تھا اور انجام کار حبشیوں نے اپنی آزادی کی جدوجہد میں کامیابی حاصل کر لی۔

مسیحی مذہب میں غلامی: مسیحی مذہب میں غلامی کے خلاف کوئی صریح نص نہیں ملتی، نہ اس کے خلاف حواریوں نے کوئی تصریح پیش کی اور نہ ہی مختلف کلیساؤں میں کسی عیسائی جماعت نے غلامی کی حرمت میں کچھ کہا۔ صرف انجیل میں اس قدر ہے:

> "تمام لوگ بھائی بھائی شمار کیے جاتے ہیں' ان پر یہ امر واجب ہے کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کریں۔"

بلکہ پولس نے اپنے ایک خط میں جس کو اس نے افسیین کی طرف روانہ کیا تھا۔ غلاموں کو یہ وصیت کی ہے کہ وہ اپنے آقاؤں کی خوف و رعب کے ساتھ اسی طرح اطاعت

کریں جیسا کہ وہ مسیح علیہ السلام کی اطاعت گزاری کرتے تھے۔ اسی طرح ان کو حواری پطرس نے بھی نصیحت کی تھی کہ وہ ان کے آقاؤں کے تابعدار رہیں اور ان سے ڈرتے رہیں۔

کلیسا کے پادریوں نے ان ہی کے نقش پر چلنا اختیار کیا۔ چنانچہ انہوں نے غلامی کو جائز اور برقرار کیا۔ سپریانوس جو مشاہیر لاہوتیوں میں سے ہے کہتا ہے:

"فطرت نے بعض لوگوں کو مخصوص کر دیا ہے کہ وہ غلام بن کر رہیں۔"

بانی نے سفر خروج کے گیارھویں اصحاح اور سفر احبار کے پندرھویں اصحاح کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے غلامی کو صحیح قرار دیا ہے۔

جرمن پوپ بوبیر نے غلامی کا اقرار کیا ہے اور دلالی (ایجنسی) کو حلال تجارت میں شمار کیا ہے۔ روح القدس کے کلیسا کے رئیس پادری فوروتیر نے ثابت کیا ہے کہ غلام بنانا مسیحی نظام میں سے ہے۔

باتریس لاروک اپنی کتاب "مسیحی قوموں میں غلامی" میں کہتا ہے:

"مسیحی مذہب نے نہ صریح طور پر غلامی کو حرام قرار دیا اور نہ عملی طور پر اس کو باطل کیا۔"

پھر بیرلاروس فرانس کا سب سے بڑا ادیب کہتا ہے:

"آج تک مسیحی قوموں کے پاس غلامی کے باقی رہنے اور اس کے جاری ہونے سے کوئی انسان تعجب نہ کرے کیونکہ مذہب کے سرکاری نائبین اس کو صحیح تسلیم کرتے اور اس کی مشروعیت کے قائل ہیں۔"

خلاصہ یہ ہے کہ مسیحی دیانت آج تک غلامی پر پورے طور سے راضی ہے، کسی شخص کے لیے یہ ثابت کرنا دشوار ہے کہ مسیحی مذہب نے غلامی کو باطل کرنے میں کوشش کی ہو۔ یہاں تک کہ انقلاب فرانس واقع ہوا جس نے بلند آواز سے یکا یک پکارا کہ قانون کے روبرو تمام لوگ مساوی ہیں اور سب کو انسانی حقوق حاصل ہیں۔

اسلام اور غلامی:

گزشتہ بیانات سے یہ واضح ہو گیا کہ اسلام کے ظہور قدسی کے وقت تمام دنیا میں

غلامی کے مختلف اور گوناگوں طریقے رائج تھے آزادی کے راستے مسدود ہو چکے تھے۔ غلاموں پر قانونی سختیاں اور پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔ ان کے اور ان کے آقاؤں کے درمیان مکمل امتیازات کی دیواریں حائل ہو گئی تھیں۔ دانش وحکمت کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ دنیا سے بیک وقت غلامی کی لعنت کو دور اور اس کی زنجیروں کو پاش پاش کر دیا جائے۔ کیونکہ غلامی گزشتہ ارضی وسماوی شریعتوں اور قانونوں کے ثابت ہونے کی وجہ سے دنیا میں جڑ پکڑ گئی تھی۔ لوگوں نے اس کی زنجیر کو نسلاً بعد نسل کئی صدیوں سے مضبوطی سے تھام لیا تھا اور اس کو اپنے تمدنی وعمرانی اصول میں سے تسلیم کر لیا تھا۔ اگر اسلامی شریعت اس کو یکدم باطل قرار دیتی تو لوگوں کے دل مکدر ہو جاتے اور وہ الٰہی ووضعی شریعتوں کے اصول وقوانین سے حجت پیش کرنے پر مجبور ہو جاتے اور پوری مدافعت کرنے پر آمادہ ہو جاتے۔

اس کے علاوہ اسلام نے غلامی کا ایک علیحدہ اور جداگانہ راستہ اختیار کیا۔ وہ یہ کہ کافروں کی قوم کے روبرو پہلے اسلام پیش کیا اور پھر جزیہ اور اس کے بعد ان سے منظم شرعی جنگ کی۔ اگر دشمن ان دو امور میں سے کسی کو قبول کر لیں تو انہوں نے اپنے نفسوں اور مالوں کو محفوظ کر لیا اور ان کے بھی وہی حقوق ہیں جو مسلمانوں کے لیے ہیں۔ اگر انہوں نے انکار کر دیا اور جنگ چھڑی جس میں ان کو شکست ہوئی تو یہ امام کی اجازت سے فاتحین کے غلام بن گئے۔

لیکن ان کی یہ غلامی انہیں پھر اپنی آزادی کی طرف رجوع ہو جانے کی نعمت سے محروم نہیں رکھتی بشرطیکہ وہ مال کے ذریعہ فدیہ دے کر اپنی جانوں کو چھڑا لیں۔ اسی طرح حاکم کو یہ حق حاصل ہے کہ اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے ان کو آزاد کر سکتا ہے۔ اس کے متعلق باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”فاذالقيتم الذين كفروا فضرب الرقاب حتى اذا ثخنتموهم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء حتى تضع الحرب اوزارها“

(سورۃ محمد، آیت نمبر: 47)

”جب تمہاری کافروں سے مڈبھیڑ ہو تو گردنیں مارنی ہیں یہاں تک کہ جب

ان میں کشتوں کا ڈال چکو تو مضبوط باندھو قید' پھر یا احسان کرو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ جب تک کہ لڑائی اپنا ہتھیار ڈال دے۔"

آزادی کے طریقے: اسلام میں آزادی کی راہیں بے شمار ہیں جن میں سے اہم یہ ہیں۔

1: غلام کو آزاد کرنا عام گناہوں کی بخشش کا وسیلہ ہے۔ آنحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں غور کیجئے! جب کہ ایک اعرابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر عرض کیا:

"اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!! مجھے ایسا عمل بتائیے جو مجھے جنت میں داخل کر دے۔؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عتق النسمة وفك الرقبة"

"جان کو آزاد کرنا اور گردن کو چھڑانا۔"

اعرابی نے کہا:

"اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا یہ دونوں ایک نہیں۔؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"نہیں! جان کو آزاد کرنا یہ ہے کہ اس کو مستقل طور پر آزاد کر دیا جائے اور گردن کو چھڑانا یہ ہے کہ اس کی قیمت مقرر کر دی جائے (کہ غلام وہ قیمت دے کر آزاد ہو جائے۔)"

2: شریعت اسلامیہ کا فیصلہ یہ ہے کہ غلام کے بعض اجزا کی آزادی اس کے کل اجزا کی آزادی میں اثر کر جاتی ہے۔ چنانچہ جو شخص اپنے غلام کو تھوڑی آزادی بخشے تو اس کی یہ آزادی باقی اجزا میں بھی سرایت کر جائے گی۔ اسی طرح اگر بعض حصہ داروں نے اپنا شریکوں کے حصہ کی تلافی کر دے گا بشرطیکہ اس کے پاس مال ہو۔ ورنہ غلام ان کے حصوں کو ادا کرنے کی کوشش کرے گا اور غلامی سے نجات حاصل کر لے گا۔

3: شریعت نے غلام آزاد کرنے کو قتل خطا کا کفارہ قرار دیا ہے:

"ومن قتل مومنا خطا فتحریر رقبة مومنة ودیة مسلمة الی اهله"

"جو شخص غلطی سے کسی مومن کو قتل کر دے تو ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہے اور مقررہ دیت اس کے رشتہ داروں کو دینا پڑے گا۔"

اس کا راز یہ ہے کہ قتل جسمانی زندگی کو معدوم کر دیتا ہے' کفارہ کے ذریعے آزاد کرنا معنوی زندگی کو وجود بخشتا ہے۔

4: اللہ کی قسم کو توڑنے یا کسی صفت خداوندی کی بے حرمتی کرنے کی بخشش کے لیے غلام کو آزاد کرانا ایک بہترین وسیلہ ہے۔

5: جب کوئی شخص اپنی بیوی سے ظہار کرے یعنی یہ کہے کہ:

"انت علی کظهر امی"

"تو میری ماں کی طرح ہے۔"

پھر وہ اس قول سے رجوع کر لے اور بیوی کی عصمت کی حفاظت کرے تو اس پر یہ ضروری ہے کہ وہ غلام کو آزاد کرے۔

6: جو شخص اپنے غلام میں کچھ بھلائی پائے تو اس سے معینہ مقدار پر مکاتب بنا لے جو اس کو بالاقساط ادا کرتا رہے' غلام اپنی قسط ادا کرنے سے آزاد ہو جائے گا اور مکاتبہ کی اولاد پر بھی کتابت کے بعد اس کتابت کا اثر ہو گا اور مکاتبہ لونڈی کی آزادی سے اس کی اولاد بھی آزاد ہو جائے گی۔

7: جو شخص یہ نذر کرے کہ اپنی مراد میں کامیاب ہونے یا کسی آفت سے محفوظ رہنے کے بعد غلام آزاد کرے گا تو اس کی مراد پوری ہونے کے بعد اپنی نذر کو وفا کرنا اس پر واجب ہو جائے گا۔

8: شریعت اسلامیہ نے غلاموں کے ساتھ شادی کرنے کو جائز قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"ومن لم یستطع منکم طولا ان ینکح المحصنات المومنات فمما ملکت ایمانکم من فتیاتکم المومنات"

''جو شخص تم میں سے آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی پوری وسعت اور گنجائش نہ رکھتا ہو تو وہ آپس کی مسلمان لونڈیوں سے جو کہ تم لوگوں کی مملوکہ ہیں نکاح کرے۔''

پھر اسلام نے اس شادی سے جو اولاد پیدا ہوگی اس کو احرار (آزاد) قرار دیا ہے۔ وہ اپنے باپ کی میراث کے حق دار ہوں گے۔ حالانکہ وزیقوط' جو جرمنی کی ایک قدیم قوم کی شاخ ہے' کے پاس یہ قانون تھا کہ اگر کوئی آزاد عورت کسی غلام کے ساتھ شادی کرے گی تو وہ اپنے شوہر سمیت آگ میں جلا دی جائے گی۔

غلاموں کے امتیازات: شریعت اسلامیہ نے درماندہ غلاموں پر شفقت و رحمت کی نظر کی ہے۔ جس کو آزادی کامل کی نعمت خداداد سے پورے طور پر بہرہ اندوز ہونے کا موقع نہیں ملا، اسی لیے ان کے جرائم کو احرار کے جرائم کے مشابہ قرار نہیں دیا، بلکہ غلام کے جرم کو اس کی درماندگی و کمزوری اور آزادی کی نعمت سے بے بہرہ مندی کی وجہ سے آزاد کے جرم کے مقابلہ میں اس کی کمال قوت اور آزادی سے بہرہ ور ہونے کی وجہ سے بہت ہلکا قرار دیا۔ چنانچہ غلام کی سزا کو آزاد کی سزا کا نصف قرار دیا بشرطیکہ اس کے لیے کوئی امر مانع نہ ہو۔ اس لحاظ سے آزاد پاکباز کو مثلاً: تہمت لگانے کی وجہ سے جتنے تازیانے لگائے جائیں گے اس کے نصف غلام کو مارے جائیں گے۔ چونکہ چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا کا نصف کرنا دشوار امر ہے' اس لئے یہ سزا پوری رکھی گئی بالخصوص اس لئے کہ اس سزا میں مالوں کی حفاظت اور شریر نفوس کی مدافعت کا راز مضمر ہے۔

اجتماعی آزادی کی خوبیاں: شریعت اسلامیہ نے غلام کو اپنے آقا سے آزادی کی بدولت جدا کرنے کے بعد دونوں کے تعلقات و روابط کو برقرار رکھا ہے۔ چنانچہ ان کے باہم دوستی کے جذبہ کو استوار کیا جس کے فائدے محض غلام کے لئے بے شمار ہیں نہ کہ آقا کے لیے۔ کیونکہ یہ دوستی غلام کو گوشہ نشینی اور انفرادی کمزوری اور اس کی ذلت و رسوائی کی آفات سے محفوظ رکھتی ہے۔

اس دوستی کی وجہ سے آقا پر واجب ہو جاتا ہے کہ غلام جب اپنی ضرورت کی تحصیل سے عاجز ہو جائے تو اس کی ضرورت کو پورا کرے۔ زنباع کا یہ واقعہ جو اس کے غلام کے

ساتھ درپیش ہوا۔ اس حقیقت پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ زنباع کے غلام نے ایک جرم کا ارتکاب کیا۔ زنباع نے اس کی ناک کاٹ ڈالی۔ غلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر زنباع کی شکایت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زنباع سے فرمایا:

"تجھے ایسا کرنے پر کسی چیز نے آمادہ کیا۔؟"

اس نے کہا:

"اس نے ایسا اور ایسا کیا ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام سے فرمایا:

"جا! تو آزاد ہے۔"

غلام نے کہا:

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اب میں کس کا غلام بن کر رہوں۔؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تو اللہ اور اس کے رسول کا غلام بن کر رہ۔"

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا تو غلام حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت۔؟"

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"بے شک! تجھ پر اور تیرے اہل وعیال پر نان نفقہ حسب دستور جاری رہے گا۔"

پھر اس نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے بھی آپ کی خلافت کے وقت یہی کہا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"بے شک! تو کہاں کا ارادہ رکھتا ہے۔؟"

اس نے کہا:

"مصر کا۔"

چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے مصر کے گورنر کا لکھا کہ وہ اس کو کوئی زمین دے دے جس

سے یہ بہرہ ور ہوتا رہے۔

یہ دوستی (ولاء) آزاد شدہ لونڈی میں ترغیب پر آمادہ کرتی ہے' کیونکہ بعض لوگ اس عورت سے شادی کرنا پسند نہیں کرتے جس کا کوئی سرپرست رشتہ داروں میں سے نہ ہو یا وہ ان کے قائم مقام ہو۔

غلاموں کے ساتھ حسن سلوک:

اسلام نے غلامی کو نہ تو ذلت وتوہین کا موجب بنایا اور نہ شرافت وکرامت کے زوال کا سبب۔ مسلمانوں کے درمیان غلام اور آقا کے درمیان کوئی بڑا فرق نہیں تھا۔ بلکہ انہوں نے غلاموں کے ساتھ اپنے خاندان کے افراد کی طرح معاملہ اور حسن سلوک کیا اور بذات خود ان سے میل جول رکھا۔ شریعت نے ان کے ساتھ نرمی اور رحم دلی کے ساتھ معاملہ کرنے کو واجب قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"واعبدو اللہ ولاتشر کوا بہ شیئاو بالوالدین احسانا وبذی القربی والیتامی والمساکین والجار ذی القربی والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبیل وماملکت ایمانکم ان اللہ لا یحب من کان مختالا فخورا"

(سورۃ النساء، آیت نمبر: 4)

"اور تم اللہ کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو۔ والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو۔ اہل قرابت کے ساتھ بھی' یتیموں کے ساتھ بھی' غریب غرباء کے ساتھ بھی' پاس والے پڑوسی کے ساتھ اور دور والے پڑوسی کے ساتھ بھی' ہم مجلس کے ساتھ بھی' راہ گیر کے ساتھ بھی اور ان کے ساتھ بھی جو تمہارے مالکانہ قبضہ میں ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے محبت نہیں رکھتا جو اپنے کو بڑا سمجھتا ہو اور شیخی کی باتیں کرتا ہو۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اتقو االله فیما ملکت ایمانکم"

"تم اپنے غلاموں کے بارے میں اللہ سے ڈرے رہو۔"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اتقو االله فی الضعیفین المملوك والمرأة"

"تم دو کمزوروں یعنی غلام اور عورت کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اخوانکم خولکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطمعہ مما یاکل ویلبسہ مما یلبس"

"تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں۔ جس کا بھائی اپنے ماتحت ہو تو اس کو اپنے کھانے کی چیزوں میں سے کھلائے اور جو کچھ یہ پہنتا ہے اس کو وہ پہنائے۔"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص اپنے غلام کے طمانچہ مارے اسے اس کو زدوکوب کرے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو آزاد کردے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام کی تحقیر اور اس کی غلامی وذلت کا تذکرہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لایقل احدکم عبدی امتی ولیقل فتای وفتاتی وغلامی"

"تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ میرا غلام، میری لونڈی، بلکہ اس کو کہنا چاہیے میرا لڑکا، میری لڑکی اور میرا بچہ۔"

ان تمام احکام کے علاوہ اسلام نے غلام کی تعلیم وتربیت اور اس کی تہذیب وشائستگی کی بھی ترغیب دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"من كانت له جارية فعلمها و احسن اليها و تزوجها كان له اجران في الحياة والاخرى اجر بالنكاح والتعليم واجر بالعتق"

"جس کے پاس کوئی لونڈی ہو وہ اس کو تعلیم دے، اس کے ساتھ حسن سلوک کرے اور پھر اس سے شادی کر لے تو دنیا و آخرت میں اس کو دو ثواب ہوں گے۔ ایک ثواب نکاح اور تعلیم کا اور دوسرا ثواب آزاد کرنے کا۔"

تاریخ میں بے شمار حقائق و واقعات ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ غلاموں کو کیا خاص مقام اور کیسی قدر و منزلت حاصل تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو اس لشکر کا سردار مقرر کرنے کا حکم دیا۔ جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ جیسی فخر روزگار مقدس ہستیاں تھیں۔

قرآنی آیات' نبوی ارشادات' آئمہ دین کے اقوال و آثار اور تاریخی شواہد و واقعات سے واضح ہو گیا کہ دین اسلام نے غلامی کی حدود کو بڑی حد تک تنگ اور محدود کر دیا، ان انسانوں کی آزادی و نجات کے ذرائع و وسائل بیان کر دیئے جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیئے گئے ہیں' ان کے لیے اپنی رحمت و حفاظت کی آغوش پھیلا دی اور ان کی حمایت کا جھنڈا بلند کیا۔ ان کے ساتھ نرمی اور رحم دلی کی وصیت کی، حسن معاملہ سے پیش آنے' ان کو ادب و تہذیب سکھلانے' ان کی حقارت و توہین نہ کرنے کے احکام صادر کیے اور غلاموں سے شادی کرنے کی ترغیب و تحریص دلائی۔ ان تمام کی غرض و غایت یہ تھی کہ غلامی کی زنجیروں سے رہائی دلانے میں جلدی کی جائے۔

☆☆☆

باب نمبر 13:

خصوصیاتِ اسلام

امتیاز اسلام:

گزشتہ اوراق کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ "اسلام" دوسرے تمام مذاہب سے ممتاز و مخصوص ہے۔ صرف اسلام ہی ہر حیثیت سے کامل دین ہے، یہ سارے انسانوں کے لئے خدا کا آخری پیغام ہے اور نجات کے لئے ضروری ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔ خدا کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی جو دعوت پیش کی وہ مکمل اور ایسی جامع تھی جس کے بعد کسی اور تعلیم کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی اور یہ ہدایت ہمیشہ کے لئے، ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے کافی وشافی ہے۔

دین اسلام کی اہم ترین خصوصیات درج ذیل ہیں:

1: عالمگیریت۔
2: کاملیت۔
3: محفوظیت۔
4: پسندیدہ دین۔

عالمگیر دین:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت عالمگیر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زمین کے کسی خاص خطے یا کسی ایک قوم کے لئے نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کے لئے اور تمام انسانوں کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وما ارسلنك الا كافة للناس بشيرا و نذيرا"

"اے محمد! ہم نے تمہیں تمام لوگوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔"

(سورۃ السبا، آیت نمبر ۲۸)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اعلان خود بھی بحکم الٰہی یوں کیا تھا:

"یایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا"

"لوگو! میں تم سب لوگوں کے لئے اللہ کا رسول ہوں۔"

(سورۃ الاعراف، آیت نمبر ۵۸)

یہ ایک ایسی بات ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لئے خاص ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء کرام علیہم السلام آئے تھے ان میں سے کسی کی حیثیت یہ نہ تھی۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

"کان النبی یبعث الی قومه خاصة و بعثت الی الناس عامة"

"مجھ سے پہلے کا ہر نبی مخصوص طور پر اپنی ہی قوم کے پاس نبی بنا کر بھیجا جاتا تھا لیکن میں تمام لوگوں کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت جس طرح عالمگیر ہے اسی طرح ہمیشہ کے لئے بھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وحی و رسالت کا سلسلہ اپنی آخری حد تک پہنچ کر ختم ہو گیا اور اب قیامت تک کوئی رسول نہ آئے گا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

"ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین"

"بلکہ وہ اللہ کے رسول اور سارے نبیوں کے سلسلے کو ختم کرنے والے ہیں۔"

(سورۃ الاحزاب، آیت نمبر: ۴۰)

حدیث مبارکہ میں ہے:

"ختم بی النبیان و ختم بی الرسل"

"مجھ پر نبوت و رسالت ختم ہو گئی۔"

ایک اور جگہ فرمایا:

"انه لا نبی بعدی"

"بلاشبہ میرے بعد کوئی نبی نہ آئے گا۔"

(بخاری، مسلم، مشکوۃ)

کامل واکمل دین:

اس کے مقابلے میں دوسرے پیغمبروں کی رسالت کا معاملہ کسی شرح کا محتاج نہیں۔ پھر جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو دین وشریعت لے کر آئے وہ ہر پہلو سے کامل ہے جبکہ پچھلے تمام دینوں میں سے کسی کو یہ اعزاز نہ ملا تھا۔ یہ شرف اللہ تعالیٰ نے صرف اسلام کے لئے مخصوص کر رکھا تھا کہ وہ "دین کامل" ہو۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا"

"لوگو! آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور دین کی حیثیت سے تمہارے لئے اسلام کو پسندیدگی کی سند عطا کر دی۔"

(سورۃ المائدہ، آیت نمبر ۳)

پہلے جو دین بھی آیا وہ اس قوم، اس زمانے اور اس علاقے کی اصلاح وہدایت کے لئے مخصوص تھا اور جس طرح اس کی مخاطبت کا دائرہ محدود تھا اسی طرح اس کی تعلیمات کا مجموعہ بھی مختصر اور محدود تھا، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت کا فیصلہ یہ ہوا کہ اب ایسا نبی بھیجا جائے جو سب کے لئے ہو اور ہمیشہ کے لئے ہو تو اس فیصلے کا فطری تقاضا تھا کہ اس نبی پر نازل ہونے والے دین کا مزاج بین الانسانی ہو اور اس کی تعلیمات ہر زمانے، ہر ملک اور ہر طرح کے انسانی مسائل پر حاوی ہوں۔ قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت اسی فطری تقاضے کی تکمیل کا اعلان کر رہی ہے۔

محفوظ ترین دین:

اسلام کا یہ بھی امتیاز ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کتاب نازل ہوئی وہ جوں کی توں محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی، جس پر خود قرآن، حدیث اور تاریخ گواہ ہیں اور یہ کتاب ایک ایسی زبان میں ہے جو زندہ اور انٹرنیشنل زبان ہے۔ کروڑوں آدمی اسے بولتے ہیں اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس کے جاننے، سمجھنے اور پڑھنے پڑھانے والے بے شمار انسان موجود ہیں۔ اس کے مقابلے میں کوئی ایک کتاب بھی ایسی

نہیں جو ان صفات کی حامل ہو۔

اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین:

رسالت محمدی کی اس امتیازی حیثیت کے پیش نظر کچھ لازمی تقاضے پیدا ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ اس کا پہلا فطری اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ دوسرے تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں اور اب اللہ کے نزدیک منظور شدہ دین صرف اسلام ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ان الذين عند الله الاسلام"

"بلاشبہ اللہ کے نزدیک مقبول دین تو صرف اسلام ہے۔"

(سورۃ آل عمران، آیت نمبر:١٩)

اس لئے ضروری ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ہر قوم، ہر ملک اور زمانے کا انسان اسی کی پیروی کرے ورنہ:

"من يبتغ غير السلام دينا فلن يقبل منه "

"جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا تو اللہ کے یہاں اس کی طرف سے یہ دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔"

(سورۃ آل عمران، آیت نمبر:٨٥)

کیونکہ جب یہ دین ساری دنیا کا دین اور اس کا لانے والا پیغمبر پوری نوع انسانی کا پیغمبر قرار دیا گیا ہے تو اب کسی اور دین اور کسی اور پیغمبر کا زمانہ باقی نہیں رہ سکتا۔ رسول تو آتا ہی اس لئے ہے کہ جن لوگوں کی طرف وہ بھیجا گیا وہ اسے اللہ کا رسول تسلیم کریں اور اس کی غیر مشروط پیروی کریں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وما ارسلنامن رسول الا ليطاع باذن الله"

"ہم نے جو رسول بھیجا صرف اسی لئے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔"

(سورۃ النساء، آیت نمبر ٦٤)

اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سارے انسانوں کی طرف مبعوث ہونا اور پھر آخری رسول ہونا اس کا کھلا تقاضا کرتا ہے کہ ہر انسان، ہر زمانے کا انسان آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر

ایمان لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین مان کر لازماً اس کی پیروی کرے۔ اگر کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو نہیں مانتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کا حلقہ اپنی گردن میں نہیں ڈالتا تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغاوت نہیں بلکہ اس فرماں روائے کائنات اللہ تعالیٰ عزوجل کے خلاف بغاوت ہے جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری دنیا کا ہادی اور آخری نبی بنا کر بھیجا ہے۔

اس بات کا ثبوت کہ اسلام ہی کی پیروی ضروری ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں بھی موجود ہے۔ اگر یہ بات قرآن مجید کے نزدیک بھی صحیح ہوتی ہے کہ سارے دین سچے ہیں اور کسی ایک رسول کی پیروی کافی ہے تو اس کا بالکل منطقی تقاضا یہ تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہود اور نصاریٰ کو اسلام کی دعوت نہ دیتے، حالانکہ آپ نے جس طرح مشرکین عرب کو دعوتِ اسلام دی ہے اس طرح اہل کتاب یہود و نصاریٰ کو بھی دی۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ"

"اے اہل کتاب! اس کتاب پر ایمان لاؤ جسے ہم نے اتارا ہے جبکہ وہ اس کتاب (کی پیش گوئیوں) کے عین مطابق بھی ہے جو تمہارے پاس ہے، قبل اس کے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور انہیں پیچھے کی طرف پھیر دیں یا ان پر لعنت کریں۔"

(سورۃ النساء، آیت نمبر ۴۷)

نہ صرف یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اسلام لانے کی دعوت دی بلکہ ان میں سے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا انہیں صاف لفظوں میں "کفر" کا مرتکب قرار دیا گیا، حتی کہ بعض مقامات پر تو ان کے اس انکار اسلام کو صرف کفر ہی نہیں بلکہ "بدترین کفر" اور انہیں صرف کافر ہی نہیں بلکہ "پکا کافر" کہا گیا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ

اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا o اُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا o"

"جو لوگ اللہ کے اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کر دیں اور کہتے ہیں کہ بعض رسولوں کو ہم مانیں گے اور بعض کو نہ مانیں گے اور اس طرح کفر و ایمان کے درمیان کی کوئی راہ اختیار کر لینا چاہتے ہیں، وہ پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کے لئے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

(سورۃ النساء، آیت نمبر 151-150)

پھر اہل کتاب کے انکار اسلام پر ایک جگہ یوں تبصرہ کیا گیا:

"وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَیَکْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ"

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کتاب پر ایمان لاؤ جسے اللہ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتاری گئی تھی اور اس طرح وہ اس کے ماسوا ہدایت الٰہی کو تسلیم کرنے سے انکار کر جاتے ہیں۔"

(البقرہ، آیت نمبر 91)

دعوت اسلام کے جواب میں وہ جو کچھ کہتے تھے وہ ٹھیک وہی فلسفہ تھا جو آج وحدت ادیان کے نظریے کی بنیاد ہے، یعنی یہ کہ جب ہمارے پاس بھی خدا ہی کا بھیجا ہوا دین ہے جو اپنی جگہ حق ہے اور اسلام اپنی جگہ حق ہے لیکن ان کے اس "فلسفے" کو اللہ تعالیٰ صاف طور سے "کفر کا فلسفہ" قرار دیتا ہے اور انہیں "یہ بھی حق وہ بھی حق" کہنے کے باوجود اصل حق کا منکر (کافر) ٹھہرایا۔

اس کے علاوہ جب قرآن مجید کے سوا اب کوئی دوسری کتاب بھی ایسی نہیں رہ گئی ہے جو پوری طرح محفوظ ہو اور جس کی اصل زبان دنیا کی مردہ زبانوں میں شامل نہ ہو چکی ہو تو دوسری کتابوں اور شریعتوں کی ٹھیک ٹھیک پیروی ممکن بھی کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ صورتحال تو گویا خود ان کتابوں اور شریعتوں کا اقراری بیان ہے کہ اب ہمارا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور ہمیں

منسوخ قرار دیا جا چکا ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر شخص کے لئے اسلام ہی کی پیروی ضروری ہے اور اسلام ہی شرط نجات ہے۔ چنانچہ "ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ" فرمانے کے بعد وہ اپنے اس فیصلے کا بھی اعلان کر چکا ہے:

"وھو فی الاخرۃ لمن الخسرین"

"اور ایسا شخص (جو اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی پیروی کرے وہ) آخرت میں قطعاً نامراد رہے گا۔"

(سورہ آل عمران، آیت نمبر: ۸۵)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی فیصلہ خداوندی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد کی جان ہے! اس امت (مراد گروہ انسانی) میں سے جس کسی بھی شخص (یہودی، نصرانی، کافر) تک میری نبوت کا پیغام پہنچا اور اس کے باوجود وہ میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا تو وہ دوزخی ہوگا۔"

(صحیح مسلم)

اس فیصلہ خداوندی کے تحت جس طرح یہود و نصاریٰ آتے ہیں اسی طرح دوسری قومیں اور ملتیں بھی آتی ہیں، بلکہ ایک حیثیت سے تو دوسری قوموں اور ملتوں کا معاملہ اور زیادہ اہم ہو جاتا ہے، کیونکہ دنیا کی ساری قوموں میں سے صرف یہود و نصاریٰ ہی وہ دو گروہ ہیں جن کو قرآن مجید نے اہل کتاب کہا ہے۔ ان قوموں اور ملتوں کے لئے اس کا شرط نجات ہونا اور زیادہ ضروری ہوگا جن کو قرآن مجید نے صاحب کتاب و شریعت کے نام سے یاد نہیں کیا۔

غرض جہاں تک اسلام کے اپنے فیصلے کا تعلق ہے وہ بالکل دو ٹوک انداز میں اپنی پیروی کو سارے انسانوں کے لئے ضروری اور شرط نجات قرار دیتا ہے اور اس سے مستثنیٰ وہی فرد ہے جس تک اسلام کا پیغام ہی نہ پہنچا ہو۔ اب اس پیغام کو پوری نوع انسانی تک پہنچانے کا فریضہ امت مسلمہ کا ہے۔

☆☆☆

اسلام کے امتیازات

علاوہ ازیں دین اسلام میں مندرجہ ذیل امتیازی خصوصیات پائی جاتی ہیں:

1: توحید۔ 2: اخوت اسلامی۔

3: اسلامی مساوات۔ 4: اعتدال اور توازن۔

5: ابدی اور دائمی مذہب۔ 6: اصلاحی اور انقلابی دین۔

توحید:

دین اسلام کی بنیاد اور محور عقیدۂ توحید ہے۔ توحید کے تین ذیلی عنوانات ہیں:

1: توحید ربانی۔ 2: توحید انسانی۔

3: توحید ایمانی۔

توحید ربانی: عقیدۂ توحید سے مراد ہے کہ خدا وحدہ لاشریک ہے، وہ اپنی ذاتی صفات اور صفاتی کمالات میں بے مثل ہے، کوئی اس کا شریک نہیں ہے، تمام کائنات کا وہ مالک ہے، وہ حی وقیوم ہے، حاضر وناظر ہے، عالم الغیب ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں، تمام مخلوق اس کی محتاج ہے، وہ ابد تک رہے گا، ہر عیب ونقص سے پاک ہے اور ہر صفت کمال سے متصف ہے۔ لہٰذا اصلی حاکم ومطاع وہی ہے، اس کے احکام وقوانین کی اطاعت ضروری ہے۔ اسلام میں توحید ربانی کے ساتھ ساتھ انسانی توحید ایمانی اور توحید ایمانی پر بھی زور دیا گیا ہے۔

توحید انسانی: توحید انسانی یہ ہے کہ تمام انسان اصل کے لحاظ سے ایک جان سے پیدا کئے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"خلقكم من نفس واحدة"

حضرت آدم علیہ السلام ابوالبشر ہیں اور ان کا خمیر مٹی سے اٹھایا گیا۔ انسان کو مٹی سے

ہی خوراک مہیا کی گئی اور بالآخر ایک دن اسے مر کر اسی مٹی میں جانا ہے۔ اس طرح تمام انسانوں کی ابتدا اور انتہا یکساں اور ایک جیسی ہے۔ اسلام نے یہ عقیدہ پیش کر کے تمام علاقائی اور جغرافیائی حدود کا خاتمہ کر دیا ہے۔

توحید ایمانی: توحید ایمانی سے مراد یہ ہے کہ تمام اہل اسلام کے عقائد ایک ہی اجزائے ایمانی سے مرکب ہیں، یکساں ہیں اور ارکان اسلام میں تمام اہل ایمان شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایک، رسول ایک، قرآن ایک اور خانہ کعبہ ایک ہے۔

نیز جملہ اسلامی احکام، حلال وحرام، نکاح وشادی کی تقریبات اور پیدائش وموت کی رسومات یکساں ہیں جس سے اہل اسلام میں اتحاد ویگانگت پیدا ہوتی ہے۔

اخوتِ اسلامی:

اسلام اونچ نیچ کے امتیازات صرف حلفی طور پر ہی ختم نہیں کرتا بلکہ وہ ایجابی طور پر اعلان کرتا ہے کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اسلامی معاشرہ کی بنیاد اتحاد ویگانگت ایثار واخوت پر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"انما المومنون اخوة" "تمام مومن بھائی بھائی ہیں۔"

(سورة الحجرات، آیت نمبر:١٠)

معاشرہ میں جو چیزیں تعلقات کو بگاڑنے والی ہیں اور دلوں میں کدورت پیدا کرتی ہیں مثلاً غیبت، خیانت اور غلط بیانی کو اسلام نے حرام ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ اس سے خیانت نہیں کرتا، غلط بیانی نہیں کرتا، ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی عزت، مال اور خون حرام ہے۔"

نیز ارشاد فرمایا:

"مسلمان باہمی مروت، شفقت اور ہمدردی میں ایک جسم کی مانند ہیں۔ اگر ایک عضو بیمار ہو تو کل جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"

عالمی بھائی چارہ اور قرآن مجید:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"یایها الناس انا خلقنکم من ذکر وانثی وجعلنا کم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند الله اتقا کم ان الله علیم خبیرO"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 49، آیت نمبر 13)

"اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تمہارے گروہ اور قبائل بنائے تا کہ تمہاری پہچان ہو سکے، تم میں سے اللہ کے ہاں عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے، بیشک اللہ تعالیٰ علم والا اخبر والا ہے۔O"

اخوت و بھائی چارہ متعدد اقسام کا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر......

خاندان اور قرابت داری کی بنیاد پر اخوت و اتحاد، علاقے اور وطن کی بناء پر اخوت و اتحاد، ذات، قوم یا قبیلے کی بنیاد پر اخوت و اتحاد اور عقائد کی بنیاد پر اخوت، اتحاد اور بھائی چارہ۔

یوں سمجھیے کہ یا تو خاندانی اخوت ہوگی یا قومی اخوت یا قبائلی اخوت یا دینی اخوت لیکن اخوت و اتحاد کے متذکرہ بالا تمام تصورات محدود ہیں جب کہ دین اسلام لامحدود عالمی اخوت، اتحاد اور بھائی چارے کا تصور پیش کرتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں اسلامی اخوت، اتحاد اور بھائی چارے کے بارے میں موجود تصور بہت واضح طور پر پیش کر دیا گیا ہے۔

گزشتہ آیت مبارکہ میں قرآن مجید بنی نوع انسان سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم سب کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا گیا ہے۔ پوری دنیا میں جتنے بھی انسان ہیں سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور تم کو قبیلوں اور قوموں میں اس لئے تقسیم کیا گیا ہے کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو یعنی یہ تقسیم محض تعارف کے لئے ہے نہ کہ تعظیم و عزت کے لیے اور نہ ہی اس لئے ہے کہ اس کی بنیاد پر تم ایک دوسرے سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دو۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں فضیلت اور برتری کا معیار جنس، ذات، علاقہ، رنگ و نسل اور مال و دولت نہیں ہے بلکہ اللہ کے ہاں فضیلت کا معیار صرف اور صرف تقویٰ، پرہیزگاری، نیکوکاری اور حسن

عمل ہے۔ جو شخص زیادہ متقی ہے، زیادہ پرہیز گار ہے اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرنے والا ہے وہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ عزت والا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کے بارے میں پورا علم اور خبر رکھنے والا ہے۔

ایک اور آیت مبارکہ میں ہے:

”ومن ایتہ خلق السموت والارض واختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذلك لایت للعلمین٥“

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر (30)، آیت نمبر 22)

”تمہاری بولیوں اور تمہارے رنگوں کا مختلف ہونا اور آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق اس (اللہ) کی نشانیاں میں سے ہیں، بیشک اس میں تمام جہان والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔٥“

اس آیت میں قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ رنگ، نسل اور بولی کا اختلاف اللہ ہی کا پیدا کردہ ہے۔ یہ کالے، گورے، لال، پیلے لوگ سب اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں، لہٰذا اس اختلاف کی بنیاد پر نفرت کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ روئے زمین پر بولی جانے والی ہر زبان خوبصورت ہے۔ اگر آپ نے کوئی زبان پہلے نہیں سنی یا آپ یہ زبان نہیں جانتے تو عین ممکن ہے کہ آپ کو وہ زبان مضحکہ خیز معلوم ہو اور وہ آپ کو متعجب کر دے لیکن جو لوگ اس زبان کو بولنے والے ہیں ان کے لئے شاید یہ دنیا کی سب سے خوبصورت زبان ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ زبان اور رنگ و نسل کے یہ اختلاف محض تعارف اور پہچان کے لئے پیدا کیے گئے ہیں۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد عالی شان ہے:

”ولقد کرمنا بنی ادم وحملنھم فی البر والبحر ورزقنھم من الطیبت وفضلنھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا٥“

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر (17)، آیت نمبر 70)

”اور تحقیق ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ان کے لیے بحر و بر میں سواریاں بنائیں اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا اور ہم

کثیر مخلوق پر واضح فضیلت سے نوازا۔o"

اس آیت مبارکہ میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف عربوں کو عزت دی ہے نہ صرف امریکیوں کو اور نہ ہی کسی خاص قوم کو عزت دی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تمام اولاد کو عزت دی ہے۔ رنگ، نسل، قوم، عقیدے اور جنس کے امتیاز کے بغیر ہر انسان کو عزت دی ہے۔

بہت سے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ نسلِ انسانی کا آغاز ایک ہی جوڑے سے ہوا ہے یعنی آدم و حوا علیہما السلام سے لیکن بہت سے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت حوا علیہا السلام کی غلطی اور گناہ کی وجہ سے پوری بنی نوع انسان گناہگار ہو گئی ہے۔ وہ ہبوطِ آدم علیہ السلام کی ذمہ داری ایک عورت یعنی حضرت حوا علیہا السلام پر ڈالتے ہیں حالانکہ اسلام اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ اسی طرح یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے عورت سے ناراض ہو کر اس کو اولاد پیدا کرنے کی تکلیف میں مبتلا کیا، اس سے بھی اسلام قطعاً اتفاق نہیں کرتا۔ اس طرح تو ماں بننے کا عمل ایک سزا اور عذاب ٹھہرتا ہے۔

سورۂ نساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"یایها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منهما رجالا کثیرا و نساء واتقوا الله الذی تسائلون به والارحام ان الله کان علیکم رقیبا o"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 4 (النساء)، آیت نمبر 1)

"اے لوگو اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کی بیوی پیدا فرمائی اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت پیدا فرمائے اور اس اللہ سے ڈرو، وہ جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو بیشک اللہ تعالیٰ تمہارا نگہبان ہے۔o"

اسلام کا مؤقف تو یہ ہے کہ ماں بننے کا عمل عورت کے مقام اور مرتبے میں اضافہ

کرنے والا عمل ہے۔ چنانچہ سورۃ لقمان میں ارشاد ہوتا ہے:

"ووصینا الانسان بوالدیہ حملتہ امہ وھنا علی وھن وفصلہ فی عامین ان اشکرلی ولوالدیک الی المصیرo"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 31 (لقمان)، آیت نمبر 14)

"اور ہم نے انسان کو والدین کا حق پہنچاننے کی تاکید کی، اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کو دودھ چھوڑانا ہے۔ (اے بندے!) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔o"

اسی طرح سورۃ احقاف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"ووصینا الانسان بوالدیہ احسنا حملتہ امہ کرھا ووضعتہ کرھا وحملہ وفصلہ ثلثون شھرا"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 46 (احقاف)، آیت نمبر 15)

"اور ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے، اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ حمل عورت کو اور زیادہ محترم اور مکرم کرتا ہے۔ یہ کوئی سزا نہیں ہے۔ اسلام عورت اور مرد کو برابر اور مساوی قرار دیتا ہے۔ صحیح بخاری کتاب الآداب میں ایک حدیث ہے، جس کا مفہوم ہے کہ ایک شخص جناب پیغمبر علیہ السلام کے پاس آیا اور پوچھنے لگا:

"یارسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم! مجھ پر سب سے زیادہ حق کس کا ہے۔؟"

آپ علیہ السلام نے فرمایا:

"تیری ماں کا۔"

اس شخص نے پوچھا:

"اس کے بعد۔؟

آپ علیہ السلام نے فرمایا:

"تیری ماں کا۔"

اس نے پھر پوچھا:

"اس کے بعد؟"

آپ علیہ السلام نے پھر فرمایا:

"تیری ماں کا۔"

اس شخص نے چوتھی مرتبہ پوچھا:

"اس کے بعد کس کا حق ہے۔؟"

آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تمہارے باپ کا۔"

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اولاد پر تین چوتھائی یعنی پچھتر فی صد حق ماں کا بنتا ہے اور ایک چوتھائی یعنی پچیس فی صد باپ کا۔ ماں کو گولڈ میڈل بھی ملتا ہے، سلور میڈل بھی اور برونز میڈل بھی جبکہ باپ کو صرف حوصلہ افزائی کا انعام ملتا ہے۔ یہ ہیں اسلامی تعلیمات کا والدہ کے ساتھ حسن سلوک۔

اسلام مرد اور عورت کو برابر قرار دیتا ہے لیکن برابری کا مطلب یکسانیت نہیں ہے۔ اسلام میں خواتین کے حقوق اور مقام کے حوالے سے بہت سی غلط فہمیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ غیر مسلموں اور خود مسلمانوں میں پائی جانے والی یہ تمام غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں، اگر اسلام کو قرآن اور صحیح احادیث کی مدد سے سمجھا جائے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ اسلام میں مجموعی طور پر مرد اور عورت برابر ہیں لیکن اس برابری کا مطلب یکسانیت نہیں ہے۔ اس حوالے سے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

فرض کیجئے! ایک ہی جماعت میں دو طالب علم ہیں "اعجاز" اور "معاذ"۔ یہ دونوں طالب علم ایک امتحان میں اول آئے ہیں کیوں کہ دونوں نے سو میں اسی نمبر حاصل کئے ہیں لیکن اگر آپ ان کے پرچوں کا تجزیہ کریں تو صورت حال یہ ہے کہ پرچے میں دس سوال ہیں اور ہر سوال کے دس نمبر ہیں۔ پہلے سوال میں طالب علم "اعجاز" نے دس میں سے نو نمبر

لئے ہیں اور طالب علم "معاذ" نے دس میں سے سات نمبر۔ لہٰذا پہلے سوال کی حد تک طالب علم "اعجاز" کو ایک درجہ برتری حاصل ہے۔ دوسرے میں "معاذ" نے نو اور "اعجاز" نے سات نمبر لئے ہیں، لہٰذا دوسرے سوال میں برتری طالب علم "معاذ" کو حاصل ہے۔ باقی آٹھ سوالوں میں دونوں طالب علموں نے آٹھ آٹھ نمبر حاصل کیے ہیں۔ مجموعی طور پر دونوں طالب علموں کے نمبر اسی اسی ہیں۔

اس تجزیے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ مجموعی طور پر تو دونوں طالب علم برابر ہیں لیکن کسی سوال میں "اعجاز" کو برتری حاصل ہے اور کسی میں "معاذ" کو۔ اسی طرح اسلام میں عورت اور مرد کو مجموعی طور پر مساوی درجہ دیا گیا ہے لیکن کسی جگہ عورت کا درجہ زیادہ ہے تو کہیں مرد کو فضیلت حاصل ہے۔

اسلام میں اخوت، اتحاد، مساوات اور بھائی چارے سے مراد یہ نہیں ہے کہ صرف مرد ہی آپس میں برابر ہیں۔ اس اخوت اور بھائی چارے میں خواتین بھی شامل ہیں۔ عالمی اخوت سے یہی مراد ہے کہ رنگ، نسل، زبان اور عقیدے کے علاوہ جنس کی بنیاد پر بھی انسانوں کے درمیان کوئی فرق روا رکھنا جائز نہیں۔ سب برابر ہیں البتہ جزوی فرق ضرور موجود ہے۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے میرے گھر میں ڈاکو آجاتا ہے، اب میں خواتین کے حقوق اور آزادی پر پورا یقین رکھتا ہوں اور دونوں جنسوں کو بالکل برابر سمجھتا ہوں، لیکن اس کے باوجود میں یہ نہیں کہوں گا کہ میری بیوی یا بہن یا ماں جائیں اور ڈاکو کا مقابلہ کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سورۂ نساء میں فرماتا ہے:

"الرجال قوامون على النساء"

(القرآن الکریم، سورۃ النساء، آیت نمبر 34)

"مرد عورتوں پر قوام ہیں۔"

چوں کہ مرد کو جسمانی قوت زیادہ عطا کی گئی ہے لہٰذا اس حوالے سے اسے ایک درجہ برتری حاصل ہے اور یہ اس کا فرض ہے کہ خواتین کی حفاظت کرے۔ قوتِ جسمانی ایک ایسا پہلو ہے جس کے حوالے سے مرد کو برتری حاصل ہے جب کہ اولاد پر حق کے حوالے سے عورت کو برتری حاصل ہے جیسا کہ میں نے کہا کہ اولاد پر ماں کا حق تین گنا زیادہ ہے۔

اسلام میں اللہ تعالیٰ نے یہ تصور نہیں دیا کہ وہ کسی خاص قوم یا خاص نسل کا خدا ہے بلکہ ارشاد فرمایا:

"الحمد لله رب العلمين○ الرحمن الرحيم○ ملك يوم الدين○"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 1 (الفاتحۃ)، آیت نمبر 3-2-1)

"تعریف اللہ ہی کے لئے جو تمام کائنات کا رب ہے۔○ نہایت مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔○ روز جزا کا مالک ہے۔○"

اور آخری سورۃ میں بتایا جاتا ہے:

"قل اعوذ برب الناس○"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 114، آیت نمبر 1)

"کہو میں پناہ مانگتا ہوں تمام انسانوں کے رب کی۔○"

حقیقی اخوت:

1: اسی طرح سورۃ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

"يايها الناس كلوا مما في الارض حللا طيبا ولا تتبعوا خطوت الشيطن انه لكم عدو مبين○"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 2، آیت نمبر 168)

"لوگو! زمین میں جو حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں انھیں کھاؤ اور شیطان کے راستوں کی پیروی نہ کرو، بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔○"

اسلام اس دنیا میں حقیقی عالمی اخوت اور بھائی چارہ قائم کرنے کے لئے ایک مکمل نظام اخلاقیات بھی دیتا ہے۔ اسلام ایک ایسا اخلاقی قانون فراہم کرتا ہے، جس کی مدد سے پوری دنیا میں اخوت، اتحاد اور بھائی چارے پر مبنی معاشرے کا قیام ممکن ہو جاتا ہے۔

2: چنانچہ سورۂ مائدہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"من قتل نفسا بغير نفس او فساد في الارض فكانما قتل الناس جميعا ومن احياها فكانما احيا الناس جميعا"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 5، آیت نمبر 32)

"جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔"

یہاں قرآن مجید فرماتا ہے کہ اگر کوئی کسی انسان کو قتل کرتا ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ انسان مسلمان تھا یا غیر مسلم، تو یہ عمل ایسا ہی ہے جیسے پوری انسانیت کا قتل کرنا۔ یہاں نہ مذہب اور عقیدے کی تخصیص کی گئی ہے نہ رنگ و نسل اور جنس کی۔ کسی بھی بے قصور انسان کو قتل کرنا ایسا ہے جیسے پوری انسانیت کو قتل کرنا۔ دوسری طرف اگر کوئی کسی انسان کی جان بچاتا ہے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے پوری انسانیت کو بچا لیا جائے۔ یہاں بھی کوئی تخصیص نہیں کی گئی کہ بچایا جانے والا انسان کس مذہب یا عقیدے سے تعلق رکھتا ہو؟

3: اسلام اس مقصد کے لئے متعدد اخلاقی قوانین وضع کرتا ہے تا کہ عالمی اخوت و بھائی چارہ دنیا کے ہر حصے میں جاری و ساری ہو سکے۔ قرآن مجید ہر صاحب نصاب کو زکوۃ ادا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یعنی ہر قمری سال میں کل مال کا 2.5 فی صد حصہ مستحقین میں تقسیم کرنے کا حکم دیتا ہے۔ آج اگر دنیا کا ہر شخص زکوۃ ادا کرنا شروع کر دے تو دنیا میں غربت کا مکمل طور پر خاتمہ ہو سکتا ہے یہاں تک کہ دنیا میں کوئی شخص بھی بھوک سے نہیں مرے گا۔

4: قرآن مجید ہمیں اپنے پڑوسیوں کے کام آنے کا بھی حکم دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالی ہے:

"ولا یحض علی طعام المسکینO"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 107 (الماعون)، آیت نمبر 3)

"اور (وہ نامراد ہوا جو) مسکین کو کھانا نہیں دیتا۔O"

اسی طرح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"وہ شخص کامل مسلمان نہیں جس کا ہمسایہ بھوکا ہو اور وہ خود پیٹ بھر کر سو جائے۔"

5: قرآن مجید فضول خرچی سے بھی روکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"وات ذا القربى حقه والمسكين وابن السبيل ولا تبذر تبذيراO ان المبذرين كانوا اخوان الشيطين وكان الشيطن لربه كفوراO"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 17، آیت نمبر 26-27)

"رشتہ داروں اور مسکین اور مسافر کو ان کا حق دو اور فضول خرچی نہ کرو۔ o فضول خرچ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ o"

اگر آپ اسراف کا مظاہرہ کرتے ہیں تو یقیناً آپ اخوت کی فضا خراب کرنے کا باعث بن رہے ہیں، کیوں کہ جب ایک شخص فضول خرچی اور ریا کاری کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں ناپسندیدگی اور نفرت کے جذبات کو فروغ ملتا ہے اور لوگ ایک دوسرے سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا کسی کو بھی دوسرے کا حق نہیں مارنا چاہئے، بلکہ ایک دوسرے کی امداد کرنی چاہئے اور اپنے پڑوسیوں کے کام آنا چاہئے۔ یہ تمام اخلاقی اصول ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔

6: اسی طرح قرآن مجید رشوت سے بھی سختی کے ساتھ منع کرتا ہے۔ قرآن مجید کی سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے:

"ولا تاكلوا اموالكم بينكم بالباطل وتدلوا بها الى الحكام لتاكلوا فريقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمونO"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 2 (البقرۃ)، آیت نمبر 188)

"اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناجائز طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس غرض کے لئے پیش کرو کہ تمہیں دوسرے کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے۔ o"

گویا کہ رشوت کے ذریعے دوسرے کا مال ہتھیانے سے منع کیا جا رہا ہے۔

7: اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ کوئی بھی شخص اپنے بھائی کی جائیداد یا مال کو ہتھیانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

"یایھا الناس امنوا انما الخمر و المیسر و الانصاب و الا زلام رجس من عمل الشیطن فاجتنبوہ لعلکم تفلحون O"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 5، آیت نمبر 90)

"اے ایمان والو! بیشک شراب اور جوا اور آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو تا کہ تمہیں فلاح نصیب ہو۔ O"

اس آیت مبارکہ میں قرآن پاک ہمیں تمام نشہ آور اشیاء، جوئے، قمار بازی اور اسی طرح ضعیف الاعتقادی کے مختلف شرکیہ مظاہر سے روک رہا ہے، کیوں کہ یہ سب شیطانی افعال ہیں۔

8: ہم جانتے ہیں کہ معاشرے میں موجود بہت سی برائیوں کا بنیادی سبب منشیات کا استعمال ہے اور نتیجتاً یہ اُس مثالی اخوت و بھائی چارے کی فضا کو بھی خراب کرنے کا سبب بنتا ہے جو ایک حقیقی اسلامی اور فلاحی معاشرے کا مقصود ہے۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ امریکہ میں اوسطاً روزانہ تقریباً ایک ہزار نو سو جنسی زیادتی کے واقعات ہوتے ہیں اور بیشتر صورتوں میں زیادتی کرنے والے یا زیادتی کا شکار ہونے والے نشے کی حالت میں ہوتے ہیں۔

اسی طرح شماریاتی اعداد و شمار ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں "Incesl" کے واقعات کی شرح آٹھ فی صد ہے یعنی ہر بارھواں یا تیرھواں فرد محرمات کے ساتھ زنا میں ملوث ہے اور محرمات کے ساتھ زنا کے تقریباً تمام واقعات نشے کی حالت میں ہی ہوتے ہیں۔

ایڈز جیسی بیماریوں کے دنیا میں اس قدر تیزی سے پھیلنے کی وجوہات میں سے ایک وجہ منشیات بھی ہے۔ اسی لئے قرآن مجید منشیات کو شیطانی عمل قرار دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ کامیابی اور فوز و فلاح کے حصول کے لئے ان شیطانی افعال سے اجتناب ضروری ہے۔ اگر آپ واقعی ان اعمال سے مجتنب رہتے ہیں تو دنیا بھر میں حقیقی اخوت کا ماحول قائم کرنے میں مدد ملے گی۔

9: قرآنِ مجید فرقانِ حمید میں ارشاد ہوتا ہے:

"ولا تقربوا الزنا انه كان فاحشة وساء سبيلاO"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 17، آیت نمبر 32)

"زنا کے قریب نہ پھٹکو، وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ ہے۔O"

گویا اسلام زنا اور بدکرداری سے سختی کے ساتھ منع کرتا ہے۔

9: سورۂ حجرات میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"يايها الذين امنوا لا يسخر قوم من قوم عسى ان يكونوا خيرا منهم ولا نساء من نساء عسى ان يكن خيرا منهن ولا تلمزوا انفسكم ولا تنابزوا بالالقاب بئس الاسم الفسوق بعد الايمان ومن لم يتب فاولئك هم الظالمونO يايها الذين امنوا اجتنبوا كثيرا من الظن ان بعض الظن اثم ولا تجسسوا ولا يغتب بعضكم بعضا ايحب احدكم ان ياكل لحم اخيه ميتا فكرهتموه واتقوا الله ان الله تواب رحيمO"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 49، آیت نمبر 11-12)

"اے ایمان والو! نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بُری بات ہے۔ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں۔O اے ایمان والو! بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے؟ دیکھو تم خود اس

سے گھن کھاتے ہو، اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔O"

اس قرآنی ارشاد کے مطابق کسی کی پیٹھ پیچھے برائی کرنا یا غیبت کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ عمل ایسا ہی ہے جیسے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا اور اس کام کی کراہت اس مثال سے واضح ہو جاتی ہے۔ انسانی گوشت کھانا ہی حرام ہے اور پھر اپنے مردہ بھائی کا گوشت......؟ گویا حرمت دگنی ہو جاتی ہے۔ آدم خور لوگ جو انسانی گوشت مزے لے لے کر کھاتے ہیں وہ بھی اپنے بھائی کا گوشت کھانے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ لہٰذا اگر آپ کسی کی غیبت کرتے ہیں تو یہ دہرا گناہ ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ تو کیا آپ یہ پسند کریں گے؟ قرآن مجید خود جواب دیتا ہے کہ نہیں تم یہ پسند نہیں کرو گے۔ کوئی بھی یہ پسند نہیں کرے گا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ویل لکل همزة لمزةO"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 104()، آیت نمبر 1)

"تباہی ہے ہر اس شخص کے لئے جو لوگوں پر طعن کرتا اور پیٹھ پیچھے برائیاں بیان کرتا ہے۔O"

قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں دیئے گئے یہ تمام اخلاقی اصول، حقیقی اخوت اور بھائی چارے کو فروغ دینے والے اور مستحکم کرنے والے ہیں۔ اسلام کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ محض اخوت، اتحاد اور بھائی چارے کا ذکر نہیں کرتا بلکہ اخوت و بھائی چارے کے عملی مظاہرے کے لئے بھی مطلوبہ اقدامات پر زور دیتا ہے۔

مسلمان اس اخوت و بھائی چارے کا ایک عملی مظاہرہ دن میں پانچ مرتبہ نماز با جماعت کی ادائیگی کے دوران کرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"جب ہم لوگ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو کندھے سے کندھا اور پاؤں سے پاؤں ملا کر کھڑے ہوتے تھے۔"

سنن ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو اپنی صفیں سیدھی کر لیا کرو، کندھے سے کندھا ملا لیا کرو اور شیطان کے لئے خالی جگہ نہ چھوڑا کرو۔"

مندرجہ بالا حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز کے دوران ایک دوسرے کے قریب کھڑے ہوا کرو اور شیطان کے لئے خالی جگہ نہ چھوڑا کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں اس شیطان کا ذکر نہیں کر رہے جسے آپ لوگ ٹی وی پر دیکھتے ہیں جس کے دو سینگ اور ایک دُم ہوتی ہے۔ یہاں شیطان سے مراد اس قسم کی کوئی مخلوق نہیں ہے، بلکہ یہاں مراد نسل پرستی کا شیطان ہے، علاقائی تعصب کا شیطان ہے، رنگ و ذات پات اور زبان کے تعصب کا شیطان ہے جسے اپنی صفوں میں جگہ دینے سے یہاں روکا جا رہا ہے۔

بین الاقوامی اخوت کی ایک بڑی مثال "حج" ہے۔ دنیا بھر سے تقریباً پچیس لاکھ افراد فریضہ حج کی ادائیگی کے لئے سعودی عرب کے شہر مکہ مکرمہ پہنچتے ہیں۔ یہ لوگ دنیا کے کونے کونے سے وہاں آتے ہیں۔

اس موقع پر تمام مرد ایک جیسی اَن سِلی سفید چادروں میں ملبوس ہوتے ہیں۔ اس موقع پر آپ اپنے اردگرد کھڑے لوگوں کے بارے میں یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکتے کہ ان کی کیا حیثیت ہے۔ وہ بادشاہ ہوں یا فقیر ان کا حلیہ ایک سا ہوگا۔ بین الاقوامی اخوت و بھائی چارے کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟ حج دنیا کا سب سے بڑا سالانہ اجتماع ہے۔ کم از کم پچیس لاکھ افراد وہاں جمع ہوتے ہیں۔ آپ بادشاہ ہوں یا فقیر، غریب ہو یا امیر، گورے ہوں یا کالے، شرقی ہوں یا غربی، آپ ایک ہی لباس میں ملبوس ہوں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبے میں اعلان فرما دیا کہ تمام انسان ایک ہی رب کی مخلوق ہیں، لہٰذا کسی عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ کوئی گورا کالے سے یا کالا گورے سے افضل نہیں ہے، ہاں! برتری کی بنیاد صرف اور صرف تقویٰ ہے۔

صرف تقویٰ، پرہیزگاری، نیکی اور خوفِ خدا ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں فضیلت کا معیار ہیں۔ آپ کی قوم اور آپ کا رنگ آپ کو کوئی برتری نہیں دلاتے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب

انسان برابر ہیں۔ ہاں! اگر آپ اللہ سے زیادہ ڈرنے والے ہیں، زیادہ پرہیزگار ہیں، زیادہ متقی ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کے افضل ہونے کا امکان ہے۔

حج کے موقع پر تمام حاجی مسلسل یہی الفاظ دہراتے ہیں:

"لبيك اللهم لبيك لا شريك لك لبيك......"

"حاضر ہوں! اے اللہ! میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں......"

پورے حج کے دوران وہ مسلسل یہ الفاظ دہراتے رہتے ہیں تاکہ یہ ان کے ذہن میں راسخ ہو جائیں یہاں تک کہ جب وہ واپس آتے ہیں تو پھر بھی یہ الفاظ ان کے ذہن میں رہتے ہیں۔

اسلامی عقیدے کا بنیادی ستون یہی ہے کہ اس بات پر ایمان رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا واحد بلا شرکتِ غیرے خالق اور مالک ہے۔ صرف وہی ہے جس کی عبادت کی جانی چاہیے۔ اگر آپ غور کریں تو ایک اور صرف ایک خدا پر ایمان کی صورت میں ہی عالمی اخوت و بھائی چارے کا قیام ممکن ہے۔

ایک ہی خدا پوری انسانیت کا خالق ہے۔ اسی نے سب کو پیدا کیا ہے۔ آپ امیر ہوں یا غریب، کالے ہوں یا گورے، مرد ہو یا عورت، آپ کا تعلق کسی عقیدے سے ہو، کسی ذات سے ہو، کسی ملک یا علاقے سے ہو، آپ سب برابر ہیں کیوں کہ آپ سب ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں۔ آپ سب کو خدائے واحد ہی نے پیدا کیا ہے۔ اگر آپ ایک رب پر ایمان رکھتے ہیں تو آپ کے درمیان حقیقی اخوت و بھائی چارہ قائم ہونا ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بیشتر بڑے مذاہب میں ایک اعلیٰ سطح پر خدائے واحد کا تصور پایا جاتا ہے۔

اسلام میں حقیقی اخوت و بھائی چارے کا تصور محض "اُفقی" نہیں "عمودی" بھی ہے۔ یعنی اسلام محض اتنا ہی نہیں کرتا کہ تمام علاقوں کے رہنے والے تمام انسانوں کے مابین بھائی چارے کا تصور دے، بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے۔ عمودی تصور سے مراد یہ ہے کہ ہم سے پہلے گزرنے والے لوگ اور بعد میں آنے والے لوگ بھی ہمارے بھائی ہیں۔

ماضی میں اس زمین پر رہنے والے لوگ اور ہم جو آج اس زمین پر زندہ ہیں در حقیقت ایک ہی قوم سے اور ایک ہی اُمت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ایمان کا تعلق ہے۔ یہ وہ بھائی

چارہ ہے جو "ایمان باللہ" کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح بھائی چارے کا ایک عمودی تصور ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ ایمانی بھائی چارہ ہے جو زمانی بھی ہے اور مکانی بھی۔ دنیا کے تمام مذاہب میں کسی ایک خالق پر ایمان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

ایمانی اور خونی اخوت و بھائی چارہ:

اگر آپ غور کریں تو حقیقی بھائی چارہ اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے اور دنیا بھر میں قائم بھی رہ سکتا ہے جب تمام لوگ ایک ہی خدا پر ایمان رکھیں، ایک خالق اور ایک مالک پر ایمان رکھیں۔ اس طرح بھائی چارے کا جو رشتہ وجود میں آئے گا وہ خون کے رشتے سے بھی زیادہ مضبوط اور زیادہ اہم ہوگا۔

میں نے پہلے عرض کیا کہ اسلام ہمیں والدین کی فرماں برداری کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وقضی ربك الا تعبدوا الا اياه و بالوالدين احسانا اما يبلغن عندك الكبر احدهما او كلهما فلا تقل لهما اف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما O واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما كما ربينى صغيرا O"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 17، آیت نمبر 23-24)

"تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو، مگر صرف اس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انھیں اُف تک نہ کہو۔ نہ انھیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان کے ساتھ احترام سے بات کرو o اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ پروردگار! ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔ o"

مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں والدین کی عزت، احترام اور محبت دینا ہر مسلمان کا فرض ہے لیکن اس کے باوجود ایک چیز ایسی ہے جس میں والدین کا حکم بھی نہیں مانا جا سکتا۔

سورۂ لقمان میں ارشاد ہوتا ہے:

”وان جاهدك علی ان تشرك بی ما لیس لك به علم فلا تطعهما و صاحبهما فی الدنیا معروفا و اتبع سبیل من اناب الی ثم الی مرجعكم فانبئكم بما كنتم تعملون○“

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 31، آیت نمبر 15)

”لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ۔ مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے۔ اس وقت میں تمہیں بتا دوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو۔○“

گویا والدین کی اطاعت ایک لازمی امر ہے، لیکن اس کی اجازت بھی وہیں تک ہے جہاں تک وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا حکم نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات ہی برتر ہیں اور جہاں دونوں احکام میں ٹکراؤ ہو وہاں آپ اللہ کا حکم ہی مانیں گے۔ اسی طرح ایمان اور عقیدے کی بنیاد پر بننے والا بھائی چارہ ہی حقیقی بھائی چارہ ہے۔ ایمان کا رشتہ خون کے رشتے سے برتر ہے۔ قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے:

”قل ان كان اباؤكم و ابناؤكم و خوانكم وازواجكم و عشيرتكم و موال ن اقترفتموها و تجارة تخشون كسادها و مسكن ترضونها احب اليكم من الله ورسوله و جهاد في سبيله فتربصوا حتى ياتي الله بامره و الله لا يهدي القوم الفسقين○“

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 9، آیت نمبر 24)

”اے نبی! کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے

ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں۔ تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔ O"

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ بتاؤ اور سوچو تمہاری ترجیحات کیا ہیں؟ کیا تمہیں اپنے بیٹے عزیز ہیں؟ یا تمہیں اپنے والدین عزیز ہیں؟ یا تمہارے زوج؟ (زوج کا لفظ شوہر کے حق میں بیوی کے لئے اور بیوی کے حق میں شوہر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ انگریزی لفظ "Spouse" کے معنوں میں) یا دیگر عزیز و اقارب۔؟

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے کہ کیا تمہاری ترجیح مال دولت، کاروبار اور جائیداد ہے؟ کیا یہ تمام چیزیں تمہیں زیادہ پسند ہیں۔؟ اگر تم ان چیزوں کو اللہ اور اس کے رسول اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے مقابلے میں زیادہ عزیز جانتے ہو تو پھر اللہ کے فیصلے کا انتظار کرو۔

پتہ یہ چلا کہ اگر والدین کسی غلط کام کا حکم دیں جس سے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہو تو اس کام کا کرنا جائز نہیں۔ والدین یا اولاد یا بیوی یا دیگر کسی رشتہ دار کی محبت میں چوری کرنا، بے ایمانی کرنا، رشوت لینا، کسی کے ساتھ زیادتی کرنا، کسی کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ کے عذاب کا باعث ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح مال و دولت، کاروبار، جائیداد بنانے کی خواہش میں جائز و ناجائز سے بے پروا ہو جانا بھی عذاب خداوندی کو دعوت دینے والا کام ہے۔ جہاں بات عقیدے اور ایمان کی آئے گی تو خونی رشتے بھی پیچھے رہ جائیں گے۔ قرآن مجید میں مزید ارشاد ہوتا ہے:

"یایھا الذین امنوا کونوا قومین بالقسط شھداء للہ ولو علی انفسکم او الوالدین و الاقربین ان یکن غنیا او فقیرا فاللہ اولی بھما فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا وان تلوا او تعرضوا فان اللہ کان بما تعملون خبیرا O"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 4، آیت نمبر 135)

"اے ایمان والو! انصاف کے علم بردار اور اللہ کے واسطے گواہ بنو، اگرچہ

تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔O"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب معاملہ عدل و انصاف کا ہو، جس وقت آپ گواہی دینے کے لئے کھڑے ہوں تو صرف سچی گواہی دیں خواہ اس میں آپ کا ذاتی نقصان ہو، خواہ آپ کے والدین یا رشتہ داروں کا نقصان ہو، آپ ہر حال میں سچائی پر قائم رہیں۔ اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ صاحب معاملہ غریب ہے یا امیر، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون سب کے لئے یکساں ہے۔ سو جب بات عدل و انصاف کی آئے گی، جب معاملہ حق اور سچائی کا ہو گا تو خون کے تمام رشتے فراموش کر دیئے جائیں گے، کیونکہ یہ عقیدہ کا معاملہ ہے اور عقیدے کا رشتہ تمام رشتوں سے برتر ہے۔

عقیدے کے اس رشتے کی اساس اس یقین پر ہے کہ ایک ہی خدائے بزرگ و برتر اس کائنات کا خالق ہے۔ تمام مذاہب فی الاصل اسی عقیدے کی تبلیغ کرتے ہیں اور جیسا کہ میں نے پہلے آپ کے سامنے قرآن مجید کی آیت پیش کی، اسلام اسی مشترکہ بات کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہے:

"قل یاھل الکتب تعالوا الی کلمۃ سوا بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرك بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمونO"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 3، آیت نمبر 64)

"اے نبی! کہہ دیجئے! اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا

کسی کو اپنا رب نہ بنائے گا، اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو تم صاف کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم (صرف اللہ کی بندگی و اطاعت کرنے والے) ہیں۔ ٥"

اللہ تعالیٰ کی ذات پر صرف ایمان رکھنا کافی نہیں بلکہ عبادت بھی صرف خدائے واحد ہی کی ہونی چاہیے۔ حقیقی عالمی اخوت، اتحاد، مساوات اور بھائی چارے کا قیام صرف اسی صورت ممکن ہے کہ پوری انسانیت ایک ہی خدائے بزرگ و برتر پر ایمان رکھے اور صرف اسی کی عبادت کرے۔

سورۂ انعام میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوا بغير علم"

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 6، آیت نمبر 108)

"اور اے مسلمانو! یہ لوگ اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔"

قرآن مجید کی یہ آیت مبارکہ اخوت اسلامی کو بڑے واضح طریقے سے بیان کرتی ہے:

"يايها الناس اتقوا ربكم الذى خلقكم من نفس واحدة و خلق منها زوجها وبث منهما رجالا كثيرا ونساء واتقوا الله الذى تساء لون به والارحام ان الله كان عليكم رقيبا○ "

(القرآن الکریم، سورۃ نمبر 4 (النساء)، آیت نمبر 1)

"لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔ اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق

مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات بگاڑنے سے پرہیز کرو، بے شک اللہ تمہارا نگہبان ہے۔o"

مساواتِ انسانی:

اسلام نے بنی نوع انسان کو وحدت اور مساوات کا سبق دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"یایھاالناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ"

"اے لوگو! اپنے اس رب سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا فرمایا۔"

تمام بنی نوع انسان بحیثیت انسان برابر ہیں۔ قبائل، خاندان اور اقوام محض باہمی تعارف کے لئے ہیں۔ اسلام میں مساوات سے دو باتیں مراد ہیں۔ ایک ہی قانون ہے امیر ہو یا غریب، سربراہِ حکومت ہو یا عام انسان، کسی کو کسی بنا پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ معاشرتی مساوات سے مراد ہے کہ عام اجتماعی اور سوشل لائف میں کسی کو فضیلت حاصل نہیں۔ اسلام میں نہ اونچ نیچ ہے، نہ برتری و کمتری۔ عزت و اکرام کا معیار فقط تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ان اکرمکم عنداللہ اتقکم"

"بیشک تم میں سے سب سے معزز سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ان العباد کلھم اخوۃ"

"سارے انسان بھائی بھائی ہیں۔"

اور فتح مکہ کے موقعہ پر فرمایا:

"اے لوگو! تم سب آدم سے ہو اور آدم مٹی سے تھے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کے ساتھ۔"

اعتدال اور توازن:

پوری کائنات اعتدال پر قائم ہے اور حیات انسانی میں بھی یہی توازن مطلوب ہے۔

اسلام کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ اس میں زندگی کی انتہاؤں کے درمیان ایک حسین توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے۔

انسانی زندگی میں اعتدال صرف الہامی ہدایت ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ اسلام نے دین و دنیا، فرد و اجتماع اور روح و جسم کے درمیان توازن قائم کیا ہے اور افراط و تفریط کو ختم کیا ہے۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"میں تو سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور شادی بھی کرتا ہوں۔ پس اللہ سے ڈرو! تم پر تمہارے نفس کا حق ہے، تمہاری آنکھوں کا تم پر حق ہے، تمہارے اہل و عیال کا تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا تم پر حق ہے، ہر حق اس کے حقدار کو ادا کرو (میری ہدایت یہ ہے کہ) روزہ بھی رکھو، افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھو اور سویا بھی کرو۔"

اسی طرح دین اسلام نے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بہترین توازن قائم کیا۔ ایک طرف فرد کی نشو و نما کا پورا ساز و سامان کیا تو دوسری طرف اسے اجتماعی ذمہ داری کے نظام میں منظم کیا۔

اسلام نے حیات انسانی کے تمام شعبوں کے متعلق مفصل ہدایات دے کر ان تمام شعبوں کے درمیان اعتدال قائم کیا۔ سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر شعبہ زندگی میں یہ سنہری ہدایت دی ہے:

" خیر الامور اوسطها"

"معاملات میں بہترین معاملہ میانہ روی ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا:

"اعتدال نبوت کا حصہ ہے۔"

پھر اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو امت وسط (میانہ رو امت) قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہ امتیاز صرف تہذیب اسلامی کو حاصل ہے کہ اس نے افراط و تفریط سے ہٹ کر زندگی کے فطری تقاضوں کو پورا کیا، ان میں توازن قائم کیا تا کہ انسانی زندگی اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ ترقی کر سکے اور کہیں اس میں جھول، انتہا پسندی، عدم توازن اور بے اعتدالی پیدا نہ ہو۔

ابدی اور دائمی مذہب:

زندگی ایک بدلنے والی چیز ہے، اسے گھڑی بھر کے لئے قرار نہیں۔ اسلامی تہذیب کا خالق رب العالمین ہے جو ازل سے ہے ابد تک رہے گا، اس لئے اسلام کے اصول وضوابط بھی دائمی اور ابدی ہیں۔ یہ اصول انسانی معاشرے کی نت نئی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق ہیں۔

انسان کے لئے محض اپنی فکر اور تجربے کی بنا پر ایسے اصول وضع کرنا ممکن نہیں۔ زبان و مکان کی جو مجبوریاں انسان کو لاحق ہیں ان کی بنا پر وہ اس کے لئے نااہل ہے۔ یہ اسلامی نظریہ حیات کی خوبی ہے کہ جہاں وہ ایک طرف زندگی کی ابدی صداقتوں کو پیش کرتا ہے، وہیں انسانی معاشرے میں جو فطری تغیرات آتے رہتے ہیں ان سے پیش آمدہ مسائل کا حل بھی فراہم کرتا ہے۔

لہذا اجتہاد اور قیاس اسلامی فقہ کے اہم اصول ہیں جن کے ذریعے نت نئے مسائل کا حل نکالا جاتا ہے۔

اصلاحی اور انقلابی دین:

دین اسلام فقط ایک نظریہ ہی نہیں جو لوگوں کے ذہنوں میں ہے، بلکہ یہ ایک اسلامی اور انقلابی دین ہے۔ جس کا مطالبہ یہ ہے کہ اسے دنیا میں رائج کیا جائے اور غلبہ واقتدار خدا کے دین کو حاصل ہو۔ چنانچہ قرآن مجید کا اعلان ہے:

"هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون"

"وہی ذات ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ تمام ادیان پر غالب ہو، خواہ مشرکین اسے ناپسند ہی کریں۔"

(سورۃ التوبہ، آیت نمبر:۳۳)

اس طرح دین اسلام ایک تبلیغی اور اصلاحی تحریک ہے۔ جس کا مقصد ریاست اور نظم کا قیام ہے۔ مسلم معاشرے کا ہر فرد اصلاً معلم اور داعی الی الحق کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ چنانچہ ہر فرد کو ہدایت ہے:

"تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان"
"نیکی اور تقویٰ کے معاملے میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور برائی و سرکشی کے معاملے میں تعاون نہ کرو۔"

(سورۃ المائدہ، آیت نمبر:۲)

نیز امت مسلمہ کو خیر امت قرار دیتے ہوئے اس کا سبب یہ بیان کیا ہے:

"کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر"
"تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کی اصلاح کے لئے میدان میں لائی گئی ہو۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔"

(سورۃ آل عمران، آیت نمبر:۱۱۰)

اخلاق میں متعدی تاثیر ہوتی ہے، اچھے اخلاق کو دیکھ کر دل میں نیکی کا رجحان پیدا ہوتا ہے اور برے اخلاق والوں کے ہاتھوں دوسرے لوگ بھی برائی میں پڑ سکتے ہیں۔ اس لئے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ضمن میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اگر کسی قوم میں کوئی گناہ کرتا ہے اور وہ قوم باوجود قدرت کے اس شخص کو گناہ سے نہیں روکتی تو ان پر مرنے سے قبل دنیا میں عذاب الٰہی مسلط ہو جاتا ہے۔"

(مشکوۃ المصابیح)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم میں سے جو برائی کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے روکے، اگر اس میں یہ استطاعت نہ ہو تو زبان سے روکے اور اگر ایسا بھی نہ کر سکے تو دل میں اسے برا سمجھے لیکن یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔"

(صحیح مسلم)

اسلام کے نظام کی برکتیں:

اسی طرح اسلام محض ایک فکری تہذیب ہی نہیں، بلکہ ایک اسلامی اور انقلابی تحریک بھی ہے، جس کا مقصد نیکیوں کی اشاعت اور برائیوں کی بیخ کنی ہے اور خدا کی زمین پر ظلم و

ستم، استحصال، ناجائز نفع اندوزی، جبر و تشدد، فحاشی اور گمراہی کو مٹا کر گلشنِ حیات اچھائیوں سے بھر دیتا ہے اور ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الفاظ میں زمین اپنے خزانے اگل دیتی ہے اور آسمان اپنی برکتیں برسانے لگتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تمام عرب تیئس سالوں کی مدت میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور اسلام بہت جلد دور دور تک پھیلنا شروع ہو گیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے:

"ورايت الناس يدخلون في دين الله افواجا"

"اور تو نے لوگوں کو اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔"

(پارہ نمبر 30، سورۃ النصر، آیت نمبر 2)

مسٹر سیل قرآن مجید کے انگریزی ترجمے کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"دنیا میں اس دین کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی جس کی مثال اور نظیر نہیں ملتی۔ اس دین کو نا صرف ان لوگوں نے قبول کیا جو عربی تھے بلکہ انہوں نے بھی قبول کیا جو غیر عربی تھے، حالانکہ اس میں کوئی بات اس سے بڑھ کر نہ تھی جو ایک مذہب میں عموماً خیال کی جاتی ہے۔ بہر حال اسلام نے اپنی تعلیمات کے ذریعے عجیب ترقی حاصل کی۔"

☆☆☆

خلاصہ کتاب

خلاصہ واختصار:

ہم نے ایک حد تک اسلام کے نظام حیات کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ اس کتاب کو ختم کرنے سے پیشتر ہم پورے اسلامی نظام پر ایک وسیع نظر ڈالتے ہیں اور پچھلے بیانات کا خلاصہ چند الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

افراد، جماعت اور عبادت ومعاشیات:

اسلام نے اولاً افراد کی ظاہری و باطنی طبائع کی اصلاح کی طرف توجہ دی ہے۔ جس کے لیے عبادات اور عقائد کا نظام پیش کیا۔ پھر جماعت کی تنظیم اور تشکیل کی اسکیم پیش کی اور افراد کے اندر جماعت انسانی کا رکن بننے کی استعداد پیدا کی۔ اس نے نہ صرف عبادات پر زور دیا بلکہ زندگی کی دیگر ضروریات پر بھی توجہ دلائی ہے' مثلاً زراعت کا حکم اس طرح دیا:

"اطلبو االرزق من خبایا الارض"

"زمین کی گہرائیوں سے تم رزق تلاش کرو۔"

اس میں ضمنی طور پر اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ زمین کے معاون اور اس کے خزانوں کو جو اس کی گہرائیوں میں ہیں تلاش کیا جائے۔

صنعت وحرفت وعلوم وفنون:

اسی طرح صنعت وحرفت کا بھی اسلام نے حکم دیا ہے۔ علوم وفنون کی تحصیل کی ترغیب دی ہے۔

قوانین واحکام:

اخوت ومساوات' علوم کی نشرواشاعت' دفاعی امور' لشکر کی تنظیم اور تنظیم کے قوانین واصول نافذ کیے ہیں۔

اخلاق، تمدن وعمران:

اخلاق' معاملات' معاشرتی آداب' اقتصادی ومالی امور کی تنظیم' سوسائٹی کے اصول غرضیکہ تمام تمدنی اور عمرانی ضروریات کی تشکیل کے مکمل قوانین واحکام پیش کیے ہیں۔

حقوق دولیہ وملّیہ:

اس کے امور خارجہ کی طرف نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نے حقوق دولیہ اور حقوق ملیہ مقرر کیے ہیں۔

اقوام عالم:

دنیا کی قوموں کے لیے الگ اصول منضبط کیے۔ جنگ' صلح' معاہدہ اور خط وکتابت کے احکام۔

بین الاقوامی قوانین:

سیاسی' بین الاقوامی اصول وقوانین' ہمسایہ کے حقوق آداب' مختلف حالات میں معاہدات کے آئین' اجنبی رعایا اور اہل ذمہ کے معاملات کے حدود اور ہر فرقہ وطبقہ کے حقوق مرتب کیے ہیں۔

اسلام برہانی دین:

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام ایک برہانی دین ہے جو معاش ومعاد کی اصلاح کا کفیل اور زندگی کی ضروریات کی تکمیل کا ذمہ دار ہے۔ اسلام نے فکری اور ذہنی آزادی عطا کی ہے کسی کو زبردستی غلام بنانے سے منع کیا ہے۔ انسانوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے اور انسانیت کو ذلیل کرنے سے روکا ہے۔ انسانی معاملات کو الٰہی احکام سے مربوط کیا ہے۔ تمام حقوق وواجبات اور حدود کی تشریح کردی ہے۔ مسلمانوں کے درمیان اخوت ومساوات اور حریت کے اصول مدون کیے ہیں۔ چونکہ حکومت الٰہیہ کے قوانین کو دنیا میں نافذ کرنے اور ربانی احکام کو رائج کرنے کے لئے اثر واقتدار کی ضرورت تھی' اس لیے دین اسلام نے ایک امام عادل کو مقرر کرنے کا حکم دیا۔

خلفائے راشدین کا دورِ حکومت:

اسی اساس و بنیاد پر خلفائے راشدین نے خلافت اسلامیہ کا بار اپنے کندھوں پر اٹھایا اور اپنے فرائض و واجبات کو خوش اسلوبی سے انجام دیا اور مسلمانوں کے لیے اپنا اسلامی نمونہ پیش کیا۔

فقط اسلامی و ایمانی تحریک:

اگر مسلمان اسلام کے اس نظام پر کاربند ہوں تو ان کو دنیا کی کسی تحریک میں حصہ لینے کی ضرورت نہ ہوگی۔ وہ تمام اقوام عالم کے لیے ایک ربانی و الٰہی نمونہ اور مثال ہیں۔ کیا ایسی امت جس کے پاس الٰہی و ربانی سرچشمہ (قرآن) اور ہدایت اور حق و صداقت کا بیش بہا سرمایہ اور اسلام کا ایک اٹل قانون اور نظام ہو، جس کی روشنی میں وہ زندگی کے تمام مسائل کو حل کر سکتی ہے اور قوموں کو درس حیات دے سکتی ہے دنیا کی قومی تحریکوں اور زمانے کے بے لوچ اور غیر مستقل نظاموں میں پنپ سکتی ہے؟ آج بھی مسلمان اپنے منبع اور سرچشمہ کی طرف رجوع کریں تو وہ پیاسی انسانیت کی پیاس بجھا سکتے اور پھر سے دنیا میں حکومت الٰہیہ کو نافذ کرنے کی صلاحیت جو ان کے اندر پائی جاتی ہے اسے اجاگر کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

ہماری کتابیں ،معیاری کتابیں
خوبصورت اور کم قیمت کتابیں

ناشر: مشتاق احمد

اہتمام: سلمان منیر

نام کتاب — اسلامی نظام زندگی قرآن اور عصری سائنس کی روشنی میں
مصنف — شیخ احمد دیدات رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ — مصباح اکرم
ترتیب جدید — علامہ مفتی محمد وسیم اکرم القادری
اشاعت — 2010ء
مطبع — آر۔آر۔ پرنٹرز، لاہور
ڈیزائن — عاطف بٹ
کمپوزنگ — گل گرافکس
قیمت — روپے

استدعا

پروردگار عالم کے فضل، کرم اور مہربانی سے، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہ کرم مطلع فرما دیں۔ ان شاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کے لیے ہم آپ کے بے حد مشکور ہوں گے۔ شکریہ۔ (ناشر)

THIS IS TRUTH
www.OnlyOneOr3.com
OnlyOneOrThree.com
مشتاق بک کارنر